A sum of **5 Paise** on general books and **25 P.** on text-books per day, shall be **charged** for books not returned on the date last stamped.

خطۂ کوکن کی سیاسی، تمدنی اور تہذیبی تاریخ

اشوک اعظم سے لے کر عہدِ عالمگیر تک ۔

ڈاکٹر مومن محی الدین

ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی (اڈنبرا)

پبلشرز

نقشِ کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ

۴۴۔ جمیل روڈ (ایسٹ)، ڈونگری، بمبئی ۹

تاریخ دکن

○ مصنف : مومن محی الدین

○ پیدائش : بھیمڑی (ضلع تھانہ) ۱۰ مارچ ۱۹۳۱ء

○ تعلیمی لیاقت : ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (اڈنبرا۔ اسکاٹ لینڈ)

○ اعزازات : گولڈ میڈل (۱۹۴۸ء، ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء)

ڈیوک آف اڈنبرا فیلوشپ اور اسمٰعیل یوسف کالج فیلوشپ
(۱۹۵۰ء - ۱۹۵۲ء)
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سینیئر ریسرچ فیلوشپ
(۱۹۶۲ء - ۱۹۶۵ء)

استاد شعبۂ فارسی اور ثقافتِ اسلامی، دانشگاہِ بمبئی

○ کتابت : جمشید اختر
سلام خوشنویس

○ سرورق کا ڈیزائن : آرٹسٹ آرا

○ ٹائیٹل : سیٹیلائٹ پرنٹرس بمبئی ۸

○ پریس : اجمل

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرنسس بلڈنگ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی نمبر ۳

بیاد نگار

مرحوم عبداللہ مستری صاحب

(۱۸۹۶ - ۱۹۶۷)

ء

اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

تاریخ پیدائش ۲۲ رجون ۱۸۹۶ سنہ ء

تاریخ وفات ۵ راکتوبر ۱۹۶۷ سنہ ء

پبلشرز

عرضِ ناشر

والٹیئر کے خیال کے مطابق "تاریخ" دُنیا کے جرائم کی داستان۔ نپولین کے قول کے مطابق ایک "متفقہ کہانی" اور آسکر وائیلڈ کی نظر میں صرف ایک "گپ" ہے۔ میکس ویل ڈرورک کہتا ہے کہ: "تاریخ ماضی کے واقعات کا ایسا دفتر ہے جو مستقبل میں متعصبانہ طور پہ تحریر کیا گیا" یا پھر تاریخ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ نااہل حکمرانوں اور احمق سپاہیوں کے اعمال کی داستان ہے اور ان ناانصافیوں اور مظالم کی رُوداد جو انسان نے انسان کے ساتھ رَوا رکھے۔

اشوک اعظم سے عہدِ عالمگیر تک ہندوستان نے زمانے کے کئی اُتار اور چڑھاؤ دیکھے — تہذیبیں اُبھریں اور مٹ گئیں — تاریخ کوکن میں ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقے کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ کیونکہ بیرونی دُنیا میں ہونے والے واقعات اور اثرات سے متاثر سب سے پہلے یہی علاقہ ہوتا رہا ہے اور پھر یہیں سے یہ اثرات پورے ہندوستان میں پھیلتے رہے ہیں۔

ہمارا مقصد اُردو میں ٹھوس قسم کی علمی تصنیفات پیش کرنا ہے ـــــ ڈاکٹر مومن محیُ الدین ایم-اے،-پی-ایچ-ڈی ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) کی اس تاریخی تصنیف کی اشاعت سے اس منزل کی جانب پہلا قدم اُٹھا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اِس پیش کش کا خیر مقدم خاطرخواہ کیا جائے گا۔

یہاں، خانصاحب عبداللہ مستری (مرحوم) کی اُس ہمت اَفزائی اور دلچسپی کا ذکر بھی ضروری ہے جو انھوں نے اس کتاب کی اشاعت سے رکھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اِس کتاب کے منظرِعام پر آنے تک ہم میں موجود نہیں رہے۔

ہم ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ہماری تحریک پر اپنا قیمتی وقت اِس موضوع کی تحقیق اور تصنیف میں صرف کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اُن کی یہ گراں بہا تصنیف علمی حلقوں سے قرارواقعی داد و تحسین حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائیک

چیئرمین نقش کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ۔ بمبئی

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

تاریخ کی اساس تحقیق پر ہے اور جس کی تصنیف میں
حقائق و واقعات کی توضیح سے زیادہ ان سماجی عوامل اور معاشی
محرکات کی توجیہ ضروری ہوتی ہے جو سیاسی حالات کی رفتار
متعین کرتے ہیں اور تاریخ کو نیا موڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے مورخ
کے لیے علم تاریخ کے اصولِ فلسفہ و نظریات اور تاریخی جدلیات کا
شعور و ادراک رکھنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ چاہے وہ اپنی تاویلات
ابنِ خلدون کے عمرانی تصورات کی تعبیر کرے یا مارکسی نظریات
کی تفسیر، مگر اسے اپنے راستبازِ قلم اور خلوص میں گھلی ہوئی روشنائی
سے ان سچائیوں کے بارے میں لکھنا چاہیے جن کی کھوج وہ ماضی کی
سرحدوں میں، یادوں کے کھنڈروں اور ملبوں میں کرتا رہتا ہے۔
ایسی سچائیاں، (گو زہرِ غم بن کر رگ و پے میں اتر ہی کیوں نہ
جائیں اور جن سے "تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش" ہی کیوں نہ ہو)
نہ صرف ماضی کی غلطیوں کا عقلیت کے مطابق استدلال کرتی ہیں

ا ہوتا علوم اور انسانی زندگی کو آگے بڑھانے میں ممد بھی ثابت ہوتی ہے۔ مؤرخ کو چونکہ دیگر دانشوروں کی طرح اپنے معاشرے کی ذہنی و فکری ارتقا میں ایک اہم سماجی کردار ادا کرنا ہوتا ہے اس لیئے اسے معاشرے کی عام ذہنی سطح سے بلند ہوکر سوچنا چاہیئے۔ کسی مؤرخ میں ان اوصاف کا فقدان اسے حیرت انگیز داستان گو تو بنا سکتا ہے مُفید مؤرخ نہیں۔ ایسا داستان طراز اپنے انکشافات سے تسخیرِ قمر سے زیادہ عجوبۂ روزگار کرشمے دکھلاتا ہے اور وہ اپنے جادو کے قلم سے بیک جُنبش قطب لاٹ کی جگہ اشوک لاٹ کھڑا کرسکتا ہے اور تاج محل کے حُسنِ مرمریں پر تعصب کی کالکھ اور سفید جھوٹ کی سیاہی پھیر کر صداقت کا چہرہ مسخ کرسکتا ہے، اور کچھ دیر کے لیئے زمانے کو چونکا دیتا ہے۔

معلوم نہیں یہ حقیر تصنیف اور یہ ہیچمداں مصنّف ان کسوٹیوں پر کہاں تک کھرے اُترتے ہیں لیکن سچ کی سیدھی لکیروں سے میرے ذہنی پس منظر کے خطوط اور جذباتی زاویئے واضح ضرور نظر آجائیں گے کہ اس کتاب کا مصنّف انسانیت کی عظیم اقدار کا احترام کرتا ہے اور انھیں مقدم تسلیم کرتا ہے — اور یہ کہ قومی اتحاد و یگانگت اور جذباتی ہم آہنگی پر ایمان رکھنے والا یہ کوئی مؤمن ہے (گو یہ ایمان متزلزل ہوجاتا ہے جب فرقہ وارانہ سانحات میرے آدرش کو صدمہ پہنچاتے ہیں) اس کتاب کی تصنیف و طباعت میں تاخیر ہوئی تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا تصنیف تو یوں بھی عاشقی کی طرح صبر طلب ہے اور تمنائیں اتنی بیتاب کہ

ایک ساتھ کئی "معشوقوں" سے دل لگا بیٹھیں ۔ میری انگریزی تصنیف
طبع ہوچکی ہے مگر "انڈکس" کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے ۔ اسی
دوران یونیورسٹی لائبریری نے "ذخیرۂ کھٹکھٹے" کے عربی، فارسی
اور اُردو مخطوطات کی بیانی فہرست کا کام بھی سپرد کردیا ۔ بہرحال ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کاری کردم

قارئینِ کرام سے معذرت کے ساتھ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر آپ
کو تاریخ کے مطالعہ سے دلچسپی ہے تو آپ اس کتاب کا دوسرا باب،
اور تیسرا باب جی کڑا کے پڑھ جائیں گے ۔ یوں تو میں نے تاریخ کے
خشک موضوع کو دلچسپ اور شگفتہ بنانے کے لیئے ایک مُنفرد اُسلوب
اختیار کیا ہے ۔

میں "نقشِ کوکن" ٹرسٹ کا بے حد ممنون ہوں جس
نے میرے "نقشِ فریادی" کو کاغذی پَیرہن عطا کیا ۔ تاریخ کوکن کی
تصنیف و طباعت میں جس نے تاریخی کردار اَدا کیا ہے وہ میرے
محترم دوست ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب ہیں جو نہ صرف ایک کامیاب
اور ماہر ڈاکٹر ہیں بلکہ مخیّر اور مقبول سماجی کارکن بھی ہیں ۔ ڈاکٹر موصوف
صرف جسمانی امراض کے معالج ہی نہیں معاشرے کے نبض شناس اور
سماجی علالتوں کے ماہرِ تشخیص بھی ہیں ۔ تشکر و امتنان کے چند رسمی
جُملوں سے حق تو یہ ہے کہ حق اَدا نہ ہوگا ع

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

مَیں اکسپریس بلاک کے محترم سعید الرحمٰن صدیقی صاحب کا بیحد شکرگُزار

ہوں جنھوں نے اِس کتاب کی اشاعت و طباعت میں نہ صرف دلچسپی لی بلکہ انتہائی جدوجہد بھی کی ہے۔ سعید صاحب ایک بے لوث اور مخلص دوست ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست بھی ہیں۔

میرے شکریہ کے مستحق جناب فقیر محمد مستری بھی ہیں جنھوں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بے حد مدد فرمائی ہے۔ میرے عزیز دوست حیدر پٹھان صاحب (ایڈوکیٹ) نے اس کتاب کے بارے میں جو مفید مشورے دیئے ہیں ان کے لیئے میں ان کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

جناب شاہد علی خان منیجر مکتبۂ جامعہ نے اس کتاب کی اشاعت میں جو دلچسپی لی ہے اس کا میں شکر گزار ہوں۔

سرورق کے لیئے بین الاقوامی شہرت کے حامل آرٹسٹ آرا صاحب کا ممنون ہوں۔

بات ادھوری رہ جائے گی اگر میں اپنی "نصف بہتر" نوشابہ مؤمن کا شکریہ نہ ادا کروں جن کے طعنے اِس تصنیف کی تکمیل کا باعث بنے۔

○

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاران بیش

عمرِ رواں کی اِس منزل پر ایک عظیم سانحہ میرا مقدر بن گیا۔ میرا وہ بڑا بھائی جس نے میرے مقدر کو اپنی محنت کے ہاتھوں سے تراشا اور سنوارا ۴ رمئی ۱۹۶۹ء کے روز داغِ مفارقت دے گیا۔ ایسے بڑے بھائی ہر دَور میں پیدا ہوتے رہے ہیں جو کبھی مشہور مصوّر وان گاگ کے فن کی نمو و نمود اپنے خونِ جگر سے کرتے ہیں اور کبھی ذاکر حسین مؤمن بن کر اپنے حوصلوں اور اُمنگوں سے چھوٹے بھائی کو اِس علمی مرتبے اور سماجی رُتبے تک پہنچا دیتے ہیں ــــــ میں یہ چند سطریں لکھ کر اپنے مرحوم برادر بزرگ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم، پختہ شدم، سوختم

اگست ۱۹۶۹ء
"یونیورسٹی کلب ہاؤس"
شعبۂ فارسی۔ دانشگاہِ بمبئی
چرچ گیٹ۔ بمبئی

فہرستِ عنواناتِ تاریخ

پہلا باب	کوکن ہزاروں سال پہلے	۱ تا ۳۱
دوسرا باب	کوکن کا سیاسی وتمدنی عروج	۳۲ تا ۶۲
تیسرا باب	کوکن سلاہار راج میں	۶۳ تا ۹۷
چوتھا باب	کوکن نئے دین کی دہلیز پر	۹۸ تا ۱۲۸
پانچواں باب	کوکن ہلالی پرچم کے سائے تلے	۱۲۹ تا ۱۶۵
چھٹا باب	مسلم دورِ حکومت میں کوکن کی زرعی معاشیات	۱۶۶ تا ۲۰۰
ساتواں باب	طرزِ معاشرت اور معیارِ زندگی	۲۰۱ تا ۲۳۸
آٹھواں باب	اسلامی ثقافت اور مدنیت	۲۳۹ تا ۲۷۳
نواں باب	کھونٹ کھونٹ کے لوگ	۲۷۴ تا ۲۹۹
دسواں باب	بھانت بھانت کی بولیاں	۳۰۰ تا ۳۳۲
گیارھواں باب	نوآبادیاتی نظام کی بنیاد کوکن میں	۳۳۳ تا ۳۶۹
بارھواں باب	مغل سامراجیہ اور مرہٹہ سوراجیہ کوکن میں	۳۷۰ تا ۳۹۲
تیرھواں باب	کوکن میں دولتِ انگلیسیہ کی پہلی صبح	۳۹۳ تا ۴۲۴
چودھواں باب	مشاہیر کوکن	۴۲۵ تا ۴۴۲
پندرھواں باب	صنادید کوکن	۴۴۳ تا ۴۹۳

٭

بے دِلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذَوق
بے کسی ہائے تمنّا! کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں!

۱

۷۸۶ء

پہلا باب

کوکن ہزاروں سال پہلے

عرب ساگر اور سہادری کے کوہستانی سلسلے کے درمیان۔ کوکن کا سرسبز اور زرخیز خطہ جنت ارضی کا ایک ٹکڑا ہے جو دھانو سے لے کر گو آتک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں زمردیں پہاڑوں سے گھری ہوئی جھلملاتی ہوئی جھیلوں کے نقرئی جال ہیں جن کے اطراف ناریلوں اور تاڑوں کے گھنیرے جھنڈوں کے گہرے سائے ان گنت صدیوں سے ڈول رہے ہیں۔ پہاڑوں کی وادیوں میں ساگوان، برگد، پیپل اور ہرے بانس کے دشوار گزار اور پُراسرار جنگل ہیں۔ کوہساروں سے نکلی ہوئی نرمل پانی کی ندیاں ہیں جو کناروں پر بساط گل بچھاتی ہوئی کہیں کھاڑیوں سے سنگم بناتی ہیں اور کہیں دریا بیکراں چٹانوں سے گر کر سرگم سناتی ہیں اور پھر مفلس کی قبا کی طرح کٹے پھٹے ساحلوں سے الجھتی بیکراں سمندر میں جل پریاں بن کر گم ہو جاتی ہیں۔ یہی ندیاں کوکن کے سدا بہار حسن اور شادابی کی آبرو بن گئی ہیں۔ بساط قدرت نے سہادری کی کالی زلفوں میں کہیں چوٹیاں گوندھ دی ہیں اور کہیں مانگ نکال دی ہے جس میں دریاؤں اور ندیوں نے سیال چاندی کی افشاں بکھیر دی ہیں۔

کوکن کے جنوب میں گوا کا حسین جزیرہ گومتی (منڈووی) اور اگھناشی (زواری) کے نقرئی گہوارے میں بہار کا بالک بنا ہلکورے کھا رہا ہے جس کے نظر نواز نظارے کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے تاڑوں اور ناریلوں کے گہرے سبز پتوں نے اپنا آنچل ڈال دیا ہے۔ رتناگیری اتراتی ہوئی روپہلی ندیوں کا دیس ہے جس کے کناروں پر حسن انگڑائیاں لیتا ہے اور جلترنگ کا اُتم سنگیت گونجتا رہتا ہے۔ سفید چنبیلی کے بیلوں میں لپٹا ہوا اور چمپا کے زرد کنجوں سے گھرا ہوا۔ قلابہ پھولوں اور کلیوں کا چمن زار ہے تھا۔ امر لوک (دیوتاؤں کی دنیا) کا استھان ہے۔ جس کے شمال میں ویترنا اور اُلہاس ندیوں کا وہ دوآبہ ہے جس کی وادی میں ہزاروں سال قبل از مسیح۔ آریائی تہذیب و تمدن کا پہلا قافلہ اُترا تھا۔ ہندو پرانوں کے مقدس پہاڑ تنگر کی وادی میں اور نرمل کے تیرتھ استھان سے قریب سوپارہ (اوفر) کا قدیم شہر آباد ہے۔ روایت جس کا تاریخی رشتہ حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا سے جوڑتی ہے۔ سعادتوں کا شہر کلیانا اور شری استھانک (تھانہ) کی قدیم بندرگاہوں کی عظمتِ رفتہ کا عکس آج بھی اُلہاس ندی کے پانی میں جھلک رہا ہے۔ یہ ندی جو مغربی گھاٹ سے نکلتی ہے، بھاتسا اور کالو کی لہروں کو اپنے روپہلے دامن میں سمیٹتی کلیان اور بھیونڈی کے گرد پانی کی حصار سا کھینچ کر انہیں سالشٹی سے جدا کرتی ہے۔ تھانہ کی کھاڑی (خلیج) سے دامن چھڑا کر چاندی کا ہالہ بناتی ہوئی اور مختلف ٹاپوؤں کے اِرد گرد گردشِ روزگار کی طرح چکر یں کاٹتی اُلہاس ندی کاشیہ کے مقام پر بھیونڈی کی کامواری (کھاڑی) سے اور آگے بڑھ کر بسین کھاڑی سے گلے لگ جاتی ہے۔ اُلہاس ندی کے پھیلے ہوئے کنارے اپنے قدرتی مناظر کے سبب ہمیشہ سے "فردوسِ نظر" بنے رہے ہیں۔ تنگر کے

اودے پربتوں کے پس منظر میں اُلہاس کا والہانہ رقص اور اس کے کناروں کا خاموش دلربا حسن اتنا سحر انگیز ہے کہ کئی پرتگیزی اور مغربی سیاح اس کا مقابلہ دنیا کی حسین ترین جھیلوں کے مناظر سے کرتے ہیں۔ آج سے[1] دو سو برس پہلے — مغربی ساحل پر بسین سے کولابہ (بمبئی) تک پچیس چھوٹے چھوٹے جزیرے پھوٹی تقدیر کی طرح منتشر اور ویران پڑے تھے۔ یونانی جغرافیہ نویس انہیں "ہپتانیسیا" کہتے تھے۔ بمبئی جسے آج عروس البلاد کہتے ہیں۔ سات جزیروں کے جمگھٹے میں بیوہ کے اُجڑے سہاگ کی مانند تھا۔ یہاں صرف مچھیرے اور مچھیرے رہتے بستے تھے۔ یہ سات جزیرے تھے (۱) مجھی گاؤں (مجگاؤں) (۲) ورلی (۳) کولابہ (۴) ٹرامبے (۵) پردیبت یا نیولے (مہانم) (۶) ممبئی اور (۷) ساشٹی (تھانہ سے لے کر بھانڈپ اور اندھیری تک کا علاقہ)۔ ان جزیروں کی جغرافیائی ہیئت اور ان کے نام سیاست اور حکومت کے بید رد ہاتھوں مسخ ہوتے رہے ہیں۔ اور پھر انسانوں کی محنت سے سنورتے بھی چلے گئے۔ جب یہ جزیرے انسانوں سے آباد ہوئے تو زر اور زرخیزی کے سبب خوابوں کے جزیرے بن گئے! اس عروس البلاد کو حاصل کرنے کے لئے کبھی دکن کے شہزادے اور گجرات کے راجکمار گھوڑے دوڑاتے آئے تو کبھی سات سمندر پار سے فرنگی بحری بیڑے لے کر چڑھ آئے۔

تہذیب کی پہلی کرن:

کوکن کے ریگزاروں کی میکراں وسعتوں میں تاریخ آج بھی اُمر لوک کے اُن دیوتاؤں کے

---

[1] J. G. Da Cunha Notes on the History & Antiquities of Chaul and Bassein (Bombay 1876) Page 254

نقشِ قدم ڈھونڈھتی پھر رہی ہے جنہوں نے اس بھومی پر قدم رکھا۔ ان میں ہندو دیومالاؤں کے اوتار پرسورام بھی تھے اور مہابھارت اور بھگوت گیتا کے سورما ارجن بھی پرانوں کے عہد میں رتناگیری کے راجہ ویرت رائے نے کورو پانڈوؤں کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ برار کا راجہ بھیم سین جو دمینتی کا پتا تھا۔ اس علاقہ تک راج کرتا تھا۔ ہندو اساطیر کا سورما پرسورام جو وشنو کا چھٹا اوتار مانا جاتا ہے۔ کوکن کا پہلا کوکنی تھا جس نے اپنے تیشے (پرشو) سے چپلون کے قریب واشِشٹی کے کنارے ساٹھ کنڈ کھود کر چشمہ شیریں جاری کیا تھا اور سمندر کو پیچھے دھکیل کر اس دھرتی پر کوکن کی تشکیل کی تھی۔[۱] پرسورام ہی نے ویترنی کو زمین پر اتارا تھا۔ مہابھارت میں جس کا شمار چار پوتر ندیوں میں کیا گیا ہے۔ قدیم آریائی جغرافیہ دانوں نے کوکن کو بھارت ورش کے سات منطقوں کا ایک حصہ تصور کیا ہے[۲] سنسکرت کی کتابوں میں کوکن کا رقبہ دیوگڑھ سے سداشیوگڑھ تک بتلایا گیا ہے۔ نوے میل پھیلے ہوئے کوکن سے لگا ہوا تاپتی تک کا علاقہ ابھیر کہلاتا تھا یعنی گڈریوں کا دیس، جو بربرہ (مرہٹہ)، (تاپی سے دمن یا لبین) ویرات (دمن سے بانکوٹ) اور کیرات (بانکوٹ سے دیوگڑھ) تین حصوں میں بانٹا گیا تھا۔ گوا کو گومیت یا گومنت کہتے تھے۔

۱ Bhandarkar R.G. "Early history of the Deccan" (مرہٹی ترجمہ)
Bapat (1887) P. 99 — گزیٹیر ضلع رتناگری جلد ۱ (۱۸۸۰) صفحہ ۳۲۶، ۳۵۵

۲ پرسورام خنڈ کے مطابق جنوبی آریہ ورت کے یہ سات حصے ہیں۔
केरला तुलंगाश्च,
सौराष्ट्रवासिन, कौंकणा करहाटाश्च, वरालाश्च बर्बरा

دیکھئے مرات احمدی (انگریزی ترجمہ)۔

۳ Rev. A.K. NAIRNES KONKAN (BOMBAY 1894
A.L. BASHAM, The Wonder That was India (London 1954),

مہابھارت میں کوکن کو اَپرانت کہا گیا ہے۔ پراچین اَپرانت میں تہذیب و تمدن کے علمبردار وسطی ایشیا کے وہ خانہ بدوش آریائی تھے جو ڈھائی ہزار برس قبل از مسیح ترکِ وطن کر کے شمالی ہندوستان میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ آریائی تہذیب کے چڑھتے سورج کی کرنیں اُن کی دیوی اُدِتنا اور دیوتا شوریہ کے روحانی اُجالوں کی طرح چاروں طرف پھیلتی گئیں اور دو ہزار برس بعد ایک آریائی قافلہ مقدس سندھو دریا پار کر کے ویترنا کی زرخیز وادی میں گوبا (واڈہ تعلقہ ضلع تھانہ) کے مقام پر اُترا تو اپرانت میں بھی نئی آریائی سانسکرتی کی پو پھوٹی۔ اپرانت کے قدیم باشندے ڈنڈکارنیہ (گھنے جنگلوں) اور مٹی کے فصیلوں سے گھرے ہوئے "پوروں" میں رہنے والے ادیباسی تھے۔

کھیتوں میں آگری (کنبی) اور ساحلی علاقوں میں کولی ماہی گیر یگ یگ سے رہتے چلے آرہے تھے۔ یہی اس دھرتی کے لال اور عرب ساگر "رتن کار" کے بیٹے رتن اور سنتان تھے جو اجنبی خانہ بدوشوں سے رنگ و روپ میں بیحد مختلف تھے۔ آریائی اپنی اس محکوم قوم کو "داس" کہتے تھے۔ اس زرخیز دو آبے میں قبائلی زندگی کی تمام سہولتیں انہیں میسر تھیں۔ یہاں ان کے ریوڑوں کے لئے لمبی لمبی گھاس کی وسیع چراگاہیں تھیں، گھنے جنگلوں میں ان کے مقدس درخت اشوتھ (پیپل) لھد (برگد) اور اشوک کے گھنے سائے، تلسی کے پیڑ، کُشا اور دُربھ (دوب) کے سبزہ زار اور کدمب کے نارنجی پھولوں کے پودے تھے۔ اتی مکت (سفید چنبیلی) کی لہراتی ہوئی بیلیں اور چمپکا (چمپا) کی مہکتی ہوئی زرد کلیوں کی کنجیں تھیں۔ اور کبھی نہ خشک ہونے والا ویترنی کا شیتل پانی تھا جس کی پوترتا اور مذہبی تفضیلت کا سبب اس کا یہی افادی پہلو تھا۔ زندگی کے بہاؤ، وقت کی رفتار اور ویترنا کے تیز دھاروں کے ساتھ ساتھ آریائی اپنی ساحلی کشتیاں، چھوٹے ناؤ اور مہانگری نے کر ویترنی سے نکلتے اور ہواؤں کے رخ پر کھیتے کھیتے گوگی

اور اگھنیشی کے کناروں تک چلے جاتے تھے۔ وسیترنا کا بحری رابطہ کاموری کے
ذریعے بھیونڈی اور وہاں سے تھانہ ضلع کے اندرونی علاقے تک تھا اور
پھر تھانہ۔ اُدرن کی کھاڑی سے براہ راست اُس بندرگاہ سے تھا جسے چمپاوتی
(چیول) کہتے تھے۔ انگروں نے جب پتوار سنبھالے اور ہمت نے جب اپنے
بادبان کھولے تو ان کے بڑاؤ اور تڑاپے جن کے تختے ناریل کی رسیوں سے
جوڑے جاتے تھے۔ مستولوں کا سربلند کئے سمندر کے پھیلے ہوئے سینے پر دوڑنے
لگے اور بدیس کی منڈیوں اور بازار ہاٹوں کی خبر لانے لگے۔

قبائلی سماجی زندگی کے آغاز نے تجارتی اور معاشرتی رشتوں کو اُستوار کرنا شروع
کر دیا۔ تاریخ کی یاد سے پہلے اور وَید زمانوں سے قبل مغربی ساحل کی بندرگاہوں
کے تجارتی مواصلات بالخصوص اُس سرزمین سے مستحکم ہو چکے تھے۔ جو بابل اور نینوا
کی تہذیبوں کے گہوارے تھے۔ اور جہاں کئی پیغمبر نازل ہوئے ہیں۔ چمپاوتی، شرپارک
(سوپارہ) شری استھانک اور کلیانا کے بحری رابطے بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ذریعے عراق
و عجم، مصر و شام اور روم و یونان سے عرصہ سے قائم ہو چکے تھے۔ انہیں ملکوں کی ساٹھ
چپوؤں والی بادبانی منقش کشتیاں یہیں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ ان میں اجنبی زبان بولنے
والے وجیہہ یَوَن (یونانی) لمبی عباؤں والے بازارِ مصر کے سوداگر اور گھنی داڑھیوں
والے اور اہورمزدہ کی پرستش کرنے والے عجمی تاجر آتے تھے۔ ان کے لئے یہ ناریل اور
ساگوان کا ملک تھا۔ جس کے دریاؤں میں موتی مونگے رُلتے تھے، جس کے پہاڑوں میں
یاقوت کی کانیں تھیں اور درختوں میں عطر بسا ہوا تھا۔* سونے چاندی کی جھنکاروں اور

عرب و ہند کے تعلقات۔ مولانا سید سلیمان ندوی (الہ آباد ۱۹۳۰ء) صفحہ ۵۰

* بحرها درّ و جبالها یاقوت و شجرها عطر

عود و عنبر کی مہکاروں نے ان کے دلوں اور دماغوں پر ایسا سحر طاری کر دیا کہ مصر کا جادو اور سامری کا طلسم بھی ٹوٹ کر رہ گیا۔ جمبو دیپ کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولا کہ یہ اپنی بولیاں بھول گئے اور اپنے دیوتاؤں زیوس اور متر اکی حمد و ثنا، کی بجائے اندرا اور ورونا کے بھجن گانے لگے۔ انہوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے اور یہی ایرانت کے پہلے بدیسی نو آباد کار کہلائے۔ جن کی بستیاں میلاد مسیح کے عہد تک شتر پارک، کلیانا اور گومتی کے علاوہ دیگر ساحلی علاقوں اور مقدس مقاموں میں آباد ہو چکی تھیں۔

خیالوں کے صنم خانے

آریاؤں کی پہلی مذہبی کتاب رگ وید کے عہد تک مذہب نے کئی صنم خانے آباد کر رکھے تھے۔ عناصر کی قوتوں اور فطری مظاہر کی برکتوں کو آریائی، انسانی اور الوہی علامتیں (پرتک) دیکر پوجتے چلے آتے تھے۔ یم (موت کا دیوتا) اندر اور ورونا۔ لوک پال (کائنات کے محافظ) خداؤں میں سے تھے۔ وایو۔ ہوا کا دیوتا تھا۔ یہی ترت اگنی (مقدس آگ، کے کئی روپ تھے۔ یہ دیوتا کبھی بجلی بن کر آکاش پر چمکتا اور کبھی گھروں کے آتشدانوں اور تنوروں میں انگارا بن کر دہکتا تھا۔ راتری (رات) کی چھایا بیتھ (کہکشاں) پر جب سوما (چاند) اپنے روپہلے رتھ میں نکلتا تھا تو دھرتی پر کھیتوں میں اُجالا پھیل جاتا' دھانوں کی بالیاں جھومتے ۔۔۔ اور کونپلیں اپنی مٹیالی چلمنوں سے جھانکنے لگتی تھیں۔ کومل کلیوں کے ہونٹوں پر تبسم پھیل جاتا تھا[1]۔ دن کی سلطنت پر سوریہ دیوتا کا پہرہ تھا جس کے دہکتے ہوئے سنہری رتھ کی آمد کی

---

[1] یہ آریاؤں کا عقیدہ تھا۔

خبر اُوشا صبح کی دیوی اپنا گلنار آنچل لہرا کر دیتی تھی۔ اُس کے پیچھے اس کی بیٹی سوریا کا تین پہیوں والا رتھ ہوتا تھا جس کے گھوڑوں کی باگیں اُس کے جڑواں ساتھی اشون کے ہاتھوں میں تھیں۔ پُوشن۔ سوریہ دیوتا کے راستوں کا محافظ اور بھٹکے ہوئے ریوڑوں کا گلہ بان تھا۔ مگر سب سے بڑا دیوتا جنگجو اور قہر آلود اِندر تھا جس کے اشارے پر طوفان و باد و باراں اُٹھتا تھا اور جو مَعَدَ دیوتا کی طرح اپنے دشمنوں کو بجلی (وَجر) سے بھسم کر ڈالتا تھا۔ گھنگھور گھٹائیں اس کی میگھ دُوت تھیں۔ اور کائنات کی تخلیق کرنے والا اور کائناتی تسلسل کو برقرار رکھنے والا بادشاہ ۔ ورُون تا اپنے امرلوک (دیوتاؤں کی دنیا) میں روشنی کے خدا مِترا اور دیگر دیوتاؤں کے ساتھ محل میں بیٹھا وقت کا پہیہ چلا رہا تھا، جس کی گردش سے موسم تبدیل ہوتے رہتے تھے اور سمے کا سفر جاری رہتا تھا۔ وقت کے بہتے ہوئے تیز دھارے پر کبھی بسنت بہار کی رُت میں میگھ راگ کے کنول تیرنے لگتے، اور کبھی پت جھڑ کی رُت میں اُداس راگ، سوکھے پتوں کی طرح لرزتے رہتے تھے۔ کائنات کی ساری دلربائیاں، قدرت کی ساری دلآویزیاں مذہب کے سانچے میں سمٹ کر فنونِ لطیفہ میں ڈھل رہی تھیں۔ اپسرائیں خوبصورتی کے اعلیٰ معیار کا تخیّل بن گئیں۔ برہما اور شکتی کا تصور سات سروں میں گونجنے لگا، گندھرو نیلے آسمانوں کا الوہی مطرب تھا۔

یہ سب تھا مگر آریاؤں کی پرستش اور عقائد پر برہمنوں کی مشکل پسندیوں اور باریکیوں نے رسوم و قیود کی اتنی دبیز تہیں چڑھا دی تھیں کہ وید دھرم کا گلا گھٹنے لگا تھا۔ جانوروں کی قربانی جو پہلے آریائی قبیلوں کی خوراک کا ذریعہ تھی۔ مذہبی عبادت (یجنا) کے روپ میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کا بہانہ بن گئی۔ سامراجیہ کے سمراٹ اپنے آپ کو "چکرورتی" کہلانے کا استحقاق "اشومیدھ" (گھوڑے کی قربانی) کر کے حاصل

کرنے لگے۔ قربانی کے فلسفہ نے پروہتوں کی چھریوں کو تیز اور ان کی زبانوں کو دراز کر دیا۔
طلسماتی منتروں کی ساحری اور الوہی شاعری نے انہیں بادشاہوں اور دیوتاؤں سے زیادہ شکتی پیدا
کر دی کیونکہ صرف ان پروہتوں کو ہی قربانی کے پیچیدہ رسوم و رموز سے آگہی حاصل تھی پھر کائنات
کی بقاء کا دار و مدار انہیں افسونِ گردوں پر تھا اس لئے کہ تخلیقِ کائنات بذاتِ خود ایک
آفاقی قربانی کا نتیجہ تھی اس طرح جب پُرش (انسان) مافوق الفطرت طاقتوں، مابعد الطبعیاتی
نظریات اور معجزانہ قوتوں کا دعویدار بن گیا تو یہ انتر گیانی (ہمہ دان) براہمن کہلایا، پُرش
خود دیوتاؤں کی قربان گاہ پر چڑھ کر پرجاپتی کے روپ میں ظاہر ہو چکا تھا۔ پرجاپتی۔ جو
براہما تھا۔ براہمن دھرم کا خدا۔ اُپنشدوں کا قادرِ مطلق۔ یوگیوں اور جوگیوں کی ذاتِ مطلق۔
انانیت اور خودی کا یہ شعور خدائی کا ادراک بن گیا۔

میلادِ مسیح سے نو سو سال قبل جب آریائی تہذیب گنگا کے دھارے کے ساتھ ساتھ
آگے بڑھی تو نئی وچار دھاراؤں سے اس کا سنجوگ ہونے لگا۔ دو صدی بعد آواگون (تناسخ)
کا چکر۔ کرم (اعمال) کے مارگ پر چلنے لگا۔ یہ زندگی کی ارتقا کا نامیاتی فلسفہ تھا۔ مادہ
برقرار رہتا ہے۔ صرف اس کی ہیئت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کی علت موت
ہے۔ موت جو انسان، حشرات الارض، نباتات، عناصر اور یہاں تک کہ دیوتاؤں پر بھی
حاوی ہے۔ موت جو دوسرے جنم کا پہلا دروازہ ہے۔ یہ جدلیاتی فلسفہ اُس عہد کے آریائی
سماج کی ناانصافیوں، ذہنی انتشار اور زندگی کے ازلی مصائب کا کسی حد تک اطمینان
بخش جواب تھا مگر فلسفہ کی اس چھاؤں میں بھی موت کا بھیانک چہرہ نظر آتا رہا۔ ہر جنم کے
بعد مرنا۔ اور ہر جنم سے پہلے مرنا اور اس طرح مرتے رہنے کا تصور بے حد درد انگیز اور لرزہ
خیز تھا جس نے ذہین دماغوں میں تشکیک کے بھنور ڈال دیئے۔ ہنستی کھیلتی زندگی پر خوف کا

پہرہ بٹھا دیا اور فرار کا چور دروازہ کھول کر نراجیت اور مایوسی کا راستہ دکھا دیا۔ یہ راستہ جو رہبانیت کے سنسان بیابانوں اور بیراگ کے جنگلوں میں پہنچتا تھا۔ بیراگ کے مارگ پر دگمبارے (برہنہ) یوگی بھی تھے۔ اور بھبھوت ملے جوگی بھی۔ دُن پرشتھوں نے بنوں اور بیابانوں کی راہ لی اور آوارہ گرد پریوراجک سنیاسی گاؤں کے کنارے نرسلوں کی کٹیاؤں میں مٹھ اور آشرم بنا کر تپسیا کرنے لگے اور سمادھی میں بیٹھ گئے۔ کچھ ٹولیوں میں گھوم گھوم کر بھکشا مانگنے لگے اور مکتی (نجات) کی تشکشا دینے لگے۔ ان میں جنک جیسا گیانی راجہ بھی تھا اور بنارس کا اجاتشترو جیسا فلسفی حکمران بھی۔ تزکیۂ نفس، تعذیب اور تپسیا کے ذریعے یہ ذہن پرست اپنے گیان دھیان میں براہمنوں سے بھی اتنے اونچے ہو گئے تھے کہ بعض رشی بن کر اوتار کہلائے اور بعض منی بن کر چپ سادھے اپسراؤں کی طرح آکاش میں اڑتے لگے۔ اسرار و رموز کے تاریک غاروں میں ذات مطلق (ست) اور برہما کی کھوج میں یہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ ماسوا اور ماورائے ادراک کی خبر لانے لگے۔ اور جب ان کی ذات مطلق تمام علائق سے آزاد ہوئی تو مکتی (نجات) کی لامتناہیوں میں کھو گئی۔ یہی ان کے دعوے تھے۔ گو رہبانیت زندگی کی جدوجہد سے فرار کا راستہ تھا مگر یہی علم و ادراک اور تجربوں کی منزلوں کی طرف جاتا تھا۔ قیاس، استنباط، مابعد الطبعیاتی نظریات اور مجردانہ تصورات نے تمام اختلافات کے باوجود فلسفوں کے باسٹھ صنم خانے آباد کر رکھے تھے۔ اور انہیں اپنشدوں نے اپنے اندر سمو لیا جس کی تعلیمات میں علم، ادراک، اور شعور کو مکتی کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ عقیدہ اور کرم کی اہمیتوں کو کم کر دیا گیا ہے۔ انہیں علوم باطن اور متصوفانہ خیالات نے چھٹی صدی قبل از مسیح کے برہم مت کی دینی اور فکری فضا کو یکسر بدل دیا تھا۔ یہ بھگوت گیتا کا عہد تھا۔

کوکن کے روحانی حکمران:

—اور طوفانوں کا دیوتا ۔ اندر ناراض ہو چکا تھا ۔ مہا بھارت کی جنگ میں اس کی قربانگاہ پہ لاکھوں انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جا چکا تھا ۔ یہ جنگ جو در قبائلی نظام کی سماجی اور سیاسی اقتدار کی جنگ تھی ۔ اور جس کے ردِ عمل کے طور پر مگدھ سامراجیہ کو عروج حاصل ہوا تھا ، مگر جنگ اب بھی ذہنوں میں جاری تھی ۔ اور کشتریوں کی آنکھوں کے سامنے برہمنوں کی چھریاں چمک رہی تھیں اور ان کی قربان گاہوں کے الاؤ ابھی تک دہک رہے تھے ۔ براتن اتہاس (قدیم تاریخ) کا رتھ ۔ وقت کے راستے پر اب ایک ایسے موڑ پر آن پہنچا تھا جہاں سے نئے سماج کا سفر شروع ہو رہا تھا ۔ مادی اقدار کی نمود کے باوجود ہر طرف مایوسی اور یاسیت کا آسیب چھایا ہوا تھا ۔ ایک نفسیاتی اضطراب تھا جو بھنور کی طرح پھیلتا بڑھتا جا رہا تھا ۔ قدیم قبائلی جرگوں کا اشتراک مشترکہ زندگی کا اتحاد اور سماجی اجتماعیت اور اس کا شعوریت جھڑ کے سوکھے پتوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے ۔ سامراجیہ کا رکھشش چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہڑپ کر رہا تھا ۔ اپنشد کے ایک بادشاہ شاعر نے لکھا "میں تنہا ہوں اور سوکھی باؤلی کے مینڈک کی طرح قید ہوں"[۱] ۔ دراصل یہ زندگی اور کائنات کے عدم تحفظ کا شدید احساس تھا جس نے انسان کو تنہا اور اداس ساری کائنات کے سامنے کھڑا کر دیا تھا ۔ مگر پھر بھی سار کے مگدھ راج میں ویشالی کے جنگلوں سے وردھمان مہاویر نکل آیا جس نے انسان سے کہا کہ تو کب تک خداوند عالم کی مدد کا بے کار منتظر رہے گا ؟ اس کا تو وجود ہی نہیں ہے ۔ وجود صرف ازلی

۱۔ اپنشد (انگریزی) ایضاً صفحہ ۲۴۶

اور ابدی دنیا کا ہے۔ اور مادہ لافانی ہے۔ دھرم، اَدھرم اور کال (وقت) کی بنیاد جیو (جان)، اجیو (بے جان) اور آکاش (خلاء) پر ہے۔

پھر انسان نے دیکھا کہ کپل وستو کے شاکیہ منی راجکمار سدھارتھ گوتم کے اُپدیش کے رتھ کا چکر چلنے لگا ہے۔ اور جو ایرانت کے جنگلوں اور کوہستانوں میں بھی جا نکلا ہے۔ اور پھر اس کی مایوسی اور گہری ہوگئی۔ جب اُس نے سُنا کہ زندگی دُکھوں کا نام ہے۔ ہر شئے آنی جانی۔ انیک ہے۔ رُوح کا وُجود نہیں کیونکہ ہر شئے انہونی اور اتّش (غیر ذی روح ہے) مگر اُسے اِس اُپدیش کے چکر "میں موکش (نجات) اور نروان کا مارگ دکھائی دینے لگا۔ اور وہ اسی پر چل پڑا۔ اور پھر اس کے سنگ بہت سارے چلنے لگے۔ اور اُنہوں نے "اپنا سنگھ" بنا لیا، کیسری رنگ کے لبادوں میں ملبوس بودھ بھکشوؤں اور بھکشونیوں (راہباؤں) کی ٹولیاں گاؤں کے کنارے سرکنڈوں اور بانسوں کی کٹیاؤں میں وِہار بنا کر، برہم وہار کے آسنوں میں بیٹھ گئیں۔ درختوں کے کنجوں میں یا برگد اور پیپل کے بودھی (عقل بخش) درختوں کے نیچے چھپائیں قائم ہونے لگیں۔ یہی ان کی خانقاہیں تھیں اور یہی عبادت گاہیں ــــ اور ایرانت کے کوہستانوں میں شیلا کاروں (سنگ تراشوں) اور مورت کاروں کے اوزاروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اور کرشن گری (کانہیری) کے مقدس غاروں میں جہاں اندر، ورونا اور بریتما کی آرادھنا کی جاتی تھی۔ اب گوتم بودھ کو اوتار بنا کر اسے شردھان جلی (خراج عقیدت) اَرپن کی جانے لگی تاکہ انہیں اُرہنت۔ یا نروان کا درجہ حاصل ہو جائے۔

بودھ مت کا سب سے بڑا مبلغ موریا خاندان کا سمراٹ اشوک (۲۶۳ سنہ تا ۲۳۲ سنہ قبل از مسیح)، تھا جو خود بہت بڑا بھکشو اور اُپاسک (دنیا دار عابد) تھا۔ بھارت کا یہی پہلا راجہ ہے جس نے سب سے پہلے صلح کل اور اَمن و آشتی کا پرچار کیا۔

اسی نے اپنے مذہبی احکام چٹانوں اور ستونوں پر مگدھی زبان اور براہمی اور کھروشتی لپیوں میں کندہ کرائے۔ آٹھویں سنگی کتبہ فرمان کو شرپارک میں جگہ ملی جہاں اس کے ایک مبلغ (دھرم رکھشت) نے جو یونی تھا۔ ہزاروں کشتریوں کو نروان کا مارگ دکھلایا تھا۔ شرپارک اپرانت کا صدر مقام اور بودھ مت کی تبلیغ کا اہم مرکز بن گیا[۱] اس کی روحانی مرکزیت اور مذہبی افضلیت کا اندازہ ایک غارت شدہ استوپ سے بھی ہوتا ہے۔ مہاشٹی میں کانہیری بھکشوؤں کا سب سے بڑا مسکن بن گیا۔ کوآں، د اور چیلون کی گپھاؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میلاد مسیح سے دو سو برس پہلے سے بودھ مت کا تسلط اپرانت کی آخری سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ اور ایک صدی بعد از مسیح تک قلابہ اور رتناگیری پر قائم رہا جیسا کہ چمپاوتی (چھول) کدا، دابھول اور پال کے غاروں کے نقوش بتاتے ہیں۔ گومنت کے جزیرے میں سناپرانت (شروناپرانت یا اپرانت) کے ایک بھکشو پنّا نے شاکیہ منی کے دھرم کا پرچار کیا تھا گولوبل گپھا سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی تک بودھ کلا کار۔ گومتی اور اگھنیشی کے کناروں تک پہنچ چکے تھے جہاں دولت کی دیوی گج لکشمی کی پوجا ہوتی تھی۔ مقدس کرشنا اور گوداوری کے نچلے دو آبے میں بودھ مت کا تسلط دوسری صدی قبل از مسیح سے قائم ہو چکا تھا۔ اور جب چندر گپت موریا کے راج میں کال پڑا تو جین مت کا دھرم چکر اپرگنگا سے آگے دکن اور کاٹھیاواڑ تک چلنے لگا۔

---

۱. S.M. EDWARDS. The Rice of Bombay (BOMBAY 1902) P. 5

۲. DIKSHIT, BUDDHIST SETTLEMENT OF WESTERN INDIA, (BOMBAY UNIV 1933) P. 23. ۱۳۶ قلابہ۔ ص ۱۸۸۳ء صفحہ ۱۳۶

چونسٹھ گن

ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی تخلیق دیا دھرم کے سائے میں ہوئی ہے۔ سام وید کے بھجنوں کی دھنیں سنگیت کے سروں (گرام) میں ڈھل گئیں اور چھ بنیادی راگوں نے جنم لیا۔ جو سمے اور رُت کے مختلف مظاہر اور ان کی کیفیات و جذبات کی گویا تفسیریں ہیں۔ پھر سنگیت کی دھن اور تال پر نٹ راج (شیو) نے اپنا آفاقی رقص پیش کیا اور نرتیہ کلا بڑے بھاؤ اور رس کے ساتھ انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور چکرورتی راجاؤں کی رنگین سبھاؤں میں امبا پالی جیسی سندر پائلیں اور رنگین مہندی رنگے ہاتھوں اور انگلیوں کی مدراؤں سے پراکرتی (فطرت) اور کائنات کے آفاقی اسرار کی گرہیں کھولنے لگیں۔ اور ویدانت کے توحید پرستوں نے کہا کہ یہ مادہ کی دنیا برہما کی لیلا (کھیل) ہے۔ اور انسان رنگ بھوم (اسٹیج) پر آٹھ حرکات (ابھی نیہ) کے ذریعے اپنے جذبات کو تمثیلیں بنا کر پیش کرنے لگا۔ اور بھرت منی نے بھارت ناٹیہ شاستر" لکھ کر اداکاری کے قوانین و اصول مرتب کیے۔

موریا عہد میں ناٹک اور سنگیت کے بعد جس فن کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا وہ سنگتراشی تھا۔ پتھر اور چٹانیں مکتی کا اپدیش دینے لگیں اور موہنی مورتیاں وشوکرمن اور سندرشن [illegible] نے جمالیاتی نظریات کا سندیس پہنچانے لگیں مجسمہ سازی اور سنگتراشی کو سب سے زیادہ تر [illegible] اور دکن میں ترقی ہوئی۔ جس طرح قدیم سنسکرت کے شاعر اپنی کویتاؤں کو "النکار" یعنی تشبیہات و استعارات سے سجاتے تھے اس طرح استوپ اور غاروں کے مندروں کو مزین کرنے کے لئے مجسموں کا رواج ہوا۔ پونہ سے قریب قبل از مسیح کے بھاجا غاروں کے بودھ مندروں کی صناعی اور صنم سازی میں کلاکاروں کا فنی جمال عروج پر نظر آتا ہے۔ غاروں

کی دیواروں پر دیالو دھوانوں کی مورتیاں تراشی گئی ہیں جو عموماً اپنے جوڑوں (دمپتی) کی صورت میں ہیں۔ کرشنا اور گوداوری کی مورت کاری کے فنی ارتقاء پر امراؤتی کے شیل کاروں کا اثر غالب ہے۔ بھاجا کے مندر اُن کے منقش ستون بودھ بھکشوؤں کی خانقاہیں (سنگھارام) اور قدیم تجارتی راستے پر کارلی اور اجنتا کی پرامین گپھائیں اور چیتیائیں (عبادت گاہیں) اُس یگ کے فنی منصب انسانی عزائم اور حوصلہ مندیوں کے مظاہر ہیں جن میں سماجی زندگی کی گہما گہمی، تڑپ، توانائی اور تنظیم کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فنکاروں میں وہ بھی تھے جو "حقیقت" کو مذہب کی آنکھ سے نہیں بلکہ کلاکار کے تخیل کی چلمنوں سے دیکھتے تھے۔ یہ لوگ دُنیادار تھے جو زندگی اور کائنات کی مسرتوں سے محبت کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی صنم تراشی میں تیکھے خطوط، اُبھری لکیروں اور بھرپور تناسب سے جنسی قوتوں کا بے پناہ اظہار ملتا ہے۔ موریا عہد کے ستونوں کے طرز اور نقش و نگاری پر یونانی اور ایرانی صناعیوں کے اثرات بہت گہرے پڑے تھے۔ اسی عہد میں پراکرت زبان اور اس کی متعلقہ بولیوں کو رواج حاصل ہوا۔ پالی موریا راج کی دفتری زبان تھی۔ گنگا کے دیس میں شورسینی رائج تھی۔ اور دکن اور کونکن میں مہاراشٹری بولی کا چلن تھا۔ مہاراشٹری بولی ادب اور خاص کر شاعری کے لئے نہایت موزوں ذریعہ اظہار تھی۔

موریا عہد میں سماجی اور معاشی حالات میں نمایاں تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ دولت کی فراوانی نے مشترکہ طرز زندگی اور سماجی اجتماعیت کے تصوّرات کو صدمہ پہنچایا، ورن اور جاتی تقسیم کی دھار اور تیز ہو گئی۔ طبقاتی کشمکش کی ایک وجہ دستکاری کا فروغ بھی تھا۔ جس نے بیرونی تجارت کی راہیں کھول دی تھیں۔ کلیان، سملہ (چیول) اور سوپارہ کا شہرہ مصر و روم کے دروازوں پر دستک دینے لگا۔ پاٹلی پتر، بنارس اور کوشامبی کا رابطہ نربدا

بھاسکر، صفحہ ۶۴

کی وادیوں میں ودیشا اور اُجینی سے ملا ہوا تھا اور یہی آخری شہر دکن اور کونکن کے قدیم تجارتی راستوں کا نشان راہ بھی تھا۔ جو ایک طرف پرتشتھان (پیٹھن) اور کرشنا۔ گوداوری کے کناروں کی سمت بتلاتا تھا اور دوسری طرف اُتر کوشل کے شراوستی شہر سے آنے والے تجارتی قافلوں کو سوپارہ کی راہ دکھلاتا تھا۔

سوپارہ

جو اٹھارہ عظیم الشان دروازوں اور ہزاروں باسیوں کا نگر تھا۔ جس کا شمار مگدھ اور گپتا سامراجیوں کے بارونق شہروں: ویشالی، گوشامبی، کاشی، پاٹلی پتر، چمپا، اور راجگرھ میں ہوتا تھا۔ یہاں تجارت کی بہت بڑی منڈی تھی اور چاروں کھونٹ سے تاجروں کے قافلے سارتھواہ (میر کارواں) کی سرکردگی میں آتے تھے۔ رنگین سوتی کپڑوں کے علاوہ صندل (گوشیرش) کا بیوپار سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ شہر کے نواح میں چندن کا بنا ہوا گوتم بودھ کا بنا ہوا شاندار مندر تھا۔ دور دور تک برہمنوں کی شالائیں تھیں، وہ آشرم تھے، کدمب اور موگرے کے کنجوں اور سفید چنبیلی کی بیلوں سے گھرے ہوئے رشیوں کے مٹھ تھے جن کے آگے ہرے بھرے مصنوعی ٹیلوں پر بگیا (کریڑا شیل) پھولتی تھی۔ کھپریل کی چھتوں والے اور چونے سے پُتی ہوئی سپید دیواروں کے کئی منزلہ مکانات تھے جن پر پچی کاری سے چترکاروں نے ناگرک اور دھارمک چترکاری کے نمونے دکھلائے تھے۔

۱؎ بھاشم (انگریزی) ایضاً صفحہ ۲۲۴

۲؎ تھانہ گزیٹر۔ ج ۱۳ حصہ ۲، صفحہ ۴۰۶، بھاشم۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۰۴

ان میں شیو، ورونا، دولت کے دیوتا کبیر ___ اور گمنامی میں ڈوبتے ہوئے برہما کی شبیہیں تھیں جن کی۔ وینا کے تاروں کی جھنکاروں اور عود ولوبان کی مہکاروں میں آرادھنا (پوجا) اور سندھیا کی جاتی تھی (بودھ مت کا تسلط ابھی ہونا باقی تھا) یہاں سونے چاندی کے سکوں اور زیوروں پر باریک کام کرنے والے چابکدست سنار، ماہر شیل کار، معمار اور دیگر دستکار رہتے تھے [۱]۔

سوپارہ ___ موریا سامراجیہ کے پانچویں پرانت: اپرانت کا صدر مقام تھا یہ اجنتی میں شامل تھا۔ ہر پرانت میں کئی جنید ہوتے تھے اور ہر جنید کئی گنوں یا استھانوں میں تقسیم ہوتا تھا، ہر گن میں کئی گرام (گاؤں) ہوتے تھے۔ پرانت کا حاکم ایرک کہلاتا تھا، نگرک شہر کا ناظم ہوتا تھا اور گرام کے اہلکار کو گرامانی کہتے تھے، شہروں اور دیہاتوں میں سمیتیائیں اور سبھائیں ہوتی تھیں ایرک کے قانونی مشیروں میں تجارتی منڈل (شریشنی)، کا سربراہ سارتھواہ (میر کارواں) اور ساہوکار ہوتے تھے، دیہاتی پنچایت کا مکھیا: گرام بھوجک کہلاتا تھا، ارتھ شاستر کے مطابق چنگی اور ٹیکسوں کی وصولی کی ذمہ داری آنت پال پر ہوتی تھی جو راستوں کا محافظ بھی ہوتا تھا، مالیہ کا مہتم: سماہرتر ہوتا تھا جس کے ماتحت کئی گوپ ہوتے تھے، جین اور بودھ مذاہب کی تعلیمات کا گہرا اثر تجارتی اخلاقیات پر پڑا جس نے ایمانداری اور جزرسی کا درس دے کر خصوصاً مہاویر کے پیروکاروں کو ایک کامیاب بیوپاری طبقہ میں ڈھال دیا۔

ساتواھن راج (۲۷ء ق.م تا ۳۰ء عیسوی):

موریا سامراجیہ کی خاک سے کئی خانوادے ابھرے، ساتواھن شاتکرنی

---

[۱] تھانہ گزیٹیر۔ ایضاً صفحہ ۴۰۹

اور[۱] آندھرابھرتیہ ہتین ناموں کا ایک راج مگر جس کے بڑے گُن اور کام تھے، یہ دکشنا پتھ (دکن) سے ابھرے اور کوکن تک چھا گئے، بڑی طاقتوں کے راجہ تھے اسی لئے اشومیدھ (گھوڑے کی قربانی) کرتے تھے جیسا کہ نانا گھاٹ کے کتبے سے پتہ چلتا ہے، یسوع مسیح سے ایک صدی قبل کلیان اور سوپارہ ساتواھن راج کے مرکزی شہروں تگر اور پرتشٹھان سے سیاسی اور تجارتی کڑیوں میں بندھ چکے تھے، قلابہ میں کداگپھاؤں کے بانی بودھی مہابھکشو مہاڑ سے قریب پال کے پہاڑی غاروں کے رکھوالے "کانوبھا" "گتم کے" "مہابھی" اور رتھک شاہ حکمرانوں کی سرپرستی میں آچکے تھے اور بیاہ کے بندھنوں میں بندھ چکے تھے۔ اور اپرانت کا یہی دکشنی علاقہ سمٹ کر ان کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔

آریاؤں کے دلیشانتر (دوسرے دیس)۔ اریہ (ایران) میں اشکانی سامراجیت گندھارا پار کر کے سپت سندھو تک پہنچ چکی تھی، ان کے نام لیو اشتراپ یا جاگیردار شک خود مختار ہو کر مالوہ میں اُجینی سے حکومت کرنے لگے۔ [اور کاٹھیاواڑ تک ۳۸۸ء تک راج کرتے رہے] کوکن میں ان کے سب سے بڑے سیاسی و تجارتی حریف ساتواھن تھے۔ سیاسی اقتدار اور تجارتی تسلط کی ہوس نے جنگ کی آگ بھڑکائی تو آگ کے پجاری شکوں کے آتشکدے سرد پڑ گئے، ساتواھنوں نے اس شاندار فتح کی یادگار میں ۷۸ عیسوی میں شک تقویم کی بنیاد ڈالی[۲]۔

لیکن جب شکوں کے ساتھ پارسیکاؤں کا قبیلہ پہلوی۔ پہلو ملا کر کاٹھیاواڑ کی بھومی پر دھرنا

---

[۱] کھاریویلا کے ہاتھی گپھا اور نانا گھاٹ کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ساتواھن راج کا بانی سیموکا تھا۔ (۲۲۰ ق م)۔ حوالہ کے لئے دیکھئے: مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتناگیری) طبع نو ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۰۱

[۲] Dr. Burgess "Archaeological Survey; XI: 2-4, 9, 4, 17 اور نیل کنٹھ شاستری: "History of South India" صفحہ ۸۸

[۳] ...iatic Researches, X, 90-91 اور Dr Burgess ...chaeological Survey X, 2, 4, 9 اور 14.

دے بیٹھا تو سیاست نے بھی پہلو بدلا، شنک پہلوی حکومت کے بانی نہپاان اور اُس کے داماد اشودت نے اُپرانت پر دھاوا بول دیا، اس زمانے میں یہاں ساتواھن راج گوتمی پتر شاتکرنِ کا بول بالا تھا (سنہ ۱۲۰ء) کے لگ بھگ اس نے شنک پہلوؤں کو اُپرانت کے پہاڑوں سے پرے بھگا دیا اور "کرشن گیری (کانہیری) کے پوِتر استھان کو ملیچھوں سے پاک کر دیا"۔ وِندھیا کے بنوں سے لے کر سھیا کے پربتوں تک ساتواھن راج کا سورج چمکنے لگا۔

گوتمی پتر شاتکرنِ (اول ۱۰۴ سنہ ء):

اس خاندان کا سب سے بڑا چکرورتن راجہ گذرا ہے، دکشناپتھ کے میدان اس سورما کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اسی طرح لرزتے رہتے تھے جس طرح پڑوسی راجہ اس کے نام سے کانپتے تھے، سھیا [دری] کی چوٹیاں اس کے آگے سرنگوں تھیں، مرہٹوں کا دیس "آری اِک" جو گوڈی (گوآ) سے تاپتی تک پھیلا تھا۔ اس کے ڈر سے پچھمی ساگر کے چرن چھوتا رہتا تھا، اس کی راج ماتا بال شری نے اپنے پیارے راجہ بیٹے "ڈِگ وجیہ" کی یادگار میں کئی گپھائیں کھدوائی تھیں ایک ایک کتبے سے گوتمی پتر کی سُندرتا، ویرتا اور سادھوتا کی جھلکیاں ملتی ہیں، یہ برہمن دھرم کا پرچارک اور دھارمک لوگوں کا سیوک تھا پرجا کا پالن ہار اور پریمی تھا، اس نے وَرن اور جاتی کی اونچ نیچ کو اور گہرا کر دیا کیونکہ بدیسی شنک پہلوی راج میں یہ ہموار کر دی گئی تھی۔ اٹھارہ سال راج کرنے کے بعد اپنے بیٹے پُل مادی کو راج پاٹ کے کاج سونپ کر سُدھار گیا۔

مگر پُل مادی برائے نام دکشناپتھ کا چکرورتن راجہ تھا۔ اور جب یگیہ شری گوتمی پتر (دوم ۱۷۰ء تا ۱۹۹ء) نے سنگھاسن سنبھالا تو رُدرادامن نے سنبھالا نہ لینے دیا جو پارسیکاؤں کے ایک

دوسرے شک قبیلے کا مہاشتراپ تھا اور جس کا سیاسی دامن اس کے عہد عروج (۱۵۰ء) میں سندھ دریا اور گرنار کے جنگلوں سے لے کر ساوتری تک پھیل چکا تھا اور شاتکرنیوں کے اقتدار سے اُلجھنے لگا تھا گو بجشری اپنی بھومی کے لئے اپرانت کی رن بھومی پر مدتوں لڑتا رہا مگر یہ سارا حصہ وہ ہار بیٹھا جیسا کہ رُدرادامن کے گرنار سنسکرت لکھی سے معلوم ہوتا ہے۔

گجرات کاٹھیاواڑ کے شک پہلوی اور دکشناپتھ کے شاتکرنیوں کے درمیان اپرانت پر تسلط جمانے کی کشمکش دوسری صدی عیسوی کی ڈھلتی دھوپ میں اور شدت اختیار کر گئی، اس حریفائی میں سیاسی برتری کی آرزو بھی تھی اور معاشی تسلط کی تمنا بھی، کیونکہ کلیانا سوپارہ، سمیلا اور راجپوری کے بحری رشتے دراز ہو چکے تھے اور ان کے ڈانڈے بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ذریعے ایران، مصر اور روم سے مل چکے تھے، ہندوستانی مصنوعات کی مانگ کا یہ عالم تھا کہ نیرو کے عہد تک یہاں کا ململ روم کی اعلیٰ سوسائٹی میں سب سے زیادہ فیشن ایبل تسلیم کیا جاتا تھا[1] اشیائے برآمد میں دکن کے سوتی ملبوسات کوکن کے جنگلوں سے خوشبودار اور طبی خاصیتوں کی جڑی بوٹیاں، تل، تیل، مسالے (تھانہ سے) ریشم کے لچھے، ادویات، شکر (طباشیر) اور چاول، سمیلا اور سوپارہ کے صدف زاروں سے آب دار موتی. گوداوری کے کنارے سے پرتشتھان کے سنگ سلیمان اور قیمتی دھاتوں میں لوہا، زمرد اور بلور دساور بھیجے جاتے تھے۔ ان کے بدلے میں یونانی، مصری اور ایرانی سوداگر اپنے لمبے چوڑے منقش جہازوں میں اطالوی اور عربی شراب، مونگے مرجان، شیشے اور چاندی کے ظروف اور سونا لاتے تھے، انہیں بادبانی محملوں میں ہندوستانی راجاؤں کے انتہپورہ (حرم) اور عشرت کدوں کے لئے زرخیز یونانی حسینائیں بھی لائی جاتی تھیں جو شاہی زندگی کا جزو بن گئی تھیں اور ہندوستانی سماج کا حصہ جنہوں نے کالیداس کے ڈراموں میں بھی داسیوں کے کردار

John Irvin & Jaykar : Textile & Ornaments of India. 16

ادا کیے ہیں۔

روما کی سلطنت سنہ ۳۰ ق م تک مصر کے اہراموں تک پہنچ چکی تھی، ہندوستان کا تجارتی رابطہ مصر کے علاوہ یونان، بابل اور فونیشیہ سے وہاں کی تہذیبوں کی طرح قدیم تھا، سنہ ۲۲۴ء میں جب ایران میں ساسانی حکومت کی نیو پڑی تو کلیانا کی بیرونی تجارت کو نئی رونق ملی۔ کوکن کی بندرگاہوں کے ذریعے رومی طلائی سکے جو انتشی عہد کے ٹکسالی دینار اور ساسانی سلطنت سے سونا بھارت میں بہہ کر آرہا تھا، ایران سے یہ معاشی مواصلت زیادہ دنوں تک استوار نہ رہ سکا کیوں کہ پارسیکاؤں کی قومی حمیت یہ گوارا نہ کر سکی کہ ہندوستانی سونے کی چڑیا ساتواھنوں کے سیسے کے سکوں کے بدلے ایرانی موتیوں کے دانے چگتی رہے۔ انہوں نے اس سونے کی چڑیا کو پھنسانے کے لئے بحری بیڑوں کا جال پھینکا اور کوکن کی متعدد بندرگاہیں ان کے زیر دام آگئیں صرف کلیانا ان کے دستبرد سے محفوظ رہ گیا جو نئے ہوئے ساتواھنوں کا آخری محاذ تھا، انہوں نے معاشی جنگ لڑنے کے لئے اُن ملکوں سے جو ان کے حریف تشک پہلوی دائرۂ اثر سے خارج تھے اپنے تجارتی رشتے مستحکم کرنا شروع کر دیئے، یونان سے تجارت کی تجدید اسی عہد (سنہ ۲۲۴ء) میں ہوئی مگر جلد ہی پارسیکاؤں نے کلیانا پر قبضہ کر کے یہ راستہ بھی مسدود کر دیا۔

تہذیب کے قافلے

۔ اور میلادِ مسیح کے ڈیڑھ سو سال بعد۔ اسکندریہ میں بیٹھا ہوا یونانی ہیئت داں بطلیموس (سنہ ۱۵۰ء) اپنے پیشرو مصنف پلینی (سنہ ء) کے جغرافیہ پر مزید تفصیلات کے حاشیے چڑھا رہا تھا، سیملہ سے آئے ہوئے ہندو ساہوکاروں، نوآبادکاروں اور لپتے ہم قوم یونانی

تاجروں سے دہ مرہٹوں کے دیس 'اری اِک' کے پوتر استھانوں' مقدس ندیوں' تجارتی بندرگاہوں اور بستیوں کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ جنوبی کوکن۔ جہاں بحری قزاقوں کے جرگے رہتے تھے راجپوری خلیج کے سرے پر واقع منوپلی (مہسلا) ان کا گڑھ تھا۔ اور جنجیرہ کا جزیرہ اسی خلیج کے دہانے پر آباد تھا۔ بانکوٹ کی کھاڑی کے کنارے منڈن گور (منڈن گڑھ) کی پرانی بستی تھی اور دو ندیوں کے سنگم پر راجہ پور کا قدیم شہر بسا ہوا تھا۔ پھر وسطی کوکن کا علاقہ تھا جس کی بندرگاہ سیملہ تھی جہاں یونانی جہاز ساتواہن عہد تک لنگر انداز ہوتے تھے۔ جن کے آدیجے مستولوں سے لڑکیاں لٹکی ہوتی تھیں جو تجارتی جہازوں کی علامت تھی۔ چیول کی منڈی اور بستی کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ موجودہ چیمبور (بمبئی) اس کے مضافات (مامولے) میں شامل تھا۔

مہاڈ سے قریب پالی پٹن (پال) کے (اٹھائیس) غاروں کی بستی تھی جن میں سنگتراشوں نے دھیان میں ڈوبے ہوئے شاکیہ منی کے کئی روپ تراشے ہیں۔ اٹھے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں "جنان مُدرا" اور "دھرم چکر مدرا" کی علامتیں بنی کہیں نبض کا اتھاہ ٹٹولتی نظر آتی ہیں اور کبھی موکش کا اپدیش دیتی ہیں۔ کنول' ہرن' ودیا دھر (نیم دیوتا) تبرک خانے (داگھوب) وہاریں اور چیتیائیں سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

پیتوکرا (گھوڑیگاؤں) ندیوں کے سنگم پر تاریخ کے بیکراں سمندر کے کنارے نہ جانے کب سے کھڑا تھا۔ "ہیپتانیشیا" کے جزیروں کے جھرمٹ میں دستی کا سوپارہ (اپارہ، لار کا (لات دیس شمالی کوکن) کا تابناک ستارا بنا ہوا تھا۔ آریاؤں کے قدیم مسکن گوربلسے "گوآری" کا نام لے کر وتیرنا ندی بطلیموس کے تخیل میں جل ترنگ بجا رہی تھی۔ اس نے اپنے جغرافیہ میں ایک دوسری ندی بنڈا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا اشارہ غالباً بھیونڈی کی کاموری

ندی کی طرف ہے (جو آگے بڑھ کر کھاڑی بن جاتی ہے)۔ یہ ندی کی وجہ تسمیہ اور اشتقاق یہی بنڈا ہے۔ اسی کھاڑی کے کنارے بطلیموس کا "ڈونگا" ۔۔۔ ڈونگا کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ یہ معمولی حیثیت کا بندر ہے۔ مغربی ساحل کی قدیم بندرگاہیں۔ دکھن اور ڈونگا (بنگال) کے صنعتی مرکزوں کی دیسی مصنوعات کی منڈیاں بن گئی تھیں۔

بطلیموس، کو برہمنوں کے دیوتاؤں کے بارے میں جان کر تعجب نہیں ہوا ہوگا کیونکہ یونان کی دیو مالاؤں میں مختلف ناموں سے یہی وَرُنا، رُدر، سوُریہ اور اس کی بیٹی سوریا اور ساکتی اَشوِن موجود تھے اور اُن کے اُلوہی اوصاف بھی مماثل تھے۔ ہاں! اُس نے ایک ذہن پرست کی طرح بودھ مت کے بارے میں سوچا ضرور ہوگا جس کے اُپدیش کے رتھ کے پیچھے خود اُس کے ہم مذہب یون۔ مکش کی کھوج میں کونکن کے کوہستانوں میں بھٹک رہے تھے اور وَنْ پَرَستھ بن چکے تھے اور جن کے دان پُن کی داستانیں ناسک جنیر، کارلی اور کانیری گپھاؤں میں درج ہو چکی تھیں گوتم سِدھارتھ۔ اب برہم ورت کے باسیوں کا معبود بن چکا تھا اور وشنو کا نواں اوتار مانا جاتا تھا اور ہندو رسوم کے ساتھ جس کی پوجا کی جاتی تھی۔[1] اس یونانی جغرافیہ داں کو ناناگھاٹ کی قدیم تجارتی گذرگاہ کے بارے[2] میں بھی پتہ تھا۔ اور جب وہ رَواں دَواں قافلوں کے بارے میں سنتا ہوگا تو گرد و کارواں سے دُھندلایا ہوا ماضی اس کے تصور میں دوڑنے لگتا ہوگا کہ کس طرح آریائی گوداری کے کنارے چلتے ہوئے کاسن پہاڑ کی ترائی میں اُترتے ہوں گے اور پھر اُس قدیم ترین راستے

---

[1] گزیٹیر تھانہ۔ ج ۱۳۔ حصہ ۲ صفحہ ۴۱۶

[2] بھاشیم (انگریزی) ایضاً صفحہ ۷ ۔ ۳۰۶

[3] گزیٹیر تھانہ صفحہ ۱۵۔ ۴۱۴ (فٹ نوٹ) تلابہ صفحہ ۴۰ ۔ ۱۳۷، رتناگیری۔ صفحہ ۱۹۲ (فٹ نوٹ)

کو اختیار کر کے جو کھار باؤ اور بھیونڈی سے گزرتا تھا۔ وہ لوناڑ، وانندری اور تھوالہ سے ہوتے ہوئے نانا گھاٹ پہنچتے ہوں گے۔ کوکن سے دکن کے شہروں جنیر، پیٹھن اور نگر پہنچنے کے لئے نانا گھاٹ کے علاوہ، مالسیج، بور گھاٹ، تھل گھاٹ ۔۔۔ اور چملہ، جہاڑ، گھوڑے گاؤں اور راجپوری کے کاروانوں کے لئے مہیب غاروں جیسے تاریک درّے، بور، دیوستھالی اور کمباتھے۔

اِن گذرگاہوں سے صدیوں کی تاریخ کے قافلے گذرتے رہے ہیں۔ ان میں ونگا اور کوشل کے شراوستی شہر کے تجارتی قافلے تھے جو موریا عہد کے لگائے ہوئے درختوں کے خیابانوں سے سارتھواہ (میر کارواں) کی سرکردگی اور پیشہ ور محافظ کی رہبری میں ستاروں سے سمت معلوم کرتے گزرتے تھے[1]۔ ان میں نگر نگر پھرنے والے ہنستے گاتے بجاتے بھاٹ بنجارے تھے۔ یونانی اور نسطوری سوداگروں کے لدے پھندے کاروان تھے جن میں عربی و عجمی گھوڑے دکن کی منڈیوں کے لئے لائے جاتے تھے جہاں ان کی بڑی مانگ تھی۔ انہیں بادیہ پیماؤں کے ساتھ یونان کی سفید فام لیلاؤں کی محملیں بھی ہوتی تھیں اور بردہ فروشوں کے ساتھ حبش کے افریقی غلام بھی ہوتے تھے جن سے حکومت کی مملوکہ معدنیوں، نمک زاروں اور سمندر کے صدف زاروں میں بیگار (وشٹی) لی جاتی تھی[2]۔ انہیں گذرگاہوں پر دیا دھرم کے مارگ پر چلنے والے نارنجی رنگ کے لبادوں میں ملبوس بودھ بھکشوؤں اور بھکشونیوں کے سنگھ اور دنیا ترک سنیاسیوں کے گروہ رمتے پھرتے نظر آتے تھے۔ سارے کوکن پر بودھ مت کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ مہاشٹر میں کانہیری، کونڈیوتی اور ماگا ٹھنہ کی گپھائیں بودھوں

---

[1] بھاشم۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۲۵

[2] بھاشم۔ ایضاً صفحہ ۱۵۲۔ صفحہ ۱۰۵

کے بڑے کیندر (مرکز) بن چکے تھے جنہیں تک اُن تمام منزلوں پر ۔ لوناڑ (بھونڈی)، امبیولی
(کرجت)، کونڈانہ (ماسک)، کارلی، جمبرگ، بیڈسہ، بھاجا ـــ اور کنڈا ۔ کوٹی، پلٹی اور چپلون
کے غاروں اور گہری دھاروں کے گہرے سینوں میں ان ہزاروں بدیسی تاجروں، جاگیرداروں،
شانکرنی راجکاروں، چکرورتی راجاؤں کے اطاعت گذار مہاسامنتوں، مہا بھوجوں
اور مہارتھیوں کے علاوہ سارتھواہ (میر کارواں) اور بیوپاریوں کے منڈل اشرے نی،
کی یادیں اور عبادتیں دفن ہیں جو انہیں راہوں سے موکش، نِرواں یا نجات کی تلاش میں
گذرے ہیں اور جنہوں نے رواں دواں زندگی کے اٹوٹ سفر میں ہر قدم پہ علم دفن کا چراغ
جلایا ہے بعد آنے والی نسلوں کے ذہنی، فکری اور فنی سفر کی رہنمائی کی ہے، ان میں وہ کلاکار
بھی تھے جنہوں نے معاشرے کی روحانی مرتبت کو فنی اور سماجی منصب عطا کیا اور زندگی
کے حسن اور دلربائی اور غم و نشاط کو فن کی لازوال قدروں میں اس صنّاعی سے ڈھال دیا
ہے کہ ان میں مذہب کی ادائیں آگئیں اور سماجی حقائق کے لاکھوں بناؤ پیدا ہو گئے ہیں، یہ
پراچین گپھائیں اور خانقاہیں صرف فن سنگتراشی اور صنم گری کے نادر نمونے ہی نہیں بلکہ انسانی
عظمت اور تہذیب و ثقافت کی ایسی لازوال تحریریں ہیں جنہیں سماجی محنت نے ہاتھوں کے تسلسل
اور کاوشِ مسلسل کے پسینے کی روشنائی سے چٹانوں کے لوحِ محفوظ پہ لکھدیا ہے ۔

کوکن پر یونانی و عجمی اثرات

موریا عہد سے مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کے باہمی امتزاج سے ایک نئی تہذیب
کا خمیر بننے لگا تھا اور قومی وحدت کا سانچہ ڈھلنے لگا تھا، ہندوستانی تاجر ساہوکار
اور پیشہ ور روما کی سلطنت میں تلاشِ روزگار اور دولت کی کھوج میں بودوباش

اختیار کرنے لگے تھے، ان میں جوتشی تھے جو اپنی قسمت کا ستارہ اجنبی افق پر چمکتا دیکھ رہے تھے، جادوگر تھے جنہوں نے اپنے دیس کے جادو کے علم سے بدیسیوں کو مسحور کر رکھا تھا (عرب ممالک میں بھی اس کا چرچا تھا) اور دیشیائیں (طوائفیں) بھی تھیں جو دیناالی کے لعبا پالی کی طرح سندر اور رنگی تھیں، عود و عنبر کے جزیرے سقوطرہ میں ان ہندوستانیوں کی سب سے بڑی نوآبادی تھی۔ قسطنطنیہ کے قیصر روم جسٹینین کا باورچی ایک ہندوستانی تھا۔ سفارتی وفود (دوت) کے تبادلے موریا اور روما سامراجوں کے درمیان ہر دور میں ہوتے رہے ہیں — سیاست اور تجارت کے ساتھ ثقافتی اور تہذیبی لین دین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ باہمی اختلاط کا اثر یونانی اور سنسکرت ادبیات اور لسانیات پر بڑی حد تک ناطق اور گویا تھا۔ یونانی زبان میں سنسکرت کے شبد سمو گئے۔ اور سنسکرت میں یونانی ہیئت اور ریاضی کے الفاظ اور ان کی اصطلاحات سرایت کر گئیں۔ مثلاً ہورہ (گھنٹہ)، کیندر (مرکز) کونا (زاویہ) درما (دو سکے)، دینار، پستاک (کتاب)، میلا (روشنائی) اور کلم (قلم) وغیرہ جو یونانی زبان کے ہیں فوج کے میدان سے سُرنگ اور کمپنہ (چھاؤنی) سنسکرت کو ملے۔

وشنو پران میں یون کے علاوہ شک اور پارسیکاؤں کے دیگر قبیلوں کے حوالے ملتے ہیں، کانہیری، کارلی، ناساک اور جنیر کی پراچین گپھاؤں میں ایسے کتنے ہی یونانی تاجروں اور بدیسی سوداگروں کے نام نقش ہیں جنہوں نے کوکن اور دکن میں توطن اختیار کر لیا تھا، کانہیری کے غار نمبر ۶۶[1] میں سنسکرت اور پراکرت کے علاوہ پہلوی زبان کے بھی کتبے ہیں۔ جو اس تاریخی حقیقت کی سند دیتے ہیں کہ یونان و ایران کے تسلط کی کارفرمائی یہاں تک تھی، شاکا پہلوی حکمرانوں نے اس بھومی سے اپنا رشتہ جوڑا تھا اور یہیں اپنی امیٹ

---

۱ : بھاشم (انگریزی) ایضاً۔ صفحہ ۲۲۳ — ۲۲۸

تہذیبی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان آگ کے پجاریوں کے سینوں میں جب اس دھرتی سے
محبت کی آگ بھڑکی اور بودھ مت کے اُپدیش کا نور پھیلا تو ان کے دھرم کرم کا اُجالا ناسک،
کارلی، اور جنیر کی گپھاؤں تک پھیل گیا جہاں ان کے نام آج بھی کالے چٹانوں میں روشن ہیں۔
اُنہوں نے رفاہ عام کی غرض سے سوپارہ میں کئی سرائیں بنائیں اور [illegible] دھانو اور پارڈی کی
لنگر گاہیں تعمیر کرائیں، مقامی ہندو عورتوں سے شادیاں کر کے۔ یہ اُسی قوم میں خلط ملط ہو گئے۔[1]
یہ یا تو بودھی بن گئے یا نچلے درجے کے کشتری۔ ان کے ناموں سے اسی دھرتی کی سوگندھ آتی
ہے جس کی مٹی سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ مثلاً۔ دھرم دیو، اگنی درم، پرشبھ دتا وغیرہ[2]

ساتویں دور میں ایران کی اشکانی حکومت سے تجارتی تعلقات ہندوستانی شکوں
اور پہلویوں سے ملک گیری کے تنازعوں کے باوجود برابر استوار رہے، یہ بیرونی تجارت
جہاں ملک کی معاشی خوشحالی کی ضامن تھی وہاں اسی معاشی رابطہ نے معاشرتی اور
تہذیبی لین دین کا بازار بھی گرم کر دیا تھا۔ معاشرتی اختلاط اور تمدنی امتزاج کی جب
راہیں کھل گئیں تو یہ دونوں ملک ایک دوسرے کی قدیم تہذیب اور کلچر سے اثر قبول
کرنے لگے، باہمی اثرات کا نفوذ دونوں ملکوں کی مذہبی، تمدنی اور فنی سرگرمیوں
میں زیادہ نمایاں ہوا جس کا ثبوت کانہری گپھاؤں کے طرز تعمیر اور پہلوی کتبے سے
ہوتا ہے، بھیونڈی سے چھ میل دور۔ لوناڑ کے مسمار شدہ غاروں سے جو یسوع مسیح
کی میلاد سے قبل وجود میں آچکے تھے عجمی اثرات نمایاں ہیں، عجمی تسلط کا ایک اور سبب
شک پہلوی جاگیرداروں کی ملکی توسیع پسندی بھی تھی جو عرصے تک کوکن کو اپنی بانہوں
میں سمیٹے رہی، انہیں بودھی بدھیوں کے زیر سایہ فرہاد کی سرزمین سے عجمی سنگتراش۔

[1] ASIATIC RESEARCHES, X 90-91; Dr BURGESS Archaeological SURVEYS 2, 4, 7, 21, 52 —

[2] مہاراشٹر اسٹیٹ گزیٹیر رتناگیری صفحہ ۱۰۴

اور نوآبادکار ترک وطن کرکے کوکن کے کوکنی بن گئے۔ ضلع تھانہ اور اس کے متصل علاقوں کے بودھی غاروں کی صناعیاں بتلاتی ہیں کہ انہیں اجنبی ہاتھوں نے تراشا ہے، کارلی کی گپھاؤں کے منقش ستونوں کی تراشں اور تہذیب — فارس کے خزانۂ استخر سے بے حد مماثلت رکھتی ہے۔ کوکن کی سرزمین پر بسنے والے مہاجرین کی بڑی تعداد خلیج فارس کی نسطوری تاجروں کی تھی، کلیان اور سوپارہ کی بستیاں ان کی آماجگاہیں بن گئیں۔ کلیان کے نسطوری نوآبادکاروں کا راہب ایک ایرانی تھا۔ اسی عہد میں شمالی ہندوستان کے شک پیلوی بھی ہجرت کرکے کوکن میں آباد ہو گئے۔ وقت کے بہاؤ میں سماجی اور عمرانی عوامل کے تھپیڑے کھا کر یہ عجمی النسل قوم کوکن کے مختلف قبیلوں اور بھارت کی مشترکہ تہذیب کے دھاروں میں اس طرح مل گئی کہ صدیوں کے گرد وغبار میں آج ان کے اصلی خد وخال نظر نہیں آتے۔ مگر ماہر عمرانیات کی دوررس اور گہری نظریں ان کی اصلیت کی جھلکیاں کوکنی براہمنوں کنبیوں اور مراٹھوں کے قبائلی ناموں اور نسبتوں میں دیکھ لیتی ہیں۔ مراٹھوں اور کنبیوں کے "پلہو" یا "پاہو" لقب میں "پیلوی" کا پہلو نمایاں[1] ہے۔

ساتواھن دور کی سنسکرتی

ساتواھنوں کا عروج اپنے جلو میں معاشی خوشحالی، مذہبی احیا اور ثقافتی ترقی لایا۔ تجارت اور دستکاری کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اس خانوادے میں کئی نامور راجہ گذرے ہیں جو علوم وفنون کے سرپرست تھے۔ کوکن اور دکن کے خوشحال سماج میں

نمبر[1] ایشیاٹک ریسرچز ج ۹۔۱۰ صفحہ ۲۲۳ - ۱۵۶

مادی اقدار کی تخلیق کے ہم رکاب فنی، تہذیبی اور ثقافتی تخلیقات بھی ہوئیں جن کی سرپرستی
نہ صرف ساتواھن راجکمار ہی کرتے تھے بلکہ اہلِ اقتدار و حکمران کے وہ روشن خیال اور ذہین
افراد بھی شامل تھے جنہیں "مہارتھی" "مہابھوج" یا "مہاسیناپتی" کہتے تھے۔ بدیسی
تاجر خصوصاً یونانی بھی دیا دھرم کے مارگ پران کے ہمسفر تھے۔ گویہ سارے بودھ مت
کے راستے کے مسافر تھے۔ اور ساتواھن براہمن تھے اسی لئے ان کے راج میں غار مندروں
کی تعمیر میں اضافہ ہوا۔ گوتمی پترادل (۱۰۶ء) اور یجنا شری تماتکرنی (۱۷۰ء) نے ناسک
کارلی اور کانیہری کی گپھاؤں میں کئی چیتیائیں تعمیر کرائیں۔ دیالو دھنوانوں کی رہائش گاہوں
"دھرتی کرٹ" کے حوالے جو مختلف غاروں کے کتبوں میں ملتے ہیں۔ اُن راستوں کا تعین کرتے
ہیں جن پر کانیہری، تھانہ، شیلارواڑی، کارلی، ناسک اور جنیر (پونا) کی منزلوں پر ساتواھن
امراء اور سوداگروں کے تجارتی پڑاؤ ڈالے جاتے تھے۔ اور جہاں سے دکن کا سیاسی قافلہ
کوکن تک پہنچتا تھا۔ فن سنگتراشی اپنی تمام حسن کاریوں کے ساتھ بھاجا، بیڈسہ، کارلی،
کونڈانہ اور گھارا پوری (ایلیفنٹا) کے غاروں میں درجۂ کمال پر نظر آتا ہے۔ صنم سازی نے
بھاجا کے صنم خانے میں فن آذری کو چھو لیا ہے۔ اور چتر کاری نے اجنتا کے غاروں کو نگار خانۂ
چین بنا دیا ہے۔ ساتواھن دور کی صناعی اور کاریگری ہی نے ان روایات اور فنی مناصب کی
داغ بیل ڈالی ہے۔ جو عرصے تک معیار فن کے اُصول تسلیم کئے جاتے رہے ہیں۔ اور انہیں
بنیادوں پر "شلپ شاستر" کی تصنیف ہوئی ہے۔ یہ گپھائیں، وِہاریں، اور شالائیں ہمارا تہذیبی
ورثہ ہیں۔ جو عہد قدیم کے فنی منصب اور انسانی عزائم اور حوصلہ مندیوں کے حسین مظاہر ہیں۔
اس کے علاوہ یہ ایک ایسے معاشرے کی نقاشی کرتی ہیں جس کے افراد خوشحال بھی تھے اور
باذوق بھی۔ فنون لطیفہ سے شیفتگی رکھتے تھے۔ جس کا اظہار صنم تراشی کے علاوہ اس دور کی

ادبیات سے بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پراکرت کی ترویج ہوئی جو عوام سے رابطے کی زبان تھی (اور جو گپتا عہد تک دفتری زبان رہی) مہاراشٹری (پراکرت) میں پہلی صدی عیسوی کے ساتواہن راجہ ہال نے اپنی کویتاؤں کا پہلا مجموعہ "سپتشتک" (ہفت صد) مرتب کیا۔ یہ نظمیں جو آریہ وزن میں ہیں۔ اپنی دلآویزیوں اور ایجاز کے سبب اُس عہد کی شاعری کا نادر نمونہ ہیں۔ ان میں جنوبی ہند کے تامل لوک گیتوں کی مٹھاس رچی ہوئی ہے اور دیہاتی مناظر کے پس منظر میں عوامی زندگی کی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ساتواہنوں کے حریف اُجینی کے شکوں کی سرپرستی میں سنسکرت زبان کو بے حد ترقی ہوئی۔ رُدرادامن (۱۵۰ء) نے گرنار کی مصنوعی جھیل کی تعمیر پہ سنسکرت کا جو کتبہ لگایا تھا وہ اس زبان کا قدیم ترین نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ویدعلوم کا احیا راسی زبان میں ہوا۔ اور یہی دور دیگر علوم و فنون کی زبان تھی۔ پراکرت کو ساتواہنوں کے سبب بے حد فروغ حاصل ہوا۔

آندھرا بھرتیہ سماج میں ورن اور جاتی نے گہری اونچ نیچ پیدا کر دی تھی۔ چکرورتی راجہ کے سنگھاسن کے پائینتی وہ راجہ براجمان رہتے تھے۔ جن کا سکہ چلتا تھا اور جن پر کھڑے ہوئے ان کی چھایا سے ان کا درشن کیا جا سکتا تھا۔ پھر مہا بھوج اور مہا رتھی اُمراء کا درجہ تھا۔ یہ جاگیرداری سماج کے اُونچے ستون تھے۔ براہمن اور دیوتاؤں کے بیچ چند شبدوں اور شلوکوں کا فرق تھا، آریاؤں کی مذہبی عبادت یجنا کے الاؤ کی آگ براہمنوں کے سبب تیز تر ہو گئی تھی۔

چکرورتی شاتکرنیوں کا راج کئی دلشیوں (صدیوں) تک پھیلا ہوا تھا، ہر دیش میں کئی آہار ہوتے تھے۔ سوپارہ بھی ایسا ہی ایک آہار تھا، آہار کا حاکم اماتیہ آماتیہ بھنڈارک

ما بھاشم۔ (انگریزی) ایضاً صفحہ ۴۶۱ - ۵۱۱

یا صرف آماک کہلاتا تھا۔ ہر آہار کئی تیتھکوں میں بانٹ گیا تھا۔ تیتھک کا حاکم گوپ یا گرامک ہوتا تھا۔

دوسرا باب

کوکن کا سیاسی و تمدنی عروج

ساتواہنوں کی سلطنت سے ستون زیادہ دنوں تک ہمسایہ حکمرانوں کی جارحانہ کارروائیوں اور معاشی معرکہ آرائیوں کی تاب نہ لاکر اکھڑ گئے، لیکن دلِ ناتواں کی آخری زور آزمائی اور عارضی استقلال نے کلیانا کو تھانہ اور چیمول کے مقابلے میں دیسی مصنوعات اور تجارتی اسباب کی اہم منڈی کی حیثیت سے لاکھڑا کر دیا تھا (موریہ اور راشٹرکوٹوں کے آنے والے دور میں کلیانا کی بدیسی تجارت کو اور زیادہ استحکام پہنچا)[1] کوکن میں آندھرا بھرتیوں کے زوال کے اسباب دراصل اقتصادی اور تمدنی عوامل تھے۔ بیرونی دولت کی فراوانی اور معاشی استحصال کی گرم بازاری ہی اہلِ اقتدار کی باہمی آویزش اور خانہ جنگی کا سبب بن گئی تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے موڑ پر کوکن کے "رنگ بھوم" پر راج لیلا، کا جو ناٹک رچایا جا رہا تھا اس کے منظر اتنی تیزی سے تبدیل ہونے لگے تھے کہ سارے واقعات گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

---

[1]: بمبئی کا عروج (انگریزی)، صفحہ ۱۲

راج ناٹک

ابھیر (۲۵۰ سنہ ء): اس راج ناٹک میں اپرانت کے ابھیر۔ ابھر کر سامنے آتے ہیں "گڈریوں کے دیس" کے یہ باسی اتری دکشنا پتھ سے بڑھے اور اتر پوربی اپرانت کے نواسی بن بیٹھے۔ ناسک گپھا کے ایک کتبہ میں ابھیروں کا ذکر ملتا ہے۔ مدھوری پتر ایشورسین ابھیر اور اس کا بیٹا شیودت اس خاندان کے نامور راجہ گذرے ہیں۔

راشٹرکوٹ: ساتواھنی تسلط کے ستون سرنگوں ہوتے ہی مہا سامنتوں نے سربلند کر لیے کئی خودسر گھرانوں نے سیاسی گھروندے بنا لئے مگر دکن کے راشٹرکوٹوں کے سیلاب میں یہ سارے سیاسی تنکے بہہ گئے۔ اس کٹم کا ایک مشہور راجہ کرشن (سنہ ۸۰۰-۷۶۰ء) گذرا ہے جس کے اقتدار کا سکہ بگلان (ناسک) سے لے کر اتر اپرانت ششٹی اور ہیتا نیپا کے دیہاتوں اور جزیروں تک چلتا تھا۔ جیسا کہ اس کے عہد کے دریافت شدہ سکوں سے شہادت ملتی ہے۔ غالباً یہی راجہ کرشن تھا جس کے حکم سے ایلورا کے دیو زیب کیلاش مندر کو ایک پوری چٹان سے تراش کر بنایا گیا تھا جس کی بے نظیر صنم تراشی اور نادر صناعی نے ہندوستانی کلا کو کیلاش پربت کی طرح اونچا کر دیا۔ جزائر بمبئی کے مختلف بندروں کے تجارتی اور بحری رشتے ششٹی اور تھانہ سے اس عہد میں مستحکم ہو چکے تھے۔ (یہ استحکام آگے چل کر کلیانا کی بین الاقوامی تجارت کے لئے نہایت ممد ثابت ہوا) کوکن پر راشٹرکوٹوں کی فرمانروائی ڈھلتی دھوپ اتری چھایا تھی کیونکہ ابھیروں کے پرانے مہا منڈلیشور (اطاعت گذار) ترے کوٹکوں

۱؎ بھاشم۔ (انگریزی)۔ ایضاً۔

نے کالیدآس کے ناٹک کی "تین پرتیوں کی بستی"۔ ترے کوٹ یا (ٹنگر) کو راجدھانی بنالیا تھا اور اُترا اَپرانت بھی راشٹرکوٹوں سے چھین لیا تھا ۔۔۔ اور چھٹی صدی کے آخری موڑ تک اس کی راج یا ترا اَپرانت میں جاری رہی۔ اَپرانت کے چند آہار جو راشٹرکوٹوں کے راج کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی موریہ اور نل سے راشٹرکوٹ ہار بیٹھے۔ ان میں جزائر بمبئی اور سشتشٹی کے چند آباد گاؤں تھے۔

ترے کوٹک

راشٹرکوٹوں کے حریف ترے کوٹکوں کا راج ۔ سامراج کی سیما چھونے لگا' سیندھا کی دھند میں ڈوبی ہوئی سُرمئی گھاٹیوں سے نیچے اور دور لات دیس اور کاٹھیاواڑ کے چمکتے ساحلوں تک ترے کوٹک راج کا اُجالا پھیل گیا۔ مگر ابھی اس نئے عہد کا سورج اُبھر رہا تھا کہ برآر اور مرہٹوں کے برتیرہ دیس سے اُٹھتے ہوئے واکاٹک قافلے کے گرد و غبار نے اسے اپنے لپیٹ میں لے لیا۔ چند دان پتروں سے ان کی رائج کی ہوئی تقویم اور نئے عہد کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں، بدھ مت کے مہایان فرقہ کو اس عہد میں نمایاں حیثیت حاصل رہی۔

اَپرانت کے راج اکھاڑے میں اَنگنیر کب کے ڈھیر ہو چکے تھے، راشٹرکوٹ پٹ چکے تھے اور ترے کوٹک راج کی زندگی کٹ چکی تھی' دیس اب واکاٹکوں کی راہ تک رہا تھا ۔۔۔!!!

۱؎ ڈوکشت، "مغربی ہندوستان کی بُدھ مت نوآبادی" (بمبئی یونیورسٹی)، صفحہ ۴۳ ۔ ۴۵ ـ ۶۴ ۔

واکاٹک (۲۷۵ء تا ۵۳۵ء) :

جب گرد و غبار چھٹا تو نئی سانسکرتی اور سبھیتا کا سورج نئی آب و تاب سے چمکنے لگا جس نے گپت دور کی پرمپرا کو نئی جلا بخشی اور دکشناپتھ کی سانسکرتی کی بیتھ پر دتوں اُجالا پھیلائے رکھا۔ اس عہد میں سنسکرت بھاشا کو نئی طاقتِ گویائی عطا ہوئی۔ اس گھرانے کو دکن اور کوکن کی تہذیبی تاریخ میں نہایت اہمیت حاصل ہے[1]۔ نئی سانسکرتی کی نیو ڈالنے والی اور گپت دور کی پرمپرا کا پرچار کرنے والی خود چندر گپت (دوم) کی بیٹی پربھاوتی گپت تھی جو واکاٹک راجہ رودرسین کی رانی تھی! درجہ عرصہ تک اپنے کمسن راجکماروں کے نام سے اپرانت پر راج کرتی رہی۔ لات دیس اور کاٹھیا واڑ کی مہموں میں اس نے اپنے پتا راجہ کی بڑی سہائتا کی تھی، اس کے تدبر نے بڑی بڑی طاقتوں کو سفارتی تعلقات اور رشتہ داری کے بندھنوں سے باندھ لیا تھا، کہ تب گھرانے کی ایک راجکماری اس کے پوتے نریندرسین کی رانی تھی۔

واکاٹک دور میں جین دھرم میں نئی جان پڑی، سوپارہ جو جینوں کے ایک تیرتھنکر (اگردا) رشبھ دیو کے عہد سے مذہبی مرکز بن گیا تھا۔ اس عہد میں نئی اہمیتوں کا حامل رہا، دلفریب وادیوں میں جین بھکشوؤں کی ٹولیاں اور دھان کے لہلہاتے کھیتوں سے پرے دیہاتوں میں جین مندروں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ رتناگیری میں جین مت کا تسلط برسوں برقرار رہا، یہی پورے دیس کا دھرم[2] تھا۔

---

[1] مہاراشٹر پردیش گزیٹیر۔ رتناگیری) صفہ ۱۰۵

[2] ایضاً۔ صفہ ۱۰۶

چالوکیوں کا عروج (۵۵۰ء)

نریندر سین واکاٹک کے عہد میں نئی قوتوں نے سر بلند کیا۔ کدمب (۳۴۵ء تا ۵۵۰ء) کانچی کے پلاوہ طاقت کے بل بوتے پر جنوبی ہند سے بڑھے اور امر ساگر کے پچھم سے لے کر اُتر میں مالوہ تک اُنہوں نے قدم جما لیا۔ مہاکوشل کے کلاچوری، اَپرانت کی اور بڑھے اُنہوں نے ناسک پر قبضہ کر لیا اور کلیانا کو راجدھانی بنا لیا۔ نل گھرانہ بھی ماہنا کس بل دکھانے لگا جب تک چالوکیوں نے اُتر اَپرانت کی طرف توجہ نہیں دی وہ کوکن کے راجہ بنے رہے۔

جب چھٹی صدی کا سورج سر پر آیا تو کئی راجواڑوں کی شام ہو چلی تھی۔ کدمب گھرانہ خانہ جنگیوں کے سبب مختلف گھرانوں میں بٹ کر کمزور ہو چکا تھا۔ کلاچوری اب موریا اور نل کی بڑھتی ہوئی طاقتوں کے سامنے مجبور ہو چکے تھے۔ شاردولا (شیر) کی نشانی والے موریا جو گذشتہ کے بھوج راج کا بھوگ دے چکے تھے چالوکیوں کو آنکھیں دکھانے لگ گئے تھے، مگر چالوکیوں نے موریا کو اُتر اَپرانت کے کوہستانوں میں دھکیل دیا۔ اُتر بھارت میں دیس کا سب سے بڑا سامراج گپت زوال کی سرحد پار کر رہا تھا۔ اب سارا دکشنا پتھ۔ رتناگیری تک سنسان پڑا تھا۔ جئے سمہا اور اُس کا بیٹا رن راگ جو واکاٹک راج کے چالوکیہ مہامنڈلیشور تھے۔ اب راج راجیشور بننے کا سپنا دیکھنے لگے مگر ابھی انہیں کدمبوں کے بڑھتے قدموں کو روکنا تھا۔ گنگ کو لنگ کرنا تھا۔ کلاچوروں کے سائے کو اپنے سے دور اور اُتنگ موریہ اور نل طاقتوں کو مجبور کرنا تھا۔ سب سے پہلے اُنہوں نے ریوتی دیپ (ریڈی) اور باداَمی یا واتاپی

(آندھرا) کولہنے محاذ بنا لئے اور ساونت واڑی میں کدآل اور کولہاپور سے قریب سنکیشور کی بستیاں چالوکیہ راجکماروں کی راجدھانیاں بن گئیں۔ اُتری اپرانت میں نل اور موریا کا راج مینوں بنکھ پھیلائے ناچتا رہا ——— !! داپھول کے بادامی چٹانی مندر اور چندریکا دیوی کے کھنڈروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پراچین بستی اور "دیوتاؤں کے دیس" (امراوتی) کو مذہبی فضیلت حاصل ہو چکی تھی۔

موریہ اور نل (۵۰۰ء تا ۶۱۰ء)

گو بادامی چالوکیہ آٹھویں صدی کے اوّل نصف تک مہاراشٹر کے متعدد علاقوں پر راج کرتے رہے مگر قلابہ، تھانہ، جزائر بمبئی اور سشٹی پر موریہ اور نل کے مقامی گھرانے ایک صدی تک حکمرانی کرتے رہے، کلیانا مغربی ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں سے ایک ریاست کا صدر مقام تھا۔ کلاچوری عہد کی مرکزی حیثیت اسے اس دور میں بھی حاصل رہی، مصری راہب قوضمس جب ۵۳۵ء میں یہاں آیا تو اسے بین الاقوامی حیثیت کی ایک تجارتی منڈی پایا[۱] جہاں سے تانبا، لوہا، آبنوس اور کپڑے سیلون برآمد کئے جاتے تھے اور وہاں سے ریشم، لونگ اور عود وصندل یہاں آتا تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ مرچ، سونٹھ، مسالے، ریشمی اور سوتی کپڑوں کا بیوپار بھی منافع بخش تھا۔ خلیج فارس کے ذریعے کلیان کی بدیسی تجارت کو قم سے قریب جدّہ اور اُبلہ کی بندرگاہوں سے عروج پر تھی جہاں بانس اور ساگوان کی بڑی مانگ تھی، اسی تجارت کے سلسلے میں بنی اسرائیلی قبیلے یمن سے ہجرت کرکے شمالی کوکن کی بندرگاہوں میں آباد ہونے لگے تھے، چھٹی صدی میں قلابہ میں خصوصاً

---

[۱] تاریخ کوکن۔ (انگریزی) بیرنے، صفحہ ۳

راجپوتری بندر میں ان کی بڑی تعداد توطن اختیار کر چکی تھی[۱]۔ کلیان میں آباد ایران کے نسطوری خاندان اپنی تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے ایرانی کلیسا کی پیروی کرتے تھے اور وہیں سے احکام حاصل کرتے تھے، کلیان کا راہب ایران سے مقرر ہو کر آتا تھا[۲]

تومیش جب کلیان آیا تو یہاں نل گھرانہ راج کرتا تھا۔ نل راجہ کی زبردست عسکری طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پاس پانچ سو سے لے کر چھ سو تک جنگی ہاتھی تھے۔ اس خاندان کی یادگار کلیان سے قریب ملنگ گڑھ کا مشہور پہاڑی قلعہ (بالا حصار) ہے (عہد غزنویہ میں جب حاجی عبدالرحمٰن نامی ایک عرب معہ دیگر مبلغین کے کوکن آئے تو اسی قبیلے کی ایک راجکماری ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی تھی)۔ نل قبیلہ کا موریہ گھرانے سے نسبتی اور قومی تعلق کا ثبوت ملتا ہے، اکثر ایرانت میں یہی راشٹرکوٹوں اور بعد میں کلاچوریوں کے جانشین اور بادامی چالوکیو کے حریف تھے۔

سکندو رماراجہ کے عہد میں موریہ راج کی آخری سرحد "واڈہ" کی بستی اور ویترنی ندی تھی، پانچویں صدی کے ایک سنگی کتبے سے جو مذکورہ بالا مقام میں دریافت ہوا ہے اس کی سند ملتی ہے، بھیونڈی کو مذہبی فضیلت اسی عہد میں نصیب ہوئی، اس کی توثیق لوناڑ کے مسمار شدہ غاروں اور سنگی مندر سے ہوتی ہے جو بھیونڈی سے چھ میل کے فاصلے پر اس قدیم ترین شاہراہ پر تعمیر کئے گئے تھے جو کوکن کو دکن سے ملاتی تھی، لوناڑ غار میں موریہ دربار کی نقاشی کی گئی ہے جس کی صناعی اور سنگتراشی سے عجمی فنکاری کی

---

(۱) تاریخ کوکن۔ صفحہ ۔

(۲) تھانہ گزیٹیر۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۷۰۰

جھلکیاں نمایاں ہیں، جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایرانی تاجروں اور نسطوری نوآبادکاروں کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے گہرے اثرات ذہنوں اور دلوں کے علاوہ چٹانوں اور پتھر کی سلوں پر بھی ثبت ہو چکے تھے۔ جس طرح کلیانا ٹل گھرانے کا گڑھ تھا موریہ خاندان کی راجدھانی "پچھمی ساگر کی دھن دیوی ـ پوری" کی نئی بستی تھی، پوری یا گھارا پوری (موجودہ ایلیفنٹا) کا بندر جزائر بمبئی اور چمپاوتی (چیمل) کے درمیان مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔

تاریخ کے اس موڑ پر جہاں ٹل اور موریہ کی قومی حکومتوں کا ملاپ ہوا تھا وہیں سے کلیان اور بھیونڈی کی جغرافیائی سیاسی اور اقتصادی وابستگیوں کا سفر بھی شروع ہوتا ہے۔ ان دونوں قدیم بستیوں کے نام تاریخ کے راستے پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، کلیان کو ہمیشہ سیاسی اہمیت حاصل رہی۔ اور بھیونڈی ماتحت قصبہ اور تجارتی منڈی کی حیثیت سے وابستہ رہا[1] اتر اپرانت میں داخل ہونے کے لئے یہی دو دروازے تھے، بھیونڈی ہی کے راستے بارہویں صدی میں گجرات کے انہلواڑہ اور تھانہ کے سلاہار راجہ ایک دوسرے کی سلطنت پر حملہ آور ہوتے رہے۔ مغلوں کی فوجوں اور مرہٹوں کے آوارہ دستوں کی یہی گذرگاہیں تھیں۔ موریہ اور ٹل قبیلوں کے کچھ آثار اب بھی کنبی، کوتی اور مرہٹہ گھرانوں کے "موریے" اور "ٹل" القاب میں ملتے ہیں۔ ایلیفنٹا اور کرنجا (اورن) میں دو ساحلی گھاٹ "موریے" کے نام سے ایک صدی قبل تک مشہور تھے۔

بادامی چالوکیہ راج (۵۵۱ء تا ۷۵۳ء)

---

[1]: تھانہ گزیٹیر ـ ایضاً ـ صفحہ ۴۲۰ (فٹ نوٹ)

چالوکیہ راج کی نیو ڈالنے والا پُلکیشن (اوّل) تھا اور اُسے سامراج کا روپ دینے والا اس کا بیٹا کیرتی ورمن (۵۶۶ء تا ۵۹۷ء) تھا جس نے کدمب راج کی اتحادی طاقتوں کا سر کچل کر سربلندی حاصل کر لی اور دکشنا پتھ سے لے کر ریوتی دیپ تک اپنی سرحدیں بڑھالیں، ریوتی دیپ میں اس نے اپنے مہاسینا پتی سوامی راجہ کو مہامندلیشور مقرر کیا۔[۱] اتر اپرانت میں ابھی نل، موریہ اور نل بر اجمان تھے یہ دیکھ کر کیرتی ورمن باداموی (آندھرا) سے آندھی بن کر اٹھا اور "موت کی اندھیری رات کی طرح موریہ اور نل پر چھا گیا"۔[۲] گو آندھی گذر گئی اور نل راج کا کس بل جاتا رہا مگر موریہ کا مور اپرانت کے جنگلوں میں ناچتا رہا ــــــــ!!

کیرتی ورمن کے بعد اس کے سوتیلے بھائی منگلیشور (۵۹۷ء تا ۶۱۰ء) نے راج پاٹ غصب کر لیا، ریوتی دیپ میں سوامی راجہ کا جیون دیپ بجھا کر اپنے بیٹے اندر وامن کو مہا مندلیشوری سونپ دی، سوامی راجہ کیرتی ورمن کے دوسرے بیٹے کے لڑکے پلکیشن (دوم) کا طرفدار تھا، منگلیش نے ناسک کی کلاچوری راجہ بدھ (۶۰۱ء) کو شکست دے کر اپنی طاقت اور بڑھالی اور اس زعم میں آکر اپنے آپ کو "رنا وکرانت" اور شری پرتھوی ولبھ" کہلانے لگا۔[۳]

اندر وامن ۶۱۰ء تک ریوتی دیپ کا راجہ بنا رہا، اس کے راج میں چار وشیا منڈل (صوبے) تھے، گومنت اس کا حصہ تھا اور اس کا اپنا سکہ تھا، اس کے دان پتروں پر اس

---

[۱]: مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتناگیری) صفحہ ۱۰۹-۱۱۰

[۲]: نیرنے۔ تاریخ کونکن (انگریزی) صفحہ ۱۳-۱۴

[۳]: مہاراشٹر پردیش گزیٹیر۔ ایضاً۔ صفحہ ۹

کا بھاری بھرکم خطاب "ستیا شریہ دھرو راجا ندروامن" نظر آتا ہے۔

پل کیشن (دوم ۶۴۲ — ۶۱۰ سنہ ء)

اب سنگھاسن کے اصلی دعویدار مستحق پل کیشن (دوم) کا زمانہ تھا جس نے اپنے غاصب چچا منگلیشور کو ایک لڑائی میں قتل کر کے باداَمی کا تخت حاصل کر لیا (۶۱۰ سنہ ء) چالوکیہ سامراجیہ کا سب سے نامور راجہ گذرا ہے۔ اسی کے عہد میں اُتراپرانت بھی چالوکیہ راج کا حصہ بن گیا جس پر موریہ ابھی تک حکمراں تھے، مگر جس کو "اِس کی طاقت کی لہریں برساتی جوہڑ میں جمے ہوئے پانی کی طرح بہا کے لے گئیں" اور رد ی کرتی۔ راج کوی نے پل کیشن پر تھوی وبھ کی جھا میں لکھا "شیو دیوتا کی طرح فروزاں — وہ لچھمی سمندر کی دولت کی دیوی۔ پوری پر پوری طرح چھا گیا، مست ہاتھیوں کی طرح نیلے سمندر میں جھومتے جہاز سیکڑوں کی تعداد میں اس طرح نظر آتے تھے جیسے گہرے نیلے آکاش پر گھنگھور گھٹاؤں کے دل تیر رہے ہوں[۱]" پل کیشن کو کن کی بندر گاہوں کا ناخدا اور گومنت سے لے کر شکستی کے دیہاتوں تک کا دہخدا بن بیٹھا، اس کی شہرت ایوان کسریٰ کی دیواروں سے ٹکرانے لگی، سیاسی اور تجارتی استحکام کی غرض سے پارسیکاؤں کے شہنشاہ خسرو پرویز (۶۲۲ — ۵۹۰ سنہ ء) نے ایک سفارتی وفد پل کیشن کے دربار میں بھیجا۔ ایرانی مدنیت اور ثقافت نے ہندوستانی کلاکاروں اور چترکاروں کو اتنا متاثر کر دیا تھا کہ تخیل کی تمام پرکاری حقیقت نگاری بن چکی تھی، اجنتا کی مصوری میں ایرانی سفارت کی نقاشی کی گئی ہے۔ اور گومنت کی ایک پراچین مورتی گج لکشمی کی دیوداسیاں ایرانی پوشاک میں ملبوس

نمبر ۱: بھاشم۔ (انگریزی) صفحہ ۱۳۱ — ۱۳۰، صفحہ ۱۱۵

نظر آتی ہے۔ چینی سیاح ہیون تسنگ اسی راجہ کے آخری دور میں ہندوستان آیا تھا اور اس کے راج اور پرجا کے بارے میں تفصیل سے لکھتا ہے۔ چیلوکن کے ایک دان پتر میں پُلکیشن کی دیوتا، وِدیا اور سادھوتا کو سُندر شبدوں میں سراہا گیا ہے۔

گپت سامراج کے راجہ ہرش وردھن کو پسپا کرنے والا پُلکیشن راجہ اپنے پرانے پڑوسی حریف، پلّاؤ سے ایسی بُری طرح پسپا ہوا کہ تخت بھی کھو بیٹھا اور جان بھی ہار بیٹھا۔ واتاپی کی بربادی پلّاؤ راجہ نرسِمہا وِشنو (ورمن) کے خطاب "واتاپی کونڈ" سے برسوں جھلکتی رہی اور راج سنگھاسن مدتوں اپنے راجہ وِکرم دتیہ (اول) کے لئے آغوش کھولے ڈانواڈول رہا ۔۔۔!!

وِکرم دِتیہ (اول سنہ ۸۱-۶۵۵ء)

چالوکیہ راج سنگھاسن پر کئی دعوے دار راجکمار تلواروں کا سایہ کئے ہوئے تھے۔ مگر پُلکیشن کے بیٹے وِکرم دتیہ نے سبھوں کو اپنی تلوار کی باڑھ پر رکھ لیا۔ تین دِشاؤں کے سمندر اُس کے دیس کی دھرتی چھونے لگے اور کیرل، پانڈیہ اور چولا کے راجہ اس کے چرن چھونے لگے، کانچی کی بربادی نے واتاپی کا انتقام لے لیا، وِکرم دِتیہ نے پلّاؤ راجاؤں کو پے در پے شکست دے کر اپنے گھرانے کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرلیا، ان تمام مہمات میں اُس کا بیٹا وِنیہ دِتیہ اور پوتا وِجیہ دِتیہ اُس کے دست و بازو بنے رہے، بھاری بھرکم القاب اور خطابات سے اس کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "ستیاشرکیہ راج ملّا" اور "شری پرتھوی ولبھ" سے بھی آگے۔ وہ مہاراج ادھیراج

ANCIENT SHRINES OF GOA — P. 9

پرملیشور" کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا اور" بھٹارک" سے اس کے راج کی وسعت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے[1]۔ وکرم دتیہ کے عہد میں جب چالوکیہ راج اپنے عروج پر تھا۔ زوال کی مرحلہ شروع ہو چکی تھی۔ سو سال کے بعد اشٹرکوٹوں کا دوبارہ سیاسی جنم ہوا۔

وکرم دتیہ براہمنوں اور دیوتاؤں کا رکھشک تھا، اپنے گرو۔ ناگر وردھن اور شری میگھ آچاریہ کا سیوک اور ویدک دھرم کا پرچارک تھا، اس کے عہد کے کئی دان پتروں سے اس کے دان پن کی داستانیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

چالوکیہ سانسکرتی:

چالوکیہ راج اور راجکمار اپنے آپ کو وشنو نارائن کے پجاری یعنی پرم بھگوت کہتے تھے۔ ان کے عہد میں برہما، وشنو اور مہیش کی آرادھنا کی جاتی تھی۔ مگر جہاں مندروں کے منڈپوں میں رونق تھی وہاں جین مت کی وہاریں بھی آباد تھیں، بدھ شاکیہ منی کے اپدیشوں کا رتھ کسی موڑ پر آکر رک چکا تھا، ویدک علوم کا احیا ہوا تھا۔ ہیاؤں کی قربانی کی عبادت میں نئی جان پڑ گئی، دھرم کرم اور دان پن نے مندروں کے گوپوروں میں اضافہ کر دیا۔ پل کیشن (اول) نے ساونت واڑی میں وینگورلے سے قریب کوچراگاؤں دکشنا میں کر دیا تھا، اس کی تجدید جیند رد تیہ کی رانی وجیہ بھٹارکا نے ایک دان پتر دے کر کی تھی۔ منگلیشور (منگلے) نے گومنت میں کنڈی واتک (کڈنے) (۵۷۸ء) میں دان کر دیا تھا۔ کڈنے چالوکیہ راج میں سانسکرتی کا بہت بڑا کیندر

---

[1]: مہاراشٹر ریاست ڈسٹرکٹ گزیٹیر (رتناگیری) صفحہ ۱۱۲-۱۱۳

تھا[1] منگلے کے بیٹے اندر دامن نے ۶۱۰ء میں کھیت ہر دیش (کھیڑ) میں ایک گرام دھار ہک کا مول کے لئے دان میں دے دیا تھا، وجیہ دتیہ نے (۷۰۵ء) میں ساونت واڑی میں ایک دیہات "اگرہار" کے لئے وقف کر دیا تھا[2]۔ اس عہد کے ساہتیہ کار دں میں ردی کیرتی کوی اور وجیہ بھٹارک ایک شاعرہ کا پتہ چلتا ہے۔

گو چالوکیہ راج کے اولین مندروں کی تعمیر میں گپت طرز کے اثرات غالب ہیں۔ مگر یہ خود راشٹر کوٹوں کی طرح ایک نئے طرزِ تعمیر کے بانی مشہور ہیں۔ سنگمیشور کے راجہ کرن چالوکیہ نے تقریباً ۳۶ مندروں کی تعمیر اور مرمت کر ڈالی تھی۔ کرنیشور کا مشہور مندر اسی راجہ کی یادگار ہے۔ اسی طرح قلابہ میں کنکیشور کا مندر، اسوگ، آم، پیپل اور تاڑ کے پیڑوں میں چھپا ہوا اور چمپا کے گھنے کنجوں سے گھرا ہوا، محرابوں کی ساخت میں چالوکیہ طرزِ تعمیر کا چلن بتلاتا ہے۔ داتاپی یا بادامی کا یہ چالوکیہ راج جسے کبھی چالوکیہ گھرانہ بھی کہتے ہیں، ساہتیہ، ودیا، سبھیا اور سانسکرتی کے اتہاس میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اور سب سے زیادہ اس کی اہمیت ہندوستانی تاریخ میں اس وجہ سے بھی ہے کہ اسی عہد میں ــ دُور عرب کے صحراؤں میں نورِ الٰہی کی تجلی چمکی۔ جب کونکن اور دکن کے صنم کدوں میں پتھر سے غار کھودے جا رہے تھے۔ غارِ ثور میں توحید کا کلمہ گونج رہا تھا۔ عرب کے صنم کدوں کے لات و ہبل منہ کے بل گر کر ھو اللہ احد کہنے لگے

---

[1] : گوا کی قدیم عبادت گاہیں (انگریزی) صفحہ ۹، صفحہ ۲۰۳

[2] : INDIAN ANTIQUITEIS VII, 163; VIII, 25, 45, 244; BOMBAY Govt. Sel X, (NEW SERIES) 163, 183, 195, 206, 233,

تھے، عرب کے بادیہ نشینوں میں ایک کالی کملی والا اُٹھا جو چاند بن کر چمکا اور زمین زار دل کی طرح مہکا۔ اور نجب بیز ہوائیں اس کے پیغام حق کی پیامبر بن کر برہماورت کی طرف چلنے لگیں ——— !!

دو سو سال کی راج یاترا کے بعد چالوکیہ سامراجیہ سانجھ کی سیما پر ستا رہا تھا۔ راشٹر کوٹ بہت دیر سے گھات میں بیٹھے تھے، اُنہوں نے بڑھ کر اسے تباہی کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا تھا۔ مانکھیٹ کے راشٹر کوٹوں کا جب دوسرا اسیا سی جنم ہوا تو وہ ایک ایسے سامراجیہ کے چکرورتی راجہ بنے جس کی اُتری سیما بندھیاچل سے ٹکرانے لگی۔ اور بھڑوچ سے لے کر گومنت تک عرب ساگر کے پانی کی دیوار اس کی پچھمی سرحد بن گئی، سلیمان تاجر پہلا عرب سیاح ہے جس نے اپنے سفرنامہ سلسلۃ التواریخ (۲۳۵ھ) میں بلہراراج کے دیس کمکم (کونکن) کا ذکر کیا ہے۔ جس کا راجہ اور اس کی پرجا عربوں سے میل ملاپ رکھتے تھے۔ جزر (گجر۔ گجرات) کے راجہ سے جس کی لڑائیاں رہا کرتی تھیں[1]۔ ساٹھ سال بعد ۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں جب مشہور مورخ ابوالحسین علی المسعودی کھمبایت آیا تو یہاں کا حاکم ایک بنیا (براہمن) تھا۔ جو بلہرا [رے] کے ماتحت تھا[2]۔ بلہرا کی راجدھانی کا نام عرب جغرافیہ نویس مانکیر بتلاتے ہیں[3]۔ جو غالباً مانیکھیٹ یا مالکھیٹ کی معرب شکل ہے۔ مسعودی کے بیان سے پتہ چلتا ہے۔

---

[1] : عرب و ہند کے تعلقات، سید سلیمان ندوی، صفحہ ۲۷، ۲۷۷۔ بعض مورخین مانیکھیٹ کو ... نواح میں موجود ہ مرکنڈ بتلاتے ہیں جسے میورکھنڈی کہتے تھے، مانیکھیٹ دراصل شولاپور کے قریب تھا۔

[2] : مسعودی۔ مروج الذہب و معادن الجواہر۔ ج ۱ صفحہ ۵۴۔ کھمبایت اور اس کے نواح میں دراصل راشٹر کوٹوں کا ایک دوسرا سلسلہ راج کر رہا تھا دیکھیے : Imperial Gazetteer of India Vol VIII (Oxf 1908) P. 281

[3] : اصطخری اور بزرگ بن شہریار کے بیانات۔ بحوالہ سید سلیمان ندوی۔ ایضاً صفحہ ۲۴-۲۵

کہ بلہرا سارے کیمکر (کوکن) کا چکرورتی راجہ تھا، جس کا ایک صوبہ لار تھا جو کھمبایت سے لے کر صیمور (چیول) تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں اُتری اَپرانت کا علاقہ اور سوپارہ اور تھانہ شامل تھے۔ لار میں لاریہ زبان بولی جاتی تھی، مسعودی بھی بلہراج کی عرب دوستی کا ذکر کرتا ہے[1]۔

اُبھرتے ڈوبتے سائے:

مسعودی جب کنبایت سے صیمور آیا تو یہاں کا حاکم جانچ تھا جو دراصل جنجہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جنجہ لار دیس کے سلاھار گھرانے کا پانچواں مہا منڈلیشور تھا۔ سلاھار گھرانے کے تین مختلف سلسلے جہار لمشرطیں، مہا سامنت اور مہا منڈلیشور بن کر راج کر رہے تھے۔ یہ تینوں سلسلے تھے۔

(۱) گومنت کے سلاھار (۷۶۵ء تا ۱۰۲۰ء) (۲) کولہاپور یا کرہاڈ کے سلاھار (۹۴۰ء تا ۱۲۱۵ء) اور (۳) لار دیس کے سلاہار (۱۰۰۰ء تا ۱۲۶۰ء) انہیں تھانہ کے سلاھار بھی کہتے ہیں۔ وقت اور سیاست کے آہنی ہاتھ ان کی اطاعت کا رُخ اور چوکھٹ بدلتے رہے، یہ پہلے راشٹرکوٹوں کی اطاعت کا دم بھرتے تھے مگر درپردہ اپنی خودمختاری کا بھرم رکھتے تھے، پھر چالوکیوں نے دوبارہ سر بلند کیا تو انہوں نے ان کے آگے سر جھکا دیا، جب پرمار کی مار پڑی تو ان کے اطاعت گذار بن گئے اور جب گومنت کے کدمبوں نے قدم بڑھایا تو ان کے قدمبوس بن گئے۔ جب ان کے عہد میں عرب سیاحوں اور تاجروں کی آمد و رفت بڑھی تو اُن کے کانوں میں سلاھار نام ہی کی گونج سنائی دی جس نام کے گجرات سے لے کر گومنت تک گُن گائے جاتے تھے۔ اُن کے ذہنوں میں طاقت

---

[1] مسعودی۔ ج۔ صفحہ ۸۳۔ ۳۸۲

(دکھن) کے راشٹر کوٹ راج کے وسیع تسلّط کا تصوّر تھا ۔ مگر زبان پر کونکن (کیمکر۔ کمکم) کے سلاھاروں ہی کا نام تھا جس نام کو ان بادیہ پیماؤں نے قافیہ پیمائی کر کے بلہرا اور بلھارا بنادیا جو ممکن ہے کہ بلبھ (ولبھ) رائے کا مخفف ہو جیسا کہ فارسی کی ایک قدیم ترین جغرافیہ پر تصنیف حدود العالم سے علم ہوتا ہے ۔ بلہرا نام کی اصلیت پر محققین کو اختلاف ہے ۔ بعض اسے ولبھی پور کا ولبھ رائے بتلاتے ہیں اور ولبھی پور کو بھانگر (مانکیر[1]) راجدھانی سمجھتے ہیں جو موجودہ بھاؤنگر کے پاس ایک بستی تھی ۔ مگر تاریخ مانکیر کی سمت مالکھیٹ کی طرف بتلاتی ہے جو دکن (عربوں کے طاقن) میں راشٹر کوٹوں کا صدر مقام تھا ۔ طاقن کے راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر تمام سیّاح کرتے ہیں[2] ۔ طاقن کا تسلّط اُس عہد میں کم از کم کوکن میں کمزور ہو چکا تھا کیونکہ سارا کوکن مہا سامنتوں اور مہا منڈیلیشوروں کے بیچ بندر بانٹ کا تماشا دکھلا رہا تھا ۔ اور عربوں کے دشمن جرز (گجرات) کے راجہ جو اپنے ساربانوں اور گھوڑ سواروں کے دستوں کے سبب بلہراؤں پر فوقیت رکھتے تھے ان کے دیس پر دست درازی کیا کرتے تھے ۔ سلاہاروں کے عہد کے مختلف سکوں اور کتبوں سے تلفظ کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے ۔ سلاہار ۔ ایک دوسرے تلفظ شریلار کا ہم قافیہ ہے ۔ سِلار اور شِلار میں نقطوں کا فرق ہے ۔

گویہ کہانی گوا اور اپرانت کے سلاھار گھرانوں کی ہے مگر راشٹر کوٹوں اور چالوکیوں کی راج بیتیوں سے اس کی کڑیاں ملی ہوئی ہیں ۔ آٹھویں صدی کا سورج بیچ آسمان پر چمک رہا تھا ۔ راشٹر کوٹ راجہ کرشن (۷۵۳ء-۷۷۵ء) چالوکیوں کو ونا کے گھاٹ اتار کر جین کی

---

[1]: مسعودی صفحہ ۲۸۶ جیمبہ کوثر ۔ شیخ محمد اکرام (بمبئی ۱۹۴۴ء) صفحہ ۳۸

[2]: مسعودی ۔ ایضاً ؛ ندوی ۔ صفحہ ۲۷۷ -- ۲۸۰

بنسی بجا رہا تھا۔ گومنت اور دکشنا پتھ پر راشٹرکوٹ راج رتھ چلنے لگا تھا۔ مگر گجرات یا لات دیس کے سولنکی اتر اپرانت میں گھس آئے تھے اور برسوں راشٹر کوٹوں کی راہوں میں رکاوٹ بنے رہے۔

سولنکی راج میں کلیان

کلیانا، سولنکی راج میں ایک مرتبہ پھر اپنی اہمیت کے رنگ بھوم پر ابھرا، اب اسے مفتوحہ ممالک سے لوٹے ہوئے مالِ غنیمت کا بہت بڑا گودام بنا دیا گیا تھا۔ یہاں کے جوہری کاریگری کے جوہر دکھلاتے تھے۔ کرگھوں پر تانے بانے سلجھانے والے بنکروں کا ہاتھ پکڑنا مشکل تھا، رتھ کاروں کے بنائے ہوئے پہیوں کی شہرت کا چکر آج تک چل رہا ہے، عالیشان حویلیوں کی دیواروں کو نامک چترکاروں نے اپنے شہکاروں سے نگارخانہ بنا دیا تھا۔ یہاں ویدوں کا ہجوم تھا، گپھاؤں اور جھیلوں کے ٹھنڈے شوالاؤں میں لگے رہتے تھے۔ سنگیت کاروں کی سبھائیں سجتی تھیں اور کلاونتوں کی منڈلیاں دل سندری سے قریب کلاونتی ڈونگر پر اپنے ڈیرے ڈالتی تھیں[1]۔

گوومیت یا گومنت کے سلاہار (۷۶۵ء تا ۱۰۲۰ء):

—— پچاس برس اسی طرح گذر گئے، پھر گجرات دیس کے سولنکی راج کی موت کا گجر لار دیس میں سلاہار نے بجا دیا اور نئے راج کا بانی کپرڈین اول ([illegible]) راشٹرکوٹوں کا مہامنڈلیشور بن گیا، پہلے پوری پھر شری استھانک راجدھانی بنا۔ ان کے پڑوس میں تنا...

---

[1] : راس مالا۔ اے۔ کے۔ فوربس۔ ج۔ صفحہ ۲۶

سے لیکر گومنت تک اسی گھرانے کی ایک دوسری شاخ نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ گوآ کے پراچین راجہ تھا کے سلاھار گھرانے کا ایک فرد سن پھلا (۷۹۵-۶۵ء) ریوتی دیپ کا پہلا مہامنڈلیشور بنا۔ کرشن اوّل نے سن پھلا کی خدمات کے صلے میں سنبھا اور سمندر کے بیچ پھیلی ہوئی بھومی اُسے سونپ دی تھی۔ جہاں ڈھائی سو برس تک سن پھلا کا سلسلہ خوب پھولا پھلا

ریوتی دیپ کے سلاھار راج کے نویں مہامنڈلیشور رٹ راجہ (۱۰۲۰-۹۹۵ء) کے اُٹھان کی رُت تھی، وہ راشٹرکوٹ راجہ تیلا (دوم) کا مہاسامنت تھا۔ واتاپی چالوکیہ کے ایک دوسرے گھرانے کلیانی چالوکیہ کا راجہ وکرم دیتیہ جنوبی ہند کے چولا راج کی چولیں ڈھیلی کر رہا تھا کہ رٹ راجہ کو سیاسی ڈھیل مل گئی، مہامنڈلیشوری کا چولا اُتار کر جلکیہ رتی راجہ کا روپ دھارن کر بیٹھا۔ لیکن وکرم دیتیہ چالوکیہ کو اپنے پرانے دشمن راشٹرکوٹوں کے ادنیٰ اطاعت گذار کا برا اُوتار ایک آنکھ نہ بھایا، اس طرح گومنت کا سلاھار راجہ رٹ سب کچھ ہار بیٹھا۔ مگر کوکن کے دوسرے سلاھار گھرانے کا راجہ اپراجیت، راشٹرکوٹوں کو کمزور پاکر خودمختار بن بیٹھا۔ ریوتی دیپ کے سلاھار راج کا راج دیپ بجھ گیا اور رتناگیری کے ایک گمنام علاقہ میں یہ گھرانہ برسوں بجھا بجھا رہا، گو چالوکیہ راجہ ستیہ شری (۱۰۴۰-۱۰۱۸ء) نے اپنی بندگی کا بھرم رکھوانے کی غرض سے انہیں اس وقت تک مہاسامنت دھیتی بنائے رکھا جب تک گومنت کے نئے چالوکیہ مہامنڈلیشور بیلگام کے کدمب گھرانے نے انہیں ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔

ریوتی دیپ اور گومنت کا یہ سلاھار قبیلہ ولی پٹن یا غالباً کھارے پاٹن سے رتناگری تک راج کرتا تھا اور کولھاپور کی دیوی مہالکشمی کی پوجا پاٹ کرتا تھا۔ مگر براہمنوں کے علاوہ جین مت کے بھکشوؤں اور دوسرے دھرم کا پالن کرنا بھی ان کا دھرم تھا۔

راشٹرکوٹ چکرورتی راجاؤں کی تقلید میں گومنت سلاھار دور میں زیادہ پرانوں کی پرانی عبادتیں نئی رسموں میں بدل گئیں۔ اور نئی عبادت گاہیں چٹانوں اور سلوں کے سانچوں میں ڈھل گئیں۔ بیٹارے (گوا) کا مہالکشمی مندر سلاھاروں کی یادگار ہے۔ اور ایلورہ کا غار مندر راشٹرکوٹوں کے حسن عبودیت کا سنگین اظہار ہے، ایلورہ کا کیلاش ناتھ مندر بھی اس عہد کی یادگار ہے، رتی راجہ یا راتو راجہ نے وجے درگ کے قریب گرشن منڈی کا گرام یاترلیں' ودیاوانوں اور یوگیوں کے سیوا کے لئے دکشنا میں دے دیا تھا یہاں شیو کی آرادھنا کی جاتی تھی۔ مورت کاروں کی بھاؤنائیں نٹ راج (شیو) کی صنم تراشی میں اپنے بھید بھاؤ کھو نے لگیں۔ اور اس فن میں انہوں نے ایسا کمال دکھایا کہ بصرہ کے مشہور فلسفی اور ادیب الجاحظ (۸۶۲ء) نے بھی ہندوستانی کلاکاروں کی تعریف میں قلم سرنگوں کر دیا[۱]۔ جس طرح نٹ راج کے رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہر ہیں اسی طرح اس کی پرستش کے سیکڑوں مظاہر مندر اور مورتیوں میں ڈھل کر آج بھی کوکن کی دھرتی پر موجود ہیں[۲]۔ نٹ راج جو مہاکال بھی ہے یعنی وقت اور موت کا دیوتا وہ سب کو فنا کر دینے والا "تانڈو" ناچ بھی کبھی کبھار ناچ اٹھتا ہے اور دکشنا پتھ کے رنگ بھوم پر دسویں صدی کے پس منظر میں ایک ایسا ہی تانڈو ناچ ہو رہا تھا — !!!

گومنت کے کدمب (۱۰۰۵ء تا ۱۲۷۷ء)

امرساگر سے لے کر مالوہ تک راج کرنے والے کدمبوں کی جب اٹھان تھی تو وہ اپنے

۱: عرب و ہند کے تعلقات۔ صفحہ ۱۲۶

۲: دیکھئے ذخیرہ۔ ہیرس انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیقات تاریخی، (سینٹ زیویرس کالج بمبئی) مضمون۔ جیمز سوامی۔ ٹائمز آف انڈیا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۶۲ء

پلادہ چکرورتن راجاؤں کے مقابلے میں اشومیدہ قربانی کی رسم ادا کر کے اپنی عظمت کا بھرم رکھتے تھے، چندرگپت (دوم) - یا وکرم دتیہ) اپنے راج دوت (سفیر، کدمب راج سبھا میں بھیج کر دوستی کا طلب گار ہوتا تھا۔ اس راج نیتی کی اصل نیت مصالحت تھی، کیوں کہ جنوبی ہند میں کدمب راج کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ چھتر بھوج (سنہ ۹۶۶-۹۹۰ء) یا گھسلا دیو (اول) گومنت کے سلاھاروں کا اطاعت گذار (مہا منڈلیشور) تھا جس نے راشٹرکوٹوں کے خلاف چالوکیوں سے ناطہ جوڑ لیا تھا اس طرح ریوتی دیپ کے سلاھاروں سے ان کا سمبندھ ٹوٹ گیا اور دشمنی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو سلاھار راجہ رتّ اور کدمب راجہ شستہ دیو (دوم سنہ ۱۰۰۵-۱۰۰۵ء) کے زمانے میں جنگ کا باعث بن گیا۔ ریوتی دیپ کے سلاھاروں کی مہا منڈلیشوری پر کدمب قابض ہو چکے تھے اور رتناگیری کے کچھ حصہ پر خود ان کے عزیز تھانہ کے سلاھار مالک بنے بیٹھے تھے۔ اپراجیت سلاھار سنہ ۹۷۳ء سے لار دیس کا خود مختار راجہ تھا اور وہ کوکن چکرورتن کا خطاب اپنا کر ریوتی دیپ کے شرنارتھی سلاھاروں کی آنکھوں کا کانٹا اور گومنت کے کدمبوں کی راہوں کی رکاوٹ بن چکا تھا، اپراجیت کے بیٹے اریکیشری (سنہ ۱۰۱۵-۱۰۲۵ء) نے تری استھانک (تھانہ) راج کی گدی سنبھالی تو رتّ راجہ نے اپنا کھویا ہوا حصہ حاصل کرنے کے لئے اریکیشری پر دھاوا بول دیا، خانہ جنگی کی آگ دونوں سلاھار گھرانوں کو بھسم کرنے لگی بشست دیو راجہ کو اپنے وقار پر آنچ آتی نظر آئی تو وہ خود آگ میں کود پڑا اور دونوں گھرانوں کی چتا جلا کر خون کی ہولی کھیلا۔ رتّ راجہ کا نام پھر سننے میں نہیں آیا اور اریکیشری۔ کدمب گھرانے کا مہاسامنت دھیتی بن کر برسوں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا۔ کدمب راجہ شستہ دیو خود چالوکیہ راجہ جے سمہا (دوم) کا مہا منڈلیشور

تھا۔ رتناگیری کے اُس حصّے میں جہاں ریتی دیپ کے تئر ناریمی سلاہاروں گھرانے نے پناہ لی تھی مدتوں جنگل کے کدمب (۹۶۷ء تا ۱۳۴۴ء) مہامنڈلیشوری کی گدی اپنے گومنت کے کدمب گھرانے کی پُشت پناہی حاصل کر کے سنبھالے رہے۔

شست دیو (۱۰۰۵ء - ۱۰۵۰ء)

چھتر بھوج اور رانی اکا دیوی کے بیٹے گہلا دیو (دوم ۱۰۰۰ء تا ۹۸۰ء) کے زمانے میں کدمب راج سہیا گھاٹ سے لے کر سمندر تک پھیل گیا تھا جس کا خاص حصّہ سالسیٹ تھا۔ وہ سات دیس کے راجاؤں کا مہاراج تھا۔ اس کا بیٹا شست دیو (دوم) کدمب نارنجی رنگ کے کدم پھولوں کی طرح برسوں مہکتا رہا۔ ہیم چندر کی کادیہ (نظم) کی تشبیہوں اور استعاروں کا شہر چندرپور —— چندر منڈل بن کر چمکتا رہا اور بارہ دیسوں تک اپنی روشنی پھیلاتا رہا۔ شست دیو سمندری طاقت کا دیوتا تھا جس کے قبضے میں سیکڑوں جنگی جہازوں کے بیڑے تھے جو اپنے راجہ کا سنگھاسن لئے مستولوں کا مغرور سر اٹھائے اور بادبانوں کا سینہ پھیلائے لار دیس کے سلاہار راجاؤں کے بڑاؤں اور ناوں سے بھی پہلے سومنیور (سومناتھ) پہنچ جایا کرتے تھے۔ شیولنگ کا سومناتھ جسے ابھی ابھی (۱۰۲۴ء) پُر جوش پڑاؤ (غزنہ) کے ترک سلطان محمود نے لوٹ کر ننگا کر دیا تھا۔ شست دیو دوسرے راجاؤں کی طرح سومیشور کا یاتری، شیو اور مہالکشمی کا پجاری تھا اسی لئے اس نے اپنے راج میں کا نورستا کر دیا تھا جو شیو کی پوجن کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بحری مہمات نے چاروں کھونٹ شہرت و نصرت کے بادبان کھول دیئے۔ اس کے بیٹے جے کیشی کے زمانے میں نئی راجدھانی گوپاک پٹن یا گوا پوری کی بندرگاہ

سے چوزہ دیسوں سے تجارتی رشتے استوار ہو گئے ۔

جے کیشی (اوّل سنہ ۱۰۵۰-۱۰۸۰ء)

کدمب راج کا اصل بانی یہی جے کیشی ہے، جنوب کے چولاؤں کے خلاف اپنے چکرورتی چالوکیہ راجہ سومیشور کو سہاتا دے کر اس نے نہ صرف چالوکیہ سنگھاسن کو سنبھالا تھا بلکہ اپنی مہامنڈلیشوری کی گدّی کو اور مضبوط کر لیا۔ اسی کے بل بوتے پر وکرم دتیہ (ششم سنہ ۱۰۷۶-۱۱۲۶ء) نے جو جے کیشی کا داماد تھا تلواروں کی باڑھ سے چالوکیہ سنگھاسن بچا لیا۔ مگر تلواروں کا سایہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ گو اس طرح کدمب راج کو پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا مگر پھر بھی جے کیشی کے بعد گہلّا دیو (سوم سنہ ۱۱۰۰-۱۱۰۰ء) کے دور میں لار دیس کی طرف سے ایک ایسی آندھی اٹھی جس میں سلاھار راجہ انت پال کی للکاریں گونج رہی تھیں۔ ارکیشری۔ اس کے دادا اور ممونی اس کے تایا کی شکست و خون کے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

جے کیشی (دوم سنہ ۱۱۰۴-۱۱۴۷ء)

پھر وجیہ دتیہ (اول) کا زمانہ آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا، اس کا بیٹا جے کیشی (دوم) تلواروں کے سائے میں گومنت کا مہامنڈلیشور بنا، جنوب کے ہوئسل گھات میں بیٹھے تھے۔ چالوکیہ سامراج کی بنیادیں ہلنے لگ گئی تھیں۔ جب دونوں کے درمیان چپقلش چل رہی تھی تو جے کیشی کو چال چلنے کا موقع مل گیا۔ اپنے کو کن چکرورتی ہونے کا ڈھنڈورا پٹوا دیا جس کی گونج لار دیس کی راجدھانی شری استھانک (تھانہ) سے لے کر تنگیری

اور گومنت کا سنائی دینے لگی۔

سلاھاروں پر پھر چوٹ پڑی، لاردیس کا راجہ ملیکارجن اپنے خطاب پر اس طرح
وہ سکر کا دعوا دیکھ کر بلبلا اٹھا کرہاڈ کا سلاھار گھرانہ جو پہلے اپنے ہی عزیزوں کا حریف
تھا اب حبیب بن چکا تھا۔ وجے یہ دتہ (۱۲۰۰-۱۲۱۱ء) جے کیشی کا رقیب بنا بیٹھا تھا۔
ملیکارجن کی ہتک نے سارے سلاھاروں کو تلواریں سونتنے پر مجبور کر دیا۔ جے کیشی کو
جو اس وقت ہویسلوں سے الجھا ہوا تھا۔ راجہ بیجی کا سپہ سالار دیستی اور شانتی
ہی میں دکھائی دیا۔ وجے یہ دتہ نے اپنے کرہاڈ کے سالار قبیلے کو اس طرح کوکن کی
سیاست میں دخیل بنا لیا۔ ملیکارجن کا راج رتنا گری کی سیما کو چھونے لگا۔

مگر اب سارے کوکن پر زوال آمادہ راجواڑیاں راج کر رہی تھیں۔
سوسنیور رچہارم (۱۱۸۹-۱۱۷۹ء) کے بعد ایک چالوکیہ گھرانے نے رتنا گیری میں گھر بنا لیا
اور دوسرے نے سنگمیشور کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ چولوں اور چالوکیوں میں تلواریں چل رہی
تھیں، کدمب راج بھی ہویسلوں کی تلواروں کی باڑھ پر تھا۔ کبھی ان کے چرنوں پر سر
جھکایا تو کبھی خود اپنے ہی تلواریں گھمانے کی قسمت آزمائی کی اور جب یادو راجہ
ڈنڈنایک نے پھر اپنے گومنت کو اپنا نشانہ بنایا تو کدمب راج کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔
چودھویں صدی کے اول نصف تک کدمب راج کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

نورِ اسلام کی کرن

بحری تجارت کی لہروں نے مسلم سوداگروں کو مغربی ساحل کے کناروں پر دور دور تک
پھیلا دیا تھا، عرب نوآبادکاروں کی بستیاں ظہورِ اسلام کے بعد جزائر سراندیپ اور مالدیپ

کے علاوہ معبر (کاروَمنڈل)، ملیبار، کوکن اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں ظہور میں آچکی تھیں۔ معبر میں ان کی مخلوط اولاد کولبّی، ملیبار میں موپلا اور کوکن، گجرات میں نائت یا نوائط کہتے تھے۔ طاقن (دکھن) کے راشٹر کوٹ اور لاردیس کے بلہرا (بلہارا) راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر تمام معاصر عرب مصنفین کرتے ہیں[1]۔ بلہرا راجہ چالیس سے پچاس برس تک راج کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے راجاؤں کی لمبی عمر ان کی وجہ عرب دوستی، عدل اور مذاہبی رواداری تھی۔ ان کے راج میں مسجدیں آباد تھیں۔ اور مسلم نوآبادیاں نئے شہروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ بدیسی تجارت کا بازار گرم تھا۔ اور شہری زندگی کے تصورات ـــ ہندوستانی مدنیت کو کوئی وسعتیں دے رہے تھے۔ عربوں اور عجمیوں کا یہ ایک بڑا سماجی کارنامہ اور بدیسی تجارت کا یہ اقتصادی کرشمہ تھا۔ کوکن کے دیار اور راجاؤں کے دربار عربوں کی سرپرستی کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ گومنت کے ایک سلاھار راجہ کا مصاحب نوسی نام کا ایک عرب تھا۔ اور لاردیس کے سلاھار راجہ اننت پال (اننت دیو) کا ایک منتری۔ السعود [الخ] عربی تھا۔

گوآ

چندرپور (جسے عرب صنداپور کہتے تھے) اور صنور میں عرب قبیلے عرصہ سے آباد تھے۔

---

[1] دیکھئے عرب ہند کے تعلقات: صفحہ ۲۷ ـ ۲۴۲، ۲۷۷، ۲۸۰

[2] گوآ کی قدیم عبادت گاہیں (انگریزی) صفحہ ۲۱

جے کیسٹی کے دور جہاں دیولی جان ایک عرب تاجر محمد نے بچائی تھی جب اس کا جہاز بندرگاہ کی یاترا پر جاتے وقت طوفانِ باد و باراں میں پھنس گیا تھا۔ اس خدمت کے سلسلہ میں جے کیشی نے اس کے بیٹے شادآمہ [ولیخ] کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ جس کے حسنِ انتظام نے گوآ پوری کی نئی راجدھانی کو جوانی بخش دی تھی۔ اور جس کی کہانی ناریل، سپاری اور تاڑ کے گہرے سبز سایوں میں ڈوبے ہوئے خیابانوں سے سفر کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ "گوآ پوری کی شاہراہیں دن رات، ہانپتے ہوئے کہاروں کے ہٹو! بچو! اور مرصع ساگوانی پالکیوں کی چرچراہٹ کی آوازیں سنتی رہتی تھیں، ان اُڑن کھٹولوں میں بڑے بڑے گیانی پنڈت دھیان میں ڈوبے بیٹھے رہتے تھے اور ان کے کانوں میں سونے کے کنڈل لرزتے رہتے تھے۔ اس خوبصورت بستی میں عیش و نشاط کی اتنی فراوانی تھی کہ لوگ اندرلوک کی کہانی بھول بیٹھے تھے[1]"

۱۵۰۹ء کے ایک پرانے نقشے سے قرونِ وسطیٰ کے گوآ پوری کا خاکہ تاریخ کے دھندلکے سے ہماری نظروں کے سامنے ابھرتا ہے کہ کس طرح کدمب قبیلے کی مذہبی رواداری نے مندروں کے گوپرم اور شیکاروں اور مسجدوں کے سفید و سبز میناروں کو ایک سطح پر بلند کر دیا تھا۔ شادآمہ نے گوآپوری میں "محی گدی" نام کی جو جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اس کے اخراجات کیلئے جے کیشی نے ۱۰۵۳ء میں کئی زمینوں کا لگان وقف کر دیا تھا[2]۔ مسلم سوداگر صنوبر سے تجارت کرتے گنیش دیوتا کی بستی بیلے میں اس طرح آہستہ آہستہ آباد ہو گئے تھے کہ یہی حصہ قدیم گوآ کا وہ تاریخی شہر بن گیا جسے گوآ دیلہا کہتے ہیں۔

---

۱ : گوا کی قدیم عبادت گاہیں (انگریزی) صفحہ ۲

۲ : ایضاً صفحہ ۲، صفحہ ۳

چودھویں صدی میں جب مراقش کا ابن بطوطہ ھنداپور آیا تو اس جزیرے کے وسط میں قدیم و جدید دو شہر آباد تھے، ایک ھندوؤں کے اتہاس کی جھلکیاں دکھا رہا تھا، اور دوسرا مسلمانوں کی تاریخ دہرا رہا تھا، یہاں بغداد کے طرز تعمیر کی تقلید میں ایک جامع مسجد تھی جسے ناخدا حسن نے بنوائی تھی۔ ھنداپور کے جزیرے میں چھتیس گاؤں تھے، ناخدا حسن کا بیٹا جمال الدین ھنوری اس وقت یہاں کا سلطان تھا اور ھنور اس کی ریاست کا صدر مقام تھا، یہ مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ یہاں عورتوں اور مردوں میں تعلیم کا بے حد چرچا تھا، ابن بطوطہ نے اس شہر میں ۲۳ لڑکوں کے اور ۱۳ لڑکیوں کے مدارس دیکھے تھے۔ فقیہ، امام، حافظ اور قاضی خاندانوں کی روحانی برکتوں سے ھنور کی فضا معمور تھی، یہاں کی مسلمان مستورات، ہندو عورتوں کی طرح ساریاں باندھتی تھیں، مسلمان فقہ شافعی کے مقلد تھے جس سے ابن بطوطہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سارے عرب یا ان کی اولاد سے تھے [1]

دھرم کرم!

چالوکیہ اور کدمب راج میں دھرم کرم کا بڑا چرچا تھا۔ دھرم اور سماج میں سمبندھ اور سمجھوتہ ہونے کے سبب راجہ ہی اپنی پرجا کا سب سے بڑا پالن ہار سمجھا جاتا تھا اور براہمن دیوتاؤں کا اوتار ہوتا تھا اور سماج میں یہی فرقہ سب سے زیادہ طاقتور اور توانگر

---

[1]: سفرنامۂ ابن بطوطہ (نفیس اکاڈمی کراچی سنہ ۱۹۶۰ء) صفحہ ۷۵ - ۶۹۹؛ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۸۹ — ۲۸۸

تھا۔ جین مت کو جب تک کدمب راج کی سرپرستی حاصل رہی اُسے سربلندی میسر رہی۔ مگر لنگایت فرقہ کے آگے اُبھر نہ سکا گو دکن کے اس حصہ میں جین منتوں اور بِکشوؤں کا اثر عرصہ تک قائم رہا اور راشٹرکوٹ راجہ ان کے مہا سامنت اور مہا سیناپتی بھی جین دھرم کے ماننے والوں میں سے تھے۔ جین پرچارکوں کے کیندر بیلگام اور سانت ودار ی میں ۱۲۰۴ء کے ایک سنگی کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ رٹوں (رٹ) دیپ جین دھرم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ واکھیل راجہ حدھانی کا راجہ ایک جین تھا۔[1]

وان پن کے کاموں میں راجہ اور پرجا دونوں کے ساتھی تھے۔ اور کیر راشٹرکوٹ اور کیا چالوکیہ۔ ہر گھرانہ اپنے سنگھاسن کے بچاؤ اور راج پاٹ کی حفاظت کے لئے دھرم کی بنیادیں مضبوط کرتا رہتا اور دان پن کی بھلائیوں کے منہ کھولے رکھتا تھا۔ چالوکیہ راج کا ایک مہا سامنت یادو بھلّم (زمانہ ۱۰۰۰ء) کے سنگمیشر کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ارجن کونڈھک کا گاؤں اکیس براہمنوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور ان کی سیوا کے لئے داس اور داسیاں دان میں دیئے تھے۔[2] بھلّم کے آقا تیلپ (دوم ۹۹۷-۹۷۳ء) کا بیٹا وکرم وشنو، ورمن وزن اور جاتی کی اونچ نیچ کو ہموار دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا، وہ ایک نئے سماج کا سپنا دیکھ رہا تھا۔

کدمب راج کے راستہ پر بودھ مت کے اُپدیش کا رتھ تھک کر ٹھہر چکا تھا پھر بھی جے کیشی کے دربار سے دو بودھ بھکشوؤں کی سرپرستی ہوتی رہی۔ کدمب مہا منڈلیشور

۱۔ بمبئی گزیٹیر (کرافورڈ) صفہ ۱۰ صفہ ۳۲۷

۲۔ مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتنا گیری) صفہ ۱۳۵-۱۲۵

اُن کے راجکمار، منتری اور ان کی رانیاں دھرم کے پرچار اور پرجا کی اُپکار کے لئے بڑے بڑے پُنیہ کرم کرتے تھے۔ جے کیشی (دوم) کے منتری لکشمن کی ویرتا کی للکار سہیا کی سربلند چوٹیوں سے ٹکرا کر سمندر کے کناروں تک گونجتی رہتی تھی اور کوکن کی بھومی کے کائر دشمنوں کے دل سوکھے پتّے کی طرح لرزتے رہتے تھے۔ لکشمن کا بیٹا سوم ساہیبا تھا، راج نیتی کے سارے گُر جانتا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی منمودھا پنڈت اور ودوان تھا۔ "صرف دھرم شاستر ہی نہیں منطق کے چھے اصولوں میں سندر اور راج نیتی میں چانکیہ کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔

کدمب راج میں گیانی پنڈتوں اور رشیوں نے آشرموں کو پوتر استھانوں اور دیوتا کیندروں سے جُڑوا یا گیا تھا۔ ان کے لئے آبادیوں کی بھاری سے دیو اگرہار اور برہماپوری بسائی جاتی تھی۔ جہاں پر پنڈتوں اور راہبوں کی سرپرستی دیتے تھے۔ شٹ دیو کی رانی کملا دیوی اپنے دور کی سرسوتی دیوی تھی۔ تقسیم نے اس کی سرپرستی میں پوجا کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے بیلگام میں ونیگا موڑے کی برہماپوری بسائی تھی، یہیں اس نے مہالکشمی کا مندر بنوایا تھا۔ اور اسی کے حکم سے دیویوں کی کئی خوبصورت مورتیاں تراشی گئی تھیں۔ اسی طرح گوا پوری میں پنجی کھلی کے مقام پر سرسوتی مندر میں علم کی دیوداکی پرستش ہوتی تھی اور برہماپوری میں اس سے برہما جیسی شکتی مانگی جاتی تھی۔ راجکمار گُہلا دیو (دوم) نے شٹ دیو کے گُرو نارائن بھٹ کو کٹیر دیرے کے گھنے جنگل میں سوائے دیرے کا گاؤں دھرمارتھ وقف کر دیا تھا، گومنت میں وید

۲؎ : مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتناگیری) صفحہ ۱۲۲-۱۲۱

اور پُرانوں کی پوجا کو فروغ و رواج[1] حاصل تھا، دونوں وقت کی خاموش عبادت "سندھیا" سے من میں برہما اور شکتی کی یادوں سے سنّاٹا گونجا رہتا تھا اور "پنچ یگیہ" کی پانچوں پوجن میں پرکھوں، براہمنوں دیوتاؤں اور پُرشوں کے ناموں سے دھیان کے مندروں کو آباد کیا جاتا تھا، گرو اپنے چیلوں کو شالاؤں میں یوگ، ویدانت اور فلسفہ کے وہ چھ راستے "درشن"، دکھلاتے تھے جو نروان کی طرف جاتے تھے، اور چھ ویدانگوں کے رموز و نکات سمجھاتے تھے۔ جن میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے:

(۱) کلپ (رسُوم قربانی) (۲) شکشا (علم الصوت، تلفظ کی صحیح ادائیگی) (۳) چھند (عروض) (۴) نرکت (اشتقاق) (۵) دیاکرن (صرف و نحو) اور (۶) جیوتش (علم النجوم)۔

تاڑوں کے جھنڈوں میں براہمنوں کے شلوکوں کی آوازیں بہار کے بھونروں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونجا کرتی تھیں۔ اور برہما پوری اور اگرہاروں کے کنجوں میں کانوں میں سونے کے کنڈل پہنے اور ہاتھ میں بید سنکھ کا قلم تھامے پنڈت۔ سمرتی (قانونِ عُرفی) کی تفسیریں لکھنے میں مشغول رہا کرتے تھے، وِژنیانیشور نے یجناولکیہ کی مشہور دھرم شاستر کی تفسیر "متاکشرا" کے نام سے وِکرم دتیہ چالوکیہ (۱۰۷۶ء-۱۱۲۷ء) کے عہد میں لکھی۔ لار دیس کے سلاھار راجہ اپرادتیہ نے اسی سمرتی کی نبندھ (تلخیص) کی تھی۔ متاکشرا آج بھی ہندو قوانین کی مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ نبندھ کشمیر میں رائج ہے[2]۔

---

[1]: گوآ کی قدیم عبادت گاہیں (انگریزی) صفحہ ۴-۵

[2]: گوآ کی قدیم عبادت گاہیں صفحہ ۴۰۶؛ بھاشم (انگریزی) صفحہ ۱۶۲ صفحہ ۳۲۳ سے ۱۱۳-۱۱۲ اور صفحہ ۱۵۸-۱۵۶

دیوگیری کے دیوراجہ :

کدمب راج کا پودا ـــ دیوگیری کے یادو راج کے ابھرتے سورج کے تلے سوکھ گیا چالوکیہ راجہ رن رنگ بھیما (تیلپ دوم) کے مہاسامنت یادو بھلّانے گوماوہ کے منج راجہ سے کوکن کو بچائے رکھا مگر منج راجہ کے جانشین بھوج دیو نے ۱۰۲۰ء کے لگ بھگ اپنی سیما وہاں تک بڑھا دی ـــ گویہ ریت کی سرحد تھی۔

چالوکیہ راج سانجھ کے اندھکار میں ڈوب رہا تھا۔ کدمبوں کے قدم اکھڑ چلے تھے، یادو راجہ بھلّم (۹۳-۱۱۴۲ء) نے شری وردھن (جنجیرہ) کو اپنا دھن بنا کر دیتی دیپ تک یہ اقتدار جمائے رکھا اور رکھارے پاٹن کی سرحد سے اس کی راج سیما ٹکرانے لگی۔ جھیولی میں یادو خاندان کا ایک راجکمار راج کر رہا تھا (بعد میں ملک کافور نے یہاں کے راجہ کو مطیع کر لیا)، کوہلاپور میں سلاھار راجہ بھوج گنگو تیلی کے ساتھ مل کر اپنے نام کا چراغ جلا رہا تھا۔ وجیارک دیو (وجیہ دتیہ ۱۱۴۰-۷۵ء) کا یہ سپوت ساہیٹا کوکن سے لے کر کاروار تک اتنے ڈھیر سے قلعوں کا مالک بن گیا تھا کہ اسے قلعوں کا راجہ کہتے تھے۔ کوہلاپور کے سلاہار سلسلہ میں سولہ راجاؤں کی کڑیاں گیارہ کتبوں کے توسط سے ملتی ہیں (۹۴۰ء تا ۱۲۱۵ء)

کلیان میں اس وقت وجول راج کا اجالا پھیلا ہوا تھا جو چالوکیہ راج کے ڈھلتے سائے سے ابھرا تھا۔ کامدیو اسی راج کا مہامنڈلیشور تھا جس کا تعلق کلیان پورور ادھیشور کے حکمران قبیلے سے تھا۔ بھلّم دیو نے اس علاقہ کو بھی ہڑپ کر لیا اور اس طرح

ـــ : بھنڈارکر "دکن کی اولین تاریخ" (انگریزی) (۱۸۸۴ء) صفحہ ۲۵۹ : گزیٹیر ضلع قلابہ صفحہ ۲۷

۲ : ایضاً صفحہ ۲۹

آہستہ آہستہ شلاہاروں کے ہاتھوں سے سارا کوکن نکل کر دیوگیر کے دیوراج کا حصہ بن گیا۔ اور یادو یادو راج (سنہ ۱۲۱۰ء) کے وقت تک دیوراج سارے جنوبی ہند تک پھیل گیا۔ تیرہویں صدی کے موڑ پر کرناٹک اور جنوبی کوکن کے براہمنوں اور پنڈت پردھانوں نے اس مجموعی پر اپنے قدم جمالیے تھے۔ سورن ورگ میں لکھی گئی سنسکرت کی لغت امرکوش سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۲۹۷ء میں یہ حصہ ایک براہمن کرشنا کی راج منشی سے گونج رہا تھا۔ رامیشور مندر کے قریب ایک کنڑی کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چیبولی پر مسلم اقتدار سحاب گزراں ثابت ہوا تھا کیونکہ اس پر بہت جلد (سنہ ۱۳۲۶ء) وجیانگرم کا سایہ پھیل گیا۔ یادوراجہ رامچندر دیو کے راج میں سانسکرتی نئی کروٹ لے رہی تھی۔ اور پراکرت کی شاخ مہاراشٹری اپنا چولا بدل کر مراٹھی کا روپ دھارن کرنے لگی تھی۔ اسی زبان میں دنیانیشور نے سنہ ۱۲۹۰ء میں بھگوت گیتا کی تفسیر ... شلوکوں میں لکھی جس کا عنوان "بھاوارتھ دیپکا" یا "دنیانیشوری" ہے۔ اسی کا ... نے پنڈھرپور کے وٹھل کی پرستش کا پہلا دیپک جلایا۔ رامچندر کا منتری سارا مشیر ہیماڈری خود ایک بہت بڑا پنڈت تھا۔ جس کی مشہور تصنیف "چترورگ چنتامنی" میں مذہبی رسوم و روایات اور زندگی کے مختلف سماجی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ ہیماڈری۔ مندروں کی تعمیر کا متوالا تھا۔ گوآ کا "تیڈی سُرلا" مندر اسی کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دنیانیشور۔ دیوگیری کے رامچندر راجہ کے اطاعت گذاروں میں کدمب مہامنڈلیشوروں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی وجہ اس قبیلہ کی وید علوم سے دلچسپی اور پرانوں کی روایات کی تجدید تھی۔ یادوراج میں علاؤالدین خلجی کے حملہ کے وقت تک کدمب معمولی مہامنڈلیشور بن کر زندگی کاٹ رہے تھے۔

عا: گوا کی قدیم عبادت گاہیں۔ (انگریزی)، صفحہ ۶-۵

تیسرا باب

کوکن ۔ سلاھار راج میں

کھنبایت سے لے کر چیول تک سمندر اور سہیادری کی گود میں مچلتے ہوئے پہار کے دلفریب ٹکڑے کو نویں صدی میں لاڑ دیس کہتے تھے، یہاں اب (سنہ ۸۰۰ء تا سنہ ۱۲۶۰ء) ودیادھر (نیم دیوتا) جیموت واہن کی روحانی اولاد سلاھاروں کا راج تھا، یہ رکشاپیتھ (دکن) کی پراچین بستی تگر کو اپنا نگر بتلاتے تھے، وقت اور سیاست کے رُخ کے ساتھ ان کی اطاعت کی چوکھٹ بدلتی رہی، پہلے راشٹر کوٹ راج کے مہامنڈلیشور بنے جس کے راجہ گووند (سوم) نے جب سلاھار راجکمار کپرڈن (اول سنہ ۸۰۰ تا ۸۲۵ء) کی مدد سے کوکن پر قبضہ کیا تو اس کو سیوا کے صلے میں اس علاقہ کی مہامنڈلیشوری سونپ دی جس کے بعد امو گھ ورش راجہ نے اس کے بیٹے پلا شکتی (سنہ ۸۲۵ تا ۸۵۰ء) اور پوتے کپرڈن (دوم سنہ ۸۵۰ تا ۸۸۰ء) کے

حق میں برقرار رکھا اس طرح سلاھار راج کا سلسلہ شروع ہوا۔

جب چالوکیوں نے دوبارہ دکشا پتھ اور کوکن راشٹرکوٹوں سے چھین لیا تو اپراجیت مہامندلیشور نے نئے سامراجیہ کا جوا گلے میں ڈالنے کی بجائے سر پہ کوکن چکرورتی کا تاج پہن لیا، چالوکیوں نے باز پرس تو نہ کی مگر گومنت میں ان کے نئے مہامندلیشور کدمبوں کو سلاھار راجہ کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی وہ ناک لگا کر بیٹھ گئے، ریوتی دیپ میں سلاھاروں کا دوسرا گھرانا شرنا رکھی بن چکا تھا مگر ابھی رتن راجہ (۱۰۰۸ء) کا کوکن چکرورتی بننے کا سپنا ٹوٹا نہ تھا، مگر ریوتی دیپ اور لاردیس کا سمبندھ خانہ جنگیوں سے ٹوٹ گیا شری استھانک (تھانہ) کا راجہ اریکیشری اور رتن راجہ ایک خون کے ہوتے ہوئے جب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے تو کدمب مہامندلیشور شست دیو (دوم) کی بن آئی، رتن راجہ کی ارتھی اٹھ گئی اور لاردیس کا راجہ اریکیشری اس کی چوکھٹ پر سیس نوانے پر مجبور ہو گیا[1]، اب تھانہ کے سلاھار گومنت کے مہامندلیشور تھے جن کی راجدھانی میں صرف چودہ سو دیہات تھے شستشٹی کے ساٹھ گاؤں اور کنارے کی پراچین بندرگاہیں بھی ان مہا سامنتوں کی ساری جاگیریں اور جائیدادیں تھیں۔

گیارہویں صدی کا خون آشام سورج ڈھل رہا تھا۔ مدتیں گذر جانے کے بعد بھی سلاھاروں کے سینوں میں انتقام کی آگ ماند نہ پڑی تھی، سیاست کی ہوا چلی تو چنگاریاں سلگ اٹھیں، اننت پال (اننت دیو ۱۰۸۱ء) نے کدمبوں کی غلامی کا جوا

---

[1] FLEET, Kanarese Dynasties, pp 444—46

جلا ڈالا اور اتنی سربلندی حاصل کی کہ خود گہلا دلیو (سوم ۱۰۸۰ - ۱۱۰۰ء) کو اس کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنا پڑا۔ لار دیس کی سرحد چمپولی سے آگے کھارے پاٹن اور جیلوآن تک بڑھ گئی۔

ایک سنگی کتبے سے انت پال کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ کس طرح اس نے "سنکٹ کے سمے جب خود اس کا ایک دوسرا [کرہاڈیا کو لہاپور کا سلاہار] گھرانا دشمن ہو رہا تھا۔ اپنی تلوار کی دھار کے سمندری دھارے میں پالیوں کی پوٹلیوں کو بہا دیا تھا جس نے سارے کوکن میں گندگی پھیلا رکھی تھی اور براہمنوں کی ناک میں دم کر رکھا تھا، ایسے سمے دیوتاؤں کا بھی کوئی پرسانِ حال نہ تھا"[1] یہ اشارہ دراصل خود اس کے کولہاپور کے سلاہار گھرانے کی طرف تھا۔ پنہالگڑھ (پنہالہ) جن کا گڑھ تھا اور جس نے ۱۱۱۰ء تک لار دیس کو اپنی تلواروں کی باڑھ پر رکھ چھوڑا تھا۔

مگر جب تلوار کی دھار کند اور اس کی چمک ماند پڑنے لگی تو پالیوں نے پھر سر اٹھا لیا کیونکہ سر جھک چکے تھے مگر ان کے قدم جمے ہوئے تھے۔ ۱۱۲۶ء میں ایک لمبی لڑائی کے بعد زن بھومی سلاہار راجہ اپرارک (اپرادِتیہ ۱۱۱۰ - ۱۱۴۰ء) کے ہاتھ رہا اور کدمب راجہ ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ سنجان (سنجان) سے لے کر ساوتری تک سلاہاروں کا راج پھیل گیا۔[2]

لیکن لار دیس کے آتر میں چالوکیوں کا آسیبی سایہ لاٹ دیس کی سیما سے پرے اسی اور بڑھ رہا تھا۔ یہاں اہنسا کا پجاری اور گوڑ کھشک راجہ کمار پال

---

[1] Indian Antiquies, IX, 41

[2] فلیٹ۔ ایضاً (انگریزی) ۵۴۴ - ۵۶۸ء

(۱۱۷۴-۱۱۴۳ء) راج کرتا تھا اور دُور دُور تک اس کا "اَمَری گھوشن" چلتا تھا۔ عرب جغرافیہ نویس ادریسی (۱۱۳۵ء) کے بیان کے مطابق نہر والہ (انہلواڑہ) کی ریاست میں دولت کی نہریں بہہ رہی تھیں[1]۔ اور ایک دن کمار پال اپنے راج بھون کے اونچے جھروکے میں بیٹھا پرجا کو درشن دے رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک بھاٹ کی آواز آئی جو سمندر سے گھرے ہوئے شاکمبری (ساپادلکش) کے سلاھار راجہ ملیکا رجن کے گن گا رہا تھا' جو "راج پتامہا" کہلاتا تھا کیونکہ اس نے اپنی تلوار کے بل پر تمام راجاؤں کو اپنے پوتروں کی طرح فرمانبردار بنا لیا تھا۔ اسی لئے اس کا نام 'راجاؤں کا دادا' بن کر چمک رہا تھا۔

بھاٹ کی آواز تیر بن کر اس کے سینے میں اتر گئی اور اس نے اپنی تلوار سونت لی تاکہ گھمنڈ کا سر کاٹ لے اور کھوکھلے دعوے کی زبان کھینچ لے۔ کمار پال کے سیناپتی انبڈ نے نوساری[2] کے پاس کاویری پار کر کے ملی کارجن کو شکست دے کر اس کا دعویٰ کھوکھلا ثابت کر دیا ــ اور ایک دوسرے حملہ میں بلساڑ کے پاس راج پتامہا کا ابھمان خاک میں ملا دیا۔ چند کھوکھلے لفظوں کا وہ خطاب جو ملی کارجن اور ہزاروں لوگوں کا خون بہانے کا بہانہ بن گیا۔ انبڈ کا صلہ بن گیا اور پھر گجرات کے 'راج پتامہا' نے اپنے راج راجیشوری کمار پال کو یدھ (جنگ) میں لوٹی ہوئی دھن دولت ارپن کی جس میں پارسیکاؤں کے دیس کے ٹکسالی سکّے، قیمتی دھاتوں کے بنے ہوئے پارسیی برتن، دو ارا سمندر کے جنوں کے ہاتھی اور تسر پارک اور چیمولی کی کھاڑیوں کے موتی تھے ــ

---

[1]: ادریسی بحوالہٗ ایلیٹ۔ ج ۱ صفحہ ۸۷، صفحہ ۹۳
[2]: کاویری کے کنارے آج بھی ملیکا رجن نام کا گاؤں آباد ہے۔

لاردویس چالوکیہ سامراجیہ کے اٹھارا راشٹروں کا حصہ بن گیا۔ اور دیّا دھر حبّو اُھن کی اولاد چالوکیہ راجہ کے چھتیس ماتحت قبیلوں میں شمار[1] کی جانے لگی۔

جب سلاھاروں کی عزت اور لاردویس کی دولت لٹ گئی تو کولہاپور کے سلاھار گھرانے کو غیرت آئی۔ وجیا یک دیو (۱۱۵۱-۶۰ء) نے چالوکیوں سے راج سنگھاسن چھین کر اپنے عزیزوں کو لوٹا دیا ——— اور پھر ایک صدی کا سیاسی سناٹا چھا گیا[2] مگر جو خوشحال زندگی سے بھرپور صداؤں سے معمور تھا جس میں دیّزوان راجہ ایرادیتیہ (دوم ۱۱۸۰ء) کے لیکھنی (قلم) کی سرسراہٹ تاڑ کے پنکھیا پتوں پر سنائی دیتی تھی۔ جو متاکشرا کی بندھ (تلخیص) "ایرک" کے نام سے کر رہا تھا اور راج پتھ پر راجکماروں اور منتریوں کے رتھوں کے دوڑنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ تجارتی منڈیوں میں عرب تاجروں کے "کَمْھَنْدا" اور ایرانی سوداگروں کے "خُیداست" کی سودے بازی کی صدائیں آتی تھیں مگر ایک دن مندروں کی گھنٹوں اور مسجدوں کی.. اذانوں کی ملی جلی آوازوں میں دیوگری کے مہادیو یادو کے ہاتھیوں کی چنگھاڑیں اور سینا کی للکاریں سنائی دینے لگیں۔ سلاھار راجہ سومایا سومیشور نے پانی میں کود کر پناہ لی، مگر موت طوفانی لہروں کی زنجیر لئے کھڑی تھی۔ اور ھیمادری منتری نے اپنے "راجہ پرشستی" میں اس کی موت کا تمسخر اڑایا اور اس طرح ۱۲۶۰ء میں سلاھار سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا۔[3]

١: انڈین اینٹی کیئری۔ ج ۹، ص ۳۵، ۴۸، جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی (برطانیہ)۔ ج ۱۲۔ ص ۱۶۰

٢: فلیٹ۔ (انگریزی)۔ ایضاً۔ ص ۵۴۴

٣: بمبئی کا عروج۔ (انگریزی) ص ۱۶

اور لیودی کے دن پورے ہو گئے۔ کوکن کی بساطِ سیاست پر کبھی دلوگری کے منتری ہار اور پنڈت پردھان فرزیں بن گئے۔ اور کبھی چیکان، جنجیر۔ اور ساونت واڑی میں کُڈال کے پالگار مرہٹہ چالیں چلنے لگے۔ تلابہ میں رانے گڑھ کا رائے، پہاگڑھ کا راجہ اور دوسرے نایک سیاسی شطرنج کے اہم مہرے بن گئے تھے۔ بمبئی کے چند جزیروں میں بنگولی اور کھنڈاری ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔

دیالو داتا:

سلاھار عہد کے پائے گئے تانبے اور سِلوں کے "دان پتروں" اور "پالیا" (یادگاری پتھروں) سے پتہ چلتا ہے کہ دیا دھرم کے مارگ پر ایسے سینکڑوں سنگ میل اور ہوں گے جو ابھی تک کوکن بُھومی کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں۔ جن سے سلاھاروں کے دان پُن اور دھارمک کاموں کی دِشا (سمت) معلوم ہوتی ہے۔ یہ چودہ سو دیہاتوں کے ادھی پتی اور مہاسامنت ہی نہ تھے بلکہ اُس یُگ کے سامیہ واد (اشتراکی) بھی تھے۔ جنہوں نے سیکڑوں گاؤں اور گرام دھرم، اور ودّیا کے پرچار کے لئے براہمنوں کو اگرہار کی صورت اور برہماپوری بسانے کے لئے دھرمارتھ کر دیئے تھے۔ اپرادتیہ (دوم) کے راجکمار کیشی دیو نے ۱۲۳۸ء میں سوریا زمانے کے دھرم استھان لونتنا (لوناڑ) میں ایک ایسی ہی برہماپوری کو کی سوم کے لئے بسائی تھی تاکہ بھیونڈی اور کلیانا کی تجارتی گہما گہمی سے دور آموں کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں وہ مہادیو کی مہما (حمد) میں "کاویہ" لکھتا رہے۔ اسی راجہ نے لوناڑ سے قریب باپگرام (بابگاؤں) میں مخبس پلّی کے اپجاؤ کھیتوں کو سومیشور کے پجاریوں کو دان دے دیا تھا۔ اپراجیت نے اس سے پہلے لونتنے کے

کے لونادتیہ کی پوجا پاٹ کے لئے شری استھانک سے قریب بھاوانے گاؤں دکشنا پن کر دیا تھا۔ سلاھار راجہ اپنے پردہتوں کے سب سے بڑے پالن ہار تھے۔ شری استھانک کے کئی براہمن پریوار اگرہار دل پر پل رہے تھے۔ اپراجیت کے راجکمار بیٹے اریکیشری نے کئی گرام اپنے پروہت کے کٹنبے کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ شلٹنشی کا ایک ایسا ہی براہمن آمدیو تھا جسے اپراجیت کے پوتے چھتراج دیو اول نے بھانڈپ سے قریب نودر (نورہ) گاؤں کا کھیت بھوودان میں دیا تھا۔ شلٹنشی کے وشیہ (ضلع) میں دہار کی سندرسرودر (جھیل) کے کنارے اور کھارے پاٹن (رتناگری) میں ایسے کئی اگرہار سلاھار راج کی بہار بنے ہوئے تھے۔ ہری پال دیو (۱۱۴۹ء تا ۱۱۵۳ء) کے راجکمار آھوملّا نے جو شرپارک میں وتارک (وتار) گاؤں کا زمیندار تھا اپنے پروہت پرہمادیو بھٹ کو شری تیوڑے کا لگان دائمی طور پر بخش دیا تھا۔ آخری راجہ سومیشور نے شری استھانک کے اُتر میشور مہادیو کو دھرم کرم کے پرچار کے لئے چاڑ پیچے (جانچے۔اورن) میں کوتھالیتھن کی باڑی بھوودان میں دے دی تھی خود اپرادتیہ نے اپنی راج ماتا لیلا دیوی کو اسی گاؤں میں ایک ایسی ہی باڑی اور ناگم (ناگاؤں) کے کھیت انعام میں دیئے تھے سلاھار راجہ اپنے دیوتاؤں کو بھوگ بھی دیتے تھے اور بھینٹ بھی چڑھاتے تھے۔ اپرادتیہ (دوم) نے شلٹنشی میں ماھولی گرام کی سرکاری آمدنی (آبادہتی (ریوڈنڈا) کے سری وجناتھ کی پوجن کے لئے منتقل کر دی تھی اور شپی دیو لکشمی نارائن کی تنے ویڈیہ "میں دیاسکوں کی تھیلیاں ارپن کیا کرتا تھا۔ سومیشور نے اپنے باپوں کی پرائشچت کے لئے بڑلوا سے (اورن) کی زمینیں کنگالوں میں بانٹ دی تھیں۔ دان پن کے اس سدبھاؤ اور بھلائی کے جذبے میں راجکمار منتری اور راجہ پروہت بھی دیالو داتا بن بیٹھے تھے۔ جلیکار جن کے وقف نامے پرکم

نے اپنے شیلار وانیک (بھیونڈی) اگرہار سے کئی کھیت مندروں کی مرمت کے لئے دان کیے تھے۔ ایرادتیہ (دوم) کے مہامنتری لکشمی نایک نے سومناتھ دیوتا کی اپاسنا (عبادت) کے لئے اپاسکوں کو اپنا سارا دھن دان کر دیا تھا۔ اننت دیو کے کھارے پاٹن دان پتر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پربھاسا کے سومناتھ کے سب سے بڑے پجاری تھے۔

من اور مندر:

انسان جب بھی اس بھری کائنات اور روشال لوک میں اپنے آپ کو تنہا اور کمزور محسوس کرتا ہے تو وہ کسی ٹھوس اور جاندار سماجی فلسفہ کا سہارا لیتا ہے۔ یا پھر مذہب کی اونچی فصیل کی حفاظت اور دھرم کی شرن میں چلا جاتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن کی بے پناہ قوتوں اور ہاتھوں کی سخت محنتوں سے اپنے سے زیادہ طاقتور ہستیاں تخلیق کی ہیں۔ انہیں میں امرلوک کے لوک پال ہیں۔ اور دیومالاؤں کے دیوتا، یکشی اور اوتار شامل ہیں۔ اس نے اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کے حل کے لئے پتھروں اور چٹانوں کی ٹھوس اور جامد شئے

۱: تفصیل اور حوالوں کیلئے دیکھئے تھانہ گزیٹیر ج ۱۳ حصہ ۲ صفحہ ۲۷-۴۲۴ (فٹ نوٹ)

کا سہارا لیا اس لئے جب وہ سنکوٹ اور دُکھ کے راکھشسوں کے سامنے اپنے آپ کو نربل اور کمزور پاتا ہے تو دیوتاؤں کو پکارتا ہے۔ مندر کے اُونچے گوپرم کو دیکھ کر اُسے دیوتاؤں کے اُونچے استھان کا احساس ہوتا ہے۔ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ اُن کی بلندیوں کی اُور بڑھتا ہے۔ اَردھ منڈپ ۔ یا منڈپ کی وِکاس اور وُسعت اس کے دِل میں کشادگی پیدا کرتی ہے۔ اُدا س من مندر کے کواڑ کھل جاتے ہیں اور وہ اَنتراِل پہونچ کر اپنا شیش جھکا دیتا ہے۔ اور اس طرح اپنے معبود کو شر دھانجلی اَرپن کرتا ہے اور پھر گربھ گرہ ۔ مورتی استھان کی نیم تاریک اور گمبھیر فضا میں پہنچ کر اُسے اپنی آتما میں اُجیارا پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ چندن کی مہکار، تازہ پھولوں کی سوگندھ اور سنگیت کی جھنکار میں ڈوب کر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ازلی دُکھ کو بھول جاتا ہے اور اُسے اپنے دیوتاؤں کی شکتی کا وشواس ہو جاتا ہے۔

——— اور پراچین بھارت میں سب سے بڑا دیوتا شیو مانا جاتا تھا جس کی شکتی سارے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے کئی نام اور کئی روپ تھے۔ جن کی پوجا ہوتی تھی۔ عرب مؤرخوں نے نوسو فرقوں اور بیتالیس مذہبوں کی دو بڑی تقسیم سمنی (بودھ) اور براہمنی اصولوں کا ذکر کیا ہے[1]۔ کتاب الفہرست میں ابن ندیم نے اور البیرونی نے کتاب الہند کے گیارہویں باب میں بُت پرستی کے بارے میں لکھا ہے۔ مہا کالی، مہادیو اور لنگ پوجا کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ عرب سیاحوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی ساحل پر لمبی جٹاؤں والے اگھارے بھکشو گلے میں انسانی کھوپڑی کی مالا لٹکائے بنوں اور بستیوں میں

---

[1] : عرب و ہند کے تعلقات ۔ صفحہ ۲۰۷

نوگش کی کھوج میں بھٹکتے رہتے تھے۔ بزرگ بن شہریار ناخدا نے بھی سراندیپ سے گذرتے ہوئے ننگ دھڑنگ سیاحوں اور سادھوؤں کے گلے میں رنڈ مالا ڈالے اور بدن پر بھبوت ملے دیکھا تھا۔ یہ مہادیو کو پوجتے تھے۔ ایک ایسے وَن پرستھ یوگی کو سلیمان تاجر نے دیکھا تھا جو سولہ برس بعد بھی۔ جب اُس کا اُدھر سے دوبارہ گذر ہوا اسی طرح دھوپ میں سمادھی لگائے بیٹھا تھا۔ ہندوستان کے بتکدوں کی طلسمی کہانیاں جہاں صرف راشٹرکوٹ کے مالکھیٹ (عربوں کے بلہرا اور مانکیر) میں قیمتی پتھروں اور جواہرات کے بیس ہزار بُت تھے۔ فارسی شاعری میں بھی تشبیہوں اور استعاروں کے بُت تراش رہی تھیں۔

غزنوی دَور کے ایک شاعر منوچہری نے اپنے ایک شعر میں لِنگ پوجا کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔ ؎ الا تا مومناں دارند روزہ

الا تا ہندواں گیرند لنگہن

حکیم سنائی نے بھی "لنگھن" سے یہ مطلب نکالا ہے ؎

لنگہنت گر ترا کند فربہ ؏ سر خوردن ترا ز لنگھن بہ

فرخی شاعر کے مندرجہ ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حوضوں کے کنارے ہزاروں بُت نئے نئے ڈھنگ سے سجائے جاتے تھے ؎

فراخ پہنا حوضی بہ صد ہزار عمل ؏ ہزار بتکدہ خُرد گِرد حوض اندر

سلاھار عہد میں تعمیر کئے گئے مندروں کے کھنڈر جو لوناڑ، انگاؤں، پارولی اور

۱؎ عرب و ہند کے تعلقات۔ صفحہ ۲۲۷-۲۲۵

بیلآر میں پائے جاتے ہیں۔ فرختی کے بیان اور اس دور کے طرز تعمیر کی گواہی دیتے ہیں۔
والکیشور (بمبئی) اور امبرناتھ (کلیان) کے مندروں کے تراشیدہ پتھر، ستونوں کے نقوش
اور مورتیوں سے بھرے ہوئے کیرتی مکھ کے گھونگھٹ' اکسرا در شاہ پور کے یادگاری
پتھروں (پالیا) کی مورت کاری چالوکیہ اور ہوئیسلا طرز تعمیر کے نمونے ہیں۔ ان سے یہ بھی
اندازہ ہوتا ہے کہ شیلا کاروں کی کلائیں ابھی تک پرانی تسکتی باقی تھی مگر ان کے دھیان
کی سیما' شیو کے پرتما (مجسمہ) کی مورت سازی سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ سلاھار مندروں
کے بڑے معمار تھے۔ جھنجھ راجہ نے شمبھو کے بارہ مندر بنوائے تھے۔ چھتراج دیو بھی مندروں
کی تعمیر میں دلچسپی لیتا تھا۔ کیشی دیو کے عہد میں بھیونڈی کی پرہماپوری کی پربھا (زینت)
شیو مندروں[1] سے تھی، چیمولی کے مندر میں فیروزہ کی مورتیاں[2] تھیں۔ کاروُلی (بھیونڈی)
میں دگمبر جین کا مندر اور خود سلاھاروں کی تعمیر کی ہوئی چیتیائیں ان کی مذہبی رواداری کی
روئداد کہتی نظر آتی ہیں[3]۔ سام وید کے بھجنوں اور رامائن کے کیرتنوں کے ساتھ ساتھ
چیمولی میں عیسائیوں کے گرجا گھروں سے کلیسائی نغمے بھی بلند ہوتے تھے۔ سنجان اور
چیمو کی جامع مسجدوں سے بانگ[4] کی آوازیں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں سے زبیّوں
کی صلوات کی صدائیں سنائی دیتی تھیں' جین مت اور بدھ دھرم کے بھکشوؤں کی ٹولیاں

۱: ٹھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳ حصہ ۲ صفحہ ۴۲۷ (فٹ نوٹ)

۲: دے کنہا۔ صفحہ ۹ (ذکریا قزوینی کا بیان)

۳: نیرنے 'کونکن' (انگریزی) صفحہ ۱۰

۴: دے کنہا۔ صفحہ ۹ (ذکریا قزوینی کا بیان)

ابھی تک موکش (نجات) کی تلاش میں کوکن کے پراسرار جنگلوں میں گھومتی نظر آتی تھیں۔

سماج اور سبھیتا

ارتھ شاستر میں لکھا ہے "رتھ ایک پہیہ سے نہیں چلتا" چکرورتن راجہ کے بعد راج رتھ کا سب سے بڑا رتھ بان مہامنتری یا منتری سار (مشیر) ہوتا تھا۔ منتری پریشد میں کمار، آماتیہ، کہلانے والے سَروادھیکاری اور مہاماتر ہوتے تھے۔ ایک یدھ اور شانتی کا منتری ہوتا تھا جسے "ساندھی وگرہکا" کہتے تھے۔ خزانچی "سنی دھاتر" کہلاتا تھا اور رسوئی کا منتری "سماہرتر" ہوتا تھا۔ راج پروہت یگیہ اور یگیہ کی دھارمک ریتوں کو رواج دیتا تھا۔ عرب مورخین مسلمان نوآبادکاروں کے معاملات فیصل کرنے والے ایک منصف کا ذکر

کرتے ہیں جسے راجہ انہیں میں سے مقرر کرتا تھا۔ اِسے "مہزمن" یا "مہترمند" کہتے تھے۔ یہ ایک موروثی اور اعزازی عہدہ تھا[1]۔ سلیمان تاجر ہند (مصنف[2]) کا بھی ذکر کرتا ہے۔ پراچین بھارت میں اُسے "پراڈوِواک" کہتے تھے۔ لار دیس میں کئی راشٹر (صوبے) تھے۔ انہیں بھکتی بھی کہتے تھے۔ ہر راشٹر کئی وِشَیہ میں بانٹا گیا تھا۔ وشیہ کے ادھیکش (نگراں) کو وشیہپتی اور گرام کے مکھیا کو مہاتر یا گرامک کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں پٹکل (پٹیل) کی نگرانی میں ہوتی تھیں۔ زمین یا کھیتی کے دان پتروں پر مہاتروں اور دوسرے گواہوں کے نام بھی کندہ کئے جاتے تھے۔

سلاھار اپنے عہد کے سامیہ وادی مہاسامنت اور روشن خیال جاگیردار تھے جنہوں نے بھودان کے ترازو میں پجاریوں اور پروہتوں کو بھی زمینداروں کے پلڑے کے برابر کردیا تھا، لیکن اس طرح سماج میں براہمنوں کا ایک نیا سامنتی گوتر یا جاگیرداری طبقہ وجود میں آگیا جو اپنی برتّھاپوری اور اگرہار کی اونچی فصیلوں کے اندر جنتا سے سمبندھ توڑ کر اپنی منڈلی میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا، سلاھار راج کے زوال اور دیوگری کے یادو سامراجیہ کے عروج کے موڑ پر یہی براہمن طبقہ کوکن کی مہامنڈلیشوری اور منتری۔ ساری کا ٹھیکیدار بن گیا تھا[3]۔ دوسرے ادھیکاریوں کی طرح ان براہمنوں، پجاریوں اور پروہتوں کو بھی اپنے کھیتوں کی آمدنی اور انعامی باڑیوں کی پیداوار پر لگان دینا نہیں پڑتا تھا۔ محصول کی معافی نے پونجی پتیوں کو دھن دولت بڑھانے کی چھوٹ دے رکھی تھی، مہاماتر اور منتری ہی دیس کے سب سے بڑے شرسیٹھی (صراف) اور بیوپاری ہوا کرتے تھے،

---

[1]: عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۷

[2]: ایضاً ۔ صفحہ ۳۰ [3]: بھاشم (انگریزی) ص۱۰۱، ص۱۰۲، ص۲۱۵ [4]: ایضاً

امنت دیو نے ولی پونہ (پالے پاٹن۔پال) کے اپنے ایک منتری شریسٹھی پرلیوار کو ۱۰۹۴ء ایک دان پتر دے کر اس کے بیوپار کو چنگی سے معاف قرار دے دیا تھا، تجارتی اسباب سے لدے ہوئے شریسٹھیوں کے چھکڑے شرپارک شری استھانک چیمولی اور ناگوٹھنہ کی بندرگاہ اور چودہ سو دیہاتوں میں کسی جگہ بھی گھاٹ آترائی دیئے بغیر مال ڈھو سکتے تھے۔ شریسٹھیوں کے گٹ اور دستکاروں کے منڈل جسے 'شرینی' کہتے تھے۔ سامنت وادی سماج میں سبھتا اور سانسکرتی کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ کانہیری، کُدا، پال اور کول کی گپھاؤں کے کتبوں میں کمار گاں بھوج اور مہابھوج پرلیاروں کے ساتھ ساتھ سیٹھ، ساہوکار، سنار لوہکار (لوہار) اور بیوپاری طبقہ کے دان پن کی بھی داستانیں ملتی ہیں۔

سلاہار عہد میں منگلپوری (ایلیفنٹا) کے راجدھانی بن جانے سے موریہ دور کی تاریخ اپنے شاندار ماضی کے ساتھ پرچھائیاں بن کر اُبھرنے لگی، جب چیمولی اور شری استھانک (تھانہ) کی بہار پر اوس پڑ گئی تو ایک مرتبہ پھر یہی پچھمی سمندر کی لکشمی دیوی۔ پوری ــــ شتانند کا اوتار بن گئی، شرپارک (سوپارہ)، شری استھانک چیمولی (چیول) اور صیمان (سنجان)، کی بندرگاہیں چین اور جاوا کے چھ مستولوں اور بارہ بادبانوں والے دیو پیکر جہازوں (جنک) کی لنگر گاہیں بن گئیں۔ یہیں بغداد، سیراف، اُبلہ، ہرمز، عدن، جدہ، اور سقوطرہ کے تجارتی جہاز [غراب اور دَھاو] لنگر انداز ہوتے تھے، سلاہار خ کی سیاسی عظمت اور تجارتی رونق کا پرتو کوفہ اور بغداد[۲] پر پڑنے لگا تھا۔ اور سنجان سے لے

تھانہ گزیٹیر صہ آفٹ نوٹ)، قلابہ گزیٹر صہ ۲۱۵-۲۳۳، ۳ (گپھاؤں کا بیان) صہ ۳ اور ۲۴، ۲۴ سے کہہ ۱۶۷ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۵ ۲ ابوالفداء ــــــــ

بھاشم (انگریزی) ص ۱۰۶ - ۲۰ - ۲۱۵

کرساوتری تک پھیلی ہوئی اس چھوٹی سی ریاست کی سطوت کی داستانیں مدتوں تک تاریخ کے ایوان میں گونجتی رہیں۔
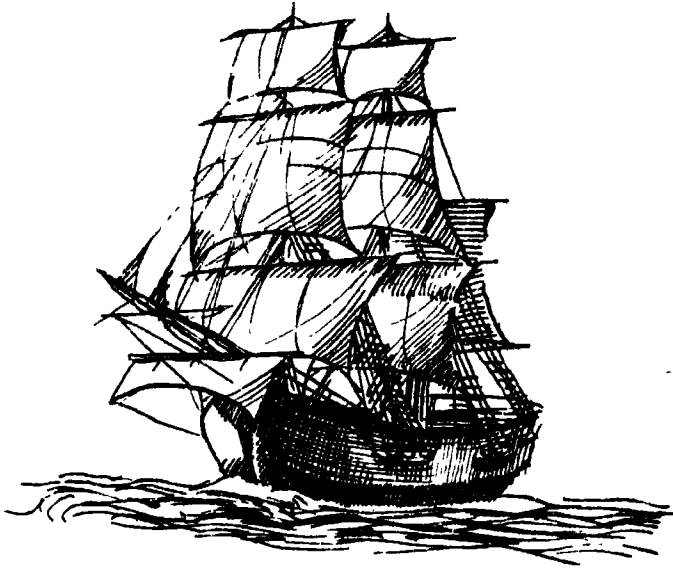
بار برداری اور سفر کے لئے بیلوں کے چھکڑے اسی عہد میں ثاروَیس کی سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی کو اپنے وطن کے محملوں اور کاروانوں سے کہیں مختلف بیل گاڑیوں کے شور مچاتے ہوئے بے ہنگم قافلے عجیب سے لگتے ہوں گے[1]۔ عراقی گھوڑے کوکن کے کوہستانوں اور گائے بیل کے سموں سے بنی ہوئی پگڈنڈیوں سے مانوس ہو چکے تھے، دکن کی راجواڑیوں میں ان کی بڑی مانگ تھی کیونکہ ترک دیس کے رہنے والے داسوں نے جب سے دلّی میں ایک نئے راج کی نیو ڈالی تھی۔ ان میں بوکھلاہٹ

---

[1]: ادریسی بحوالہٗ ایلیٹ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۴

پھیل گئی تھی۔ سمندری ڈاکو جنہیں عرب لیوراج کہتے تھے، ان گھوڑوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اور سلاھار راجہ کو جس کی سہائتا بٹ ماروں کو حاصل تھی۔ لوٹ کا حصّہ دے دیا کرتے تھے[۱]۔ اپنے اصیل گھوڑوں پر سوار سلاھار راج کے کشتری، سنیاپتی اور نایک گلے میں شہر پارک اور چیمبولی کی کھاڑیوں سے نکالے ہوئے موتیوں کی مالا ڈالے اور ہاتھوں میں پارسیکاؤں کے دیس سے لائی گئیں تلواریں لئے، بانس کے دھنش اور بید کے بان باندھے اکڑتے پھرتے تھے۔ قومی شاہراہ کا تصور جسے آج تعمیری منزل ملی ہے۔ راج پتھ کے روپ میں تعمیر ہو چکا تھا۔ شتھنتی کے کنارے گوم تی کے گاؤں سے لے کر نمکسار دلدلوں اور پہاڑی سلسلے کے درمیان اُتری راج پتھ شری استھانک راجدھانی تک چلا گیا تھا۔ تھانہ کھاڑی کی پرلی جانب اور ان میں جا پہنچے کو نتھا لیستھن کی باڑیوں تک دکھنی راج پتھ گذرتا تھا۔ لال بجری والے راج پتھ پر راجہ سونے کے کنڈل کانوں میں ڈالے اور گلے میں جواہرات کے زیور پہنے اپنے چار گھوڑوں والے منقش رتھ پر بیٹھ کر راجدھانی سے نکل کر شتھنتی کے دیہاتوں تک جاتا تھا۔ سیراف کے سیاح ابوزید کو آدمیوں کی گردنوں پر سوار آدمی' کو دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا تھا۔ بزرگ بن شہریار اس انوکھی سواری کو "تہدول' کہتا ہے جو دراصل[۲] ڈولہ یا ڈولی تھی، ان مرصع ساگوانی پالکیوں میں پونجی پتی اور شریشٹھی میو دینکھ کا جترہ (چھتری) لگائے الف لیلیٰ کے طلسمی قالینوں کے دیوتوں کی طرح اُڑتے پھرتے تھے۔ دھوپ سے بچاؤ کے لئے سڑکوں کی دونوں طرف

۱: مارکوپولو (ریلے) ج ۲۔ صفحہ ۳۴۴

۲: عرب رہنمار کے تعلقات: صفحہ ۳۴-۳۶

ناریل کے ان گنت پیڑوں کی سینا کھڑی تھی جو برسوں پہلے پورٹ سمدر سے پرے ملایا کے بنوں سے سنگلدیپ کے راستے لائے گئے تھے۔ جیسا کہ ناسک گپھا کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے۔ عرب اسی لئے کوکن کو نارجیل (ناریل) والا ملک کہتے تھے، یہی ناریل دیگر پیداواروں کے ساتھ عراق و عرب بھیجا جاتا تھا۔ ناریل اور تاڑ کے سایہ دار خیابانوں میں ململ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس شہری اور صرف لنگوٹی کسے ہوئے آدیباسی ادریسی اور مسعودی کو اجنبی ضرور لگتے ہوں گے۔ انھلپورہ کی رانیوں کو بے نقاب دیکھ کر سیراف کے ابوزیاں کی آنکھوں کے سامنے اپنے وطن کی مستورات کا سخت پردہ[۱] پھر جاتا ہوگا۔ ابن مہلہل کو جو شاہ بخارا نصر بن احمد سامانی (متوفی ۳۳۱ھ) کے دربار سے چینی سفیر کے ساتھ خاقانِ چین کے دیار کی طرف جا رہا تھا۔ صیمور کے باشندے ترکانِ شیرازی اور چینی گڑیوں سے زیادہ دلکش نظر آتے تھے[۲]۔ حدود العالم کے مصنف کو سیاحوں نے بتایا ہوگا کہ بلہرا دیس کے باسی لمبے بال (موی فرو ہشتہ[۳]) رکھتے تھے۔ شری استھانک راحدھانی میں اتنی سخت گرمی پڑتی تھی کہ اگر کوئی تھوڑی دیر کے لئے دھوپ میں کھڑا ہو جاتا تو گرمی اُسے موت کے سائے میں ڈھکیل دیتی[۴]۔

لاردیس کے شہروں اور شاہراہوں پر عجمی یا عرب سیاحوں سے جب اُن کے

---

[۱]: ادریسی بحوالہ ایلیٹ ج صفحہ ۸۸؛ الوزید۔ ایضاً۔ ج صفحہ ۱۱

[۲]: بحوالہ دے کنہا۔ صفحہ ۹-۸

[۳]: حدود العالم (فارسی) صفحہ ۲۳۸

[۴]: تھانہ گزیٹیر۔ صفحہ ۲۳۹۔

ہم وطنوں کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی ہو گی تو وہ اپنے وطن کی باتوں میں کھو جاتے ہوں گے
بزرگ بن شہریار ناخدا جو دسویں صدی عیسوی میں اپنے جہاز اس طرف لایا کرتا تھا۔
ایسے کئی نوآبادکاروں سے ملا تھا جو برسوں سے کوکن میں رہتے بستے چلے آئے تھے۔

امبرناتھ کلیان کا مندر

سیراف کا ایک تاجر محمد بن مسلم اُسے ملا تھا جو تھانہ میں بیس برسوں سے زیادہ
رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس نے سفر کیا تھا۔ صیمور میں خلیج فارس
کے شہر فسا کے ایک سوداگر ابو بکر سے بھی اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسی شہر میں
سیراف، عمان، البصرہ اور بغداد اور دوسرے ملکوں کے ہزاروں مہاجر اور تاجر آباد

سکتے ہے۔[۱] سلاحاروں ہی کے کسی دور میں عرب سے حاجی عبدالرحمٰن نامی ایک مبلغ مع اپنے حواریوں سلطان اور بختیار کے کوکن آئے تھے اور مرہٹوں میں اشاعتِ اسلام کر کے نل قبیلے کی ایک راجکماری کو مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ حاجی ملنگ کے نام سے مشہور ہیں، کوکن کے اولین مبلغوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ راجپوری میں حبش کے سِدی اور یمن کے بنی اسرائیل اب اپنے اصلی وطن کو بھول چکے تھے۔ سنجان کے پارسی مہاجر بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن چکے تھے۔ ان کے "دوباشی" باربردار جہاز ریوتی دیپا تک دوڑنے لگے تھے بدیسی بیوپاریوں اور بردہ فروشوں میں خلیج فارس کے یہودی تاجر لاردیس کے بنیوں (بنیانیہ) سے لین دین رکھتے تھے یہی بنیئے بدیسی سوداگروں کے تجارتی اسباب کی فروخت کے لئے آڑھت کا بھی کام کرتے تھے۔ یہودی تاجر کئی زبانوں کے ماہر ہوتے تھے۔ اور اگر وہ فارسی، یونانی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی اور روسی بول سکتے تھے تو یقیناً وہ ساحلی بولی "لاریہ" میں بھی شُدھ بُدھ ضرور رکھتے ہونگے جو مسعودی کے بیان کے مطابق صیمور، سوپارہ اور تانہ میں بولی جاتی تھی (دولغۃ ساحلہ مثل صیمور و سوپارہ و تانہ) تیرھویں صدی کے اواخر میں جب مارکوپولو یہاں آیا تو اُسے بھی یہی مقامی بولی سنائی دی۔ لاریہ دراصل عربوں کے 'بانانیہ' یعنی بنیا بیوپاریوں کی گجراتی زبان تھی۔ جس میں راجہ کے شاسن (احکام) ودھان (قوانین)، اور دان پتر لکھے جاتے تھے۔ سراپ یا بددعائیں پرانی

م[۱]: ندوی۔ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۷۸

مرہٹی میں ملے نظر آتی ہیں۔ اپرادتیہ (اول) نے شرپارک کے لیکھکوں کو کاشمیر ایک ساہتیہ سبھا میں شرکت کے لئے بھیجا تھا[۲]۔ اپرادتیہ (دوم) نے متاکشرا کی بنیاد سنسکرت میں لکھی ہے۔ کھارے پاٹن کے دان پتر سے اس عہد کی شکشا کے خطوط ابھرتے ہیں کہ کس طرح مندروں کے ماتحت شالائیں اور شتریاں ہوتی تھیں جو ودیا، سانسکرتی اور ساہتیہ کے کیندر سمجھے جاتے تھے۔

دیہاتوں کا دیس:

بغداد کے ابن حوقل کو سلاھار راج کنبایت سے لے کر صیمور تک پھیلا ہوا نظر آیا تھا۔ لاٹ دیس کی وحدت میں چودہ سو دیہاتوں کی اکائیاں پھیلی ہوئی تھیں جو کھاڑیوں یا ندیوں کے کنارے آباد تھیں یا پھر کسی کنوئیں یا تالاب کے اردگرد گھاس پھوس کی جھونپڑیوں کا گاؤں نظر آتا تھا۔ ارتھ شاستر میں جنگلوں کو صاف کرکے نئی بستیاں بسانے کا اپدیش ملتا ہے[۳]۔ سلاھار راج کے دان پتروں سے کئی دان پتروں سے کئی پراچین بستیوں کے خاکے ابھرتے ہیں۔ پوری، شرپارک، شری استھانک، چیمولی اور بھمان کا ذکر بار بار ملتا ہے ان کے علاوہ کئی ودیا کیندروں اور دھارمک استھانوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

۱۔ ابن خرداد بہ۔ کتاب المسالک والممالک، صفحہ ۶۸۔ بعض ماہرین لسانیات مہاراشٹری کو شورسینی (شورسین دیس متھرا) سے نسبت دیتے ہیں۔ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" ج ۱ (۱۹۶۲ء) صفحہ ۶۔ مارکوپولو۔ (یل) ج۔ صفحہ ۹۹-۲۹۸؛ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن ۱۹۳۵ء) ج ۳، صفحہ ۲۸۶

۲۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۵

۳۔ R. Shamasastry, Kautilyas Arthashastra. pp 3rd ed. Mysore 1929) Vol ii p. 1

بھاوانے کا گاؤں، راجدھانی شری استھانک اور لونتتا کے بیچ دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں آباد تھا۔ لونتتا دلیو ستھان تھا اور اس کی برہما پوری شیو مندروں کی نگری اور دودان شاعروں اور بیوپاریوں کی بستی تھی۔ باپ گاؤں اور کمبس پلی لوناڈ کے پاس اُس قدیم راستے پر آباد تھے جو (دانا ری اور تتوالہ سے گذر کر) دکن کی اُور جاتا تھا۔ انہیں بستیوں سے قریب کمبھاری ندی کے کنارے بیڑگا کا پڑاؤ تھا۔ وار الاما (ورآر) میں شامل کرنی کا کاکھیر ایک ایسا ہی دیہات تھا جو اگرہار تھا، کانیھری کے ایک کتبے سے منگلپوری کا راجدھانی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ غالباً یہ پوری یا گھاراپوری (ایلیفنٹا) کا جزیرہ تھا جسے موریا عہد میں "پچھمی ساگر کی لکشمی دیوی" کہتے تھے۔ اس کا پراچین نام سنت پور تھا۔ سلاھار عہد میں اسے شستانند کہتے تھے۔

چیمولی، یسوع مسیح سے قبل —— پانچ ندیوں[1] کے سنجوگ پر ایک راجہ کی راجدھانی تھی جو جمبو دیپ کی ایک سندر نگری اور تجارتی منڈی تھی چمپاوتی کہلاتی تھی۔ راجہ کی سینا میں سولہ سو ہاتھی، ڈیڑھ لاکھ پیادہ فوج اور پانچ ہزار گھوڑ سوار تھے۔ چمپاوتی دلدلوں سے گھرا ہوا اور مگرمچھوں سے پٹا ہوا تھا چمپک کلیوں کی یہ بستی جب اور کھلی تو چیمولی بن گئی جس کی خوشبو دیشا نتر تک پہنچ گئی۔ یہ شہر یونانیوں کے دیس میں سیملہ، تلہ اور سیمور بن کر مہکا اور عربوں کے ملک میں صیمور اور جیمور کا نور بن کر چمکا مگر اسے کوئی نام راس نہ آیا۔ اور اب صدیوں کی خلیج پار کر کے صیمور کے نواح میں ٹرامبے کا ایک

---

[1] گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۔ صفحہ ۲ یہ پانچ ندیاں دو طرفہ دریا اور سمندری کھاڑیاں ہونگیں۔

رأس اُس کے نام کی خوشبو اُڑا کر چیمور بن گیا ہے۔ جو آج پیٹرول اور تیل کی بُو باس میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناموں کا یہ آواگون اور تکرار چیمولی کی عظمت اور وُسعت کا اقرار ہے جس کا دامن جزائر بمبئی کے مضافات یا ماحول تک پھیلا ہوا تھا۔ چیمور کے قریب ماحول کی بستی کیا عجب کہ عربوں کے اسی ماحوز کی یادگار ہو۔

مسعودی جب سلاھار راجہ جنجہ کے عہد میں صَیمور آیا تو یہاں دس ہزار مسلمان آباد تھے جن میں بڑی تعداد اُن مخلوط النسل مسلمانوں کی تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اُن عربوں اور عجمیوں کی اولاد سے تھے جو یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ مقامی مسلمانوں کو مسعودی "بیاسرہ"[1] کہتا ہے۔ چیمولی کے تجارتی رابطے مضافاتی بندرگاہوں اور شہروں سے ہونے کے سبب یہاں تاجروں کی آمد و رفت مسلسل رہتی تھی۔ مسعودی صندابور (گوآ) کے موسیٰ بن اسحاق تاجر کا ذکر کرتا ہے جس سے وہ ملا تھا۔ اس وقت صَیمور کا ہنرمند ابو سعید معروف بن ذکریا تھا۔ بزرگ بن شہریار کے زمانۂ قیام میں عباس بن ماھان[2] اسی عہدے پر فائز تھا۔ ایرا دتیہ کے ایک دان پتر میں چیمولی کو ساہوکاروں کی بستی کہا گیا ہے[3]۔

ابو دلف مسعر بن مہلہل ینبوعی کے بیان پر زکریا قزوینی اپنی تصنیف آثار البلاد میں حاشیہ آرائی کرتے ہوئے صَیمور کے مقامی باشندوں کے حسن و جمال

---

[1]: مروج الذہب ۔ ج ۔ صفحہ ۸۶ ۸۵

[2]: ندوی ۔ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۸۰ ۔ صفحہ ۲۸۲ ، ۲۸۳

[3]: جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن ۱۸۳۳ء) ۔ ج ۔ صفحہ ۲۸۶

میں چین و توران کی جھلکیاں دکھاتا ہے کہ کس طرح ترکوں کی تازگی اور چینیوں کی شیرینی، ہندوستانی طاوٹ کے ساتھ عجب نکھار اور بہار پیش کرتی تھی۔ یہ سارے سبزی خور تھے ایک پہاڑی کی بلندی پر مندر تھا جس میں لعل اور فیروزہ سے سجائی ہوئی مورتیاں تھیں۔ مسجدوں سے سلامتی کی طرف بلانے کی بانگ بلند ہوتی تھی۔ کلیساؤں میں آرگن کا آہنگ گونجتا تھا۔ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں عبرانی ربی کافوری شمعیں روشن کئے توریت کی تلاوت کرتے نظر آتے تھے۔ اور زرتشتی مُوبد اور سفید دستار باندھے دستور، عود، صندل اور خوشبودار لکڑیوں کی تیز خوشبوؤں میں اوستا کی دعائیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ عود، لوبان اور خوشبودار لکڑیوں کے سب سے بڑے بیوپاری ترک ہی تھے۔ گو بعض خوشبودار لکڑیاں یہاں پیدا نہ ہوتی تھیں۔ مگر چونکہ صیمور کی منڈی میں فروخت ہوتی تھیں۔ اور یہیں سے دِساور بھیجی جاتی تھیں۔ اس لئے یہ لکڑیاں صیموری کہلاتی تھیں[1]۔ اسی سے صیمور کی تجارتی مرکزیت اور شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں عرب سوداگر بانکوٹ کی کھاڑی سے عمارتی لکڑیوں کی بدیسی تجارت میں اپنی اجارہ داری کے ستون گاڑ چکے تھے[2]

ابنِ حوقل نے جب صیمور میں دھان کے پھیلے ہوئے کھیتوں میں "سنہری بالیوں کو جھومتے دیکھا ہوگا تو اُسے اپنے کام و دھن کی وہ لذت یاد آگئی ہوگی۔ جو آفریقہ اور عرب" میں انہیں کھیتوں کے چاول کھانے سے اُسے ملی ہوگی" جہاں

---

[1]: ایلیٹ۔ ج۱ صفحہ ۹۷

[2]: گزیٹیر رتناگری ج۱ صفحہ ۳۲

یہ برآمد کئے جاتے تھے: جنگلی پھولوں کے ارد گرد اور باغیچوں میں "شہد کی مکھیوں" کو مسلسل منڈلاتے دیکھ کر ابنِ حوقل کو صیمور کے شہد کی شیرینی کی شہرت یاد آگئی ہوگی جس کا ذکر ابو زید سیرافی اور سلیمان تاجر نے بھی کیا ہے۔[1] "صیمور میں دور دور تک "پیاز کے ہرے بھرے کھیت تھے۔ ناریل کے پیڑوں" کی لمبی قطاروں نے صیمور کے ارد گرد گہری سبز حصاریں کھینچ دی تھیں۔ اور ابنرائے میں آموں کے چھتنارے ساؤں" میں کچھ دیر سستا کر سیاح ابن حوقل اپنے وطن کے تپتے ہوئے ریگزاروں کی تپش بھول جاتا ہوگا۔

البیرونی ـــــــ گیارہویں صدی میں پنڈتوں کی منڈلی اور ودوانوں کی شالاؤں میں بیٹھا اپنی کتاب الہند لکھ رہا تھا۔ وہ اس شہر کو "جیمور" کے نام سے یاد کرتا ہے۔[2] ایک صدی بعد ۔ ادریسی "صیمور" آیا تو یہ ایک مضبوط فصیل سے گھرا ہوا وسیع شہر بن چکا تھا۔ جہاں سوتے کے درخت ۔ ناریل کی بڑی بڑی باڑیاں تھیں۔ اور کچی مہندی کی خود رو باڑھیں۔ پہاڑوں پر اگتی ہوئی خوشبودار لکڑیوں کی بھرپور مہکار سے سارا جنگل بسا رہتا تھا۔ یہ لکڑیاں باہر بھیجی جاتی تھیں۔ صیمور کے پہاڑوں کی سرسبز وادیوں میں بانس (خیزران) کے پھیلے ہوئے بسیط جنگل تھے۔ چمکتی کھاڑیوں اور ندیوں کے کناروں سے نائیرہ[3] (سرکنڈوں) کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ مانجھی اور ماہی گیر اپنے

---

[1]: ایلیٹ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۸

[2]: ایلیٹ۔ ج ۔ صفحہ ۸۷-۸۵

[3]: حدود العالم "صیمور" کا بیان

مچھوے، ناؤ اور چھوٹی کشتیاں یا بار کے ر [illegible] ابھی جھومتے نرسلوں کی لہراتی پرچھائیوں کے سینوں پر سے دوڑاتے ششششش کے جزیروں کی طرف لے جاتے تھے۔
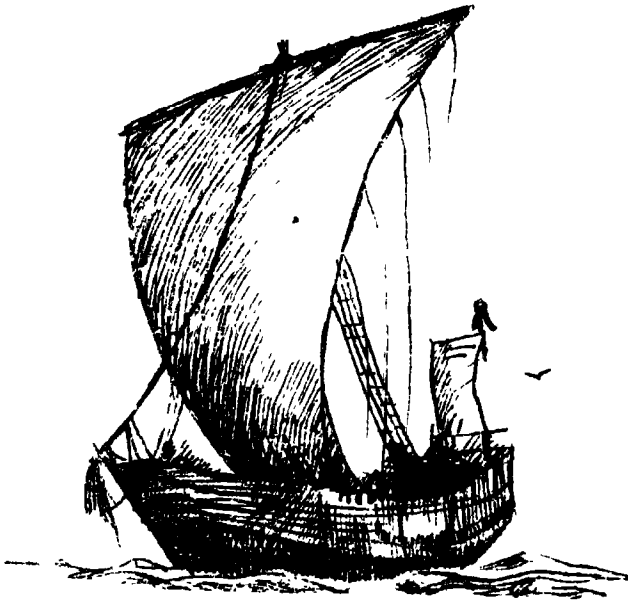
ششششش : کھاڑیوں اور دلدلوں کی سفید اور کالی لکیروں کے اِردگرد جزائر بمبئی اور ششششش کے خاکے اُبھرتے ہیں۔ ششششش سات جزیروں کا جھگمٹا تھا جس میں تردمبہ بڑا ہے، جو ہوڈ یلیادہ [ورسوا] مَروہ [سنوری] ، دھارادی اور رائے مُرڈہ جزائر شامل تھے۔ یہ چمکیلی کھاڑیاں کولی مچھیروں کی قسمت کی ریکھائیں تھیں۔ کولابھٹ [کولابہ] سے لے کر ششششش تک گھاس پھونس کی جھونپڑیوں دھان کے کھیتوں، باڑیوں اور انیراؤں میں زندگی دبے قدموں سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ بُرڈ بیت [مہاثم] کا جزیرہ ابھی تک کسی بستی بسانے والے راجہ کی راہ تک رہا تھا۔ ممبئی کے کولی باسیوں نے اپنے پُرکھوں

سے تری کونک کے کرشن راجہ کی کہانی سُنی تھی ۔ موریہ اور نل راج میں "پچھمی ساگر کی دھن دیوی"
لوپدی کے عروج کی داستانیں ابھی تک تازہ' ناریلوں' جامنوں اور کٹھلوں کے پیڑوں
کے گھنیرے سایوں میں گونج رہی تھیں ۔ خود وہ اپنے یگ میں اپنی ماتر بھومی کے آنچل
کو "اُس طرف سے پھیلتا دیکھ رہے تھے ۔ جس طرف ایک ڈونگری تھی جس کی ہری
بھری ترائی سے اُمبر کھاڑی بہہ رہی تھی ۔ اور جہاں گولر کے پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا" اب
اس جزیرے میں باہر سے آئے ہوئے انسان بستے جا رہے تھے ۔ اور" کھاڑیوں کے
اُس پار سے وہ یاتری بھی مزگاؤں کے گھاٹ سے اُتر کر آتے جاتے تھے "جو والکیشور
— یعنی رَبّ الصحرا کے پجاری تھے اور جنہیں واگھ' چیتا اور درندوں کی پرستش
کرنے والے کولی اور یاسی بڑی عقیدت سے دیکھتے تھے جو خود اب ممبا دیوی کی پوجا کرنے
لگ گئے تھے ۔

شُتشتی اور باہر سے آئے ہوئے یاتری "مزگاؤں بندر سے اُتر کر گرگام کی جانب
جانے والی پگڈنڈیوں یا جھکڑوں کے راستے پر چل پڑتے پھر والکیشور پہاڑی کے دامن میں
پہنچ کر باؤلی کے پاس آموں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر دم لیتے ۔ یہاں خرگوشوں کے
بھٹ تھے اور جنگلی بیلوں اور خودرو پودوں کے سایہ دار کنجوں میں کیسری رنگ کے
کپڑوں میں ملبوس سنت سادھو سر نیہوڑائے دھیان ساگر میں ڈوبے نظر آتے تھے —
جنگلی پھلوں پر گذارا کرنے والے بندر اِن سے بے حد مانوس ہو چکے تھے ۔ پام
کی لمبی پنکھیوں کی اوٹ میں مرطوب دھوپ سے بچنے کی غرض سے سمندری عقاب
بیٹھے اونگھتے رہتے تھے لیکن قدموں کی آہٹ سُن کر جب نیچے دیکھتے تو چھتنار املے
میں کوئی پجارن پوجا کی تھالی میں چنبیلی کے پھول سجائے سیڑھیاں چڑھتی نظر آ جاتی ۔

چٹانوں سے تراشی ہوئی یہ سنگین سیڑھی خیابانوں میں سے گذر کر دالکیشور مندر تک جاتی تھی۔ [ہفتہ کے کسی روز یاتریوں کی گہما گہمی سے اکتا کر] سمندری عقاب پر پھڑپھڑا کر فضا میں چیخیں بلند کرتا سمندر کے اوپر نیلگوں آسمان میں اڑنے لگتا ـــــ اور دیر تک موجوں کے شور اور ہواؤں کی شدید سرسراہٹوں میں گڈمڈ انسانی آوازیں سنائی دیتی رہتیں ـــــ پھر یہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور دور دور تک گونجنے لگیں کیونکہ دور دور سے ہزاروں انسان آکر اس خوابوں کے جزیرے میں آباد ہونے لگے تھے" !!! اس لئے کہ یہاں ایک پارس پتھر "شری گنڈی" تھا جس کے آگے ڈنڈوت کرنے اور جس کا درشن کرنے کے لئے ہر ہندو پہلے یاتری بن کر آتا پھر ممبئی کا نواسی بن جاتا۔

سلاھار خود بھی کوکن کے نہ تھے وہ "کنارہ" کے تھے۔ اور ان کے منتری اور مہا ماتر بھی تیلگو اور کنڑ کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ناموں کے آخر میں "ایہ" کا سابقہ۔ جیسا کہ دان پتروں میں ملتا ہے ان کے دراوڑی نسل اور کرناٹکی اصل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کے بہت سارے القاب پا ٹھارے پربھوؤں میں رائج ہیں۔ پربھو اور کائستھ بشستھی کے ساتھ یہ یہاں آباد ہو چکے تھے عربی مورخ ابن الاثیر کی روایت ہے کہ سومناتھ پر غزنوی حملے نے پربھوؤں کو کاٹھیاواڑ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ براہمنوں میں پالشیکر پائے جاتے تھے۔ جن کی تجرندیدی رسمیں اور روائتیں گوداوری وادی کی جانب اشارا کرتی ہیں جس کی گود سے بچھڑ کر یہ

۱: "ممبئی کے ارد گرد" (انگریزی) جیمز ڈگلس (ممبئی ۱۸۸۳ء) صفحہ ۱

۲: ابن الاثیر بحوالہ ایلیٹ۔ ج۲۔ صفحہ ۴۶۹

آ گئے تھے۔ گوداوری مرہٹہ سنت اور مرہٹی بولی کی گود ہے۔

شستشتی کا جزیرہ سلاھار راج کا سب سے بڑا وِشیہ تھا جس کا آخری سرحدی مقام پچھم۔ اُتر میں گوم ونی تھا جو جزائر دھاراوی اور بَردیت اور ساشتی کے درمیان گذرنے والی کھاڑیوں کے کنارے آباد تھا۔ اور جس کے سامنے ایک طرف دھاراوی کا جزیرہ اور دوسری طرف مُروَہ [ملاڈ] کا مالو تھا ان کھاڑیوں کے کنارے سے اُودے پربتوں کا شرمنی سلسلہ شروع ہوتا تھا جس کے ایک طرف سے راج پتھ گزرتا تھا اور دوسری طرف ان پربتوں کے اُودے ایڑوں کے گھیرے میں ناریل' پام اور تاڑ کے گہرے سبز پتوں کی پلکوں کی گھنی چھاؤں میں تلسئی' وِہار اور پوائی کی جھیلیں ڈبڈبائی آنکھوں کی طرح چھلکتی رہتی تھیں۔ چند برس گزرے۔ وِہار کے کنارے سلاھار عہد کے ایک گمنام وِسمار مندر کے پتھر دریافت ہونے سے جھیلوں کے کنارے آباد۔ قدیم بستیوں اور دھاروں کا تصوّر جاگ اُٹھا ہے اور تاریخ کے ایوانوں میں وہ آوازیں گو نجنے لگی ہیں جو کرشن گری (کانہیری) کی جھیلوں سے گھری ہوئی شاداب وادیوں میں شِلپ کاروں کی چھینیوں اور ہتھوڑوں سے بلند ہوتی تھیں۔ کلاکاروں کے ہاتھ ابھی تک چٹانوں کی بگڑی اداؤں میں لاکھوں نیا دُنیا پیدا کر رہے تھے۔ فن کی تخلیق کا دھارا بہہ رہا تھا اور اُپاسک کے دھاروں کے ساتھ ساتھ یاتریوں کے قافلے بھی اُس پرانے راستے پر رینگ رہے تھے۔ جو شری استھانک سے نکلتا تھا اور وادیلا سے ہوتا ہوا پربتوں کے سینوں کو چیرتا اور جنگلی پیڑوں کے سالوں سے گذرتا پل کھاتا اکسر (بوریلی) کے مندروں تک پہنچتا تھا۔ یہاں کچھ دیر کے لئے ان کے چھکڑے ٹھہر جاتے۔ "پالیا" — یادگاری پتھروں پر کھُدے ہوئے بدیسی جنگی جہازوں کی تصویریں

اور مورتیاں دیکھ کر وہ اپنے دیس کے کلاکاروں کی کلا کو سراہتے اور اُن بدیسی یاتریوں اور بیوپاریوں کے دُھندے خد و خال ان کے تصور میں اُبھر آتے جو راجپوری، چیموئی، تر پار، شری استھانک اور ہمجان کے بندروں میں کبھی کبھار نظر آجاتے تھے۔ تھوڑی دور پر کرشن گری کی پراچین گپھائیں اور خود ان کے یگ میں تراشی ہوئی وہاریں تھیں جہاں یاتریوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور جن میں اگنی کی پرستش کرنے والے سفید پوش موبد بھی ہوتے تھے جنہیں مقامی لوگ "دستور" "پارسی" یا ایرانی کہتے تھے۔ اور جو کانہیری کی گپھا میں اپنے نام پہلوی میں کھود کر اپنی زیارت کو یادگار بنا چکے تھے۔ یہ سنہ ۱۰۰۹ء اور سنہ ۱۰۲۱ء کا زمانہ تھا[۱] ـــــ دُور خموشی سے ہمکلام اور سناٹے سے ہمزبان چُپ سادھے ہوئے منی اور بیراگی سمادھی لگائے بیٹھے نظر آتے تھے۔ کرشن گری جانے کے لئے سنگھٹنشی میں ایک دُوسرا راستہ بھی تھا جو [گوم ونی] سے نکل کر گھنے جنگلوں کے بیچ سے [ساکی ناکہ] ہوتا ہوا جھیلوں کے کناروں کو چھوتا پہاڑی کے دامن میں پہنچتا تھا۔ کرشن گری کی بلندیوں سے دُور دُھند میں ڈوبا ہوا اور گہرے سبز پتوں کے شامیانے میں چُھپا ہوا آنگر کے برتیوں کا ڈیرا تھا۔ جس کی ترائی میں آکو

۱۔ جیمز ڈگلس "بمبئی کے اردگرد" (انگریزی) صفحہ ۲۹۰

وسیع : زمرد کا ٹکڑا نہ دکھائی دیتا تھا۔ کوننتھا لیسحقن اور جاڈیجے (آدرن) کی طرح یہاں بھی سلاحدار راجکماروں اور راج پروہتوں کی وسیع باڑیاں تھیں جن میں بانسوں کے اوپر پان کی بیلوں کی چھاؤنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ تنبول کی خاصیت سے مسعودی بھی واقف تھا۔ یہی مؤرخ ڈلی (فوفل) کا بھی ذکر کرتا ہے جو یمن اور حجاز میں مکّہ کے لوگوں کی محفلوں میں بڑے چاؤ سے چبائی جاتی تھی[1]۔ سپاری کے سبز مور چھلوں کے سائے میں سونے کا درخت۔ درختوں کا بادشاہ ایستادہ تھا۔ ناریل کے درخت کا نکلتا ہوا قد عرب جہاز رانوں کو سمندر ہی سے نظر آجاتا ہوگا۔ ابوزید بیان کرتا ہے کہ عمّان کے تاجر اوزار لے کر آتے تھے۔ ناریل کے پیڑوں کو کاٹ کر سکھانے کے لئے ڈال دیتے پھر اس کے تختے تراش کر ناریل ہی کی چھال کی بٹی ہوئی رسیوں سے انہیں باندھ کر کشتیاں بنا لیتے تھے۔ اس کا تنہ مستول بن جاتا اور اس کے جھوبجھے کو بُن کر پال تیار کرتے تھے۔ پھر انہیں کشتیوں میں ناریل بھر کر عمّان لے جاتے، اس طرح سونے کے درخت سے سونے کے پھل پیدا کرتے تھے[2]۔ شری استھانک میں وادُ لانک اور وسنئی میں تقریباً ہر جگہ آموں کے انبار لگے تھے۔ مسعودی کے کام و دھن ہندوستانی آموں کی مٹھاس سے اس درجہ لذت اندوز ہو چکے تھے کہ نہ تو اسے عمّان اور عراق و شام کے انبج میں وہ مزا ملتا تھا اور نہ مصری آموں میں مصری جیسی شیرینی تھی جو ہندوستانی آموں کی خاصیت تھی۔ امیر خسرو نے جہاں پان کی تعریف سے اپنی زبان لال کی ہے وہاں آموں کی مدح سے بھی اپنا منہ میٹھا کیا ہے۔ ع نغزک ما نغز کن بوستاں دلفریب ترین میوہ ہندوستاں

---

[1] مروج الذہب۔ ج۲۔ ص۸۳۔ ابن حوقل مجالۃ الیلیث۔ ج۲۔ ص۳۲۸، ۸۵

[2] : ابوزید کا بیان۔ عرب ہند کے تعلقات ص۴۳۔ اس کار آمد درخت نے ہر دور میں غیر ملکی سیاحوں سے داد حاصل کی ہے جیسا کہ سولہویں صدی میں ایک ونیزی سیاح کے سفر نامہ سے پتہ چلتا ہے۔ بعد میں آنے والے مغربی سیاح بھی اس درخت کی افادیت میں رطب اللسان ہیں۔ دیکھئے آگے : باب آٹھواں۔

آم، لیموں، پان، ڈلی اور ناریل بری راستے سے سندھ خلیج فارس اور عرب کے ساحلی شہروں کو تسری استھانک کی منڈی سے بھیجے جاتے تھے۔ اور وہاں سے کھجور، ریشم، سفید لوبان اور شراب؛ بحیرۂ احمر سے مرجان؛ سقوطرہ اور آفریقی ساحلوں سے صندل، عنبر اور لوہا اور خراسان سے درہم اسی بندرگاہ میں لائے جاتے تھے۔ دیبل سے قریب شہر بارک (سوپارہ) کی کھاڑی سے موتی نکالے جاتے تھے۔

سنجان:۔ سلاھاروں کا ہجمان، عربوں کا سندان زمرد کی تجارت کے لئے شہرت رکھتا تھا۔ یہاں بھی شہر بارک کی طرح تسمے والے جوتے بنائے جاتے تھے۔ چمڑا بھی غالباً اسی بندرگاہ سے "بوتیل" جہازوں میں بھر کر عرب بھیجا جاتا تھا۔ سنجان میں عمارتی لکڑیوں کی تجارت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اس کے ڈانڈے خلیج فارس سے ملے ہوئے تھے۔ جہاں سب سے زیادہ ساگوان، ساج اور بانس کی مانگ تھی۔ بحرین کے شہر الخطیف میں بانس کی اتنی بڑی منڈی تھی کہ اسی شہر کی مناسبت سے بانس کو عرب "قصب الخطیف" ہی کہتے تھے حدود العالم میں صیمور کے ساتھ سندان کے بانس کے جنگلوں اور نرسل (زائیرہ) کے ویرانوں کا ذکر ملتا ہے۔ سنجان، سوپارہ اور چیمولی میں یہودی تاجر عورتوں، امردوں غلاموں

۱ء ابو زید بحوالہ ایلیٹ ۔ ج ۱ ۔ ص ۱۱ ۔ مارکو پولو (ییل) ۔ ج ۲ ص ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۹۵، ۳۹۷ ۔

۲ء ادریسی ۔ بحوالہ ایلیٹ ۔ ج ۱ ۔ ص ۸۵

۳ء البلاذری و ابن خرداذبہ ۔ بحوالہ ایلیٹ ۔ ج ۱ ص ۱۵۰ ۔ ۱۲۹

۴ء حدود العالم ۔ صیمور اور تانہ کا بیان

کا تجارت کرتے تھے[1]

شری استھانک راجدھانی:- منگلپوری کے بھاگ پھوٹے تو جنجیرہ راجہ کے راج میں چیول کی قسمت جاگ اٹھی۔ گیارہویں صدی میں البیرونی کو بھگول (جغرافیہ) کے ودوانوں نے بتایا ہوگا کہ تانہ شمالی کوکن کی راجدھانی ہے۔ الہاس اور ایک بڑی سمندری خلیج کے سنگم پر آباد لار دیس کی یہ راجدھانی عرب جغرافیہ نویس ادریسی[2] کو بے حد سندر لگی تھی، یہ خلیج دلدلوں کی کالی چادر پھیلاتی بھیمڑی میں انجورتک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں آپنہ سمندر سے شیرازی کشتیاں اور عربی بارجے (بوارج) پناہ لیتے تھے۔ اور دور سمندر کے دیسوں، جاوا اور چین سے سراندیپ کے راستے چھ ستولوں اور بارہ بادبانوں والے "جنک" آکر لنگر انداز ہوتے تھے جن میں اُن دیسوں کے سوداگر گرم مسالے، عود، کافور، صندل، چینی ظروف، ریشم اور دیگر تجارتی اسباب تھانہ کی منڈی میں لاتے تھے[3]۔ شری استھانک راجدھانی اندرون ملک کی پیداوار اور مصنوعات کی بہت بڑی منڈی بن چکی تھی۔ جہاں سے دکن اور خاندیس کے ملبوسات، کپاس کوکن کے سوتی کپڑے، مسولی پیٹم کی چھینٹ (عربوں کی شیت)، پیٹھن کا ململ (اترفس)، حبش، سراندیپ، ایران عرب اور چین بھیجے جاتے تھے[4]۔

---

[1]: بمبئی کا عروج (انگریزی) صفحہ ۱۶

[2]: ادریسی بحوالہ ایلیٹ ج ۱ صفحہ ۶ تا ۶۲ صفحہ ۸۹

[3]: ابوالفدا بحوالہ تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ حصہ ۲ صفحہ ۱۳۱۔ ۳۴

[4]: مارکوپولو (یول)۔ ج ۲ صفحہ ۸۵۔ ۳۳۱، صفحہ ۳۳۳، ج ۲ صفحہ ۳۳۳ صفحہ ۳۳۴

ابوالفدا، بانہ (تانہ) کے بنے ہوئے کپڑے "تناسی" کے بارے میں تبلاتا ہے کہ کس طرح یہاں کے بلکہ نقلی ریشم سے بنتے تھے۔ اور یہ مصنوعی ریشم بانس کے ریشوں سے کشید کی ہوئی طبا شیر (شکس) اور نیشکر کے گودے سے کیمیادی طریقہ پر تیار کیا جاتا تھا[1] "تناسی یا تھانہ کا کپڑا ہی سے" تھان "مشتق معلوم ہوتا ہے۔ تباشیر کی مانگ دوسرے ملکوں میں بھی تھی۔ "یہ بہت ساری دواؤں کا جزو خاص تھی اور تھانہ میں دوا سازی کے کارخانوں میں اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہاں عطریات کی صنعت بھی عروج پر تھی[2]" ماشی کے جنوب میں کھاڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہاں نمک کے لمبے چوڑے طاس تیار کئے جاتے تھے جن کا نمک بوروں میں بھر کر چار بادبانوں والے [بیٹیلہ] جہازوں سے (۱۲۹۰ء اور غالباً فرشتہ مورخ کے عہد تک) دکن بھیجا جاتا تھا۔ مارکوپولو جب تیرھویں صدی کے آخر میں یہاں آیا تو "یہ سارا علاقہ بحری قزاقوں سے پٹا پڑا تھا اور اس کی تجارت صرف چمڑا، نفیس ملبوسات اور سوتی کپڑوں کے تار و پود میں الجھی ہوئی تھی اور سونا چاندی باہر سے آتا تھا، منگولوں کے وزیر اور مورخ رشید الدین فضل اللہ (۱۳۱۰ء) نے اپنی جامع التواریخ میں اسے تانہ۔ کوکن لکھا ہے۔

---

[1] مارکوپولو اور ادریسی بحوالہ ایلیٹ ج۱ ص۸۹

[2] ادریسی بحوالہ ایلیٹ ج۱ ص۸۹

[3] تاریخ فرشتہ (انگریزی ترجمہ) ج۴ ص۳۰۶

زوال کے اسباب :

سلاھاروں کے چار سو سالہ راج میں بحری ڈاکوؤں کا نراج چھایا رہا جن کی سب سے بڑی چھاؤنیاں یہاں کی کھاڑیاں تھیں اور بمبئی کے جزائر تھے۔ اور جن کی پشت پناہی کرکے سلاھار خود اپنی اقتصادی طاقت کی کمر توڑ چکے تھے۔ اور آر تھک استھتی کو بگاڑ چکے تھے۔ لوٹ کھسوٹ سے دولت کا ڈھیر لگایا جا سکتا ہے مگر دریا نہیں بہایا جا سکتا، بیرونی سرمائے کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ تھانہ اور چیول سے ہٹ کر گومنتک کی بندرگاہوں کی طرف مڑ گیا تھا جہاں عراق و عجم کے جہاز دھاوا اور گھوڑوں کے تاجر نظر آنے لگے تھے۔ چودہ سو دیہاتوں کے مہا سامنت دھیتی کا گھیرا سمٹ کر ساٹھ دیہاتوں کی بستی ششتی تک رہ گیا تھا۔ برہما پدیوں اور اگرہاروں کے براہمن دلوگیری راجہ کے بل بوتے پر مندروں کے منڈپوں سے نکل کر جنگ کے میدانوں میں اور کونکن کے مہا منڈلیشور کی گدیوں پر نظر آنے لگے تھے۔ کرنالا (پنویل)، دیرآت کے مہامنڈلیشور کا استھان بن گیا۔ اور اپرانت کا مہامنڈلیشور دستی سے راج کرنے لگا، رامچندر یادو (۱۲۷۱ء تا ۱۳۰۹ء) کے مہا منڈلیشور اتنے طاقتور بن چکے تھے۔ کہ وہ اپنے چکرورتی راجہ کے دان پن کی ریت رسم نبھانے لگے تھے، انجور (بھیونڈی) داؤلہ (ششتی) اور کالوار (بھیونڈی) کے دیہات انہوں نے دکھشا میں دیدیئے تھے۔ شری کرشن دیو راؤ ۱۲۴۷ء تا ۱۲۶۰ء

---

۱ : امپیریل گزیٹیر۔ ج ۱۶ (آکسفورڈ ۱۹۰۸ء) صفحہ ۲۸۳

سارے کوکن کا مہامنڈلیشیور بن بیٹھا تھا۔ اسی کے عہد میں مارکو پولو تھانہ آیا تھا جہاں کے راجہ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ کسی کا باجگذار نہ تھا۔ سلاھار راج کے سامنتی دور کی سانسکرتی اور پرمپرا کی چند یادگاریں عبادت اور عمارت کے روپ میں آج بھی مندروں اور دان پتروں اور ایرک (بنیسہ) میں موجود ہیں یہ شیلاگاؤں کا نام اور سلکیہ کامرہٹی لقب آج بھی ہزاروں برس کے بعد سلاھاروں کی یاد تازہ کرتا ہے مگر سلاھاروں کے بعد پہلی مرتبہ کوکن اور دکن کے علاقے کنڑی بولنے والے حکمرانوں کے حلقۂ اثر و اقتدار سے نکل گئے۔ اور یادو راج میں یہ ایک سیاسی وحدت میں ضم ہو گئے۔ اور اس وحدت کی اپنی ایک سانسکرتی اور ایک بھاشا میں ترقیاں ہونے لگیں۔

۱؎ نیرنے "کوکن" ص ۲۵ ۔ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ج ۔ ن ۲۰ ۔ ج ۵ ص ۱۸۰-۱۸۱

چوتھا باب

کوکن نئے دین کی دہلیز پر

ظہورِ اسلام کے بعد جب نئے دین کے علمبردار شام و عراق کے مالک بن گئے تو شہنشاہ ایران یزدجرد ساسانی کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگ گئی اور ایوانِ کسریٰ کے کنگرے گرنے لگے، نئے دین کی نئی قدروں کی تجلی سے اہورمزدہ کی روشنی ماند پڑ گئی اور آتشکدوں کی پرانی آگ سرد پڑنے لگی، ایران کی فتوحات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ھ/۶۳۶ء میں عثمان ابی العاص الثقفی کو بحرین اور عمان کی ولایت پر بھیجا، انہوں نے اپنے بھائی الحکم ابن ابی العاص بن بشیر الثقفی کو بحرین میں اپنا نائب مقرر کیا، الحکم نے خلیفۃ المسلمین کی رضامندی لئے بغیر ایک بحری بیڑہ تانہ کی مہم پر بھیجا یہ مہم ناکام ثابت ہوئی۔[۱]

تھانہ کا افتخار: تھانہ کی بندرگاہ کو ساتویں دور میں بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی

---

(۱): البلاذری۔ فتوح البلدان۔ ص ۴۳۳؛ ترجمہ F. C. Morgothin ص ۲۰۹-۲۱۰ (نیویارک ۱۹۲۴ء) ایلیٹ۔ ہندوستان کی تاریخ (انگریزی)۔ ج ۱۔ ص ۱۵-۱۶

تھی، عربوں کو کوکن کی بندرگاہوں کی تجارتی فتوحات اور اقتصادی مہمات کا علم تاریخ کے پچھلے کئی دور سے تھا، نئی مسلم مقبوضات میں بصرہ کی نئی بندرگاہ اور تجارتی منڈی سے تھانہ کا براہِ راست رابطہ نئی اسلامی مملکت کے لئے مزید اقتصادی اور سیاسی فتوحات کا سلسلہ بن سکتا تھا، اس ایک مہم سے تھانہ کی جغرافیائی، عسکری اور تجارتی اہمیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی عہد (سنہ ۶۴۰ء) میں موریا اور چالوکیہ سامراجیہ میں کوکن کی بندرگاہ پہ اقتدار جمانے کی کشمکش عروج پہ تھی، چالوکیہ راجہ پلکیشی (دوم) کے بیڑوں کے جال میں یہ ساری سونے کی مچھلیاں پھنس چکی تھیں، مگر عرب ملاحوں کے بیڑے بھی بروص (بھڑوچ) اور دیبل کی بندرگاہوں کے گرد منڈلانے لگے تھے، المغیرہ جو عثمان ابی العاصی کے بھائی تھے بروص اور دیبل کی مہمات کے سربراہ[۱] تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت (سنہ ۳۹ھ) سے ایک عرب رئیس حارث بن مرہ عبدی ان بندرگاہوں کی باقاعدہ نگرانی کرنے لگا تھا، یہ عرب سردار دو سال بعد[۲] مارا گیا (اس بحری گشت کے اور بھی کئی وجوہ تھے) ہندوستان کی مغربی ساحل کو گجرات سے لے کر ملیبار تک اور کوکن میں بالخصوص تھانہ کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی دھرتی نے صحابۂ کرام اور نہ جانے کتنے تابعین کی قدم بوسی کی۔ آنحضرت صلعم کی رحلت کے پانچ سال بعد سے عرب مسلمان ملابار کے ساحلی علاقے میں کثیر التعداد آنے جانے لگے تھے

۱: سیر الصحابہ (دار المصنفین) میں تذکرہ موجود ہے مگر ہندوستان آنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔
دیکھئے ذہبی (انگریزی ترجمہ) قلیچ بیگ (کراچی) ص ۵۵-۵۷

۲: عرب و ہند کے تعلقات، سلیمان ندوی۔ ص ۱۳

مؤخرالذکر خطہ میں چند قبروں کی انتہائی قدامت سے یہ کلیہ قائم کیا جاسکتا ہے —
ثقہ روایت کے مطابق جن اصحاب کرام نے ہندوستان کی سرزمین کو نوازا ہے ان کے نام یہ ہیں: عاصم ابن عدی، الحکم ابن ابی العاص، عبداللہ ابن عتبان، عبیداللہ بن معمر التمیمی (یہ رسول اکرم صلعم کی وصال کے وقت لڑکے تھے، ان کے فرزند عمر بن عبیداللہ التمیمی کابل کی مہم میں شہید ہوئے)، عبدالرحمٰن ابن سمرۃ بن حبیب (بن عبدشمس بن عبد مناف۔ فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں سجستان اور کابل کی مہم میں شریک ہوئے بلصرہ میں ۵۱ھ میں وفات پائی) اور سنان ابن سلمۃ بن المحبق الھذلی (۵۰ھ ہجری) میں ہندوستان کی مہم میں شریک تھے۔[۱]

ساتویں صدی میں الوالقیس قبیلہ کی بحری قزاقی دیوانگی بن چکی تھی، خلیج فارس میں بحرین کا جزیرہ ان غارتگروں کا مسکن تھا اور یہی خلیج فارس تجارتی جہازوں کے لئے گذرگاہ کا کام دیتی تھی، قادسیہ اور نہاوند کی فیصلہ کن جنگوں (۶۳۶ء-۶۴۲ء) میں ایرانی تمدنیت کا شیرازہ بکھر چکا تھا، زرتشتی مہاجرین ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پناہیں ڈھونڈھ رہے تھے، یہاں سوپارہ اور کلیان میں ان کے ہم وطن نسطوری عرصہ دراز سے آباد تھے، ان کا پہلا مہاجر قافلہ اسی عہد میں سنجان پہنچا، اس نئے ملک میں یہ پردیسی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اس لئے اور بھی محسوس کرتے تھے کیونکہ ساسانیوں کے سیاسی تعلقات معاصر چالوکیوں سے عہد ناموں اور سفارتوں کے ذریعے مستحکم ہو چکے تھے، عربوں کو اندیشہ

---

[۱] مختلف مصادر مع محولہ بالا الاصل کتاب الاستیعاب فی معرفت الاصحاب (حیدرآباد دکن۔ ۱۳۱۹ھ) اس کتاب میں مذکورہ بالا کئی نام نہیں ملتے۔

تھا کہ اُن کی طرف سے کوئی فوجی کمک ایران میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نہ بن جائے[1] اس بحری گشت اور نگرانی سے عرب تاجروں اور داعیانِ اسلام کی حفاظت بھی مقصود تھی جو تجارتی اسباب کے علاوہ اپنے نئے دین کی تعلیمات کے جواہر پارے بھی ساتھ لانے لگے تھے۔

گنگا اور دجلہ کا ملاپ : خلفائے عباسیہ کے سنہری دور میں جب عجمی ثقافت اور مدنیت کے زیرِ اثر تمدن۔ تکلف کے حریم ناز میں انگڑائیاں لینے لگا تو اسبابِ معاشرت اور کاروبارِ زندگی پر بھی نیا رنگ روغن چڑھنے لگا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دولت کی فراوانی تھی، جس کے نتیجے میں لوازماتِ عیش کی ارزانی تھی۔ عراق کے معاشرہ میں نودولتیوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جو سونے چاندی میں لوٹتا تھا۔ ان امرا کی زندگیاں بغداد کی راتوں کی طرح رنگین اور پُرشور باتیں اور جن کے خزانوں کی داستانیں الف لیلہ کے ایک ہزار ایک فسانوں سے زیادہ طلسم انگیز تھیں۔ ان الف لیلوی کرداروں میں بغداد کے ابن الجصاص جیسے پونجی پتی جوہری تھے اور سیراف، بصرہ اور دوسری تجارتی منڈیوں کے تجار اور جہازوں کے مالکان تھے۔ انہیں کی بدولت دولت کا دریا ہندوستان اور دُور دراز چین اور جاوا سے بہہ کر دجلہ اور فرات میں آرہا تھا جس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور علوم کے موتی مرجان بھی پہنچ رہے تھے۔ طب کے قراباذین، نجوم کے زائچے، ریاضی کی گتھیاں، ادب اور ساہتیہ کی چاشنی اور اخلاق کے نکات۔ کتابوں اور دانشوروں کے توسط سے عباسی دربار میں باریابی حاصل کر رہے تھے۔ ہندوستان

---

[1] : تاریخ طبری۔ ج ۱، ص ۱۶۴

پنچ تنترا اور چرک سمہتا کی کتابیں قبولِ عام کی خلعتیں پا چکی تھیں، ہندوستانی نجومیوں کی قسمتوں کے ستارے عہدِ عباسیہ کی علمی اُفق پر چمک اُٹھے تھے، بغداد کے مرمریں محلوں اور قصروں میں ہندوستانی شطرنج اور چوسر کی بساطیں بچھنے لگی تھیں — ہندوستانی مصنوعات کے عرب طلب گار لمبی عباؤں کے نیچے کمر سے دینار و درم کی تھیلیاں باندھے بصرہ اور سیراف کی منڈیوں اور بغداد کے چھت دار بازاروں میں "بانانیہ" بیوپاریوں سے سودا بازی کرتے نظر آتے تھے۔

عرب تاجر ان کی دعوتیں کر کے اپنی قومی روایت خوب[1] نبھاتے تھے۔ عربی مدنیت اور ادبیات ہندوستانی ناموں اور کرداروں میں تقلید اور تشبیہ کی راہیں ڈھونڈھنے لگ گئی تھیں۔ بانس جسے عربی میں خیزران کہتے ہیں نزاکتِ حسن اور قامتِ محبوب کا معیار قرار پایا تھا۔ اور بغداد کے عشرت کدوں میں نازک اندام حسیناؤں کو خیزران سے تشبیہ[2] دیتے تھے اور یہی نام مہذب سوسائٹی کی خواتین میں بھی مقبول تھا۔ خلیفہ مہدی کی ملکہ یعنی ہارون الرشید کی والدہ کا نام خیزران تھا۔ سیراف اور بصرہ کے شارع، سوق اور محلّے ہندوستانی بنیوں اور ملاحوں کے لئے اجنبی نہ رہے تھے، اُن کے ہم وطن اور ہم پیشہ کشتی اور خلیج فارس کے شہروں میں برسوں سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ سلاھار راج کے عہد میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا اپنے

---

[1]: عرب و ہند کے تعلقات صـ۴۸ (ابو زید کا بیان)

[2]: Hitti, History of the Arabs (London, 1940)

P.P. 337, 338, 343, 450

جہاز لے کر تھانہ اور مضافاتی بندرگاہوں میں آتا تھا تو بعض دفعہ ہزار سے زیادہ "بنیانیہ" مسافر[1] ہوتے تھے۔ ابن خرداذبہ (۲۵۰ھ) جیسے عرب سیاح اور مصنف جو مالدیپ اور ساگوان والے ملک کی زیارت سے محروم تھے وہ اپنے ہم وطن تاجروں اور جہازرانوں سے اس کی داستانیں بڑے غور سے سنتے رہتے تھے، ابن خرداذبہ کی جغرافیہ پر کتاب المسالک الممالک میں سب سے پہلے کوکن کی بندرگاہوں کا ذکر کیا گیا تھا۔

نوائط، نوایت، نایت، مسلمان:

علامہ جلال الدین سیوطی کی تصنیف کشف الانساب سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مسلم عرب مہاجرین کا پہلا قافلہ حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ آکر ۸۹ھ ۶۹۹ء کے دوران ہندوستان میں پناہ گزیں ہوا تھا، اس قافلے میں بصرہ کے موضع نایط کے مہاجر تھے۔ بنو النضر کے توسط سے قوم قریش سے جن کا شجرہ ملتا ہے[2]، عبداللہ بن زبیر کے جراءت مندانہ اقدام کے خلاف عبدالملک بن مروان کی استعماری طاقتیں حجاج بن یوسف کی سرکردگی میں مکہ معظمہ میں صف آرا ہو چکی تھیں، پانچ ہزار کے قریب علماء و صلحاء کی شہادت میں ابن زبیر کی شہادت کا خون زیادہ گہرا نظر آتا ہے، سادات بنو ہاشم زندانی بن گئے اور کچھ گھرانے بند حیات سے آزاد ہو گئے۔ انصار کچل دیئے گئے

---

[1] عجائب الہند صفحہ ۱۲۴ ، ۱۱ ، ۱۴۷ ، ۱۶۵

[2] بحوالہ تاریخ النوائط۔ نواب عزیز جنگ بہادر (حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ) صفحہ ۳۵

اور باقیاتِ صالحات حرمین شریفین سے ہجرت کر کے شمالی افریقہ اور اندلس کے محاذوں پر چلے گئے' ایک قافلے نے اُس طرف کا رُخ کیا جہاں سے 'میر عرب کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی'، مہاجرین عرب کا یہ قافلہ جزائر بمبئی کے آس پاس سوپارہ تانہ یا تیمور کی بندرگاہ پر اُترا تھا،[۱] یہ لوگ اپنے آپ کو آل عباسؓ و زبیرؓ و طلحہؓ سے منسوب کرتے تھے، عبدالملک بن مروان نے جب مختار بن ابی عبید الثقفی کو کوفہ کا مختارِ اعلا مقرر کیا تو اُس نے اقتدار کے دامن تلے انتقامِ حسین کی ایسی آگ بھڑکائی کہ قاتلین کے بچے کھچے گھرانے بھسم[۲] ہو گئے، جو بچ نکلے وہ خوف کا پہرہ توڑ کر بھاگ نکلے، فرات کی وادیوں کے باسیوں کو بانکوٹ کی کھاڑی کے کنارے عربوں کی قدیم بستیوں میں پناہیں ملیں[۳]، ان میں کچھ کنایت کی طرف چلے گئے جہاں ان کی اولاد کو نوآیتہ کہتے تھے۔ اور جب ۹۲۳-۳۶ء کے درمیان قرمطیوں نے تلواریں سونت لیں تو تارکین وطن کا تیسرا قافلہ کوفہ اور بصرہ سے کوچ کر کے ملیبار پہنچ گیا، یہاں انہیں موپلا اور لبّی کہنے لگے، سقوطِ بغداد (۱۲۵۸ھ) کے بعد جب خلافت جو سیاسی (یا نیم اور جذباتی علامت بن کر سسک رہی تھی۔ ہلاکو کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تو عرب و عجم کے

۱۔ تھانہ گزیٹیر ج حصہ ۱ صـ۲۴۳۔ گزیٹیر کا یہ بیان کہ مہاجرین کا پہلا قافلہ بمبئی کے قریب مہائم میں اُترا تھا۔ تاریخی اعتبار سے مستند نہیں ہے۔ مہائم جسے ماہی کا دیپ کہتے تھے تیرھویں صدی کے اختتام پر بمب دیو نے بسایا تھا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ دیکھئے خاندان مقبہ (مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۶ء)، صـ ۹

۲۔ الحسین عمر ابوالنصر (اردو ترجمہ) صـ

۳۔ خاندانِ مقبہ، صفـ ۹ رتناگیری گزیٹیر۔ صـ۱۲۳

آشفتہ سروں کو ہندوستان ہی میں سر چھپانے کی جگہ ملی، کچھ دلی کی گلیوں میں جا بسے اور کچھ بحری مسافروں کو کوکن کا کنارا مل گیا، ترکِ وطن کا سلسلہ ہر دور میں چلتا رہا، کبھی تجارت کا تعلق ترکِ وطن کا سلسلہ بن گیا اور کبھی حفاظت کی حاجت ہجرت کا بہانہ بن گئی اور جب دکن میں اسلامی حکومت کا دھم بڑھا تو دجلہ وفرات کے کنارے اور جیحوں اور سیحوں کے دھارے مغربی ساحل سے مل گئے۔ فرشتہ لکھتا ہے:

"... بعد از آنکہ رفتہ رفتہ تردد مسلمانان در آن ملک بسیار شد .. راجہای گوہ و دابل وجیول وغیرہ بطریق حکام ملیبار مسلمانان را کہ از عربستان آمدند و در سواحل آن دیار مسکن دارند مخاطب بہ نوایت یعنی خداوند گردانند" مورخین، گجرات سے لے کر ملیبار تک بسنے والے نو آباد کاروں کی نسلوں کو نوالیط یا نایت ہی کے لقب سے موسوم کرتے ہیں مگر نوالیطی قوم کی وحدت میں ہزاروں گھرانوں اور قبیلوں کی اکائیاں ملتی ہیں۔ تاریخ جن کو ایک سلسلہ کی کڑیاں شمار کرتی ہے مگر عمرانی اور مذہبی جائزوں کو یہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔

(۱) نوالیط: فرشتہ بیان کرتا ہے کہ ملیبار کے راجہ عرب مہاجرین [کے تیسرے قافلے کو جو گومتت کے سلاھار اور کدمب حکومتوں کے دوران میں آیا تھا] ان کے سیاسی مرتبت کے پیشِ نظر "نایت" کہتے تھے جو غالباً نایک کا بدل اور اسی مفہوم کا حامل ہے۔ گجرات میں بھڑوچ، کھمبایت اور بعد میں راندیر میں بسنے والے نوواردوں کو "نوایت" ہی کہتے تھے جو سنسکرت کے "نوآیتا" کی ترکیب ہے۔ قاموس

---

(۱) تاریخ گجرات مصنفہ نرمدا شنکر میں نوآیتوں کو ملک مومن، کہا گیا ہے۔ گجراتی اور کاٹھیا واڑ کے مسلمانوں کی ایک جماعت ابھی تک مومن کہلاتی ہے۔

کے النواتی الملاحون فی البحار سے اس کے معنی ملّاح کے نکلتے ہیں یعنی خدائے کشتی (ناخدا)۔ تاریخ النوائط میں ان تمام مختلف قبیلوں کو نوائط ہی کہا گیا ہے۔ اس زمرے میں کوکن کے قدیم مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ جبکہ یہ مہاجرین کے اوّلین قافلوں کے "گرد کاروان" ہیں جنہیں حجاج بن یوسف اور مختار بن ابی الثقفی نے ڈیرے اٹھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ یہ فرات کی وادیوں اور عراق کی بندرگاہوں سے آئے تھے۔ تحفۃ المجاہدین کی روایت سے یہ تاریخی دھندلکا اور بھی صاف ہو جاتا ہے جس میں ملیبار کے نوآبادکاروں کی اولادوں کی دو تقسیم ملتی ہے۔ (۱) ملیبار کے موپلا اور (۲) نایت۔ انہیں کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگیں تھیں[1]، خوافی خاں کے بیان سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عہدِ عالمگیر تک قدیم نوآبادکاروں کی نسل کو مجموعی طور پر نوائط ہی کہتے تھے۔ مگر اس میں وہ قبیلے بھی خلط ملط ہو چکے تھے۔ جو اپنے آپ کو سادات بنو ہاشم اور اصحاب کبار کے اعلا نسب سے بتلاتے تھے۔ "بقوم عرب ولحایط مشہور اند و جمعی کہ از اولاد عباس و زبیر و طلحہ و دیگر اصحاب کبار خود را می گیرند...[2]" الخ" وقت اور حالات کے تھپیڑوں نے انہیں جیول، داابھول، گوا، بھٹکل، بیلون اور دیگر ساحلی علاقوں تک پھیلا دیا۔ انہیں میں غالباً اوّلین مبلغینِ اسلام کی اولاد بھی شامل ہو گئی۔

(۳) کوکنی مسلمان: جیسا کہ اوپر ذکر گذر چکا ہے کوکنی مسلمانوں کے موجودہ بیشتر خانوادے

۱: بحوالہ تاریخ فرشتہ ص ۲۶۶، ۲۶۹

۲: منتخب اللباب: خوافی خاں۔ جلد سوم

مولوی سید احمد گلشن آبادی۔ بحوالۂ رتناگیری گزیٹیر، ص ۱۴۳: قلابہ گزیٹیر ص ۸۱

اولین مہاجرین عراق کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوکن میں اور خاص طور سے قلابہ ضلع میں انہیں جماعتی گوکی کہتے ہیں۔ ان میں وہ گھرانے بھی شامل ہیں جو عجمی النسل ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا نسبی و نسلی تعلق، اُن مہاجرین سے ہوگا جو بنو امیہ اور بنو عباسیہ کے مختلف زمانوں میں کوفہ، بغداد، مدینہ، حضر موت اور دیگر عرب شہروں سے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں شیوخ و سادات کی بڑی تعداد تھی تھانہ کے مدنی، مدینہ طیبہ کے سید ہیں۔ اور ادریسی حضر موت کے رہنے والے تھے، تھانہ کے قدیم قاضی اور خطیب خانوادے اسی قبیل کے ہیں[۱] بعض کوکنی خاندان پٹھانوں اور افغانوں سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتے ہیں، یہ خان کہلاتے ہیں، کوکنی مسلمانوں کے وہ قبائل جو عربی الاصل یا عجمی النسل ہیں زیادہ تر رتناگیری کے ساحلی علاقوں میں دابولی، بانکوٹ، راجہ پور اور چیپلون کی بندرگاہوں میں آباد تھے۔ یہ قبیلے آج بھی مذہبی القاب کے مقدس لبادے اوڑھے ہوئے ہیں۔ نظامِ زندگی کے اقتصادی عوامل، انسانی تعلقات کے مادی محرکات اور معاشرے کے شعورِ اجتماعیت نے گو ان کے قومی کردار اور نسلی اوصاف کی باقیات کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔ مگر یہ اپنے نسبی اور قبائلی سلسلوں کی کڑیوں کو تاریخ کے بھول بھلیوں میں گم کر چکے ہیں۔

(۳) بیاسرہ یا مخلوط النسل کوکنی مسلمان: دسویں صدی کے اوائل میں صرف صیمور کے ایک شہر میں مسلمانوں کی دس ہزار آبادی تھی اس میں سراف، عمان، بغداد، کوفہ، اور خلیج فارس کے شہروں کے مہاجر اور تاجر گھرانے تھے، بڑی تعداد بیاسرہ مسلمانوں کی تھی جو انہیں تاجروں، مہاجروں، ملاحوں اور داعیوں کی اولاد سے تھے، معاشرہ کے اجتماعی عوامل، اقتصادی محرکات

۱: تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳ حصہ ۱، صفحہ ۲۳۲، قلابہ گزیٹیر صفحہ ۱۰۱

اور کسی حد تک جغرافیائی کارفرمائیوں نے ملیبار سے لے کر کوکن کی اُفق تک پھیلی ہوئی اس قوم کی قوسِ قزح کے تمام رنگوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ اصلی رنگ اور روپ چھپ گیا ہے،" جماعتی کوکنی "غالباً اسی طبقہ کا نام پڑ گیا جو دالدی کوکنی مسلمانوں سے مختلف ہے۔

(۴) "دالدی" کوکنی مسلمان : اختلاط کا سب سے بڑا سبب معاشرتی تقاضہ تھا مخلوط النسل مسلمانوں میں وہ لوگ بھی خلط ملط ہو چکے ہیں جو مقامی نومسلم تھے اور وہ بھی جو شادی بیاہ کے رشتوں کے سبب ان کی برادری میں آگئے ہیں، بعض کفو کی پابندی نہ کرنے کے سبب اپنی اصلیت کھو کر مقامی قبیلوں کے ساتھ پیوند ہو گئے ہیں[۱]، یہ معاشرتی تبدیلیاں کوکن کے قدیم عربی و عجمی گھرانوں میں شدت سے رونما ہوئی ہیں جنہوں نے احتیاط اور ضبط معاشرت کو سختی سے نہیں برتا۔ کوکن کے 'دالدی' مسلمان اسی لئے جماعتی کوکنی قوم سے خارج ہیں۔ دالدی مسلمانوں میں خاص طور سے کولی ماہی گیروں کا نسلی اختلاط غالب ہے۔ مگر اس نسلی تال میل سے کوکن کے بہت کم قبیلے ہی محفوظ رہ سکے ہیں[۲]۔ اس کا ثبوت ان کے ہندوانہ رسوم اور کوکنی بولی سے ملتا ہے جو دالدی اور جماعتی دونوں طبقوں کی گھریلو اور مادری زبان ہے۔

۱ : تاریخ النوائط ۔ صفحہ ۶۵-۱۶۳، صفحہ ۱۹۴-۲۱۴؛ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۸۶

۲ : رتناگیری گزیٹیر : صفحہ ۳۳-۱۳۲ ۔ بحوالہ سید احمد گلشن آبادی :

Major Jervis: Statistics of Western India, pp. 14. 15.

(۵) چورواڑ کوکنی مسلمان : ہندی سرداروں اور دولتمند کوکنیوں کی غیر شرعی اولاد جو اپنے اپنے آپ کو کوکنی کہتی ہے مگر جن کے لئے مسلم کوکنی معاشرہ میں کوئی جگہ آج سے سو سال پہلے تک نہ تھی۔[1] انہیں چورواڑی مسلمان کہتے ہیں۔ غیر مسلم رسوم کی ترویج اور غیر اسلامی عقائد کی تقلید کا سبب مورخین یہ بتلاتے ہیں کہ ہندوؤں کے راج میں نوآبادکار مہاجرین نے اتنے حزم و احتیاط سے اخفائے مذہب کا تقیہ کیا تھا کہ خوف کے ہاتھوں انہوں نے زنار تک پہن لیا تھا طرز معاشرت میں ہندو عورتوں کا لباس کوکنی مستورات سے ایسا دامنگیر رہا کہ آج تک اترا ہی نہیں ہے۔ ایک مورخ لکھتا ہے ... "درظاہر دآشکارا موافق ردیہ آن ملک در لباس دیگر اطوار العمل آر دمیان آوردہ فرود آمدند [کذا] .... در اکثر دولغایۃ حال [عہد عالمگیر] زنان شرفای آنجا کہ بقوم عرب و نوایتہ مشہور اند و جمعی کہ از اولاد عباس (الخ) ...... رخت و لباس ہنود می پوشند، بہمیں دستور بطریق اخفاء زندگانی می نمودند"[2] کوکنیوں میں ہندوانہ القاب کے رواج کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے۔

کوکنیوں کے القاب معروفہ : نوایطی اور کوکنی مسلمانوں کے عجیب و غریب القاب کے کئی وجوہ ہیں : (الف) مورثینِ اعلا کا جس پیشے سے تعلق تھا وہ لقب بن گیا، مثلاً ملانٹ (کاشتکار)، پالکر (زراعت پیشہ)، بیلہ یا بیلے (ریشم کے تاجر)۔ (ب) جن کے

[1] : قلابہ گزیٹیر (جنجیرہ) ص ۴۱۹ - ص ۴۲۰

[2] : منتخب اللباب ج ۲، تاریخ النوائط ص ۲۱۴

آباؤ واجداد بحری تجارت کرتے تھے۔ یا جہازرانی جن کا پیشہ تھا وہ رئیس (جہاز کا کپتان) بن بیٹھے، ناخدا ۔ خواہ مخواہ ناخواہ بن گیا گو ابن بطوطہ کے زمانے سے لیکر پیشوا کے عہد تک اس کا اصلی روپ برقرار رہا' فارسی کے سرہنگ کا سر کاٹ کر سارنگ کو نیا رنگ دیا گیا ہے' ٹانڈیل کی اصلیت ظاہر ہے (ت) مذہب نے جنھیں پیشوائی عطا کی وہ پیش امام بن گئے، مُلّا نے سفید عمامہ سر پر رکھ لیا، حافظ اور مقری تجوید و قراءت سے ہم آہنگ ہو گئے، فقیہ نے شرع کا دامن تھام لیا، قاضی نے انصاف کا ترازو سنبھال لیا! ور خطیب منبر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ (ث) وہ قبیلے جن کے افراد ہندو راج یا حکومتِ سلاطین کے فوجی ملازم تھے یا ملکی و مالی محکموں سے تعلق رکھتے تھے ان کے القاب کی وجہ تسمیہ یہی موروثی عہدے اور درباری اعزازات ہیں۔ چوگلے، ڈیسائی، پٹیل، دشمکھ، چودھری کھوت، انعامدار، مقدم، وغیرہ مالی یا زراعتی عہدے داروں کے لقب ہوتے تھے، دلوی بہمنی دور میں فوجی افسر ہوتا تھا یہی اس نام کا قبیلہ بن گیا۔ نایک (اور نایک واڑی) مرہٹہ دور میں ہندو اور مسلمان کوتوالوں کے خطاب ہوتے تھے، خان منصب کی شان بتلاتا ہے۔ (ج) "کر" کی علامتِ فاعلی' مقامِ سکونت کی سمت بتلاتی ہے، مثلاً کرنالکر (کرنالہ نیول کا ساکن)' اسی طرح جہرمی (جائرومی) اور تانتلی کے القاب بھی نسبتِ مکانی کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ (د) بعض گھرانے ابھی تک اپنے قدیم القاب کو اپنائے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر عرب کا ایک مشہور اور نامور خاندان ۔ مقبہ، اور قریشی وغیرہ ابھی تک

۱؎ قلابہ گزیٹیر۔ ص۸۱' رتناگیری گزیٹیر ص۱۳۲

۲؎ : ریاض الانشاء۔ محمود گاواں (حیدر آباد دکن ۱۹۴۸ء) ص۳۹۱ - ۳۹۰

۳؎ : دیکھئے خاندانِ مقبہ

اپنے اصل قبیلوں کے نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان القاب معروفہ کے بارے میں مآثر الامرا کا مصنف شاہنواز خان لکھتا ہے "برای شناسای ہر فرقہ را باندک ملابست یا چیزی نسبت [کذا] بآن چیز لقب ساختہ اند و غریب لقب ہا درین گروہ شائع است"۔[1] کوکنی گھرانوں کے ایسے سیکڑوں القاب ہیں جو صدیوں کے تاریخی سفر کے نشان راہ بنے ہوئے ہیں۔

[1]: کوکن کے مختلف اضلاع کے گزیٹیرس میں مندرجہ ذیل مسلم کوکنی القاب ملتے ہیں۔ یہ کم از کم سنہ ۱۸۸۲ (سنِ طباعت گزیٹیرس) تک اپنے وجود کا ثبوت دیتے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تھانہ گزیٹیر ص ۲۳۲ (فٹ نوٹ): (۱) آبارے (۲) ادھیکاری (۳) اکھرِوارے (۴) انتولے (۵) آرائی (۶) آراکر (۷) آستیک (۸) آتش خان (۹) اورن کر (۱۰) اونڈے (۱۱) ایسکر (۱۲) اُنڈرے (۱۳) برے (۱۴) بھاپھر (۱۵) بھائی جی (۱۶) بھینکر (۱۷) بھرڑے (۱۸) بیا (۱۹) بٹو (۲۰) بوڈلے (۲۱) پالویا (۲۲) پلوارے (۲۳) پنڈے (۲۴) پنویلکر (۲۵) پرکار (۲۶) پٹھان (۲۷) پاٹل (۲۸) پنیڈے (۲۹) پینکر (۳۰) پوتگلے (۳۱) تنگارے (۳۲) تھانکر (۳۳) تنگیکر (۳۴) جلگاؤں کر (۳۵) جنجیرکر (۳۶) جاؤلیکر (۳۷) جتامب (۳۸) جنڈے (۳۹) جنکر (۴۰) جانڈلے (۴۱) چھ خور (۴۲) چوڑے (۴۳) چاؤلے (۴۴) چارلی (۴۵) چلمانی (۴۶) چیکر (۴۷) چوگلے (۴۸) چیرگے (۴۹) حسبہ (۵۰) خطیب (۵۱) خان (۵۲) غانچے (۵۳) نرلی (۵۴) دھوکلے (۵۵) دھاسکر (۵۶) داؤجی (۵۷) دادرے (۵۸) دیپارے (۵۹) ڈنگنکر (۶۰) رانیبا (۶۱) رنیس (۶۲) روگے (۶۳) زاڈلے (۶۴) سمناکے (۶۵) سرکارے (۶۶) سوائل (۶۷) سیلکے (۶۸) سونڈکے (۶۹) شاہالوکر (۷۰) شریف (۷۱) فقیہہ (۷۲) فصاحتے (۷۳) قلابکر (۷۴) قریشی (۷۵) قاضی (۷۶) کرکرے (۷۷) کٹیکر (۷۸) کلکے (۷۹) کھشکھٹے (۸۰) کھوتے (۸۱) کھانڈے (۸۲) کرتے (۸۳) کوکاٹے (۸۴) کنگلے (۸۵) گاڑیوالے (۸۶) گھسٹے (۸۷) گھشار (۸۸) گھارے (۸۹) گیتے (۹۰) لسنے (۹۱) لونڈھے (۹۲) مڈکے (۹۳) ماہاری (۹۴) مقبہ (۹۵) مکبتے (۹۶) ماماپرو (۹۷) مرڈکر (۹۸) مرگ (۹۹) مجاور (۱۰۰) مقری (۱۰۱) ملّا (۱۰۲) منگے (۱۰۳) مرگھے (۱۰۴) نالکنڈے (۱۰۵) نورنگے (۱۰۶) نیکوارے (۱۰۷) نلکر (۱۰۸) نوری (۱۰۹) ہانڈے (۱۱۰) ہوتے (۱۱۱) نیرُرکے (۱۱۲) واگھمارے

نوایتی اور کوکنی مسلمانوں کے دینی و علمی فضائل: نوایتی اور کوکنی مسلمانوں میں بڑے پایہ کے بزرگ، متعدد علماء و فقہا اور صاحب جاہ و مال گذرے ہیں، فرشتہ عہد علائی (علاؤالدین خلجی) کے جید عالموں میں سادات نوایتہ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ کوکن کے نوایتوں کو بھی اسی کے عہد میں عروج حاصل ہوا تھا۔ مجموعی طور سے تمام نوایتی مسلمان اپنی دینداری، فضائل علمی، دینی مناقب اور بحری عادت کے لئے مشہور رہتے جیسا کہ ابن بطوطہ کے بیانات سے پتہ چلتا ہے، بادشاہ وقت کے فرمان سے دینداراور عالم نوایتوں کا تقرر قاضی اور خطیب کے عہدوں پر کیا جاتا تھا، فقہی علوم میں دسترس رکھنے والوں کو فقیہہ شہر کا رتبہ دیا جاتا تھا، تغلقوں کے عہد میں فقیہہ شہر کو عموماً نووارد علماء اور مستحقین کی معیشت یا پیشوائی کے لئے بھیجا جاتا تھا، قحط کے زمانے میں جب رشوت اور معاشی استحصال کے امکانات پیدا ہو جاتے تھے تو قاضی اور فقیہہ ہی کو سرکاری گوداموں سے اناج کی تقسیم کی نگرانی سپرد کی جاتی تھی۔ قاضی عدلیہ اور شرعیہ محکموں کا ہوتا تھا اور اس کے دیگر فرائض کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سب سے بڑا نگراں ہوتا تھا۔ خطیب جمعہ و عیدین کی نمازوں کی خطبہ خوانی کیا کرتا تھا۔ قاضی و خطیب عیدین کے موقعوں پر جلوس کی صورت میں اور نوبت نقاروں کے ساتھ عیدگاہ تک پہنچائے جاتے تھے۔ جلوس کے آگے ہلالی سبز پرچم لہراتا رہتا تھا، ابن بطوطہ نے ملیبار اور کوکن کے ساحلی شہروں میں متعدد فقیہوں، خطیبوں اور دیگر مذہبی پیشواؤں سے ملاقاتیں کی تھیں، یہ سارے فقہ شافعی کے مقلد تھے۔ صندا پور پر جب وجیا نگر کا قبضہ ہو گیا تو کئی نوایتی گھرانے گوآ اور ہندو عملداری سے نکل کر کوکن کے دوسرے محفوظ شہروں میں

جا کر بس گئے اور جب سولہویں صدی میں پرتگیزی استبدادیت کا آسیب چھانے لگا تو مسلمانوں کو نظام الملکی مقبوضات میں۔ بھیمڑی عرف اسلام آباد، کلیان اور تھانہ میں پناہیں ملیں۔

کوکنی بولی :

عرب وہند کے تہذیبی اختلاط اور لسانی امتزاج نے ایک نئی بولی کو جنم دیا۔ اس کے ارتقاء کا عمل غالباً اُس وقت سے جاری ہوا ہوگا جب پہلے پہل نو آباد کار عرب و عجمی مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے درمیان تجارتی تال میل اور سماجی میل جول کا مستحکم سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ گو یہ بتانا مشکل ہے کہ 'کوکنی بولی' نے تاریخ کے کس دور میں زبان کھولی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ قدیم نو آباد کار مسلمان اور مرہٹی پراکرت بولنے والے باشندوں کے درمیان برسوں سے رابطہ کا ذریعہ بنی ہوئی تھی چونکہ اس کا دائرۂ نفاذ کوکنی یا نوائطی مسلمانوں تک ہی محدود رہا اسی لئے اس بولی میں عربی و فارسی الفاظ کا رچاؤ بدرجۂ اتم موجود ہے اور چونکہ اس کا خمیر دوسری مقامی کوکنی بولیوں ۔ سرسوتی ، چتپاونی، گوانی اور کونی کی طرح مرہٹی کی خاک سے اُٹھا ہے۔ اسی لئے اس بولی میں مرہٹی ہی کے سوتی لہجے، لسانی مزاج اور نحوی ہیئت کا رنگ[1] ودروپ ملتا ہے اور چونکہ ہر زبان کی طرح مرہٹی کے مختلف لہجے ہیں۔ اسی طرح 'مسلمان کوکنی بولی' کے بھی کئی مقامی لہجے ہیں۔ مگر اس کے بنیادی کردار میں یکساں عمرانی اور قومی خصوصیات ملتی ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل حقائق سے اندازہ ہوگا۔

آج سے پچاس برس پہلے (۱۸۸۲-۸۰ء میں) جب برطانوی حکام نے تمام ہندوستان کے باشندوں، فرقوں، قبیلوں اور جاتیوں کی تہذیبی، ثقافتی، عمرانی اور اقتصادی تواریخ

---

[1] تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ حصہ ۱ ص ۲۳۲

اور معاصر حالات کا کلی جائزہ لیا تھا تو انہوں نے کوکنی مسلمانوں کے تمام مذکورہ تہذیبی و تمدنی جزئیات کے ساتھ ان کے مرہٹی لہجے اور کوکنی بولی کی خصوصیات کے مطالعات اور مشاہدات کو بھی اپنے گزیٹیر یا فرہنگِ جغرافیہ میں جگہ دی تھی۔ "مرہٹی بولتے وقت (کوکنی مسلمان) कुठे (کُٹھے: کہاں) کی بجائے खवर (خوَر)؛ इकडे (اِکڈے: یہاں) کی جگہ हवर (اِہوَر) बोलने (بولتے: بولنا) کی بجائے जपने (جپنے)؛ कशाला (کشالا: کیوں) کی جگہ कनाला (کنالا) اور विकने (وِکنے: بیچنا) کے عوض ओवने (اوونے) بولتے ہیں، اردو بولتے وقت وہ "ڑ" کی جگہ عربی "ر" کا تلفظ کرتے ہیں[1]" (اور بعض "ر" کی بجائے "ڑ" کہتے ہیں) انیسویں صدی کے اواخر تک یہ بولی مرہٹی کا ریختہ "آپ بھرنش" بن چکی تھی۔ جیسا کہ اُس عہد کے ایک کوکنی رسالے سے ظاہر ہوتا ہے اور اس میں اردو الفاظ بڑی حد تک سرایت کر چکے تھے[2]۔

کوکنی بولی۔ اپنی تمام لسانی خصوصیات کے باوجود محدود اور کمزور ہونے کے سبب کوئی مکمل زبان بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اپنی قدامت کے باوجود ابھی تک اُدھوری اور نامکمل ہے، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ابھی تک اس نے نہ کسی رسم الخط کو اپنایا ہے اور نہ ہی اپنی کسی "لیپی" کو جنم دیا ہے، برسوں سے یہ ہونٹوں کے کوٹھوں پر چڑھی ہوئی ہے مگر ابھی تک نہ تو قلم چلانا سیکھا ہے نہ کاغذ پر چلنا سیکھا۔ اسی

---

[1]: بھانہ گزیٹیر۔ ص ۲۳۲ (فٹ نوٹ) قلابہ گزیٹیر ص ۸۱ (فٹ نوٹ)

[2]: انگریز محققین جنہوں نے گزیٹیر کی تصنیف میں ہاتھ بٹایا تھا۔ اسے (سو برس پہلے) مرہٹی اور اردو کا مرکب سمجھتے تھے قلابہ گزیٹیر۔ (جنجیرہ) ص ۴۲۰

لئے نہ تو اس کا کوئی ادب موجود ہے اور نہ تحریری سرمایہ۔ سوائے چند نوادرات کے "عرصہ ہوا کوکنی مجلس" کے عنوان سے کسی خاتون کی منظوم تصنیف اردو رسم الخط میں شائع ہوئی تھی، ایک دوسرا مجموعہ "ترت" کے نام سے موجود ہے جس میں کوکنی سماج اور قوم سے خطاب کیا گیا ہے، گو یہ بھی اردو رسم الخط میں ہے۔ مگر مصنف نے صحیح قرأت اور تلفظ کی سہولتوں کے پیشِ نظر کچھ صوتی علامتیں بھی ایجاد کی ہیں[1]۔ بمبئی کے کوکنی تعلیم یافتہ طبقہ میں اردو کے رواج کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ (تفصیلات آگے آئیں گی) گو ان کی تمام تر توجہات تبلیغی رسائل کی تصانیف کی طرف مرکوز رہیں مگر انہوں نے کبھی کوکنی بولی کو تحریری طور پر تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔

"کوکنی مثالیں اور مصطلحات"[2]: اس نام کا ایک قلمی رسالہ اردو رسم الخط میں کتب خانۂ دانش گاہِ بمبئی کے "ذخیرۂ کھٹکھٹے" میں موجود ہے۔ مرتب کا نام نظر نہیں آتا مگر یہ دہ زنگاری کا یہ عشوق، سوائے محمد یوسف کھٹکھٹے کے اور کوئی نہیں ہو سکتا جو بمبئی کا ایک جیدِ عالم اور کئی زبانوں کا ماہر تھا، اس میں سنی سنائی بھی ہے اور پوچھ تاچھ بھی اس طرح سینہ بہ سینہ آنے والی کئی مثالیں اکھٹی ہو گئی ہیں۔ راویوں کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً "مسموع از سید علی عیدروس مرحوم" اور "مسموع از شریف حسین کوت"

---

[1]: "ترت" مصنفہ ظریف نظامپوری (بھیونڈی ۱۹۶۰ء)

[2]: بمبئی یونیورسٹی لائبریری۔ کھٹکھٹے کولیکشن نمبر ۳۹۲۔ اس مختصر رسالہ سے کوکنی بولی کے ضمن میں استفادہ کیا گیا ہے جیسا کہ آگے آپ پڑھیں گے۔

دولکر" [دیویکر] وغیرہ کوکنی بولی کی چند نحوی خصوصیات کی طرف ذیلی عنوانات کے تحت مختصر اشارے بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً توالیع الفاظ' صفات اور اس کی قسمیں تکرار الفاظ وغیرہ ۔ جا بجا انگریزی میں بھی حاشیہ آرائی کی گئی ہے ۔ ایک جگہ از راہ حوالہ "مسموع" سنہ ۱۳۲۶" ہجری درج ہے جو زمانۂ تصنیف کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتا ہے ۔ اس کتابچہ کے مطالعہ سے کوکنی بولی کے دو لسانی پہلو سامنے آتے ہیں : (۱) عربی و فارسی کا اولین رجحان اور (۲) مرہٹی کی نحوی تقلید و ترکیب ۔ تاریخی نحل کے پیش نظر اس وقت صرف پہلے پہلو کی جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں تاکہ کوکنی بولی کی قدامت کی توثیق اور اس کے لسانی سرمایہ میں قدیم عربی و فارسی عناصر کی موجودگی کی تصدیق کی جا سکے ۔ دوسرے پہلو پر آگے کسی اور باب میں بحث کی جائے گی ۔

یہ ایک لسانی حقیقت ہے کہ کسی نئی بولی کی تشکیل کے بالکل ابتدائی مراحل میں رائج الوقت زبانوں کے (جن کے اختلاط سے یہ نئی بولی جنم لیتی ہے) روزمرہ کے الفاظ اور لوازماتِ زندگی سے متعلق تمام اصطلاحات اور اسماء دخیل ہو جاتے ہیں ۔ جیسے جیسے سماجی تعلقات کا گھیرا پھیلتا جاتا ہے ۔ ویسے ہی الفاظ' مثالیں' محاورے' عقائد اور رسوم کی اصطلاحیں وغیرہ بھی زبانوں پر چڑھنے لگتی ہیں ۔ انسانی جذبات اور احساسات یا تو نئے لفظوں کی بیساکھیوں کا سہارا لیتے ہیں یا پھر کسی ایک غالب زبان کے الفاظ کی غلامی قبول کر لیتے ہیں' دیومالا اور کہانیاں "نثر" کی مملکت میں رواج پاتی ہیں اور لطیف انسانی جذبات "شاعری" کا دربار سجانے لگتے ہیں' اس طرح ادبِ عالیہ کے گوہر ملتے ہیں اور شاعری کے جوہر کھلتے ہیں ۔ زبان کی تشکیل ہو جاتی ہے مگر زندگی کے نامیاتی سلسلہ کی طرح اس کی تکمیل کا سلسلہ وقت اور مخصوص سماجی حالات کے دھاروں کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے ۔

اس لحاظ سے کوکنی بولی ابھی تک نامکمل اور آدھوری ہے گو اس کی تکمیل کا سلسلہ سست روی کے ساتھ ابھی تک جاری ہے۔ اس کا پہلا سِرا اُس دَور تک پہنچتا ہے جب پہلے پہل عرب و عجمی نو آباد کاروں اور مقامی باشندوں کے درمیان تجارتی اور سماجی تعلقات اُستوار ہوئے، پہلے دونوں ایک دُوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ اپنی اپنی زبانوں میں استعمال کر کے اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کے قابل ہو گئے۔ واسطہ چونکہ نو آباد کاروں کا تھا اور وہی حاجت مند بھی تھے، لہٰذا اُنہوں نے مقامی باشندوں کی زبان سیکھنا ضروری سمجھا اس کوشش میں اُنہوں نے ایک نئی بولی کی داغ بیل ڈال دی جو مرہٹی کی نحوی بنیادوں اور صیغوں پر کھڑی ہے۔ اور جس میں عربی کے بیل بوٹے ہیں اور فارسی کی نقش کاری۔ کوکنی بولی ہندو مسلم اتحاد کا اس سرزمین پر پہلا مظہر ہے۔ ایک کُلیہ یہ بھی ہے کہ مخلوط النسل مسلمانوں نے "کولی لوگوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں لیکن چونکہ زبان مادری ہوتی ہے"۔ اسی لئے ان کی اولاد نے اسے ورثہ میں پایا۔

جب نوالیط ناریل اور ساگوان کے ملک میں آئے تو انہیں ناریل میں میٹھا پانی دیکھ کر بے حد اچنبھا ہوا "اللہ میاں چی[2] قدرت نارلان پانی" لمبی عبا اور اُجلے دستار میں بازار گئے تو جیب خالی تھی۔ ہندو بنیا منیم بھلا کب چوکنے والا تھا جھٹ بول اُٹھا۔ "بھرم بھاری کیسہ خالی" پھر اپنا بھائی چارہ جتانے کے لئے طنز یہ بولا "تمی اُمچیا برادر چی برادر، امی تُمچیا برابر جی برابر" نوالیطی بھائی نے بنئے کی ظاہری محبت کا حساب چکا دیا: "حساب اُردی جاء بخشش لاکھاچی" "اُردی" کے لفظ پر بنئے کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ برادر کے یہاں کسی میت کے موقع

---

[1] ترت۔ ص ۲۶۔ [2] : یہ فارسی اور مرہٹی "چ" کے درمیانی تلفظ کا حامل ہوتا ہے۔

پر وہ بھی رات مولود میں گیا تھا ایک جاء پر ساری رات شرما شرمی میں مولود خوانوں کا یا حبیب سلام علیک " سننا پڑا تھا، بولنا تو چاہتا تھا کہ " اُرڈی چا بینگانا۔ ساری رات دھنگانا " مگر منہ سے نکل گئی " اُرڈی چا مولود۔ ساری رات مولود " نائیطی کو غصہ آیا کہ بنئے کو فرشتہ سمجھ رہا تھا مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا " فرشتہ چاپوٹن خارشتہ " بھرے بازار میں راز فاش کر کے تنکا فضیحتی پر بائل ہے گویا " شیطان ڈھول واژوتے " ایک تو کم بخت کافر نے چاء پی اور پھر طعنہ بھی دیتا ہے آخر کیوں نہ ہو " حرام پیارا لاگتے " جب تک اُس کا بوڑھا باپ سر پر تھا اُس نے نائیطی کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا اور آج اس کا ہی بیٹا اس پر کیچڑ اُچھال رہا ہے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے " جیا جیا ما پھیروا نائی۔ تیا جیا وار شیطان " بنئے کے اس طرح بُرا کہنے سے نائیطی کا کیا بگڑ تا وہ تو خدا پر بھروسہ رکھتا تھا کہنے لگا " جیلا خدا راکھیل : تیالا کون چا کھیل " وہ دوکان سے جانے لگا تو بنیا یہ کہتے ہوئے پیچھے بھاگا " تو زا مازا بنے نای۔ تو جیا بغر سرے نای " مگر نائیطی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، ایک جگہ بنئے نے دیکھا کہ ایک خراسانی نانبائی اپنی دوکان کے آگے تلوار سونتے غصہ میں کھڑا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ نووارد خراسانی نے آدھا تیتر آدھا بٹیر والی زبان میں کہا : " یکنان پختہ کردم کُترے نے گھینی گیلا
شمشیر برکشیدم نالے چیا پار گیلا "

بنئے کو بھی اپنی فارسی دانی کا زعم تھا، کھچڑی پکاتے ہوئے بولا :

" کابل گیلو قندھار گیلو فارسی نمیدانی
آب آب کردن میلو کھاتی کھالی پانی "

اس تمام حاشیہ آرائی سے ہمارا مطلب عربی و فارسی کے الفاظ اور جملوں

(خط کشیدہ) کی طرف قارئین کرام کی توجہ دلانا ہے، بات چیت کرتے وقت کتنے حضرات ذرا ترک کر یہ سوچنا گوارا کرتے ہیں کہ ابھی ابھی جن الفاظ اور تراکیب کا انہوں نے استعمال کیا ہے۔ اُن کی اصل کیا ہے؟

شری آن = عربی الاصل ہے۔ صریحاً
ترکا فرک = ایضاً ۔ تفرقہ
شعر = " ۔ ریشہ آم کا
ھیان لیان = " ۔ ھیناً لیناً
رال = " ۔ الرال لعاب الخیل شرح الحماسہ للحمنت ص ۱۲۵
عینت ما دلیتن = " ۔ عین شمس۔ دیکھتے دیکھتے سورج چڑھ گیا یعنی زمانہ گذر گیا
آل سبا = " ۔ علی الصباح
زھنونی = " ۔ جنونی
رہون تال = " ۔ رُخ تعال
اِراکھنت = " ۔ اراقت ایشاب
سار = " ۔ شار۔ مشورہ
سَتَل = " ۔ سَطَل
ہشہ = " ۔ حاشیہ
باندا ہیک = " ۔ فق
شکری = " ۔ سُکر یا شکر
ایام = " ۔ ایام حیض

آئیک : عربی الاصل ہے ۔ پہلا بچہ مدرسہ میں آنیوالا ۔ علیک (مثلاً ایک بچہ دوسرے کو کہے ۔ انا علیک ای نوفلکُ)
ایضاً

(اپانی) کھدکھدتی : " ۔ مضعضعت ماء شمائل القبائل (دیوان نابغہ عنہ[6])

لبیک : " ۔ بلانے کے جواب میں

شبری : " ۔ عربی میں اونٹ کی شبری یا شغدف ۔ کھاٹ یا پلنگ

سافوذر : " ۔ سحر

تاکھیری : " ۔ تاخیری

عصیر : " ۔ چٹائی

سلاتی : " ۔ جھاڑو

خمس : " ۔ جمعرات

تصدیع : " ۔ دردسر

تکلاوی : تقلیدی ۔ ضعیف جسم کا

کسالت : (عربی الاصل) : بیماری ۔ علالت

شمی : " شمعی، شمع، موم بتی

شراعی : (عربی الاصل) " شرعی، منگنی، شکر

ہوُس : (فارسی) = ہوس

تلملتے (عربی الاصل) : تملمت سے اخذ ہے (از کتاب ابن قتیبہ)

(اس کے علاوہ بعض عربی تراکیب واصطلاحات کو کوکنی (مرہٹی) میں بعینہ ترجمہ کر دیا جاتا ہے مثلاً:

"کیلے چے سوپ" (باریک تار) کاتار و پود سعف النخل سے نکلا ہے۔ "لانثا" سانپ کے معنی میں عربی میں لکلفی عن الحیہ با الطویلیہ سے ماخذ ہے، "نیو" (نوء الدلو) سے بنا ہے۔ "مشید" پر مسجد کا سایہ ہے۔ "تین سائز" دراصل تین ساعت (سہ پہر) کا وقت بتلاتا ہے۔ فارسی کی رفتار بتلانے والا مصدر "دوانیدن" کو کنی کے محاورے "کو مڑی دو دوان لکو" میں چھپا ہوا ہے۔ "خفت" بہ خبطی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ دربار داری نے "حاجی" سے روشناس کرایا تو یہ "مسخری" کے پردے میں ہنسانے لگا۔ عجب عربی میں چھپانا اور مسخری میں چھپی بات کہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "کالا شیدی" حبشی کے سیدی (شیدی) کا رنگ دکھلاتا ہے۔ "نفاحتی" نحس کے روپ میں رومن قانونی اصطلاح Nefaaas dies کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "جانگلا" یا جانگلو" انگریز بن گیا ہے۔

کوکنی بولی (آپ بھرنش) پر مرہٹی صرف و نحو کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ افعال کے تمام صیغوں کے علاوہ صفات اور دیگر توابع بھی مؤخرالذکر زبان کے رہین منت ہیں:

(الف) تکرار لفظی (مترادفات اور بیشتر مع تجنیس کے):

(۱) ابانی سبانی (۲) اَبَر دَھبر (۳) باسنا کوسنا (۴) باسَن بھاسَن اور ڈھاسَن بھاسَن (عورتیں غصہ میں کہتی ہیں)! (۵) ٹیپ ٹاپ (انگریزی) (۶) ٹیکم ٹاک (۷) دھنوٹی بیڑٹی (۸) سامان سومان (۹) جاپجر واپجر (۱۰) کام ٹھام (۱۱) کہاپج کھوپج (۱۲) کاپر چوپر (۱۳) گابر گوبر (۱۴) گال گبوچے (۱۵) گر بر سَر بر (۱۶) ہچ پچ (۱۷) لَتّر پتّر (۱۸) داکرا ٹیکرا

(ب) تکرار (مع تسلسل حرکت):

(۱) دھاندلا دھاندل (۲) مارامار (۳) دھاتاں دھاتو (۴) پلاپل (۵) لکالک

(چھپانا) (۶) دھرادھر (۷) پٹاپٹ (۸) ٹکوٹک (پیالہ کا لبالب بھرجانا) (۹) دھمادھم (۱۰) سٹاسٹ (۱۱) تھراتھر (۱۲) گپاگپ (۱۳) گٹاگٹ۔ (ان میں سے بہت سارے ہندی اور دیگر بولیوں میں بھی رائج ہیں، کوکنی بولی نے صرف استفادہ کیا ہے)

(پ) باجے گاجے شی ایلیا؛ ڈھول ڈھمآکے سے ایلا۔ چورچپاتے۔ جاکرہ ماکر

(ت) صفات؛ اسماء:

بھربھریت	: (آٹا) جو چکنا نہ ہو
بھس بھسیت	: بھوسہ کی طرح
پھلپھلیت	: پتلا، جس میں پانی یا شوربہ زیادہ ہو
ترپھریت	: تازہ (مثلاً مچھلی)
ترپھراٹ	: بیقراری، تڑپ۔
چلبلیت	: (گھی کا کھانا) مرغن
چم چمیت	: تازہ تر
چکچکیت	: چمکدار، چکنا
چُپ چپات	: خموشی سے
دھردھرات	: خفقان دل
دھپ دھپیت	: (بدن) گرم
دھم دھمیت	: گرم
دھردھریت	: روبرو
چُرچراٹ	: چمڑی کا جلنا

سم سمیت : (پانی) نیم گرم
سرسریت : صریح
سلسلاٹ : کثرت
سنساٹ، شیوشوات : سنسنی
کھٹ کھٹیت : آنکھیں کھولنا بچہ وغیرہ کا صبح میں، خوب روشن ہونا
گھرگھریت، گھرگھراٹ : کھردراپن
گھم گھماٹ : زور کی مہک، تیز خوشبو
کوکواٹ : عورتوں کا غل، شور
گھوگھویت، گول گویت، گپ گپیت : بھرا ہوا جسم، تازہ اور صاف
کڑکریت : خستہ (روٹی یا پاپڑ)
گل گلیت : لیسدار
دھراٹ : بے قدری ہونا، خوار و ذلیل
للکیت : چمکدار
مکمکات : خوشبو

(ج) متفرقات :
مہاموں : بھاری کام مفصل کے لوگوں کو چڑانے کیلئے یہ بولتے ہیں۔
پیلارکر : مفصل کے باشندے۔ (پیلا: جنگلی ور، اُسپار)
گونگاٹ : شور
گلمال : اضطراب

کدّا : بھِکھ
لاسریا : مفلس
اُتانا چلنا : فخر سے چلنا
کاگرا : ہوشیار
ناک شی کر : (بچوں کو کہتے ہیں)
مَستر : چور

(ب) محاورات، استعارے

ٹکلی نی ٹاپران : کسی بات کی تکرار۔ بچوں کا رو رو کے بیزار کرنا
بالیس وایز صور : احمق
سوئی جا پھاورا : بات کا بتنگڑ بنانا۔ رائی کا پہاڑ بنانا
بتی اندگ زلتے : بتی دھندلی روشنی دیتی ہے (اندک = اندھکار سے)
آلس پھیلار : سستی کرنے والا۔ "السی پوستی" اور "ایدی چے بوکر" اسی قسم کے دوسرے محاورے ہیں
مُسلاچی دھنس : بے موقع بات۔ جیسز
اسی طرح "آیتے درکوتیا" "مشیدی لاچونالاگلا" "پیسا جا کادلا" "پانی آب دھر بھویدے پڑتے"
اور "کومری دو دو دن تکو" محاورے اور استعارے کوکنی بولی میں آج بھی رائج ہیں۔

(ح) کہاوتیں، مثالیں وغیرہ

(۱) جیسا زہار تیسا پھل۔ جیسا درخت ویسا پھل
(۲) کومری آنکیل تو آپستی وانکیل

(۳) جیاچی گھلتی ٹوپی تیاچی وازولی تھالی ۔ جس کا کھایا اُس کا گایا۔
(۴) راتے نای زاتے تای آی ماز ادہراڈکر
(۵) چالینے چے پائین تورانی پوٹن چے لاوالیا گھردا
(۶) چوراچیا آنگن چاندنا کھیلتان ۔ چوری سینہ زوری
(۷) مالکراچیا ہاتی ملین (خلین) کانگماں یا ہی کہاوں کہ پاہی
(۸) تیاچیا تنگڑیا تیاچیا گلین ۔
(۹) بھنبتس تے یوڈا ہاکتی نای تے نانگیچ سبھیتن ۔
(۱۰) بھینی نائی ائے تے لگٹ تونگرا ، ناچتا نای اسے تے انگن وانکرا ۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا
(۱۱) تُرت دان مہاپون ۔ جو ملے وہی غنیمت ۔
(۱۲) ایکالا بولادان پیں نی ایکالا بولادان پاکٹی لاگ ۔ پیٹھ پیچھے غیبت نہیں کرنی چاہیئے۔
(۱۳) داتنے کہالن کومرپالہ داداں ۔ بھُس میں آگ لگانا ۔
(۱۴) کونالا آنبے چی ساولی نی کونالا چنچے چی ساولی ۔ جس کو جس کا سایہ اچھا لگے ۔
(۱۵) بوٹ دِلاتنے ہاتھ دھرتے ۔ انگلی پکڑتے پکڑتے ہاتھ پکڑنا ۔
(۱۶) بای چی بھولا بائی چیا ماتھین ۔ عطائے تو بلقائے تو
(۱۷) ہنسلاڈ انگر سُورلا ناگر
(۱۸) دون گھراچی دھراڈی (دون مانڈواچے دھراڈی) ۔ دو جگہ کے براتی ۔
(۱۹) یکے بھیون دکے دیتین
(۲۰) گھیے گھیل سُوری بارلی ہوری ۔ جلد بازی کا انجام بُرا ہوتا ہے ۔
(۲۱) دون گھرچے پاؤنے بھوکے مرتن ۔ دو گھروں کے مہمان بھُوکے رہتے ہیں ۔

(۲۲) یا چی ٹوپی تیا جیا ما کھین = اپنا الزام دوسروں کے سر تھوپنا۔

(۲۳) اولٹیا گھرے دریانی = چکنے گھڑے پر پانی

(۲۴) جیا ما راجیا دیوالا کھیتا راجی پوزرا = لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

(۲۵) کونالا آرسی دستے نی کونلا ڈھانکنی دستے = جیسی نیت ویسا پھل

(۲۶) لیدی چاڈھو = ناقابل اصلاح

(۲۷) مہندرا چامرن لی مازری چاھنان

(۲۸) سوزلی انگشتہی یعاکو نای دھی

(۲۹) آئیا بلان ناگو یا = کام کا نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا

(۳۰) کونا چیاھی کومرے شی اُزرُو

(۳۱) ویداچی پوران کرمان مرتن = چراغ تلے اندھیرا

(۳۲) سمجھیلی تیالا سولی انی نای کھیلا پتلا پھانسی - ہر حالت میں نقصان

(۳۳) آسا داچی دوری لاب = باپ کی ڈوری لانبی ہوتی ہے۔

(۳۴) مرتان مرتان ہی ہات پائین ہلوتے - آخری دم تک جدوجہد کرنا

(۳۵) اڈری لا اونٹ جہانگ

(۳۶) رات تھوری کانی سونگ جہوب = تھوڑی رات نخرے زیادہ

(۳۷) پانی نای اُبلی توان باند باندھالا لاگتے = مصیبت کا قبل از وقت علاج

(۳۸) آتمارا کہون دھرم

(۳۹) اٹھ چیدا تو چ دھندا = وہی رفتار بے ڈھنگی۔

(۴۰) جیلین چونڈے شی، لاکری گونڈے شی

(۱۴) یائی بھر مثیہ گھیا افی ام لانا کھوالولا ۔

بعض کہاوتیں براہ راست مرہٹی زبان سے داخل ہوئی ہیں اور بعض عالمگیری روایات کی حامل ہیں اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں انہیں سماجی حقائق اور انسانی احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

بعض محاورے کوکنیوں[۱] کے قومی کردار اور سماجی کمزوریوں کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض کہاوتیں خود غیر کوکنیوں نے اس بولی میں گڑھی ہیں مثلاً "می اچیا برادر چی برادر" اور "ایلیا مانسان افرے گھیا"۔ اِن ضرب الامثال میں بعض مقامی کرداروں کے خدوخال بھی اُبھرتے ہیں۔ جو کوکنی معاشرے میں کسی تاریخی یا سماجی اہمیت کے حامل رہ چکے ہوں گے۔ مثلاً "نالی در کون تے محمد قاسم۔ کا ی سنگیچ بیل تے سیکلیچ بیل"۔

کوکنی بولی کی لچک :

قدیم کوکنی لوگ گیتوں اور زمانۂ حال کی طبعزاد غزلوں اور نظموں میں چونکہ صدیوں کا فاصلہ ہے اسی لئے اوّل الذکر میں قدیم عربی و فارسی الفاظ کی کھپت زیادہ ہے اور آج عام بات چیت اور تک بندیوں میں اردو اور یہاں تک کے انگریزی الفاظ بھی بلا روک ٹوک کھپ جاتے ہیں۔ پھر بھی بعض ترکیبیں اپنی قدامت کی طرف اشارے کر بیٹھتی ہیں مثلاً :

بے پھام (بے فام)، بخیس (بخس)، پھانکے (فاقے)، فراقات (فراق میں فکریں)، حریص (حرص)، پھساداں (فسادات)، مشیبتیں (مصیبتیں)، سُباں سُتی (صبح سے)، اُستے اُستے (آہستہ آہستہ)

---

[۱]: حوالے کے لئے دیکھئے کوکنی مثالیں اور مصطلحات۔

زن (عورت)، نشیب (نصیب)، دِلان (دل میں)، خلاص (ختم)، عشقان (عشق میں) اور اسی قسم کے انگنت الفاظ مستعمل ہو چکے ہیں۔

عربی و فارسی زبانوں نے مرہٹی پراکرت کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ عرب جہاز رانوں اور ایرانی ملاحوں نے کولی ماہی گیروں اور ماہجھیوں کو نئی اصطلاحات سے روشناس کرایا تھا کہ کوکن میں آج بھی کشتیوں کے کسی کل پرزے انہیں زبانوں کے چلتے ہیں۔ اندر بحری مصطلحات میں انہیں کی آب دکھائی دیتی ہے مثلاً :

غُراب جو چالیس چپوؤں والی کشتی تھی۔ آج بھی "گرآب" کے نام سے چل رہی ہے۔ (عربی میں کوّے کو غُراب کہتے ہیں) اس کو بعد میں تیغ ماری اور مرہٹی میں "پانی مار" کہنے لگے، سُکان، مالم (مُعلّم)، خلاصی، ربّانی، عربی الفاظ ہیں۔ دامن اور گوش (برائے گوشہ)، فارسی سے دامنگیر ہیں۔ عرب ملاح اور سیاح بھی مقامی بولیوں کے الفاظ اور اصطلاحات اپناتے رہے ہیں۔ عربی جغرافیہ اور سفرناموں میں مندرجہ ذیل اجنبی الفاظ ملتے ہیں۔

بلنج (پلنگ) بوری (بوڑی)، ابن طیفہ "ھورہ" لکھتا ہے کتاب الھند میں یہ اسی معنی میں مستعمل ہے۔ بارجہ (بیڑا) اور اس کی عربی جمع "بوراج" بحری قزاقوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ البیرونی کے یہاں بھی یہ معرب بیڑا۔ بارجہ بن کر لنگر انداز ہے۔ عرب چھوٹی کشتی کو بارجہ کہتے تھے۔ انگریزی کا barge غالباً اس بارجہ پر سوار ہے۔ دو تیغ۔ (ڈونگی) بن کر ڈول رہا ہے۔

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات۔ صفحہ ۷۲ - ۶۸

پانچواں باب

کوکن ہلالی پرچم کے سائے تلے

اس وقت جب کوکن میں عربی مسلمانوں کی نو آبادیاں پرانی بستیاں بن چکی تھیں. اور وہ مصاحبت اور وزارت کے عہدوں پر متازرہ کر داستانِ پارینہ بن چکے تھے. شمالی ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا تھا، تیرھویں صدی کے آغاز میں دلّی سلطنت کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں مگر سیاسی استحکام اور معاشی استقلال کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، جہانبانی کے لئے جہانگیری شرط تھی. اور قرونِ وسطیٰ میں سرمائے کی فراہمی کا مقدم طریقہ ملک گیری ہی تھا۔ جو توسیع پسندی کا دوسرا روپ تھا۔ خراج اور باج کے سوا کسی اور باضابطہ منصوبہ بندی کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا، ہم بازوں کی نظر میں بدیسی تجارت کا دھیما طریق عمل وقت طلب اور صبر آزما تھا، دولت کے ڈھیروں کی متلاشی نگاہیں کھیتوں اور کھلیانوں سے پرے سنگین قلعوں کے پُراسرار طلسم خانوں کی جانب اٹھتی تھیں جہاں سونے چاندی کے انبار پوشیدہ رہتے تھے۔

دیوگیری کے اسرار انگیز خزانوں کے ہوشربا افسانے علاؤالدین خلجی سے مسلسل سرگوشیاں کر رہے تھے، یہ دلی کے بادشاہ جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا، آخر ایک دن (۶۹۴ھ) کڑہ مانکپور کے اس حاکم کی مہم باز اور چونچلی طبیعت نے ایڑ لگائی، خراسانی گھوڑوں کی ٹاپوں سے دکن کا دل دہل گیا، وہ آیا ۔ اُس نے لوٹا اور وہ لدا پھندا چلا گیا اور دلی کا بادشاہ بن گیا مگر اپنے پیچھے مسلم اقتدار کے ایک طویل سفر کے لئے نشانِ راہ قائم کرتا گیا، علاؤالدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے چیول اور دابھول سے لے کر رائچور اور مدگل تک سارے جنوب میں غارت گری کا ایسا ہولناک کھیل کھیلا کہ لوگوں کے دل دہل گئے، شہر اُجڑ گئے، سلطنتیں ٹوٹ گئیں۔ دکن میں نراج پھیل گیا ۔ مگر کوکن میں ایک نئے راج کی نیو پڑ گئی۔ ایک روایت کے مطابق اسی عہد میں شاہ نصیرالدین اعظم خاں نامی ایک امیر نے سمندر کے راستے سے دابھول کے راجہ ناگوجی راؤ پر حملہ کر کے اس کے راج پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے کے نام پر اس کا نام مصطفیٰ آباد رکھا۔ لگ بھگ اسی دور میں راجہ پوری بھی مسلم مقبوضہ بن گیا۔

مہائم کا بھیم راج :

بھیم دیو یا بمب دیو ایک راجکمار تھا دیوگری کے یادو گھرانے سے جس کا تعلق تھا، راج پاٹ لُٹ گیا تھا مگر اُس کے حوصلوں پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکا تھا۔ خلجی سپاہیوں کے دارو گیر سے بچتا ہوا وہ اپنے راجگرو اور گیارہ یا بارہ گھرانوں کے ساتھ سمندری راستے سے کوکن آیا اور

---

(۱) بحوالہ تاریخ فارسی۔ مملوکہ لائبریری نواب صاحب جنجیرہ

کوکن کے اِتہاس میں اُس نے ایسی ناموری حاصل کی کہ وہ بمبئی کے گمنام جزیروں کا افسانوی شہزادہ بن گیا جس کے ارد گرد خوبصورت کہانیوں کے ایسے رنگین تانے بانے بُنے ہوئے ہیں کہ اصل کہانی اُلجھ گئی ہے اور یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کہانی کا سرا شوریہ ونشی کشتریوں کے بیان کے مطابق انہلواڑہ کے سولنکی راج سے ملا ہوا ہے یا دیوگری کے یادو گھرانے سے وابستہ ہے۔

یہاں کوکن میں اس کی بندگی کا بھرم رکھنے والے نایک، راجہ، رائے اور مہامنڈلیشور ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے راج کر رہے تھے، بمب راجہ نے سنجان سے لے کر جزائر بمبئی تک ایک نئے راج کی نیو (۱۲۹۹ء) میں ڈالی جس میں پندرہ محال تھے اور جو چار سو چوالیس پکھاڑیوں یا دیہاتوں پر مشتمل تھے یا منجملہ بارہ پرگنے اور دو قصبے تھے۔ ساشٹی جزیرے میں سے مروہ (مارؤی) جزیرے کا علاقہ ملاڈ اور جوہو جزیرے کا مروَل اس نئی راجواڑی کے اہم حصے تھے۔ ساشٹی ہی میں شامل ٹرامبے کا جزیرہ بھی بھیم راج میں شامل تھا۔ اس سے پرے نائیگام کا علاقہ تھا (ماٹنگا، پریل اور وڈالا) جو بڑ دَبیت جزیرے میں تھا۔ بڑ دَبیت کے کنارے جہاں ٹرامبے، ساشٹی اور دھاراوی کے درمیان سمندری خلیج سے نکلی ہوئی کھاڑیاں آکر سنگم بناتی تھیں وہیں بھیم راجہ کی راجدھانی تھی جسے مہی کا دیتا کہتے تھے جو زبانوں پر چڑھ کر مہی سے مہائم بن گیا۔[۲۸] اس کے سامنے واندرا (باندرا) کا جزیرہ بندر نما بدصورت اور کالے کولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

---

[۲۸]: بمبا کین۔ آر۔ پی۔ رائے۔ (بمبئی ۱۸۷۷ء) بحوالہ گزیٹیر شہر بمبئی ج ۲

بھیم واڑی: کولی مانجھیوں اور مچھیروں کے اِن ویران جزیروں میں ایک اوتار اُتر آیا تھا جس نے ان کے لئے پربھا دیوی کا مندر بنوایا اور جہی کا دیتی میں "کھیڑا" بیل اور نائیگام میں کئی بھون بنوائے جن کی بُرجیاں ناریلوں کے اُونچے پیڑوں سے سر نکالے دُور دُھند اور دھوئیں میں ڈوبی ہوئی یا رفتنک پہاڑیوں اور وڈالا پربتوں سے نظر آتی تھیں جن کے بیچ نقرئی کھاڑیوں نے روپہلے خطوط کھینچ دیئے تھے ان جھکتی ہوئی سیال چاندیوں کے اردگرد ساشٹی کے نمکساروں کے نمک ریزے دھوپ میں ہیروں کی طرح چمکتے رہتے تھے ناریل، کیلے اور آموں کے جھنڈ دور سے زمرد کے ٹکڑے دکھائی دیتے تھے برگدوں (وڈ) سے گھری ہوئی وڈالا کی زمردیں پہاڑی کے دامن تلے بھیم راجہ نے بھیم واڑی قائم کی تھی، یہاں (نیاپیہ) یا راج سبھا، بیٹھک میں وہ اپنی پرجا کی فریادیں سنتا تھا، اس کے نیائے اور دان پن کی شہرت ہبنی جزیرے کے جنگلوں کے خود رو پھولوں کی مہکار کے ساتھ دور — دور تک پھیلتی چلی گئی، بھوٹی بھونگلے اور بھنڈاری پہلے ہی سے ان جزیروں میں آباد ہو چکے تھے ان کی بستیوں کو "مُن ملا" کہتے تھے۔ بھوئی واڑی، اور ٹھاکر واڑی اسی عہد کی یادگاریں ہیں، کاٹھیاواڑ کے ٹھاکر اور بنئے بھی آ آکر بسنے لگے تھے ان کی کئی پیڑھیاں پرنش پراؤ کے غزنوی راجہ کے سومناتھ پر حملہ کے بعد یہاں آکر آباد ہو چکی تھیں[۱]۔ یہ بھوؤں کی کہانیوں میں تو بھیم دیو خود ان کا اپنا راجہ تھا جس نے غزنوی بادشاہ کا سومناتھ میں سامنا کیا تھا، یہ بھوؤں اور اُن کے پروہت پالیشکر یا یجروید کی

---

[۱]: ابن الاثیر، بحوالہ ایلیٹ ج ۲ ص ۴۶۹

براہمنوں کے نئے قافلوں نے انہیں جزیروں میں ڈیرے ڈال دیئے۔ شلشٹی کے ساتھ
دیہاتوں میں ان کی جاتی کے لوگ برسوں سے آباد ہو چکے تھے۔ سلاھار راج میں یہ اعلا
عہدوں پر متاز رہ چکے تھے۔ گوداوری کی وادی سے پالشیکر اور کوکن کے پنچ کلشی بھی
بھیم واڑی میں بس گئے۔ وَڈوَل اور آگری بھی بھیم راجہ کے ساتھ آ کر یہاں آباد ہوگئے۔ بھیم راجہ
نے اپنے راج پروہت پرشوتم کاؤلے کو ملاڈ کا علاقہ داں میں [illegible]۔ اس سے پتہ
چلتا ہے کہ ساشٹی وشیہ کے کچھ حصوں پر بھی بھیم راج کا قبضہ تھا، فارسی کے چند اسناد سے
دگو جنکی تاریخی قدامت مشکوک ہے، یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ بمبئی کا بانی۔
پُراسرار کہانیوں کا ہی راجہ تھا جس کے اصلی خدوخال افسانوی دھند میں اُجاگر نہیں ہونے
پاتے مگر جو برسوں تک اوتار کے روپ میں نچلی جاتیوں کا معبود بنا رہا۔

ملک گیری اور توسیع پسندی استعماری طاقتوں کے سیاسی اور اقتصادی حربے تھے،
دکن کی دولت کے ڈھیر پہ قدم رکھ کر علاؤ الدین تخت شاہی تک پہنچ گیا تھا، اس کے جانشین
مبارک خلجی نے ۱۳۱۸ء میں دیوگری کے راجہ ہرپال کو رام کر کے کوکن کی راجواڑیوں اور
بندرگاہوں کو پھنسانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور سمندر کی لہروں نے خلجی مملکت کی سرحدی
چوکیوں کے قدم چومنے شروع کر دیئے۔ مہی کاوتی کے نئے بندر کی رونق، جزائر بمبئی کی جغرافیائی
وُسعت اور نو آبادیوں کی بڑھتی ہوئی عظمت اور دور —— سنجان کی تجارتی شہرت —— یہ
سب پہلے خلجی سامراج کی آنکھوں کا کانٹا بنی ہوئی تھیں اب۔ آنکھوں کا تارا بن گئیں،
پہلے دلی بادشاہت کا تصور اور جیا تھا اب خود بادشاہت کوکن کے قدم چوم رہی تھی،

---

۱ بمبئی کا عروج (انگریزی۔ ایضاً) ص ۳۴ سے ۲؛ گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۲۔ ص ۱۶-۱۷

مسلمانوں کی پرانی بستیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہمگر سمندر کے کنارے قمنبا دیوی اور مہا لکشمی کے پراچین مندروں کی بنیادیں[1] ہل گئیں۔ دابھول اور چیوک کے نگر دلیو راجہ اور مہی کا وتی کے پرتاپ دیو راجہ نے خود اپنے کانوں سے ترکوں اور افغانوں کے "بگیر! بکش ہلا" کی للکاریں سنی ہوں گی جو کلیانا سے رے کرشنشتی کے ساتھ دیہاتوں اور مہا کاوتی تک گونج رہی تھیں ۔ دوڑ کھاڑیوں سے پرے دھند میں اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کو وہ دیکھتے ہوں گے جو شری استھانک کے نوجی پڑاؤ میں جلتے ہوئے الاؤ اور کافوری روغنی مشعلوں سے اٹھتے تھے۔ شری استھانک کا پوترا استھان اب مسلمانوں کا فوجی محاذ بن گیا تھا جہاں ملک ۔حاکم شہر اور قاضی شہری وشرعی حقوق وامور کا نگہدار تھا، ساشٹی اور کلیانا خلجی مملکت کے (رائے نام) پرگنے بنا دیئے گئے تھے ۔ کلیان اور اس کا ماتحت قصبہ بھیم واڑی اب اسلام آباد[2] کہلانے لگے تھے۔ بھیمڑی میں گوری پاڑہ تک جوھار کے کولی راجہ جلیہ کا راج تھا۔

تھانہ جو ایک شہر تھا : گو دلی دور تھی مگر ہر دار و گیر کی خبر دارالسلطنت تک برابر پہنچتی رہتی تھی جیسا کہ چار فرانسیسی سیاح راہبوں کے حادثہ قتل سے ثابت ہوتا ہے فرائرس جورڈونس اور اس کے ساتھی راہب اوڈوریق جو ۱۳۲۱ء میں تھانہ آئے اور تین برس یہاں مقیم رہے اس

---

[1] : گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۲ ص ۱ ۔ بمبئی کا عروج ص ۱۵

[2] : جرڈوس "کونکن" صفہ ۱۸ ۔ جرڈوس صرف کلیان کو اسلام آباد لکھتا ہے۔ مگر دراصل یہ نام بھیمڑی کو دیا گیا تھا ۔ جیسا کہ قدیم فارسی دستاویزات سے ثابت ہوتا ہے۔ دیکھئے "تذکرہ حضرت دیوان شاہ بھیمڑی. ڈاکٹر مومن محی الدین

قدیم شہر کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"مسلمانوں نے سارا ملک غصب کر لیا ہے، اُن گنت مندر ان کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں، کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لئے گئے ہیں اور اب یہ عبادت گاہیں ان کا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔" سارا شہر جو کبھی راجہ لیڈس کے سامراجیہ کا حصّہ تھا گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ برسوں پرانے بوڑھے برگد اپنی جٹائیں زمین پر گرائے اونگھتے کھڑے تھے۔ جن کے سروں پر چیل کے برابر چمگادڑیں بسیرا کرتی تھیں۔ [بڑے دادا کو پراچین کال کی نجانے کتنی پیاری کہانیاں یاد ہوں گی] بڑے بڑے پتّوں والے نو باب کے درخت (افریقہ کے جنگلوں کی جھلکیاں پیش کرتے تھے) کٹھل کے پیڑوں کے کھوؤں میں کتوں کے ڈیل ڈول جیسے گھونس گھسے پڑے تھے، بن بلاؤ اپنے سیاہ گوش اونچا کئے ان کے ارد گرد گھوما کرتے تھے، تاڑ کے اونچے پیڑوں پر تاڑی نکالنے والے (بھنڈاری) چڑھتے اترتے دور سے نظر آجاتے تھے، یہ جنگلی کھجوروں (سیندھی) کے درختوں سے بھی شراب کشید کرتے تھے جو یہاں کے باشندے اپنی خوراک چاول کی دلیا کے ساتھ پیتے تھے، ناریل کے گہرے جھنڈوں میں سے جب ساحل کی طرف سے آتی ہوئی نمناک ہوائیں گذرتی تھیں تو اونگھتے ہوئے گدھ بھی پنکھیا پتوں پر ڈولنے لگتے۔ آموں کے کسملند سالیوں میں سانپ لہراتے رہتے تھے ان کی پوجا ہوتی تھی، ماگوان کی گھنیری چھاؤں میں گینڈے اور تیندوے لوٹتے پوٹتے نظر آتے تھے۔ (وَوْلا کے ہرے بانسوں کی ٹھنڈی کچھاروں میں) چیتا اپنی مکار آنکھیں بند کئے لیٹا بندروں کی اچھل کود دیکھتا رہتا تھا، لنگوٹی کسے ہوئے کالے کلوٹے ادیباسیوں کو کلہاڑی اور ڈھال لئے دیکھ کر اکا دکا بن مانس پر تیکھ پہاڑیوں کی طرف بھاگ جاتا ہوگا۔ دور کھیمبڑی میں انجور کے کنارے تک پھیلی ہوئی سمندری خلیج کی ٹھنڈی ریت پر اور کچی مہندی کی باڑھوں میں مگرمچھ

کیچڑ اور دلدل میں لپٹا ہوا لیٹا ہوا نظر آجاتا تھا۔ باربرداری کے لئے اُونٹ تھے اور نہ بھوسے یا ہاتھی۔ ناکارہ گدھے کھاڑی کے کنارے براہمنوں کی اُکھاڑیوں میں گنے کے پودوں پر منھ مارتے رہتے تھے۔ (یہ گنا تتاشیر بنانے کے لئے اُگایا جاتا تھا) سواری کے لئے گھوڑے نہ تھے (بحری قزاقوں کی وجہ سے اس بندر سے عراق و عجم کے گھوڑوں کی تجارت ختم ہوچکی تھی) صرف بیل گاڑیاں تھیں اور یہی بیل ہل چلانے کے لئے بھی جوتے جاتے تھے۔ بیلوں کی پوجا ہوتی تھی، تلسی کا پیڑ بھی پوتر مانا جاتا تھا، اشیائے خورد و نوش میں چاول اور گیہوں کے کھلیان بھرے رہتے تھے۔ تل، ادرک، اور گھی کی افراط تھی۔ مقامی باشندوں میں چنڈال بھی تھے جو سب سے نچلی جاتی کے لوگ تھے، یہ مُردار کھاتے تھے، سرپھٹول اور مار پیٹ بچوں کا کھیل بن گیا تھا لیکن یہ سارے کافر اپنے معاملات میں بے حد ایماندار اور راست باز تھے اور ان کی عدل پسندی نے رواداری کی پرانی روایتوں کو اس وقت تک زندہ رکھا تھا اس لئے یہ عیسائیت کے تبلیغی وعظوں کو خاموشی سے سنتے تھے، ان کے برخلاف مسلمان کچھ ماننے کے روادار نہ تھے (مسلمان سو برس پہلے کی صلیبی جنگوں کی تلخیاں بھرے تھے) کافروں (اور بیاسیلوں) کے بیاہ کے وقت دولہا گھوڑی کی دمچی پر دلہن کے پیچھے بیٹھا اُسکے آگے چھُرا تانے رہتا تھا (آگے چل کر ازدواجی زندگی کی تلخیوں میں یہ چھُرا بیوی کی گردن پر چل جاتا) دولہا کے سر پر لمبی نوکدار ٹوپی ہوتی تھی اور مکھ پر سفید چنبیلی کا مکٹ گرا ہوا ہوتا تھا ان کے جسموں پر اور کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا، شب عروسی بسر کرنے کے بعد صبح دولہا دلہن برہنہ باہر نکلتے تھے، باراتی عورتیں گاتی بجاتی بانس کیلے کے پتوں اور تاڑ کی چٹائیوں سے بنے ہوئے لگن منڈپ تک ساتھ جاتی تھیں۔ اونچی جاتی میں ستی کا رواج تھا بعض،

جاتیوں میں مردے کی ارتھی دھوم دھام سے اٹھاتے تھے اور کسی بنجر کھیت میں اسے درندوں اور چیل گدھوں کے کھانے کے لئے چھوڑ آتے تھے۔ تھانہ کی سخت دھوپ میں مردار جلد سٹر گل جاتا تھا، تھانہ کی بندرگاہ سے بھڑوچ اور ملیبار تک تجارت ہوتی تھی۔ خلیج فارس اور حبش سے تجارتی رابطہ ابھی تک برقرار تھا[۱] ابن بطوطہ جب ادھر سے گذرا (۱۳۵۰ء) تو یہاں سے جہاز عدن تک جایا کرتے تھے۔ پارسیوں کے علاوہ تھانہ میں نیز نسطوری عیسائیوں کے گھرانے آباد تھے۔ راہبوں کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ گویہ ملنسار تھے مگر جہالت کی وجہ سے فرقہ بندی کے شکار ہو چکے تھے[۲]۔ پارچہ بافی کی صنعت جس کا ذکر عرب سیاحوں نے بھی کیا ہے۔ پانچ ہزار گھروں تک پھیل گئی تھی ان پر مخمل بنے جاتے تھے[۳]۔

تسلطِ تغلق:

خلجیوں کے خاتمہ کے بعد تغلقوں نے اپنا تسلط دور دراز دکن پر جنجیرہ تک قائم رکھا۔ زراعتی نظام کے سارے تار و پود ان کے ہاتھوں میں آ چکے تھے جیسا کہ ۱۳۴۳ء کے ایک فارسی محضر نامہ[۴] سے جو سر دیشمکھی عہدہ کے بارے میں ہے توثیق ہوتی ہے، اگلے پیدرہ

---

۱ تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳ حصہ ۲ صفحہ ۴۴۰ - ۴۳۹، گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۲ صفحہ ۱۸

۲ بیرنے۔ کوکن۔ صفحہ ۶-۵ تھانہ گزیٹیر۔ ایضاً

۳ : یُیل۔ مارکو پولو۔ ج ۲ صفحہ ۳۳۱

۴ V.T: GUNE, The Judicial System of the Marathas, (Poona, 1953) No. 1 P. 141.

برسوں تک کوکن پران کی سیاست کا سایہ بڑھتا رہا، مقامی راجہ اور رائے اپنے سوراجیہ کو دلی سامراجیہ کے سیاسی بندھنوں میں جکڑتا دیکھ کر اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے تھے، ان کا سیاسی ردعمل غیر جدلیاتی نہ تھا کیونکہ ان کی زوال آمادہ سنسکرتی اپنی فرسودہ قدروں کے ساتھ نئی مسلم تہذیب اور مدنیت کی قدروں سے الجھ رہی تھی اور وہ اپنے تہذیبی اثاثہ کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالا دینے کی ناکام جدوجہد کر رہے تھے، وہ اپنا سماج اور مفاد خطروں میں گھرا دیکھ رہے تھے، مگر مسلم اقتدار کا گھیرا پھیلتا بڑھتا جا رہا تھا۔

بھانسہ اور کالو (کلیان) کے دوآبہ میں واسندری اور تتوالہ کی قدیم بستیاں قدیم تجارتی خطوط پر آباد تھیں، یہیں سے خلجی عہد کے جو چند سکّے دریافت ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلی سلطنت کا سکّہ یہاں تک چلتا تھا۔ اور دلی کا بازار یہاں سے دور نہ تھا، ابن بطوطہ نے ملک ہوتنگ (۱۳۲۳ء) کی بغاوت کے بارے میں لکھا ہے، کہ جب وہ کوکن کے بربرے (مرہٹہ دیس) راجہ کی پناہ میں چلا گیا تو الغ خان نے (جو بعد میں محمد بن تغلق کے نام سے بادشاہ بنا) ہوتنگ کے باغی ساتھیوں کی سرکوبی کے لئے کلیان کے زمینداروں (اور پالیگاروں) کو حکم دیا تو انہوں نے اس حکم سے سرتابی نہیں کی۔[1] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دلی کے تسلط کے آگے یہ سارے سرنگوں ہو چکے تھے، اسی طرح جوہار کے کولی راجہ کو جب ۵ جون ۱۳۴۳ء میں تغلق بادشاہ نے "شاہ" کا خطاب دے کر

---

1. N. Venkataramanyya, The Early Muslim Expansion in South India, (Madras 1942) pp. 111-112

بائیس قلعوں کا دھنی اور نو لاکھ روپے لگان کی ریاست کا غنی بنا دیا تو وکرم شاہ تینتہ کے لئے تغلق آقا کا بندۂ بے دام بن گیا۔ یہ دِن جوھار ریاست کی تاریخ میں اتنا اہم ثابت ہوا کہ ایک نئی تقویم کی بنا ڈالی گئی اور دفتری کارروائیوں میں جس کا مدتوں رواج رہا۔

جوھار وارلی اور کولی ادیباسیوں کا دیس ہے جو سوریہ اور تھر کوہستانوں کے فصیلوں سے گھرا ہوا ہے اور گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا ہے، جہاں سے ساگوانی شہتیر پانی کے راستے سے گھوگا (کاٹھیاواڑ) بھیجے جاتے تھے، جنگلوں کی بہتات میں درندوں کی افراط تھی، چیتا، تیندوا، ریچھ، سیار، لومڑی، اور کولھا کی قدیم نسلیں آج بھی موجود ہیں۔ دھیرجی، سوریہ، بھنجلی اور واگھ کی جلترنگ بجاتی ہوئی روپہلی ندیوں کے کنارے سانبھر چپ سادھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ ہرنوں کی ڈار پانی پیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ چیتل اور دیگر چوپائے جنگلیوں کے تیر بھالوں سے محفوظ رہنے کے لئے گھنے جنگلوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ پھر ایک دِن اس وارلی راجواڑی کا ایک کولی نوجوان پابیرہ یا جبیبہ جو تقل گھاٹ کی وادی میں مکنے گاؤں کی مٹی سے بنی ہوئی گڑھی کا مالک تھا، پیری شاہ صدرالدین چشتی کی زیارت کے لئے آنکلا جو اس وقت وہاں تبلیغ کی خاطر سکونت پذیر تھے۔

شاہ صدرالدین چشتی :- حضرت بدرالدین چشتی کے مرید و خلیفہ تھے، مولانو الذکر جنوبی کوکن کے پہلے صوفی بزرگ تھے جن کی ۷۲۱ھ یا ۷۳۰ھ کے لگ بھگ قلعہ بیندہ میں شہادت ہوئی تھی، غالباً یہ حضرات بھی شمالی ہندوستان سے "پالکی" کے ساتھ

ا: Aitchinsons. Treaties and Engagements IV 321

دکن آئے تھے جس میں سات سو پالکی نشین بزرگانِ دین تھے۔ مُرشد نے اپنے خلیفہ کو گلشن آباد ناسک کی ولایت تفویض کی تھی مگر چونکہ وہاں شاہ محمد صادق سرمست حسینی آنے والے تھے۔ اس لئے یہ ناسک سے دور (اگت پوری سے قریب) قصبہ پمپری میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے رُشد و ہدایات سے تالیف قلوب فرماتے رہے۔ آپ کی وفات کا سال ۸۷۶ھ بتلایا جاتا ہے [غالباً یہ ۷۷۶ھ ہوگا] [۱] تصوف میں ایک مثنوی کب محویت یا انوار للکا شفین کا پتہ چلتا ہے۔

پمپری (کسُور گھاٹ) سے لے کر ناسک اور ترنبک تک دیوگری کے رام راجہ کے بھائی گوپی راجہ کی مہا منڈلیشوری پھیلی ہوئی تھی، سیپا کی ترائی سے لے کر بھیمڑی میں گوری پاڑا تک اس کے بھتیجے کا راج تھا، ـــــ ابھی حبیبہ دُعا طلبی کے لئے در درویش پر حاضری تھی

۱: "تذکرۂ ادبیاء دکن"۔ مولوی عبدالجبار خاں، صفحہ ۶۳۸ "اردو مخطوطات" مرتبہ حامد اللہ ندوی صفحہ ۸۲۰۸، "دکن میں اردو" (چوتھا ایڈیشن) ص ۳۷ مذکورہ بالا کتاب ۷۶۲ھ میں تصنیف ہوئی۔ اگر یہ شاہ صدرالدین کی تصنیف ہے تو یہ کوئی اور صدرالدین ہوں گے، پمپری کے شاہ صدرالدین کا سالِ وفات ۸۷۶ھ سے بھی ایک صدی پہلے ان کے خلیفہ شاہ بدرالدین کے زمانہ وصال کے قریب ہوگا۔ جیسا کہ ادیبہ حبیبہ کے قصے سے اندازہ ہوتا ہے پمپری میں آج بھی شاہ صدرالدین کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔ درگاہ سے متصل مسافرخانہ ہے جسے بھیمڑی کے ایک مخیر شرف الدین غلام محمد فقیہہ نے بنوایا تھا۔

دینے نہ پایا تھا کہ پانچ کولی سادھوؤں نے اُسے جوہار کا راجہ کہکر مخاطب کیا اور آشیرباد دی۔ یہ شاہ صدرالدین کی دعا تھی کہ سادھوؤں کی پیش گوئی ۔ جیّبہ بہت جلد دھرم پور ادرپنیت کے کولی جرگوں کا سرغنہ بن گیا، کاٹھیاواڑ تک دھاوے مارنے لگا۔ سات سال بعد جب جوہار لوٹا تو وارلی راجہ سے بیل کے کھال کے برابر زمین طلب کی تاکہ اطمینان سے زندگی بسر کر سکے ؛ راجہ کا اقرار جیّبہ کا فریب بن گیا، کھال کے ٹکڑے کر کے چاروں طرف اتنا پھیلا دیا کہ وارلی راجہ کی ریاست کو محیط کر لیا، گمبھیر گڑھ جو جوہار سے بارہ میل شمال مغرب میں ہے، وارلی راجہ کا گڑھ بن کر رہ گیا اور سارا جوہار ۔ پاپیرا کے گلے کا ہار بن گیا؛ گوری راجہ کے بھتیجے کو نیچا دکھا کر کوکن کا مالک بن بیٹھا۔ اور جب اس کا بڑا بیٹا نیم شاہ جوہار کی گدی پر بیٹھا تو دلی بادشاہ کو بھی اُسے کوکن جوہار کا راجہ تسلیم کرنا پڑا۔ اُس وقت گوری پاڑہ (بھیمڑی) سے پرے کاموری کھاڑی اور الہاس ندی کے اُس پار ممبئی کے جزیروں میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔

ممبئی: یہاں نگرو کیہ کے سرچڑھے سرداروں جے چوری اور بتھورا نے سنہ تھا کھونگلے کے سروں میں سرکشی کا سودا سمایا تھا، لگان بڑھا دینے سے کسانوں کی پریشانیاں بڑھ گئیں ۔ اور جب ممبئی کے بھنڈاریوں کی برہمی بغاوت بن گئی تو یہ دونوں سردار جان بچا کر وڈنگر (گجرات) بھاگ گئے، یہاں تغلق امیران صدہ تو اُدھار کھائے بیٹھے تھے، خوابوں کے جزیروں کی دولت آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ؛ تیکو جو غالباً نوساری کا مالک تھا فوج لے کر چڑھ آیا، ایک دستہ نے پرتاب دیو کے بسائے ہوئے قصبہ پرتاب پور[1] (مرول۔ اندھیری) کو گھیر لیا اور دوسرے نے تھانہ کا محاصرہ

---

[1] پرتاب پور آج پرداپور یا پرجاپور کے نام سے ایک ویران گاؤں ہے ممبئی کا عروج (انگریزی)، ص ۳۵

کر لیا، ایک تیسرے فوجی دستہ نے بھی کاویتی پر ہلّا بول دیا جو اُس وقت نگر دیوی کی رانی کی راجدھانی تھا، جب دیو گھرانے کی لاج اب اُسی کے ہاتھوں تھی، سیوک ساتھ تھے مقابلہ میں ڈٹ گئے مگر اس کی گردن کٹ گئی۔ اور راجدھانی لُٹ گئی۔ جبھی کاویتی کے بعد مرگاؤں جزیرے میں لڑائی چھڑ گئی، کھاتیکلہ (بھایا کلہ) کے میدان میں دُو بدُو آخری جھڑپ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، دشمن کی فوج کھیت رہی اور بھیم دیو کی پچاس سالہ حکومت کی قسمت پر موت کی مہر لگ گئی۔ (۱۳۴۷ء) پرتاپ پور اور وسئی ملک نیکو اور ایک دوسرے امیر صدہ کے محاذ بن گئے۔ اور نوساری سے لے کر بھی کادنی تک کا علاقہ زوال پذیر تغلق سلطنت کا آخری "ستق" بن گیا جس پر عرصہ تک خلجی ملک اپنی ملکیت جتاتے رہے مگر جب محمد بن تغلق کے بھتیجے ظفر خان نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے ۱۳۹۱ء میں گجرات کی مظفر شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی تو اُس نے اپنے حاکموں کو مقرر کرنا شروع کر دیا۔[1]

بساطِ سیاست کے دو نئے شاہ۔ دکن اور گجرات:

ماہم کے نئے حاکم ملک الشرق نے زمینوں کی پیمائش کر کے مالیہ کی نئی شرحیں مقرر کیں تو مہمی کے کاشتکاروں میں گجراتی حکومت کے لئے وفاداری کا جذبہ پیدا ہونے لگا، تھانہ کا مقامی رائے ۱۴۲۹ء تک شاہِ گجرات کا باجگذار رہا۔ اور یہی اطاعت دکن کی بہمنی حکومت کی رقابت بن گئی۔

بہمنی حکومت کا وجود تغلق سلطنت کے زوال کا نتیجہ تھا۔ جس نے امیرانِ صدہ سے

---

[1]:۔ تاریخ فرشتہ۔ اردو ترجمہ۔ مولوی فدا علی طالب (حیدرآباد ۱۹۲۶ء / ۱۳۴۴ھ) ج ۲۔ صفحہ ۳۹۵

بغاوت کا علَم بلند کرایا اور علاء الدین بہمن شاہ کا (جو حسن گنگو کے نام سے مشہور ہوا) پرچم بغاوت سب سے زیادہ بلند تھا، ۱۳۴۷ء میں دکن میں پہلی خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی۔ مرکزی حکومت کی کمزوریوں نے ہندو باجگزاروں کو بھی مضبوط کر دیا، ہری ہر اور بکّا نے بہمنی سلطنت کے مقابلہ میں ۱۳۳۶ء سے ایک نئے راج کی بنیاد ڈال چکے تھے، مسلم اقتدار اور تمدن جب ہندو روایات وا قتدار سے دوچار ہوئے تو ردِ عمل کے طور پر ہندو مصلحین نے راج نیتی کو دھرم کے ساتھ گڈ مڈ کر کے جنوب سے ترکی تسلط کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنی تحریکیں شروع کر دیں شنکراچاریہ مادھو دِ دراین ایسا ہی ایک ہندو سدھارک تھا۔

حسن گنگو بہمن شاہ نے گلبرگہ کو اپنی پایگاہ بنا کر اسے قرونِ وسطی کے شہروں کا گلِ صد برگ بنا دیا مگر اس طرح گلبرگہ کے چمن زاروں سے کوکن کے سبزہ زار دور رہ گئے! اور یہاں مقامی راجہ اور راجے چین کی بنسی بجاتے رہے مادران کے جنگی جہاز بندرگاہوں میں لنگر انداز ہو گئے اور قزاق کشتیاں گھاٹ اتر کر بہمنی مملکت کی سرحدوں پر چھاپے مارنے لگیں، اور انہوں نے خود قزاقی کا بیڑا اٹھا لیا۔ دابھول جو بہمنی ریاست کی بیرونی تجارت اور مواصلت کے لئے اہم بندرگاہ ثابت ہو سکتا تھا ۱۳۵۰ء میں اس مملکت کا بحری دروازہ بن گیا گو اس پر قبضہ عارضی ثابت ہوا کیونکہ وجیانگر کی حریف حکومت اس پر دوبارہ قابض ہو گئی۔ بہمنی مملکت کی سرحد ایک طرف سمندر کی لہروں سے پابہ زنجیر ہو گئی اور مغرب شمال میں کولھار (کراڈ) تک سہیادری کا دامن چھونے لگی، گلبرگہ سے لے کر دابھول تک بہمنی اقلیم کا ملک [1] سیف الدین غوری مقرر ہوا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ (انگریزی ترجمہ) برگیس۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۵

پڑوسی راجاؤں کی شرانگیزیوں کے سبب دابھول کا تجارتی و سیاسی مستقبل ڈانوا ڈول ہی رہا۔ گو چیلون اور راجاپور کی تجارت کسی حد تک چمک اٹھی تھی۔ ادھر مہی کا وینی اور ساشٹی جزیروں میں جہاں بھنڈاری بڑی تعداد میں آباد تھے گجرات کا مظفر شاہی دور تا بھونگلے سرداروں کی سرکشیوں کے سبب خاک میں مل چکا تھا، آٹھ سال تک وہ سندوراج دوبارہ قائم کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارتے رہے[1]۔ نایکوں، راجاؤں اور پالیگاروں کو وجیانگر کی بڑھتی ہوئی طاقت سے شہ ملی تو وہ بھی بساط سیاست کے اہم مہرے بن گئے۔ اور مسلم شاہی کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ جوہار کا کولی شاہ اور بھیمڑی کا راجہ ماہولی کے کوہستانوں میں، رائے گڑھ کا رائے ناگوٹھنہ سے قریب زیو کھلی کے درّے تک اور رتناگیری کا نایک وشال گڑھ میں قلعے سنا کر سیاسی داؤ پیچ میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ "شہ" کو مات دینے کی ترکیبیں سوچنے لگ گئے۔ جنوبی کوکن میں پلوارا، ماچال اور رنگ مدنگنا اور کھیلنا کے راجہ کھل کر تزاقی کا تخریبی کھیل کھیل رہے تھے[2]۔ بہمنیوں کو بھی کوکن کی اس طوائف الملوکی سے کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا، تاں کوکن کی سیاست میں اُن کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔ کلیان۔ اسلام آباد (بھیمڑی) میں اُن کے قدم جم چکے تھے فیروز شاہ بہمنی (۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء) کے ایک اصل فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ "قصبہ ہائے کلیان و اسلام آباد" دارالسلام بن چکے تھے جہاں قدیم نایطی گھرانے عرصہ سے سلامتی کی زندگی گذار رہے تھے۔ ان میں مولانا قاضی محمد کا قبیلہ بھی تھا جس کی اولاد و احفاد، کو بہمنی

---

[1] : بہمنی کا عروج - ص۴۵

[2] : نیرنے۔ کوکن۔ صفحہ ۳۱ محمود گاواں۔ ریاض الانشاء ص۶۳-۱۶۱، ص۱۷۰، ص۱۷۹

بادشاہ نے بطورِ صرف مالحیاج انہیں قصبوں میں جاگیریں انعام میں دی[1] تھیں۔ اسی عہد میں یہاں مہائم کے مخدوم شیخ علی کا گھرانہ بھی آباد تھا۔

چودھویں صدی کے اواخر میں جب بہمنیوں نے تھانہ اور قصبہ ماہی کلیان و اسلام آباد کے کلیدی محاذوں پر تسلط جمالیا تو تھانہ اور مہائم کی بندرگاہیں دونئی حریف سلطنتوں کی بحری قوتوں کا مظہر بن گئیں۔ جہی کا دیتی۔ مہائم بن کہ دوبارہ گجراتی قلمرو کا حصہ بن چکا تھا بظاہر مقصد تو باہمی دست درازیوں اور پڑوسی راجواڑیوں کی چیرہ دستیوں کا ہاتھ قلم کرنا تھا مگر یہ دونوں نئی حکومتیں سیاسی استحکام اور اقتصادی استقلال کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں تاکہ بدیسی تجارت کی اجارہ داری سے ان کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں۔ ملک گیری سے مستقل سرکاری آمدنی اور باج ستانی سے سرمایہ کی فراہمی یقینی تھی اس طرح باجگذار ریاستیں اندرونی تجارت اور عسکری نقل و حمل کے لئے مفید گذرگاہیں بن سکتی تھیں چیول کی قدیم بحری تجارت ابھی تک بیرونی ممالک سے ناطہ جوڑے ہوئے تھی۔ عرصہ دراز تک چیول کو ہی بہمنی سلطنت کی اہم بندرگاہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جہاں سے فیروز شاہ بہمنی اپنے شاہی جہاز اطراف کے ممالک بھیجا کرتا تھا۔ کہ بدیسی نوادرات مصنوعات اور ملبوسات کے علاوہ دانشوروں کو بھی سمیٹ کر دارالسلطنت پہنچایا[2] جائے۔ بندر بیوپاری اسی بندرگاہ کے ذریعہ ہرمز سے گھوڑے سراندیپ سے ہاتھی اور مشک اور چین سے سمور اور دیگر تجارتی اسباب لاکر دیا کرتے

---

(۱): فرامین و اسنادِ سلاطینِ دکن، (حیدرآباد ۱۹۶۳ء) فرمان نمبر ۱ ص ۲-۱

(۲) فرشتہ (انگریزی ترجمہ)۔ ج ۲ ص ۳۶۵

کی ساہوکار ریاست میں زیادہ منافع سے فروخت کر ڈالتے تھے۔ بہمنی اور وجے نگر کے مابین مسلسل جنگوں کی نوعیت نہ تو مذہبی تھی اور نہ سیاسی بلکہ یہ اقتصادی لڑائیاں تھیں۔ گوآ پر قابض ہونے کی بہمنی تمنا حسرت بن چکی تھی، تھانہ پر ان کا اقتدار مظفر شاہی حملوں کا بہانہ بن گیا۔ دابھول پر بہمنی دبدبہ قزاق راجاؤں کی شورہ پشتی کے سبب دب چکا تھا، بیرونی تجارت کے ان طلسمی دروازوں میں داخل ہونے کے لئے یہ سارے حریف چور دروازے ڈھونڈھ رہے تھے۔ سیاست کی عدالت میں پردیسی تاجروں کو لوٹنا، زائرین و عازمین مکہ کو ستانا اور امن و امان کو غارت کرنا سخت جرم قرار دیئے گئے ہیں۔ وجیانگر اور اس کے مہامنڈلیشوروں کے قزاق جہاز بحیرہ عرب کا بیڑا غرق کرنے کی غرض سے دابھول کے ارد گرد آسیب کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ بہمنی اپنی اس بندرگاہ کو حلقۂ صد کام نہنگ سے محفوظ رکھنے کے لئے تھانہ تک بحری بیڑوں کا جال بچھا رہے تھے۔ تھانہ کی تجارتی ساکھ برسوں سے بحری قزاقوں کے سبب اکھڑ چکی تھی اور بدیسی جہاز کھمبایت اور مہائم کا رخ کرنے لگے تھے۔ کھمبایت کا براہ راست تعلق محمد بن تغلق کے عہد سے دولت آباد سے قائم ہو چکا تھا اور بہمنی سلطنت کی تاسیس نے اس کا رشتہ گلبرگہ اور بعد میں محمد آباد (بیدر) سے جوڑ دیا تھا۔ دکن اور خاندیس کی خام پیداوار، گھریلو مصنوعات اور تجارتی اشیاء بگلان (ناسک) کی راجواڑی سے گذر کر نندربار اور سلطان پور کے ذریعے۔ اور دوسری طرف جنیر سے تھل گھاٹ ہوتے ہوئے جوہار کے کولی راج سے

م ۱ :۔ ہارون خان شیروانی "دکن کی بہمنی سلطنت" انگریزی (حیدرآباد ۱۹۵۳ء) ص ۹۸ ۔ ۱۴۷

م ۲ : مطلع السعدین۔ عبدالرزاق سمرقندی۔ بحوالہ ریاض الانشاء ص ۲۰۴ ۔ ۲۰۵

گذر کر کھمبایت یا چہاں تُم بھیجی جا سکتی تھیں جُنیر، چاکن، کوہاڈ، وائی، اور مان کی راجدھانیاں
بہمنی حکومت کی اطاعت گذار تھیں۔ مگر جب ھار کا کولی راجہ گجرات کا پلّہ بھاری دیکھ کر اُس
طرف جُھک گیا تھا، ویسے بھی مظفر شاہی اُس کے قدیم آقا تغلق خاندان سے ہی متعلق تھے
کوکن کی بساطِ سیاست پر اپنے پیادوں کو آگے بڑھانے کے لئے کولی راجہ کو اہم مُہرہ بنانا
ضروری تھا کیونکہ اُس کی سرحد سے تھل گھاٹ کی بہمنی عملداری شروع ہوتی تھی۔
اِدھر اسلام آباد میں گوری پاڑہ تک جب ھار کا دبدبہ چھایا ہوا تھا گو یہ حصّے بہمنی مملکت
میں ضم ہو چکے تھے۔

شہ اور مات : سہادری گھاٹ کے سبھی راجہ وجیانگر سامراجیہ کا اقتدار تسلیم کرتے
تھے۔ احمد شاہ بہمنی (۲۲-۱۴۳۵ء) کی نظر میں یہ تسلیم تقصیر تھی۔ اُس کے نزدیک یہ سرکش
تھے جنکی سرکوبی کے لئے اُس نے ملک[۱] التجار خلف حسن بصری کو ۱۴۲۹ء میں کوکن بھیجا یہ
مہم بے حد کامیاب ثابت ہوئی اور اُس نے "بے انتہا دولت اونٹوں اور ہاتھیوں پر
لاد کر بارگاہِ بہمنی میں[۲] روانہ کی"۔ پانچ برس بھی نہ بیتے تھے کہ رائیری (رائے گڑھ) کے
رائے سنگمیشور (سونکھیر) اور وشال گڑھ کے راجاؤں نے خراج کی ادائگی سے ہاتھ روک
کر تلواروں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے، ۱۴۳۶ء میں دلاور خاں کی مہم اتنی کامیاب ثابت
ہوئی کہ سنگمیشور کا راجہ ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو گیا اور اپنی لڑکی کا ہاتھ علاء الدین بہمنی
کے ہاتھ میں دے کر اپنا ہاتھ مضبوط کر بیٹھا، اُس راجکماری کا مسلم نام پری چہرہ رکھا گیا
اور یہی ملکہ جہاں کی جو نصیر خان والئی خاندیس کی بیٹی تھی۔ حسد رقابت کا باعث بن گئی۔

---

۱ : تاریخ فرشتہ۔ ج ۱ صفحہ ۳۶-۱۳۵ ؛ ترجمہ (انگریزی) ۲ ص ۳۳ ، ص ۴۱۳

سوتیا ڈاہ نے اپنے باپ کو اکسایا تاکہ بہمنی حکومت پر قابض ہو جائے۔

راجاؤں کی اطاعت اور بغاوت کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ اپنے گھنے جنگلوں اور اونچے قلعوں میں گھات میں بیٹھے رہے۔ کوکن کی مہمات میں گھوڑوں کے تاجر خلف حسن بصری کو جو شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں تھیں اس نے اس کے حوصلوں کو مہمیز لگا دی اور ایڑ لگا کر اپنی سرحدوں سے آگے ـــــ مہائم اور تھانہ کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ مہائم کا پربھو حاکم رائے قطب جو شاہ گجرات احمد شاہ (۱۴۱۱ - ۱۴۴۲ء) کا کمدھی تھام چکا تھا۔[۱]

شاہ گجرات نے اپنی مقبوضات کی بازیافت کے لئے شہزادہ ظفر خاں کو افتخار الملک افتخار خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر جرار کے ساتھ کوکن روانہ کیا جس نے تھانہ پر قبضہ جمالیا۔ اسی اثناء میں دیو کا کوتوال مخلص الملک بھی ستر جنگی جہازوں کا قافلہ لے کر تھانہ کی خلیج میں مورچہ سنبھال چکا تھا۔ یہ گجراتی بحریہ آسانی سے اس خلیج سے نکلی ہوئی کھاڑیوں کے ذریعے ساشٹی اور جزائر بمبئی کے بیچ سے دھاراوی جزیرے تک پہنچ سکتا تھا۔ جہاں سے جزیرہ مہائم پر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے خلف حسن بصری نے مہائم کے پاس اس دہانے کو درختوں سے پاٹ دیا جہاں کھاڑیوں کے رد پہلی خطوط آکر ملتے تھے اور دوسری طرف سمندر دشمنوں کو نگلنے کے لئے بے قرار تھا۔ بہمنی سپہ سالار نے جزیرے کے کنارے کانٹوں کی باڑھیں کھینچ لیں اس طرح خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ کیونکہ گجراتی بحریہ نے اس بحری راستہ کو ترک کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار

۱: M.S. Commissariat, A History of Gujarat, (1938) vol I pp 88-89

کر لیا جزائر بمبئی (الُعمَانی[1] اور کولابہ کے درمیان سے) کا وانگا کر جزیرہ مہائم کے سمندر کنارے پہنچ گیا۔ اِدھر گجراتی بری دستہ نے بھی تھانہ سے کوچ کر کے [گوم بوَنی کے ذریعے اور پرتاپ پور (مرول) ہوتے ہوئے] جزیرہ ساشٹی کے کنارے محاذ سنبھال لیا تھا۔ اب ایک طرف دِیو کے دیو پیکر "فتح ماری" جہاز تھے اور دوسری طرف ظفر خان کی فتحیاب فوجیں تھیں۔ بہمنی سپاہیوں کے لئے راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ گھری ہوئی فوج کا قلع قمع ہو گیا۔ اس جنگ میں کتنے دکھنی بھینٹ چڑھے اس کا اندازہ تاریخ کو تو ہو مگر خود اِس صدی نے اپنے حال کی آنکھوں سے دیکھا کہ ریت کے مدفن میں وہ ہزاروں لاشیں برسوں سے دفن تھیں جن کو ریگزاروں نے اپنے تودوں سے چُھپا لیا تھا مگر ایک دِن مخدوم مہائمی کی درگاہ کے پاس سمندر کی تیز و تند لہروں کی یلغار نے ان تودوں کو بہا کر "گنجِ شہیداں" کی شہادت[2] دے دی۔ دکھنی بھگوڑوں کے لئے فرار کا راستہ یا موت کی وادی میں نکلتا تھا۔ یا جزائر بمبئی کی وسعتوں میں۔ جہاں کے ٹھاکروں، بھنڈاریوں اور کولیوں سے بچتے بچاتے اور اِملی، بھنڈی، کٹھل اور جنگلی درختوں میں چھپتے چھپاتے، ناریلوں اور کیلوں کے گھنیرے جھنڈوں میں دم لے کر بچے کھچے سپاہی چیول پہنچے۔ جب مہائم میں کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ تو ہنگاموں سے دور ایک گوشہ میں ایک صوفی عالم مشہورِ عالم تفسیر رحمانی کی تصنیف میں مشغول تھا ــــ!!

شاہِ دکن کی غیرت کے لئے یہ ہزیمت عبرت نہ بن سکی بلکہ ہمت بن گئی۔ اپنے شہزادہ

---

[1] : جسے انگریزی میں Old woman's Island کہتے تھے غالباً عمّان سے بنا ہے جو عرب اور ایرانی "سمندر کے ماہی گیروں" کیلئے استعمال کرتے تھے یہی علاقہ اب کف پریڈ کہلاتا ہے۔

[2] : بمبئی کا عروج۔ انگریزی ص ۵۶ ، گزیٹیر شہر بمبئی ص ۲۱

علاؤ الدین کو بھاری لشکر کے ساتھ خلف حسن بصری کی کمک پر بھیجا۔ سابشی کے کنارے دھان کے کھیتوں میں دو حریف شہزادوں نے پڑاؤ ڈال دیئے۔ عروس البلاد (ممبئی) کے لئے گجرات اور دکن سینہ سپر ہو گئے۔ ساٹھ ہزار گھڑ سوار فوج اور ساٹھ ہاتھیوں کی طاقت بھی بہمنی شہزادے کو شکست سے نہ بچا سکی۔ مظفر شاہی شہزادہ ظفر خان ظفریاب ہوا۔ دکھنیوں کی شکست گجراتیوں کے بہتر اسلحہ اور تجربہ کی بدولت نہ تھی بلکہ وہ خود باہمی نزاع سے کمزور ہو چکے تھے۔ بارگاہِ بہمنی میں دکھنی اور آفاقی ذہنیتوں کے تصادم نے بغض و نفاق کا جو محاذ بنا لیا تھا، اس نے عسکری محاذوں کو کھوکھلا ثابت کر دکھایا۔ گجراتی حکومت کا سیاسی تدبر نئی قدروں کا حامل تھا، وہاں سیاسی گھروندے نہ تھے۔ سماجی گھرانے ابھر رہے تھے جس میں رائے قطب کی حسین نو مسلم لڑکی شہزادہ فتح خان کی اگر ملکہ تھی تو اس کی پرچھائیں جاتی کے دلوں پر مظفر شاہی حکمراں تھی۔ دکن کی سرزمین پر قومی یکجہتی کی غالباً یہ پہلی کوشش تھی، اور دکن میں ابھی ایک مشترکہ ثقافت کی نیو پڑنے والی تھی۔ گو اس میں سیاسی مصلحت پوشیدہ تھی مگر یہ مصلحت بدعت تھی جس نے دکن میں گجراتی اقتدار کے طویل سفر کے لئے راہیں ہموار کر دی تھی۔

منہ میں رام رام بغل میں چھری: تاں دکن میں بہمنیوں کی شکست سے ان کے ملک گیری کے خواب ٹوٹ گئے۔ ادھر جنوبی کوکن کے سرکش زمینداروں، مرہٹہ پالی گاروں اور نائکوں نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ ان کی سرکوبی کے لئے ۱۴۵۲ء میں ایک زبردست مہم بھیجی گئی۔ سیہادری کے کئی قلعے سر ہو گئے اور شیر کے جیسا خود سر سردار بھی سر جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ ملک التجار اپنی سات ہزار دکھنی پیدل فوج اور تین ہزار عرب گھڑ سوار دستہ

عسکری طاقت سے اہم مرہٹہ سرداروں کی دوستی سمجھتا تھا۔

ایک روایت کے مطابق ملک التجار نے شِرکے کے سامنے "ترکِ شرک یا موت" میں سے کسی ایک کو قبول کرنے کی شرط رکھی تھی۔ دعوتِ اسلام دربنیادِ دینی فرض ہے اور رہ گیا معاملہ قتل وہ کسی فاتح مسلمان کے لئے کسی شرط کا حامل نہیں ہوسکتا' آئینِ سیاست کی رُو سے مصلحت تھی۔ مگر شِرکے کا مُوقف مشروط بھی تھا اور جیسا کہ بعد میں کھُلا ایک سیاسی فریب بھی۔ اُس نے یہ بہانا بنایا کہ جب تک سنگمیشور اور کھیلنا کا راجہ شنکر رائے جو اس کا حریف تھا زندہ رہے گا وہ شِرکے راجہ کے مسلمان ہو جانے کو بزدلانہ فعل تصور کریگا۔ اس طرح وہ ہمیشہ اس کے طعنہ وتشنیع اور سازش کا شکار رہے گا۔ اور شِرکے کے رشتہ داروں کو شہ دے کر اُس سے اُس کا پُرکھوں کا دیس چھین لے گا۔ اسی لئے بہتر یہی تھا کہ شنکر رائے کو پہلے مغلوب کیا جائے اور اس کا راج پاٹ شِرکے یا اس کے کسی سردار کو بخش دیا جائے۔ تاوقتیکہ ایسا نہیں ہوتا نہ تو وہ نئے دین سے اپنا ناطہ جوڑ سکتا تھا۔ اور نہ تو بارگاہِ بہمنی کی بندگی قبول کرسکتا تھا۔ ملک التجار اور معین الدولہ دکھنی کی اس مہم کا مقصد ہی کھیلنا کو سر کرنا تھا اب جبکہ "شِرکے جیسا وفادار اور لائق رہبر میسر تھا تو نہ راہ کی دشواریاں آڑے آتیں۔ اور نہ چوری کا ڈر اور نہ رہزنی کا کھٹکا تھا۔"

شِرکے کی رہنمائی میں بہمنی فوج سنگمیشور کی اُور چل پڑی۔ سنگمیشور جسے رام سیترکہتے تھے ہندوؤں کا مقدس مقام تھا جہاں پہنچنے کے لئے جنگل بیابان راہ میں پڑتے تھے۔ جہاں اندھیرے کا راج تھا اور خوف کا پہرہ۔ دکھنی اور حبشی سپاہیوں نے پہلے ہی قدم پر ساتھ چھوڑ دیا۔ دو دن کے محفوظ سفر کے بعد ایک پُرپیچ رہگذر سے

ملہ: مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتناگیری) صہ ۱۳۲-۱۳۳

ساری فوج گذرنے لگی۔ ایسا دہشت انگیز جنگل تھا کہ اُس کی ہیبت سے شیر کا زہرہ بھی آب آب ہو جائے۔ "پیچیدہ اور پُر اسرار راستے!! جسے دیکھ کر معشوق کا کاکل پیچاں اپنے اپنے بل بھول جائے۔ اور جہاں سے فرار کی راہیں اتنی دشوار کہ عشق کے دشوار گذار راستے بھی سیج نظر آئیں۔ کھڑی چٹانیں اور مہیب غار!! جن کو دیکھ کر دیو اور بھوت پر بھی دہشت سے جھرجھری آ جائے۔ ایسے آسیب زدہ ماحول میں نہ تو سورج کو جھکنے کی تاب تھی اور نہ قدرت کو دخل اندازی کا یارا تھا۔ لمبی لمبی گھاسوں کی نوکوں پر زہریلے سانپوں کی ڈاس تھی اور جھکڑوں میں اژدہے کی پھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ پانی میں زہر گھلا ہوا تھا۔ اور مسموم ہواؤں میں موت بسی ہوئی تھی۔"[۲]

خوفناک جنگلوں کے تنگ و تاریک دروں اور گھاٹوں کی بھول بھلیوں میں سر کھپا کر ساری فوج آشفتہ سر ہو چکی تھی۔ تھکن سے چور دہشت سے کمزور اور سفر سے مجبور ہو چکی تھی۔ پھر ایک سب سے زیادہ خطرناک گھاٹی آئی جس کی تنگ و تاریک گذرگاہ میں ہوا کا دم بھی گھٹتا نظر آتا تھا۔ تین طرف دیوپیکر عمودی چٹانیں راستہ مسدود کئے کھڑی تھیں۔ اور آگے وادی میں سمندر کی جیتی جاگتی چنگھاڑتی لہریں تھیں۔" نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ ملک التجار پیچش اور اسہال سے اتنا کمزور ہو چکا تھا۔ کہ نہ تو فوج کی تنظیم درست رکھنے کے قابل رہ گیا تھا اور نہ اخلاقی جرات برقرار رکھنے کے لائق۔ تھکن اور نیند نے جب سپاہیوں کو مغلوب کر دیا تو جس کا جہاں سینگ سمایا گھس پھس کر سو گیا۔ آندھیوں سے بکھرے ہوئے مٹیالے پھولوں کی طرح تتر بتر خیموں میں سارے نیند کی گہری وادیوں میں دفن ہو چکے تھے۔ لیکن موت سر پر کھڑی

---

[۱] تاریخ فرشتہ۔ (بریگس انگریزی ترجمہ) ج۔ صفحہ ۴۳۶۔ نیز نے۔ کوکن صفحہ ۱۳

جاگ رہی تھی۔

رہبر نے رہزنی کا اصلی روپ نکالا۔ شرکے نے پہلے ہی سے شنکر رائے کو اپنی سازش میں شریک کر لیا تھا۔ اب جبکہ صیاد کے جال میں شکار پھنس چکا تھا تو کاہے کی دیر تھی بڑی بھاری فوج کے ساتھ شبخون مارا گیا۔ نیند اور موت کے درمیان حائل دیوار کو ننگی تلواروں نے ڈھا دیا، بھیڑ بکریوں کی طرح انسان ذبح کر دیا گیا۔ جن کی دلدوز چیخیں اور دل ہلا دینے والی فریادیں طوفانی ہواؤں کے تیز جھکڑوں میں ڈوب گئیں۔ درختوں کے پتوں نے تالیاں بجا بجا کر غافل انسانوں کو جگانا چاہا مگر وہ گہری اور ابدی نیند سو چکے تھے۔ بیمار ملک التجار شہید ہو گیا[۱] اور اس کے ساتھ مدینہ نجف اور کربلا کے پانچسو سید کچھ حبشی اور دکھنی سلحدار اور ان کے دو ہزار باردار سپاہی صبح ہونے تک موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔

بہمنی حکمران سولہ برسوں تک اس بہیمانہ قتل عام کا انتقام نہ لے سکے۔ آفاقی اور دکھنی امرا میں اقتدار کی جو جنگ جاری تھی۔ اس نے اتنی مہلت کبھی نہ دی کہ شنکر رائے کے جانشین جاکھو رائے سے مواخذہ کیا جا سکے جو رینگنا اور کھیلنا کے مضبوط قلعوں کی اوٹ میں تین سو قزاق جہازوں کے جال بچھائے گھات میں بیٹھا تھا۔ وجیانگر سامراجیہ کی سیاہ رتی ہرا (دوم ۱۴۲۱ - ۱۴۷۷ء) کے راج میں ایک طرف گوآ اور دوسری طرف کرشنا کے کناروں تک پھیل چکی تھی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ دابھول، چیول اور کھارسے پاٹن کے ساحلوں پر وجیانگر کے جہاد لنگر انداز رہتے

---

[۱] تاریخ فرشتہ (برگس انگریزی ترجمہ) ج ۲ ص ۴۳۶ - نیز نے کونکن ص ۳۱

لگے تھے۔

محمود گاواں کی فتوحاتِ کوکن:

اسی دابھول کی بندرگاہ پر گیلان کا ایک تاجر محمود ۱۴۴۷ء میں تجارتی مال واسباب لے کر اترا تھا اور اس عالم و فاضل امیر کے بارہ سال بعد عثمانی ترکی خلیفہ کا ایک گمنام خوبصورت شہزادہ ۔ یوسفِ بے کارواں کی مانند بھٹکتا پھرتا بازارِ دکن میں بکنے کے لئے اسی بندرگاہ سے لایا گیا۔ یہ یوسف ۔ بعد میں یوسف عادل خان کے نام سے عادل شاہی سلطنت کا بانی بنا۔

محمد شاہ بہمنی کو خواجہ جہاں محمود گاواں جیسے وزیر باتدبیر کی خدمات حاصل ہو چکی تھیں، بہمنی عظمت اپنے اوج پر تھی مگر گجراتی اقتدار کا چڑھتا ہوا سمندر بھی کوکن میں تلابہ کے ساحلوں تک پھیل چکا تھا۔ یہی زمانہ تھا کہ گجراتی عمال اور بہمنی حفاظتی دستوں کی آپس کی چھیڑ خانیاں کبھی امن و مصالحت کی زلفوں کو برہم بنا دیتیں اور کبھی عہد و پیماں کے گیسوؤں کو اور سلجھا دیتی تھیں جیسن دلوی جسے بارگاہِ بہمنی سے شتاب خان کا خطاب حاصل ہوا تھا چاہتا تھا کہ اپنی جارحانہ کارروائیوں سے شتابی سے فارغ ہو جائے مگر گجراتی بھی موقعہ کی تاک میں تھے۔ جو اپنے مقبوضہ راجپوری پر دلوی کے حفاظتی دستے (چشم) کی نظر بد دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ "چشم" جس میں خود دلوی کے اپنے قبیلے اور برادری کے لوگ شامل تھے مرتضیٰ آباد (چیول) اور مصطفیٰ آباد (دابھول) کے درمیان گشت لگاتا تھا۔ محمود گاواں نے اپنے

لہ : ریاض الانشاء ۔ ص ۹۱ ۔ ۳۹

بادشاہ محمد شاہ بہمنی کی جانب سے سلطان محمود شاہ گجراتی کو جو مراسلے روانہ کیئے تھے اس میں وہ خود قدیم عہد نامہ کی اس قسم کی خلاف ورزیوں کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے[1] کیونکہ اس کی خارجی پالیسی یہی تھی کہ ہمسایہ حریفوں سے مقابلہ کے لئے مسلم حکمرانوں سے دوستانہ مراسم پیدا کئے جائیں۔ اس ضمن میں اس نے بیرون ملک کے امیر جہاں شاہ لاری سے بھی فوجی استعانت[2] کی استدعا کی تھی تاکہ سنگیشور، کھیلنا اور رنگنا قلعوں کے راجہ جاکھو رائے کی غارت گری اور وجیانگر کی پشت پناہی کی کمر توڑ دی جائے۔ اور اس طرح اس کے تین سو جہازوں کے بیڑے کو غرق کر دیا جائے جو سمندر میں مسلم مسافرین اور زائرین کی زاد راہوں پر رہزنی کرتے پھرتے تھے اور چول اور دابھول کی بندرگاہوں کو نگل جانے کے لئے منہ کھولے ہوئے[3] تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی مشہور فارسی شاعر اور صوفی کے نام خواجہ جہاں نے ایسے ہی ایک مراسلے میں یہ تحریر کیا ہے۔

"تا این اراضی کہ از زمان ماضی الی ھذا العہد بکواکب ھدایت مناقب اہل اسلام منور نگشتہ است۔۔۔ مسافرین بر و بحر از خوف و خطر کفار نابکار و شر و ضرر واسر و کسر فدیۂ غدار اخلاص یافتہ۔۔ محفوظ[4] مانند"

۱: ریاض الانشاء ص۳۹۰-۹۱

۲: ایضاً ص۲۰۵-۶

۳: ایضاً۔ ص۱۶۱-۶۲ ؛ ص۱۸۰-۸

۴: ایضاً:۔ ص۱۵۴-۵۵

خواجہ جہاں محمود گاواں صاحب سیف و قلم تھا۔ قلم کے ذریعے اُس نے گجرات
اور دیگر مسلم مملکتوں کے فرمانرواؤں کی تالیفِ قلوب کی اور تلوار کو تیشہ بنا کر کوکن
کے بلواڑہ، وشال گڑھ، ماچیال، کھیلنا، رینگنا، اور اورنگ قلعوں کی کوہکنی
کی۔ "دارالحرب بیجانگر" کے بندرِ عظیم گوآ کی فتح (۱۴۷۲ء) اور کوکن کی تسخیر بقول
فرشتہ محمود گاواں کا سب سے بڑا کارنامہ[1] تھا۔ گوآ بہمنی مملکت کا سب سے
زرخیز خطہ تھا، جہاں سپاری، تاڑ اور ناریل کے گہرے سائے کھپریل کی پوشش اور ڈھلوانی
چھتوں والے مکانوں پر ڈولتے رہتے تھے۔ نیشکر کے گھنے جھنڈوں اور تنبول کے
ٹھنڈے کنجوں کے درمیان بہنے والی روپہلی نہریں "روضۂ جنان و حوضِ کوثر" کی
آئینہ برداری رہتی تھیں[2]، کوکن کی مکمل فتح سے بہمنی سلطنت کی وسعتوں میں سہادری
کے کئی قلعوں کی سربلندیاں گم ہو چکی تھیں۔ اور گوآ سے دے کر آگاشی (البین) تک
(سوائے جزیرۂ سالسٹی کے) ساحلی علاقوں کی پہنائیاں ضم ہو چکی تھیں[3]۔ کلیان اور اسلام آباد
سرحدی کلیدی مقامات بن چکے تھے۔ گو ابھی تک ماھولی اور اطراف کے قلعے سر
اُٹھا کر کسی نئے قلعہ شکن احمد نظام الملک بحری کی راہ تک رہے تھے۔ ماھولی۔
(بھیمڑی) سے جوھار کے کولی راجہ کی ریاست اور گجراتی مملکت کی سرحد لگتی تھی۔
دابھول اور چیول بندرگاہوں کی گہما گہمی لوٹ آئی تھی۔

۱: تاریخ فرشتہ (انگریزی ترجمہ) ص ۱۱۶-۱۱۷

۲: ریاض الانشاء ص ۱۸۱-۱۶۱؛ تاریخ فرشتہ (انگریزی)۔ ج ۳ ص ۴۸۶-۴۸۵

۳: ایضاً: ص ۲۴۲-۲۴۴؛ COMMISSARIATE, HIST. OF GUJRAT VOL I PP. 204-5

دابھول کی بندرگاہ جسے بہمنی دَور میں مصطفیٰ آباد کہتے تھے۔ تہذیب این دین کی سب
سے بڑی منڈی بن گئی تھی اور یہی وہ بابِ الدکن تھا۔ جہاں سے ایران کے علمی تجارتی
مراکز سے آئے ہوئے ہزاروں حاجیوں، مسافروں، اور سوداگروں کے قافلے گزرتے
تھے، اسی بندرگاہ پر شاہ نورالدین نعمت اللہ حسینی کے روحانی جانشینوں خلیل اللہ اور
نوراللہ کے بجرے آکر ٹھہرتے تھے! اور یہیں سے محمد شاہی جہاز قیمتی تحائف لے کر ہرمز
پہنچا تھا تاکہ حافظِ شیراز کو "دعوتِ بیدر" پر بارگاہِ بہمنی کھینچ کر لایا جائے۔ اسی نے
سب سے پہلے ملک قمی اور آذری جیسے نامور شعراء کے قدم چومے اور محمود گاواں
جیسے مدبر اور علم دوست کی قدم بوسی کی اور اسی کے بازار میں عثمانیہ ترکی کا گمنام شہزادہ
یوسف عادل بکنے کے لئے لایا گیا۔ یوسف عادل خاں اسے جنتِ ارضی کا ٹکڑا کہا کرتا
تھا۔ جہاں ساری نعمتیں میسر تھیں۔ اور جس کی تجارتی گرم بازاری۔ بازارِ مصر کی یاد
دلاتی تھی[1] سنہ ۱۴۷۰ء میں روسی سیاح "اَفنسی اَش نکی تن جی ڈِک" کی بندرگاہ
میں لنگر انداز ہوا تو دابھول کی شہرت نے اس کی اُمنگوں کے بادبان کھول دیئے۔ اور جب
وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ یہاں عراق و عجم اور افریقہ کے تجارتی جہازوں کے بیڑے آکر ٹھہرتے
تھے جن میں تجارتی اسباب کے علاوہ مصر، عرب، خراسان اور ترکستان سے گھوڑے لائے
جاتے تھے۔ یہاں کی مخلوط آبادی میں ساحلی علاقوں کی ساری قوموں کے لوگ پائے جاتے تھے
اِن میں حبش کے سیاہ فام سِدّی بھی تھے، اور گورے چِٹّے نوائطی بھی۔ یہاں سے بیدر
اور گلبرگہ ایک ماہ کے فاصلہ پر تھے۔"[2]

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ ج ۲ ص ۳

[2] افناسی نکیتن کا سفرنامہ مطبوعہ Hakluyt Society لندن (۱۸۵۷ء) ص ۱۹ اور دیکھئے نیرنگ ماضی ص ۳۱

محمود گاواں کے دو قدیم نمک خوار ملک وجیہ اور ملک اشرف کی کوششوں کے طفیل وابول سے لے کر بہمنی مملکت کے سرحدی مقامات سلطانپور نندر بار (نندر آباد) اور بلگانا تک نہ چوری کا کھٹکا رہا تھا اور نہ رہزنی کا خطرہ۔ عازمین حرم کے قافلے بلا خوف و خطر اسی بندرگاہ سے سوار ہو کر دیارِ حبیب کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ مصطفیٰ آباد کی نواح میں حمزہ آباد تھا۔ اسے ایک گمنام امیر شاہ نصیر الدین اعظم خاں نے اپنے [بیٹے] کے نام پر بسایا تھا۔ اعظم خاں پیر کی درگاہ مدتوں مشہور رہی۔ بہمنی بادشاہ دابھول کشتی رانی کے لئے آیا کرتے تھے[۱]۔ سلطان محمد (دوم) بہمنی نے یہاں کئی یتیم خانے اور مدرسے قائم تھے

بہمنیوں کا زوال :

آفاقی اور دکھنی فرقہ بندیوں نے اتحاد کے بند کو توڑ ڈالا جس نے نفاق کے دھارے کو اس تیزی سے بہنے دیا کہ سلطنت بہمنی کی بنیادیں اکھڑ گئیں اور علاحدگی پسندی نے مجتمع قوتوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ ایک طرف محمود گاواں تھا جس کی آفاقی پاسداری، اور اقربا پروری نے اس کے منہ بولے بیٹے یوسف عادل خاں کو غلامی کی خاکساری سے اٹھا کر دولت آباد کی طرفداری (صوبیداری) کے علوِ مرتبت تک پہنچا دیا، فتح اللہ۔ عماد الملک بن کر سلطنت کا اعلا ستون بن گیا، دریا خاں اور دیگر ترکی امراء مثلاً قاسم بیگ، شاہ قلی اور خان سلطان ہر دلعزیزی

---

۱ : تاریخ فرشتہ (ترجمہ برگس) ج ۲ ص ۱۹۹۔ منتخب اللباب۔ ج ۳ ص ۱۴۵

حاصل کر کے دکھنیوں کا دل دکھانے لگے تھے۔ دوسری جانب پردیسی جتھے کے مدِ مقابل ایک نو مسلم تما بھٹ تھا جو ملک حسن بحری کہلاتا تھا اور جو اپنی لیاقت اور تدبر کے پتوار سنبھالے بحر کی طوفان خیز موجوں کی مانند جاہ و حشمت کے چمکتے ساحل پر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بحری سے سارنگ خاں بنا پھر میر شکار کا درجہ ملا، قوش بیگی کے عہدہ سے اس کا شہباز ہمت اُونچا اُڑا تو نظام الملکی کی اوج پر پہنچا[1]۔ جنوب میں راجمندری کا طرفدار (صوبہ دار) مقرر ہوا تو سارے دکھنی امراء اس کے طرفدار بن گئے اور جب اس کا حریف محمود گاواں شہید ہوا تو ملک حسن بحری نے بحرِ زخار کی طرح بپھر کر ساری سلطنت کو محیط کر لیا۔ وکیل السلطنت اور پیشوائی کے مرتبے کو پہنچا تو یہی آخری سرفرازی سرفروشی کا بہانہ بن گئی۔

ملک احمد بحری: عوام میں شہزادہ مشہور تھا اور خواص دُور اندیشی کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ع بالائی سرش ز ہوشمندی :: می تافت ستارہ بلندی ۔ تلواروں کی چھاؤں میں جوان ہوا اور دربار کی ریشہ دوانیوں سے بچتا بچاتا حریفوں کو نیچا دکھاتا جاہ و مرتبت کی رفعتوں کو چھونے لگا۔ بادشاہ محمود بہمنی کمسن تھا۔ مگر اس کا وزیر ملک حسن نظام الملک بحری گرگ باراں دیدہ تھا اور ریاست کے طرفدار کہنہ سال اور آزمودہ کار تھے ہر کوئی اپنے طرف (صوبہ) کی گدی پر بیٹھا اپنے تخیل میں بیدر کا تخت دیکھ رہا تھا

---

[1] دیکھئے: DR. Radhey Shyam, The Kingdom of Ahmadnagar, (Delhi 1966) PP. 17-22.

فرشتہ (ترجمہ برگس) ط۱۹۱ - ۱۹۰، منتخب اللباب ۔ ج۲ ص۱۴۱ - ۱۴۰

ملک احمد ایک نئی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا۔[1]

دولت آباد اور جنیر کا سارا علاقہ مرہٹہ پالیگاروں اور قلعہ داروں کی گرفت میں تھا۔ بادشاہ کی کمسنی ان کی سرکشی کی وجہ بن گئی۔ سرکاری لگان جنیر کے سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی بجائے طاقت بڑھانے پر خرچ کیا جاتا تھا۔ پانچ سال سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا تھا۔ باپ کی سفارش اور محمود شاہ بہمنی کے فرمان سے ملک احمد ۱۴۸۲ء میں دولت آباد اور جنیر نظم و نسق کی خاطر بھیجا گیا۔ اس کے حوصلے بلند تھے اسی لئے سربلند قلعے دیکھتے ہی دیکھتے سر ہو گئے۔ کوکن کے سارے محال بحال ہو گئے اور سارا علاقہ خوشحال ہو گیا۔ دکھنی اور خراسانی ملک احمد کے گن گانے لگے اور ہندو اس کا کلمہ پڑھنے لگے۔ امن کا دور دورہ شروع ہوا تو اس کی شہرت سن کر جاکن کے عالم زین العابدین (علی بالش دہی) پر سیاسی دیوانگی کا دورہ پڑنے لگا۔ بادشاہ کو ملک احمد کے خلاف بھڑکا کر حسد کی آگ بھڑکائی گئی۔ یہ سچ تھا کہ باپ اور بیٹے دونوں کے دماغوں میں ایک نئی سلطنت کا خاکہ ابھر رہا تھا۔ محمود شاہ بہمنی کی تقریب تاج پوشی تقریب ملاقات بن گئی۔ جبکہ یہاں بیدر کے دربار میں ملک احمد کے لئے جاہ و مرتبت ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ نظام الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا اور جنیر کی طرفداری سے نوازا گیا۔ مزید انعام یہ ملا کہ قلعہ جو سر ہو جاتے ملک احمد کی جاگیر ٹھہرتے۔[2]

۱: برہانِ مآثر (ترجمہ سرادلزلی ہیگ) مطبوعہ Journal Indian Antiquary ۱۸۹۹ء صفحہ ۷۱-۷۲، رادھے شیام صفحہ ۲۸

۲: برہان مآثر۔ صفحہ ۲۴۹-۲۵۰

بیدر کے واپسی کے بعد اس کے خواب بیدار ہونے لگے۔ شاہی الطاف واکرام نے دل بڑھا دیا تھا۔ اب حوصلے اور بڑھ گئے اور میدانِ عمل میں اس کی جلد جلد بھی بڑھتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آگے مرہٹہ سرداروں کے سروں اور قلعوں کے ڈھیر لگ گئے۔ شیونیر قلعہ کی فتح جو جنیر کے نواح میں ہے مزید شہ کا باعث بنی۔ جونہ، چکن، کھیج سوارتی (پونہ) کھیر ونڈ اور مور رکن کے قلعوں کی کامرانیوں نے اس کے قدم مغربی گھاٹ پر مضبوط کر دیئے۔ لوہگڑھ کا قدیم قلعہ جو بعد میں نظام شاہی مجرموں کے لئے قید خانے کا کام دینے لگا۔ ملک احمد کا سب سے مستحکم محاذ ثابت ہوا۔ لوہگڑھ کی فتح نے جھنڈ منگ، تکونا، کونڈانہ، موربدین، پورندھر، تنگی اور تردنی قلعوں کے دروازے کھول دیئے۔ بھرپ اور پالی قلعوں کی فتح نے رتناگیری تک اسی کا دبدبہ قائم کر دیا اور شیونیر سے پورندھر تک ملک احمد کا ڈنکا بجنے لگا۔ اور جب بھیمڑی کے نواحی جنگل کا سر بلند قلعہ ماھولی سرنگوں ہوا تو تال کوکن کا سارا علاقہ دھرم تر کھاڑی کے اس پرے ناگوٹھنہ تک ملک احمد کی ملکیت بن گیا، اسی کھاڑی کی دوسری طرف ساحلی علاقہ تک محمود شاہ بیگڑا والی گجرات کے جنگی بیڑے اینڈتے پھرتے تھے (بیگڑا کے جانشین بہادر شاہ گجراتی نے والی خاندیس محمد شاہ فاروقی اور برار کے عماد شاہی سے اتحاد کر کے دکن تک اپنا تسلط قائم کرنے کی کئی کوششیں کیں) — ملک احمد کے سامنے اب ایک اور اہم مورچہ تھا۔ دو کھاڑیوں کے سنگم پر آباد ڈانڈا راجپوری کے جزیرہ نما اور بندر گاہ کا محاصرہ کوکن میں اس کا نہایت اہم اقدام تھا۔

ملہ: برہان مآثر۔ صفحہ ۲۷؛ منتخب اللباب ج ۳ صہ ۱۴۳

اُمنگ اور جنگ: مگر پایہ تخت بیدر میں فتنے بیدار ہو چکے تھے اور یوسف عادل خان طرفدار بیجاپور اور دیگر آفاقی امراء کی آنکھیں بحریوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر کھل گئی تھیں۔ یوسف عادل خان کی شہ پا کر ایک طرف گو آکے کوتوال بہادر گیلانی کے سر میں شہریاری کا سودا سمایا تھا جس نے انھوں کو دبا کر اب چیول بندرگاہ کے چپے سنبھال لئے تھے۔ دوسری جانب محمود گاواں کا بہادر گیلانی ہی کی طرح ایک اور ماتحت زین العابدین۔ ملک احمد کو جنیر کا طرفدار تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا [۱]

ملک حسن بحری نے۔ خواجہ جہاں دکھنی اور ملک اُدجی کو بھیجا تا کہ وہ ملک احمد کے ساتھ مل کر زین العابدین کی سرکوبی کریں۔ زین العابدین حاکم چاکن نے یہ پیش قدمی دیکھ کر اپنے مددگار یوسف عادل خان کو پکارا جس نے فوراً ہی اپنی فوج کمک کے لئے بھیجدی اندا پور میں پڑاؤ پڑا۔ ملک احمد باپ کا حکم پا کر تعمیل کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے باپ کو ملک عدم سے حکم آگیا۔ وہ کوچ کر گیا تو ملک احمد بھی ڈانڈا راجپوری سے محاصرہ اٹھا کر آگے شیو گاؤں ماتھر اور بیڑ کو روندتا گوداوری تک کوچ کرتا چلا گیا۔ اب وہ احمد نظام الملک بحری تھا اور اس کی تلوار اپنے اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کے لئے ننگی ہو چکی تھی

اب نہ یوسف عادل خان میں جرأت تھی کہ احمد نظام الملک بحری سے ٹکر لے اور نہ اندا پور میں مورچہ ڈالی ہوئی اس کی فوج کو یہ حکم تھا کہ آگے بڑھے۔ نتیجہ

---

(۱): برہان مآثر صفحہ ۲۷ ، منتخب اللباب ج ۳ صفحہ ۱۴۳

یہ ہوا کہ زین العابدین تنہا نظام الملک بحری کے شبخون کی تاب نہ لاسکا۔ وہ اپنے ستّ سو ہمراہیوں سمیت کھیت رہا، چاکن سے نظام الملک کی مقبوضات میں ایک نئے قلعہ کا اضافہ ہوا۔ پھر جنگ باغ کی معرکہ آرائی ہوئی جس میں شاہی فوج کو جو نئے وزیراعظم قاسم برید کے حکم سے بھیجی گئی تھی چند بار بھاری نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئی[1]۔

احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کی بنیاد (۱۴۹۰ء)

بقول روسی سیاح نکی تن۔ اب احمد نظام الملک بحری سپہ سالاری کے دونوں طرف کے علاقوں کا مالک بن گیا تھا لکوکن کے سارے قلعے سر ہو چکے تھے۔ اور اب اس کے سر پر سفید چتر (شاہی) تھا اور خطبہ میں بہمنی شاہ کے نام کی جگہ اس کے شاہی القاب نے لے لی تھی۔ نظام شاہی سلطنت میں [بقول روسی سیاح نکی تن] "دیودں کا بنایا ہوا جنیر قلعہ اور اس کا نواحی علاقہ (پونہ تک) چاکن، جیار گونڈہ اور کوکن میں ڈانڈا راجپوری تک سارا علاقہ شامل تھا۔ بہادر گیلانی کو لہاپور، کلہر، سرولاّ، ملگاؤں، میرج اور بیجاپور تک قابض ہو چکا تھا۔ یاقوت حبشی اس کا دست راست تھا۔ غارت گری جس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دو سو جنگی جہازوں کا امیر البحر یا تو طاقت کی گھمنڈ میں طاغوت بن گیا تھا۔ جس کی تباہیوں کا طاعون گجراتی بادشاہ بیگڑا کے مقبوضہ بندر مہائم تک پھیل چکا تھا۔ جہاں اس نے مسجدوں کو مسمار کر کے ملبہ بنا دیا

---

[1] فرشتہ (ترجمہ برگس) ج ۳ ص ۱۹۶-۱۹۵ منتخب اللباب ج ۳ ص ۱۴۸-۱۴۶

اور زائرین کعبہ کے چوبیس جہازوں کے بیڑے کو جو بیگڑا کی ملکیت تھا لوٹ کر غرق کر دیا۔ بیگڑا نے بگڑ کر ملک سارنگ اور قوام الملک کی سرکردگیوں میں بحری اور بری دستے بھیجے مگر یہ راستے کی رکاوٹوں کے سبب اور سماوی آفات کے باعث جزائر بمبئی تک پہنچ نہ سکے۔ محمود شاہ بیگڑا نے ۱۴۹۴ء ۸۹۹ھ میں اپنے ایک امیر ہاشم تبریزی کو ایلچی بنا کر اپنے ہمنام بہمنی بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تاکہ معتوبانِ درگاہ کی سرزنش کی جائے۔ شاہی مہم ناکام ثابت ہوئی تو احمد نظام الملک بحری نے بہادر گیلانی کی "دریابار سلطنت" کو دریابرد کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور کامیاب ہوا۔ اس کامیابی نے دکن کی نئی حکومتوں میں اس کا وقار بڑھا دیا اور بادشاہ بہمنی کے وعدہ کے مطابق بہادر گیلانی کی مقبوضات کا کچھ حصہ جس میں چیول شامل تھا نظام الملک کو مل گیا اگرچہ چیول پر محمود شاہ بیگڑا کی نظر لگی ہوئی تھی۔ ۱۵۰۸ء میں جب کہ گجراتی مملکت کا فوجی محاذ بنا تو اُس نے چیول پر قبضہ جمانے کے لئے ایک مہم بھیجی۔

بہمنی سلطنت کی شام سر پر کھڑی تھی۔ نئی قوتیں بیدار ہو کر اپنے خواب کی تعبیریں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ احمد نگر کی بنیاد اور نظام الملکی حکومت کی ساکھیں پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ اب یوسف عادل خان بھی شاہ بن چکا تھا۔ اور دارالظفر بیجاپور میں بیٹھا اپنی زلیخائے سلطنت کی مشاطگی کر رہا تھا۔ کوکن کا وہ علاقہ جو ساونتری سے لے کر دیوگڑھ تک (موجودہ ضلع رتناگیری پر مشتمل) تھا اب تالکوکن عادل خانی بن گیا۔ سنگمیشور، پالون، پربھاوتی اور دوسری مقامی راجواڑیاں عادل شاہی حکومت کے زیر سایہ اپنا آسیب پھیلانے کی کوششیں کرتی رہیں۔ بیدر میں غالب برید شاہی براجمان تھی۔ برار میں عہد عماد شاہی شروع ہو چکا تھا۔ اور گولکنڈہ قطب شاہی دور کی نئی ثقافتی و تمدنی

قدروں کا قطب بنا ہوا تھا جس کے اردگرد دکن کی ساری تہذیب گردش
کرنے لگی تھی ــــــ اور دور دور سات سمندر پار سے ایک اجنبی طوفان
آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساحلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ انگریزی استبداد
کا طوفان تھا ــــــ !!!!
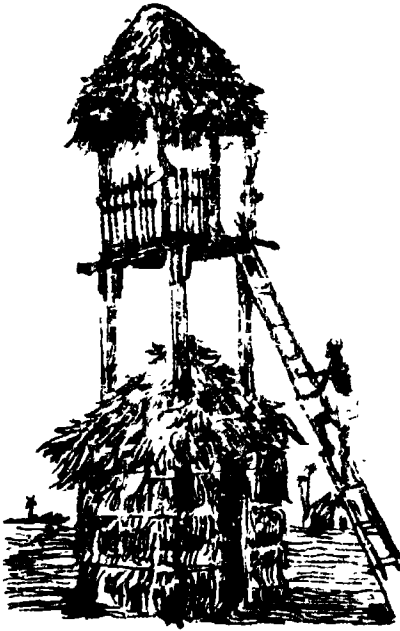
چھٹا باب

مسلم دَورِ حکومت میں دکن کی زرعی معاشیات

پندرھویں صدی بہمنیوں کے ڈھلتے اقتدار کو لے کر وقت کے دھارے میں ڈوب چکی تھی، نئی قوتوں کے سرچشمے جھیل کی صورت اختیار کر چکے تھے اور مسلم گجرات خاندیس اور دکن کے آسمانوں میں چمکتے ہلال بدرِ کامل بننے کے لئے تڑپ رہے تھے، اُفق کے اُس پار وجیانگر کا ہندو راج اِن اُبھرتے سیاروں پہ کمندیں ڈالنے کے لئے پینترے بدل رہا تھا؛ ہندو طاقت کا احیاء اسی مسلم ثقافت و تمدن کے از سرِ نو فروغ کا ردِّ عمل تھا۔

دکن کی نئی بادشاہتیں جب تشکیلی دَور سے گذر رہی تھیں تو ہم بازوں اور بحری قزاقوں کی غارتگری کا دَورہ مغربی ساحل پہ دوبارہ شروع ہو چکا تھا، روسی سیّاح اُتھنےسی اِس نکی تن کے بیان کے مطابق "یہ پتھروں کے اور گوہروں کے پجاری تھے۔ یہ نہ عیسائی تھے اور نہ مسلمان"۔ شاہانِ گجرات کو ان کے خلاف مختلف

مہمات میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں وہ ــــــ بلسار سے لے کر کوکن تک ان کا دبدبہ قائم کرنے میں ممد ثابت ہوئیں اور سولھویں صدی کی پہلی چوتھائی تک وہ بندرگاہوں کے بادشاہ بن گئے۔

بندرگاہوں کے بادشاہ: مظفر شاہی شمالی کوکن کی بندرگاہوں تک پھیل گئی، مگر یہ اقتدار عروج و زوال کی موجوں کے تھپیڑے کھانے لگا کیونکہ سات سمندر پار سے ایک اجنبی طوفان مغربی ساحل کو محیط کر رہا تھا۔ یہی کا دیتی۔ تہائم بن کر بہک رہا تھا، پچاس برس گذر چکے تھے کہ ایک بزرگ دین، صوفی اور جید عالم نے مسلم مہائم کو عالمی شہرت بخش کر اسی دھرتی کی مٹیالی علیمن میں ظاہری دنیا سے پردہ کر لیا تھا۔ جزائر بمبئی گجراتی اقلیم کا حصہ بن چکے تھے۔ ۱۴۸۵ء میں محمود شاہ بیگڑا کا تسلط جزیرۂ سالسٹی میں باندرہ (بندورہ) تک پھیل گیا تھا۔ وسئی (بسین) جس کے نئے قلعہ کی تعمیر کی تعبیر ابھی تک پردہ خواب سے باہر نہیں نکلی تھی۔ نئے بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر بیدار ہو چکا تھا۔ گجراتی مملکت کی اس "آخری" "اقلیم" کا صدر مقام تھانہ تھا جہاں نوائطی بڑی تعداد میں آباد ہو چکے تھے یہاں عالیشان مسجدیں تھیں اور دلفریب باغات تھے۔ معبدوں کے گوپرم اور کلیساؤں کی برجیاں سخت دھوپ میں چمکتی نظر آجاتی تھیں۔ گجراتی تسلط کا دھچ چڑھا تو کلیان کی کھاڑی سے لے کر ناگوٹھنہ کی کھاڑی تک[۱] اس کی سرحد پھیل کر عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں سے ٹکرانے

---

[۱] دوارت بارتوسا کا بیان۔ بحوالہ گزیٹیر ضلع تھانہ۔ ج ۱۳۔ ح ۲۔ ص ۴۴۰

لگی۔ ناگوٹھنہ فوجی محاذ تھا اور ۱۵۳۰ء تک یہاں گجراتی حاکم متعین تھا۔ اس کے دس سال بعد تک کرناّلا (بیونیل) اور سانکھشی (پین) کے قلعدار شاہانِ گجرات کے نمک خوار رہے۔ کلیان جہاں نوائطی تاجروں کے کئی گھرانے جن میں قاضی، لیکوّے اور پرودھے آباد تھے بہمنی اور بعد میں نظام شاہی مملکت کا حصہ بن چکا تھا لیکن اس کی ماتحت قصباتی بستی اسلام آباد اب ممبستان بن چکی تھی۔ ۸٦۵ھ / ۱۴٦۴ء کے ایک سنگی کتبے پر تھانہ اور مہائم کے مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ مبتان کا بھی ذکر درج ہے۔ مبتان غالباً وہی بھیم واڑی ہے جس کے رائے نے بھیم راجہ کے گھرانے کی بندگی کا بھرم رکھنے کیلئے بھیم واڑی بنا دیا تھا۔ ملک احمد بحری نے جب اٹھولی قلعہ کے ماحول تک قبضہ کرلیا۔ تو بھیم واڑی کا رائے گھرانے بھی زیر ہوگیا۔ بھیمڑی کی کاموری کھاڑی کے کنارے بسے ہوتے چھوٹے چھوٹے بندر مظفر شاہی خزانے میں چنگی ادا کرتے تھے۔ فارسی کی تاریخ "مرآت احمدی"[۱] کے بیان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مغربی ساحل کے ہر چھوٹے بڑے جزیرے اور بندر پر گجرات کا اقتدار برسوں تک برقرار رہا۔ اس بحری جال میں دمن دسی اور ممبئی تو پھنس ہی چکے تھے، اگاشی، ڈانڈا، کلوہ۔ مہائم، سوپارہ، بھیمڑی، کلیان اور بیونیل بھی الجھ چکے تھے۔ بندرگاہوں کے بادشاہ کی بحری طاقت اور تجارتی استقامت کی شہرت دلی کے بادشاہ سکندر لودی (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کے لئے قابلِ رشک تھی جو بڑی حسرت سے کہا کرتا تھا: شاہ دلی کی شان و شوکت کا انحصار گیہوں اور جوار کے دانوں پر ہے لیکن گجراتی سلطنت کا دار و مدار جس کے ماتحت

۱: مرآت احمدی ص ۲۱۴

چودھویں بندرگاہیں ہیں موتی اور مرجان کے دُردانوں[1] پر ہے۔

کوکن کے شمالی حصہ پر احمد نگر کی نظام شاہی سترہویں صدی کے ابھرتے سورج کے ہیئے تک مسلّط رہی۔ مورخین اس حصّہ میں اس کی سرحد وسئی سے لے کر بانکوٹ تک بتلاتے ہیں۔ مگر اس کی وسعت میں ردّو بدل سیاسی عروج و زوال کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی ہے۔ اسے تھالکوکن نظام شاہی کہتے تھے۔ اور یہ کلیان طرف پر مُسیا تھا۔ اس کا صدر مقام قدیم شہر اور بندرگاہ چیول تھا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد سے اسلام آباد (بھیمڑی) کا نام بھی اس طرف میں شامل نظر آتا ہے۔ ساوتری کے جنوب میں بانکوٹ کھاڑی سے پرے گوآ تک عادل شاہی سکہ چلتا تھا۔ دابھول، عادل شاہی مملکت کا سب سے بڑا بندر اور عادل خانی تالکوکن کا صدر مقام تھا۔[2]

نظم و نسق: جب زمین کی ملکیت کا پہلا دعوا بلند ہوا تو بھائی بٹوارا اور ترکہ کے تصورات پیدا ہوئے اور جب حقِ ملکیت کا جھگڑا کھڑا ہوا تو قانون نے اپنی زبان کھولی، مدعی نے عدالت کو پکارا اور انصاف نے ترازو سنبھال لیا۔ "قانونِ عرفی" کا پہلا بنیادی پتھر کھیتوں اور کھلیانوں میں رکھا گیا۔ انسان نے زمین پر قبضہ کرنے کے لئے اسے کبھی رزمگاہ بنادیا اور کبھی بزم گاہ۔ زمین پر ہی قرونِ وسطیٰ کی معاشیات کا دارومدار تھا۔ زراعت ہی سے صنعت و تجارت کی نشوونما ہوئی اور اس "تثلیث" نے مذہب سیاست کو جنم دیا۔

۱۔ مرأت احمدی۔ ترجمہ۔ جے۔ برڈ ص۱۳۲، ط۱۱۱-۱۱۰

۲: فرشتہ (انگریزی ترجمہ برگس) ج۳ ص۷۵-۷۴

زراعتی معیشت کا استحکام جاگیردارانہ معاشی نظام کی توانائی کا ضامن تھا۔ اور معاشرے کی خوشحالی کا انحصار اسی پر تھا۔ مادی اقدار کی نمود سے تمدن تنا ور بنتا ہے اور ثقافت و مدنیت پر بہار آتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عہد وسطیٰ میں زرعی نظام کی جڑوں کو ہمیشہ تر و تازہ رکھنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔

اس زرعی معیشت کے سارے تار و پود ملک کے حکمران کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ وہی اپنی مملکت کا سب سے بڑا اقطاعدار اور دہقانوں کا وہ خدا ہوتا تھا۔ دلی کا بادشاہ کئی اقلیموں کا مالک ہوتا تھا۔ ہر اقلیم میں کئی شق ہوتے تھے۔ جس کا نظم و نسق شقدار کے سپرد ہوتا تھا۔ یہی عامل اور ناظم ہوتا تھا شق کی ذیلی تقسیم تحصیلوں میں کی گئی تھی ہر تحصیل میں سو گاؤں ہوتے تھے۔ اسے صدی کہتے تھے۔ صدی کے حاکم کو امیر صدہ کہا جاتا تھا۔

بہمنیوں نے اپنی مملکت کو چار طرفوں میں بانٹ دیا تھا۔ شقدار اس طرح نام بدل کر طرفدار بن گیا۔ جو جاگیر اُسے بطور تنخواہ دی جاتی تھی اُسے مقاسہ کہتے تھے۔ ہر طرف کئی پرگنوں یا معاملوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ صیغۂ مالیہ کو دیوانی اور دیوانی کے حاکم کو دیوان یا حوالدار کہتے تھے۔ پرگنوں کی اکائیاں وہ چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جنہیں درجہ بدرجہ طرف، قریہ اور محال کہتے تھے۔ قصبہ کسی پرگنے یا طرف کا مرکزی مقام ہوتا تھا۔ یہ قصباتی بستی اگر چھوٹی ہوتی تھی تو پیٹھ بن جاتی تھی۔ جس کا تجارتی سربراہ سیٹھ ہوتا تھا۔ مہاراشٹر میں اسے شیٹیے مہاجن کہتے تھے۔ [آج کی منڈیوں کے سیٹھ اور مہاجن اسی این دیتا کی دین ہیں] اس کا نائب مہاجن ہوتا تھا۔ موضع یا دیہات کا سرکاری مالگذار مقدم یا چودھری کے نام سے موسوم تھا۔

محمود گاواں کے عہد وزارت میں جب بہمنی مملکت کو آٹھ "سرلشکری" اطراف

میں ہا نشاگیا تھا تو کوکن کا سارا علاقہ مع بلگام تا گوا جنجیرؔ کی طرف نیم شامل تھا [بھیونڈی قصبہ پندرھویں صدی کے دوسرے نصف تک خود مختار رہا۔ جو ھارپر کولی راجہ متمکن تھا] عہدِ نظام الملکی میں کلیان کا طرف لسین سے بانکوٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس طرف کا صدر مقام چیول تھا جو ایک شیخ خاندان کی نظامت میں تھا۔ بندر کے تجارتی و مالی امور تھانیدار سے متعلق ہوتے تھے، دابھول میں بھی تقریباً یہی انتظامی طریقہ رائج تھا عسکری محاذوں کے قلعہ جات کی دیکھ بھال قلعدار کرتا تھا جو قلعہ کے "توزک و احتشام کے عملہ و فعلہ"[1] کا سالار ہوتا تھا۔

گو مقامی حکام رعیت کے پاسبان اور ملکی و مالی امور کے نگہبان ہوتے تھے مگر نظم و نسق کی باگ ڈور پنچایت کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ اس پنچایت میں جہاں سماجی مسائل حل کئے جاتے تھے اور مالی و زرعی معاملات طے کئے جاتے تھے وہاں بعض موقعوں پر مذہبی امور بھی سرانجام دیئے جاتے تھے۔ اسی لئے اس کی حیثیت انتظامیہ اور عدلیہ کی تھی۔ اس پنچایتی راج کو "مجلس"[2] کہتے تھے۔

مجلس: 'ارباب مجلس' میں ہر جاتی، دھرم اور پیشہ کے لوگ شامل ہوتے تھے۔

---

[1] "دکن کے بہنی" (انگریزی) ہارون خان شیروانی ص ۳۲۲
دیکھئے راقم کی غیر مطبوعہ تصنیف (انگریزی مع متنِ فارسی): "فارسی دستاویزات برای مآخذِ تاریخ مراٹھہ اور مہاراشٹر" پروانہ نمبر ص ۱۶۲

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے: دھُل ترمبک گنّے: The Judicial System of The Marathas (انگریزی۔ مرہٹی)

مجموعی طور پر اراکین تین طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے :

(۱) مقامی حکام : دیوان یا حوالدار مجلس کی کارروائی کی نگرانی کرتا تھا۔ پیٹھ کی مجلس کا نگران شیٹھے یا عین ہوتا تھا۔ قاضی کو صدرِ مجلس کی حیثیت حاصل تھی ۔

(۲) گوت : کسانوں اور زمینداروں کی مشترکہ برادری کو کوکن اور دکن میں گوت کہتے تھے۔ اسی "برادر بھاؤ" کو گوا میں "سمت منڈلک" کا نام دیا گیا تھا۔ اس زراعتی طبقہ میں نیم سرکاری مالیاتی عہدہ داروں کی حیثیت مسلّم اور ممتاز تھی کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست رعیت سے تھا۔ اور یہی رعایا سے مختلف ٹیکس (ابواب) نذرانوں اور لگانوں کی شکلوں میں وصول کر کے سرکاری خزانے کی تحویل میں دیتے تھے تنخواہ کے عوض میں انہیں قطعاتِ زمین یا دیہات انعام میں دیئے جاتے تھے، دیوانی کی اصطلاح میں اس موروثی اور دائمی حق ملکیت کے حاملِ انعام کو "وطن" کہتے تھے ان وطن داروں میں سب سے بڑا دیشکھ (مالیہ گذار) ہوتا تھا، دیش پانڈے محاسب ہوتا تھا۔ اور قصبوں دیہاتوں میں کلکرنی، مقدم یا پٹیل کی سربراہی میں اسی حساب کتاب کا کام کرتا تھا۔ رعیت سے ان عاملوں کو جو نذرانے اور ہدیے۔ اجناس و زرِ قوم کی صورتوں میں ملتے تھے۔ انہیں "رسوم و حقوق" یا "حقِ رعیت نسبت" کہتے تھے۔ وطن داروں کو دفتری زبان میں "دیشک" بھی کہتے تھے۔ دیشکوں کے بعد ذاتی اور موروثی ملکیت (تھالکری) کی زمینوں کے مالکان یعنی میراثداروں کا درجہ تھا۔ جن کسانوں کو یہ کرائے یا اجارہ پر کاشتکاری کے لئے اپنی زمینیں دیتے تھے انہیں مہاراشٹر میں "اُپری" کہتے تھے۔ یہ عام رعیت کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔

۱؎ : ترمبک گھنے : ص۱۲، ۱۸، ۲۴ اور ما بعد

(۳) اہلِ محترفہ : ویدک عہد سے تاریخ کے سفر میں جو طبقہ معاشرے کے ہمرکاب چل رہا ہے۔ وہ محنت کش عوام کا وہ طبقہ ہے۔ جو معاشی اعتبار سے پسماندہ ہے مگر مصافِ زندگی میں سب سے آگے ہے۔ اس طبقہ میں صنعت گر، کاریگر اور دستکار بھی شامل ہیں۔ انہیں اہلِ ہنر یا ہنرمند بھی کہتے ہیں۔ جنہوں نے سمراٹ اور چکرورتی راجاؤں کے چتروں کے زیرِ سایہ، بادشاہوں کے زیرِ سرپرستی اور جاگیردارانہ نظام کے باشعور اور ذہین 'اہلِ اقتدار' کی ماتحتی میں ہمیشہ فن اور کلا کی تخلیق، آرائش اور شائستگی کی ہے۔ یہی طبقہ تمدن و معاشرت کا لائق ترین جزو رہا ہے۔ اہلِ ہنر میں قرونِ وسطیٰ کے اُن دانشوروں کو بھی شامل سمجھنا چاہئیے۔ جنہوں نے زندگی کی ہر ہر قدم پر رہنمائی کی ہے۔ گو یہ طبقہ اپنے فن کے نکاس، نمود اور نمو کے لئے اہلِ ثروت و اقتدار کا دستِ نگر تھا مگر "محنت اور درد" کے رشتے نے اس طبقے کو محنت کش عوام کا دستگیر اور محبت کیش افراد کا دوست بنا دیا تھا۔ اہلِ ہنر ہی شہری و قصباتی زندگیوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ روایتوں نے انہیں 'بارہ عاتوں' میں بانٹ دیا تھا۔ اس لئے ہنرمندوں کو "بارہ بلوتہ"[1] کہتے تھے۔ گو بقول بابر بادشاہ یہ ایک "جامع" فرقہ تھا جو صدیوں سے اپنے باپ دادا کا پیشہ کرتے آئے تھے[2]۔ بارہ بلوتوں کے علاوہ دیہاتی زندگی میں "کھوم" بھی اپنے

---

[1] : فرامین و اسنادِ سلاطین دکن ص ۱۴۰

[2] : توزکِ بابری (انگریزی کا ترجمہ بیوریج) البیرونی نے نیچ جاتی (چنڈال) کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے (البیرونی "ہندوستان" ترجمہ: سخاؤ)

پرگنہ، طرف، قصبہ اور بیٹھک کی مجلسوں میں اکثر سرگردہ اور چوگلے بھی شامل کئے جاتے تھے۔

کھیت اور کھلیان: مسلمانوں کی آمد سے پہلے دکن میں مقامی راجہ اور نایک سب سے بڑے زمیندار ہوا کرتے تھے۔ زراعتی تنظیم پر کرناٹک کے طریقۂ کار کا اثر نمایاں تھا۔ زمینوں کی کئی قسمیں مقرر تھیں جن کا انحصار محلِ وقوع پر تھا۔ چودھویں صدی کے اوائل میں جب محمد بن تغلق نے دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تو دکن کی سرزمین خلائق عامہ کے انبوہِ فراواں کی آماجگاہ اور پناہ گاہ بن گئی۔ ترکِ وطن کرکے ہزاروں لوگ کوکن سے دکن چلے گئے۔ اس اُمید پر کہ شاید قربتِ شاہ غربتِ گدا کا مداوا بن جائے لیکن جب دکن کا سہاگ اُجڑا تو سارے مہاجر قبیلے یتیم اور لاوارث بن گئے۔ مُرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق پانچ سال تک سارے ہندوستان میں بھیانک کال نے ایسی تباہی مچائی کہ لوگ قحطِ مصر کے زمانے کو بھول گئے (چون میں یوسف قحط غلہ مستمر ایست)۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:

"یک سیر غلہ بہ تعدہ درم یافت نمی شد" جبکہ ۱۶ جیتل یا چار آنے میں سیر بھر اناج ملتا تھا۔ چالیس[1] کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب بہمنیوں نے ۱۴۶۹ء میں کوکن کے اندرونی علاقے تک تسلط جمالیا تو اُنہوں نے دیکھا کہ (۱۳۹۶ء سے لے کر ۱۴۵۷ء تک کے دوران میں) یہ سارا علاقہ ویرانہ بن چکا تھا۔ اکال نے زمینوں کا خون چوس لیا۔

۱؎ تاریخ فرشتہ ص ۳۲۴، ابنِ بطوطہ (اردو ترجمہ) فصل ۱؎ ص ۱۳۳، ص ۱۹۴

تھا۔ اگلے سات برسوں ([illegible]–۱۴۰۳ء) تک یہی عالم طاری تھا کہ لوگ سوکھے کے سبب بھوک سے باؤلی اور نہروں کی طرح سوکھ گئے تھے بستیاں اُجڑ چکی تھیں جیسے وہاں کوئی کبھی بسا ہی نہیں تھا۔ لوگ گاؤں کی سرحدیں (تیہ اور تو کھ) تک بھول بیٹھے تھے۔ کھیتوں میں دھول اُڑ رہی تھی۔ اور بھوک پل رہی تھی۔ اِن بیکراں، ویرانوں میں دیوانے بھی نہ تھے کہ آبادی کا نشان ملے۔ کھیتیاں چراگاہیں بن گئی تھیں[۲]۔ گاؤں کے وطن دار دیشمکھوں نے بہمنی سلطنت کی سرپرستی میں سب سے پہلے نوآبادکاری اور آبادانی کی طرف توجہ دینا شروع کیا[۳]۔

سلاطینِ دکن نے اسی لئے سب سے پہلے زراعتی نظام کی سوکھی جڑوں کی نشاۃ ثانیہ کی۔ زراعتی اصلاحات نافذ کئے جن کی رُو سے کاشتکاروں کو سامی اور پڑتی زمینیں مفت تقسیم کی گئیں۔ اور جو جتنی اراضی پر کاشت کر سکتا تھا وہ اس کی ملکیت تسلیم کی جانے لگی۔ ایک سال تک لگان معاف تھا۔ اور اس کے بعد چند برسوں تک صرف ٹوکری بھر غلہ لگان کی صورت میں وصول کیا جاتا رہا۔ کلیان کے مسلمان عمّال پیداوار کا صرف ½ حصّہ جنس کی صورت میں بٹائی لیتے تھے۔ تشخیص اور شرح مالیہ کا پُرانا طریقہ "دھیپ" مسلمانوں نے دکن میں برقرار رکھا۔ اسے 'ہنڈ بندی'، 'مُدابندی'، اور 'تک بندی'، 'دھوک بندی' بھی کہتے تھے[۴]۔

۱: تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۲۲۔ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) فصل ۱۔ صفحہ ۱۳۳، صفحہ ۱۹۳

۲: الفنسٹن کی تاریخ (چوتھا ایڈیشن ۱۸۵۷ء) صفحہ ۲۶۷

۳: محمود گاواں۔ ہارون خان شیروانی صفحہ ۱۳۱۔ گرانٹ ڈف۔ "تاریخ مرہٹہ" صفحہ ۲۶

۴: سنجان میں ہنڈابندی اور صور داشال، ولاڑہ، کولون اور ڈانگ میں مکابدہ کہتے تھے۔ جروس کونکن صفحہ ۱۰ اور صفحہ ۸۹۔ گرانٹ ڈف صفحہ ۲۶

بے دخل کسانوں کو عارضی پٹہ پر ملتیں کاشت کے لئے دی گئی تھیں یہ براہِ راست حکومت کے آسامی ہوتے تھے۔ روسی سیاح افانسی نکیتن نے کاشتکاروں کی بدحالی کا بھی ذکر کیا ہے[1]۔ گجراتی مسلم علمداروں نے ساحلی علاقوں میں بالخصوص جزائر بمبئی میں چودھویں صدی کے اختتام میں زمینوں کی نئے سرے پیمائش کرا کے نئی شرحیں مقرر کی تھیں[2]۔

عادل شاہی دور میں دابھول کا طرف پورے رتنا گیری پر جس میں راجہ پور اور کراں شامل تھے محیط تھا۔ اسے عادل شاہی تال کوکن کہتے تھے۔ اور جس کا دائرہ ساوتری ندی سے لے کر سافشی کے جنوب میں گڑبنی ندی تک پھیلا ہوا تھا۔۔ مصطفیٰ خان جب دابھول کا طرفدار بن کر آیا۔ (۱۵۰۲ء) میں تو اس نے سب سے پہلے اس اجاڑ ویرانے کی آبادکاری اور آبادانی کی طرف توجہ دی، اُسی نے سب سے پہلے بہمنیوں کے دور کے فرسودہ بندولیت کو بدل کر کاشتکاری اور مالگذاری کے نئے طریقہ کار کی بنیاد ڈالی۔ ہر نئے قانون کے نفاذ میں اگر مفاد پرستوں کو اپنا ذاتی مفاد خطرے میں نظر آتا ہے تو وہ یا تو رخنہ اندازی کرتے ہیں، یا سرے سے اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی سرکش اور منکر بہمنیوں کے قدیم نمک خوار مکند راؤ مرہٹہ، اس کا بھائی اور وہ کسان تھے جو پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے[3]۔ عادل شاہی دور میں زمینوں کی پیمائش کا کوئی خاص طریقہ

---

[1]: بھارت روس (انگریزی) پی۔ ایم۔ کیمپ (دہلی ۱۹۵۸ء) صہ ۲۰-۱۸

[2]: جرڈوس۔ کوکن صہ ۷۶-۷۵، صہ ۹۰ - تاریخ فرشتہ۔ ج۔ صہ ۳۱ (برگز ترجمہ) صہ ۴۹۶-۴۹۵

[3]: جرڈوس۔ صہ ۸۳-۸۲

رائج نہ تھا۔ دھان کے کھیتوں اور باغوں کی پیداوار کا ⅓ حصہ جو سرکاری مالیہ جنس کی صورت میں مقرر تھا وہ بھی تشخیص اراضی اور سالانہ فصل پر مبنی تھا۔

تشخیص اراضی کی رو سے دھان کے کھیتوں کے علاوہ سامی (لائق زراعت)، افتادہ (غیر مزروعہ) اور بنجر زمینوں کی قسمیں مقرر تھیں۔ پہاڑی زمین (ورکس یا کھرو) پر ہل کے حساب سے لگان لیا جاتا تھا۔ عادل شاہی حکومت نے جنوبی تھا لکوکن میں غیر مزروعہ اور افتادہ زمینوں کی آبادانی اور پڑتی (خالی) اور گبھونی (گاؤں کے اردگرد کی زمینوں) کی آباد کاری کے لئے نئے بندوبست کی رو سے ایک ایسے طریقہ کار کو رواج دیا جس نے نئی عہدہ داروں کے ایک نئے طبقہ کو جنم دیا۔ یہ نئے عہدہ دار (خوط) کھوت کہلاتے تھے۔ جو حکومت سے ایک معاہدے (قبولیت) کی رُو سے مقررہ لگان کی بنیادوں پر کاشتکاری کا ٹھیکہ لیتے تھے اور غیر مزروعہ زمینوں کو اپنی شرائط کے مطابق آسامیوں کو پٹے یا کرائے پر بنجر توڑنے یا "نوجوت" کے لئے اُٹھا دیتے تھے[۱]۔ انہیں کھوتی کھیتیاں" کہتے تھے۔ بانکوٹ اور کھارے پاٹن میں ندیوں کے کنارے کنارے اس قسم کی "کھاتری" کھیتیاں بڑی تعداد میں کھڑی ہو گئیں۔ کھوت کو گوآ میں گاؤنکر کہتے تھے۔ کھوت گھرانوں کے خاندانی اسناد سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ عہدہ موروثی حیثیت اختیار کر کے جاگیرداری سماج کا ایسا جزو بن چکا تھا جس نے رعیت کا خون چوس کر اُسے کھوکھلا بنا دیا تھا۔ ان نئے اجارہ داروں کے باوجود

---

[۱] : جروس : ص ۸۳-۸۲

[۲] : جروس؛ کونکن : صف ۸۳-۸۲

نیم سرکاری اور موروثی زراعتی حکام مثلاً: دلیسائی، کلکرنی اور دیشپانڈے بحال رکھے گئے تھے۔ حالاں کہ یہی وہ عمّال یا مالگذار تھے جو عادلشاہی نظم ونسق کے عنان گیر بن چکے تھے اور حکومت کی زرعی پسماندگی کا سبب یہی "پالیگار" اور جاگیردار تھے جن کی انانیت کو نیست ونابود کرنے کے لئے نظام شاہی مملکت میں ایک نیا شہسوارِ سیاست آہستہ آہستہ جولانگاہِ تدبر میں اپنی جولانیاں دکھا رہا تھا۔ ان وطن داروں کے "رسوم وحقوق" کو نئے قول اور سند کے مطابق بحال رکھا گیا۔ اس نئے بندوبست نے گو "میراتداروں" یا "دھاریکاروں" کی دائمی ملکیت اراضی کو بڑی حد تک متاثر نہیں کیا۔ مگر لگان کی شرح بڑھ جانے سے ان پر مالی بوجھ پڑ گیا[۱] مگر رعیت کی جھکی ہوئی کمر پر سے نئے ٹیکسوں کا بار کم ہو گیا: "ابوابِ ممنوعہ کے دروازے بند کر دیئے گئے اور صرف دیوانی کے مقامی عملگذاروں کے رہائشی اخراجات وکفالت کے لئے "سائر" کی صورت میں کچھ رقم لی جاتی تھی۔

نظام الملکی تالکوکن کا نظم ونسق:

نظام الملکی تالکوکن میں جو زراعتی تبدیلیاں ہوئیں وہ اس لحاظ سے زیادہ ترقی پسندانہ اور تعمیری تھیں کہ اس خطے میں عادل شاہی تالکوکن کی طرح کسی نئے جاگیری طبقے کی تخلیق نہیں کی گئی بلکہ اس کے برعکس مروجہ اور فرسودہ جاگیری نظام کی جڑوں پر کلہاڑیاں چلائی گئیں۔ سدا بہار وادیوں اور سرگرم رفتار ندیوں نے اس تالکوکن کو

۱۔ د جروس۔ کونکن ص ۸۳-۸۲

ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھا ہے۔ ونیرنا اور الہاس کے زرخیز دوآبے میں کلیان اور [پرتگیزوں کے استبداد سے پہلے] وسئی کے پرگنے اس میں شامل تھے۔ سمندر اور ندیوں کے سنگم پر چیول کا تاریخی بندر، قدیم باڑا اور ہنگامہ پرور شہر کوکن کی صنعتی، زراعتی اور تجارتی زندگیوں کا شہ رگ بنا ہوا تھا۔ اس سے قریب راجپوری کی بندرگاہ اور دیوگڑھ کی بستی اس تالکوکن کی آخری سرحد تھی۔

بہمنیوں کے عہد سے کوکن میں (بالخصوص قلابہ میں) غیر مزروعہ زمین بڑی تعداد میں افتادہ پڑی ہوئی تھیں۔ دیشمکھوں کی کوششیں بھی آبادانی اور آبادکاری کے سلسلے میں رائیگاں گئیں۔ "دھمپ" کا پرانا طریقہ مختلف ناموں سے رائج تھا۔ جب نظام شاہی عملداروں نے زراعتی نظام کے تار پود کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو انہوں نے سب سے پہلے کسانوں کو ان کی کاشت کی ہوئی زمینوں کا حقِ ملکیت بخش دیا۔ انہیں "کلارگ" کہنے لگے اور یہ جنس اور رقم کی صورتوں میں میں سرکاری مالیہ[۱] دینے لگے، مگر نہ تو زراعت کے سوکھے دھانوں پانی پڑا اور نہ رعیت کی زندگیوں میں بہار آئی کیونکہ حکام بالا کی بالادستی استبداد کی چکیوں میں مظلوموں کو پیستی جارہی تھی۔ یہ زرعی حکام: دیشمکھ، دیشپانڈے، دیسائی اور کلکرنی اپنی انعامی جاگیروں اور وطنوں میں جنہیں "اضافت" کہتے تھے دہقانوں کے وہ خدا بن بیٹھے تھے۔

جب ملک عنبر نے نظام شاہی سلطنت کی سوکھی جڑوں کو اپنے خون پسینے سے

---

[۱]: جیروس کوکن ص ۸۹ - ۸۳، ۸۲

ہوا کیا تو اس نے سب سے پہلے دیہی اداروں کی نئے سرے سے تنظیم کی اور رعیت کی بہبودی کی خاطر زرعی اصلاحات جاری کئے ۔ اس کا بنیادی مقصد تھا مزارعین کا براہ راست گاؤں کے مالیہ گزار حکام سے تعلق پیدا کرنا۔ اسی لئے اس نے مقدم اور پٹیل کے عہدوں کو موروثی قرار دیدیا اور اس طرح حکومت سے ان کی وفاداری اور وصول مالیہ کی ذمہ داری[1] دونوں مستحکم و متیقن ہو گئیں۔ پٹیل عموماً برہمن ہوتے تھے جو مسلمان عمل گزاروں کے ماتحت اپنے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ ملک عنبر نے اکبر بادشاہ کے وزیر مالیات راجہ ٹوڈرمل کی تقلید میں بیگھ کی بنیاد پر پیمائش کا طریقہ رائج کیا۔ مگر یہ اندازے سے کی جاتی تھی اور اسی لئے اسے "نظر پیمائی" کہتے تھے۔ شرح مالیہ کی بنیاد بھی زمین کی سالانہ فصل اور پیداوار کے اندازے پر رکھی گئی اور (۱۶۱۴ء) تک یہ جنس کی صورت میں کل پیداوار کا ۲/۵ حصہ لیا جاتا رہا۔ جسے کئی فصلوں کے اندازے کے مطابق نقد (کل آمدنی کا ۱/۳ حصہ) کی صورت میں منتقل کر دیا جاتا تھا[2]۔ مزروعہ زمینوں کی چار قسمیں مقرر کی گئی تھیں۔ تشخیص اراضی کے بعد اس کی باقاعدہ قیمت مقرر کی جاتی تھی جو فصل کی سالانہ آمدنی پر مبنی ہوتی تھی۔ ملک عنبر نے لگان کی بنیاد پر کاشتکاری کی اجارہ داری کے پرانے طریقے کو منسوخ قرار دے دیا۔ افتادہ زمینیں کاشتکاری کے لئے آسامیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اور یہی دھرتی کے مالک تسلیم کئے جانے لگے۔ گاؤں کے

۱۔ گرانٹ دف: "مرہٹوں کی تاریخ" (انگریزی) صفحہ ۴۸

۲۔ ایضاً: صفحہ ۶۸-۶۷

اردگرد کی زمینیں (گھبوتی) دیہی سماج کی مشترکہ ملکیت قرار دے دی گئیں۔ پڑتی زمین خالصہ کے دفتر میں جمع کر دی گئیں[1] مسجد، مندر اور مذہبی خدام اور ائمہ کے اوقاف کو بحال رکھا گیا۔ "ابواب ممنوعہ" (جنہیں مرہٹوں نے آگے چل کر دوبارہ رائج کر دیئے تھے) یک قلم منسوخ کر دیئے گئے صرف اہلِ محترفہ سے چند زائد ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ ملک عنبر کی اصلاحات کا نفاذ حبشان جزیرے کو چھوڑ کر دیتر ناکی وادی لے کر ساد تری کے کنارے تک برقرار رہا مگر تلابہ میں ادھے اور ناگوٹھنہ کے علاقوں میں دھیپ یا ھنڈ کے طریقہ پیمائش کا رواج برقرار رہا۔ کلیان اور اس کا متعلقہ علاقہ زیادہ بہرہ ور ہوا مگر یہ "بہارِ جانفزا" زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہی۔ اور ملک عنبر کی موت کے بعد۔ "تگر" اور تگر طریقہ دونوں اجڑ گئے۔ گو صفی خان اور مرشد قلی خان نے (اور بعد میں داداجی کونڈدیو نے) تھوڑے تک ملک عنبر کی اصلاحات کو زندہ رکھنے کی کوشش کیں[2]۔ مگر ملک عنبر کا نام مدتوں دیہاتوں کے گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں گونجتا رہا۔ کوکن میں بار بردار بیلوں اور ہلوں میں جوتے جانے والے بیلوں، گایوں اور گھوڑوں کی کمی نہ تھی۔ ہل میں لوہے کی بجائے لکڑے کا پھل لگایا جاتا تھا۔ کوکن کے محنتی کاشتکاروں کی تعریف ڈاکٹر جان فرائر بھی کرتا ہے جن کی مشقت اور کاشتکاری میں مہارت دیگر قوموں کے لئے نمونہ تھی[3]۔ تالاب

۱: رادھے شیام۔ "احمد نگر کی سلطنت" (انگریزی) ص۲۸۲ - ۲۸۳

۲: جرنل سی کوکن ص۸۱

۳: ڈاکٹر جان فرائر ج۲ ص۱۰۸

نہروں اور باولیوں سے سینچائی کی جاتی تھی۔ کوکن میں قدرتی تالابوں کی موجودگی کے سبب آبپاشی کا مسئلہ اتنا کٹھن نہ تھا۔ اس خطہ سے متصل بگلانہ میں مصنوعی نہریں اس طرح جاری رہتی تھیں جس طرح محمود گاواں کے عہد میں گوا کا حال تھا۔

زرعی پیداوار :

کوکن کی زرخیز زمین صدیوں سے چاول کے دانے اُگا رہی ہے جنہیں چگنے کے لئے دُور دُور کے دیسوں سے بیوپاری آتے رہتے تھے۔ مگر خود اناج اُگانے والے کسانوں کے کام ودھن بھات جیسے اعلیٰ قسم کے چاول کی لذت سے اتنے آشنا نہ تھے کیونکہ وہ صرف شادی بیاہ اور خاص خاص تہواروں کے موقعوں پر بھات پکاتے تھے۔ عام دنوں میں ہر ایک کا گذارا موٹے چاول ہرک پر ہوتا تھا۔ اس کی خاصیت کیف انگیز ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اس چاول کو اس کے عادی ہی کھا سکتے ہیں۔ جس کے اوپر چاول کی کشید کی ہوئی شراب کے چند جرعے دوآتشہ کا کام دیتے تھے۔ رتنا گیری اور قلابہ کے پہاڑوں کے ڈھلوانوں میں ایک دوسرے ادنیٰ قسم کے چاول وری کی فصلیں ہوتی تھیں۔ ناچنی (ناگلی) یا راگی بھات کے بعد بڑھیا قسم کا چاول شمار ہوتا تھا۔ مسلمان کھلی جگہ پر بیلوں کے پیروں سے روند کر دھان صاف کرتے تھے اور ہندو لکڑیوں سے دھان گاھنے کا کام کرتے تھے۔ قصبوں میں

لے : قلابہ گزیٹیر صفحہ ۹۷، رتناگیری گزیٹیر صفحہ ۲۷، ۴ ا تھانہ گزیٹیر صفحہ ۲۸۹

امراء دھان کوٹنے اور صاف کرنے کی غرض سے بلغور خانے بھی قائم کرتے تھے، جنہیں حکومت کی سرپرستی حاصل رہتی تھی۔ غریبوں کو ان بلغور خانوں سے مفت دھان صاف کر کے دیا جاتا تھا۔[۱]

گیہوں کے سونے کی بالیاں صرف دھالو کے دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھیں ویترنا کی وادی اور تیویل میں جواری کی فصلیں ربیع اخیر میں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اسی کی بنی ہوئی چپاتیاں مفلوک الحال کاشتکاروں کی خوراک تھی۔ چاول اور دال کی کھچڑی پر محنت کش طبقے کا دارومدار تھا۔ [جس سے شکم سیر ہوکر وہ کچھ دیر کے لئے خیالی پلاؤ پکا لیتے تھے] کوکن میں دو ہی بڑی فصلیں عام طور پر اُگائی جاتی ہیں، اُرد (ماش سیاہ) اور تور۔ نخود (چنا) غریبوں کے پیٹ کے بھاڑ میں جھونکنے کے کام آتا تھا۔ اسلام آباد۔ کلیان۔ تیویل اور ویترنا کی وادی میں "ہار بھرے" [ہرے چنے] کی ہری بھری فصل خریف میں کھڑی رہتی تھی۔ کلتھ (کلتھی) چنا گھوڑوں کا راتب تھا۔ رتناگیری اور تھانہ میں اس کی فصلیں اُگائی جاتی تھیں۔ کوکن میں کہیں کہیں ننگ (ہرا چنا) بھی بویا جاتا تھا۔ دال، مٹر، (ڈمانا) اور چاولی۔ ساگ بھی ہیں اور تھانہ کے غریب لوگوں کی خوراک کے بھاگ بھی ہیں۔ تیل نکالنے والے بیجوں میں تِل (کنجد)، کرڈی، خراسانی اور لرنڈی گھانیوں میں پیلے جاتے تھے۔ مرچ سیاہ

۱۔ ہ فرائر۔ ج۲ ص۱۰۱۔ اور دیکھئے مصنف کی تصنیف تذکرۂ دیوان شاہ صفحہ ۱۸۰

Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India[۲], (1963); P. 91

(مرچ) ابھی تک صرف مرہٹہ دیس کی نمکینی کو تیکھا بنا رہی تھی [شمالی ہندوستان میں اس کا استعمال اٹھارویں صدی میں مرہٹوں کے توسط سے ہونا شروع ہوا تھا] گول مرچ بھی مہاراشٹر کی دین ہے۔ زیرہ، دھنیہ (کوتمیر) ادرک اور رائی غریب عوام بھی اپنے پکوانوں میں گرم مسالے کی صورت میں استعمال کر لیتے تھے مگر الائچی کے ذائقے سے وہ ناواقف تھے اور لونگ پر جب تک ولندیزیوں کی اجارہ داری قائم نہ ہوئی تھی بچیوں اور عورتوں کے کانوں کی "کلی" اور ناکوں کی پھلی بنی رہی۔ قلابہ اور سالسٹی کی کھاڑیوں کے کنارے نمک کے بڑے بڑے طاس تھے۔ مگر چونکہ نمک گیہوں کے دام سے بھی دوگنا گراں تھا اسی لئے اس کا استعمال محدود تھا۔ نیشکر شکر اور گڑ (قند سیاہ) بنانے کے کام آتا تھا۔ گنے کی اکھاڑیوں کی کوکھ میں کمی نہ تھی مگر بقولِ غالب ع

آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟ آموں کے باغات رتناگیری اور سالسٹی میں کوئلوں کی پکاروں سے گونجتے رہتے تھے۔ جزائر بمبئی میں تو دمیہ (ٹرامبے) کے جزیرے میں اس "نازپرور دہ بہار" اور "صاحب شاخ و برگ و بار" کا دربار لگا رہتا تھا۔ سو آموں کی قیمت ۴۰ پیسے تھی [ابھی تک پرتگیزوں نے اپنے ملکی آم الفانسو کا قلم لگانے کے متعلق سوچا نہیں تھا] وسئی اور اس کے مضافات میں کیلا اکیلا نہیں اُگایا جاتا تھا۔ موٹ سے کھینچے ہوئے پانی کی نہروں میں۔

---

۱ ۔ خزانۂ عامرہ ۔ آزاد بلگرامی (نول کشور، کانپور ۱۸۷۱ء) صفحہ ۴۸

۲ ۔ عرفان حبیب صفحہ ۹۲

بسنرائی، سونکیلی اور نرنگی کیلوں کے پیڑوں کے پہلوؤں میں پان کی بیلوں کی پرچھائیاں ڈولتی رہتی تھیں۔ کلوۂ ھمائم ۔ پان کی بیلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دکن میں پان کا ٹھیکہ پندرہ ھوَن (طلائی سکہ مساوی چار روپیوں کے) سالانہ کے مطابق بقالوں کو دیدیا جاتا تھا۔

ھائم (بمبئی) میں بھیم راجہ کے عہد میں لگائے گئے 'ناریل، سپاری، تاڑ اور دیگر پام کے یادگار پیڑوں سے باڑیاں بھری رہتی تھیں۔ پھلوں کے باغات رتناگیری سے لے کر دھالوتک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سرسراتا ہوا سناٹا اتنا سکون بخش ہوتا تھا کہ ابدی سکون کی خاطر مسلمان انہیں بوستانوں میں اپنے مدفن بناتے تھے [پھلوں اور پیڑوں کی آمدنی سے متوفی قبرستان کی کفالت ہوتی تھی]

سکۂ رائج الوقت :

اجناس کی قیمتوں کی طرح چاندی، سونے اور طلائی و نقرئی سکوں کے باہمی مبادلوں کی شرحیں بھی گھٹتی بڑھتی تھیں۔ تانبے کے سکے بھی اپنی فلزاتی قدروں کے سبب باہمی مبادلے کی شرحوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ سارے ملک میں کسی ایک سلطنت یا بادشاہت کے سکوں کا چلن نہ تھا۔ بلکہ اصل قیمت فلزاتی قدر کی تھی۔ اسی لئے اُس زمانے میں سکے ۔ قدر کے معینہ معیار تسلیم نہیں کئے جاتے تھے۔ بلکہ وہ بھی ایک قسم کا مالِ تجارت تصور کئے جاتے تھے۔ پرانے سکے جب بہت فرسودہ

---

۱ ؎ منتخب وقائع دکن (حیدرآباد) (۱۹۵۳ء) صفحہ ۷۳

۲ ؎ ہند کی معاشی حالت (مورلینڈ) صفحہ ۷۵ - ۶۹

ہو جاتے تو کسی قلعہ کے "کوٹھے" [کوٹھری] میں ذخیرہ کر دیئے جاتے تھے[1]۔ مگر
بقال، مس فروش [کسار] اور صراف چوری چوری خرید لیا کرتے تھے[2]۔ پرانے
سکوں کی اہمیت فلزاتی اعتبار سے اتنی منفعت بخش تھی کہ چور انہیں چرا کر بیچ ڈالنے[3]
سے چوکتے نہ تھے۔ جعلی سکے بھی ڈھالے جاتے تھے۔ فرسودہ اور مسخ شدہ نقرئی سکوں
کو خزانہ کہتے تھے۔ اور سترھویں صدی میں زر مبادلہ کی شرح کے مطابق اُن کی خرید
پر دستوری لی جاتی تھی۔ خزانہ کی قیمت مروجہ روپے سے کم نہ تھی[4]۔ یہی وجوہ تھے
کہ وجیانگر راج کے خاتمے کے سو برس بعد تک کوکن اور دکن کی منڈیوں میں وجے نگر
راجاؤں سے منسوب ہن: بھکّی (بھکّا۔ وجے نگر راج کا بانی ۱۳۵۴ء)؛ ہری ہر
(دوم ۱۳۷۷ء)؛ دیو لائے (دوم ۱۴۲۳ء)؛ کرشن رائے (۱۵۰۹ء)؛ اچیت
رائے (۱۵۳۰ء)؛ سیو لائے (۱۵۴۳ء)؛ اور تری مولی (تریملا ۱۵۷۰ء) زر مبادلہ
کے طور پر مستعمل تھے۔ ان کے علاوہ ایسے کئی اور ہن تھے جو کسی مقام سے منسوب
تھے۔ مثلاً: دریائے بھیما کا بھمرا۔ مدورا (گینش مدورا)؛ دھارواڑ، تیلچری، ادھونی
اور چوکل وغیرہ۔ راجاؤں کے علاوہ ان کے نایک بھی اپنے نام سے ہن جاری[5]
کرتے تھے۔ ۱۶۶۱-۶۲ء تک عنبر شاہی اشرفی بھی منڈیوں میں نظر آجاتی تھی۔

1: منتخب وقائع دکن۔ صفحہ ۱۵۵

2: ایضاً

3: ایضاً اور صفحہ ۱۰۷

4: ایضاً اور صفحہ ۱۳۰ (انگریزی)

5: ایضاً صفحہ ۱۳۷-۱۲۸ (انگریزی) صفحہ ۲۳ ز ۳۶، ۳۳

زرمبادلہ اور تجارت کا یہ سہرا دستور صرف جنوبی ہند اور مہاراشٹر تک تھا اس کے برعکس مغل امراء اشرفیوں یا مُہروں کو "زر اندوختہ" تصور کرتے تھے۔ اشرفی کا معیاری وزن گیارہ ماشہ ہوتا تھا اور ۱۶۶۱ء میں اس کی قوت خرید ۱۴ روپیوں کے برابر تھی۔ ھُون۔ تین سے لے کر چار روپیوں کے مساوی بازار میں بکتا تھا۔ ھُون کو وار ھو اور فرنگی۔ پگوڈا کہتے تھے۔ گولکنڈہ میں وجیا نگری ھُنوں کے مبادلے میں جواہری ہیرے خریدتے تھے۔

ساحلی علاقوں [کوکن اور گجرات] میں بحری تجارت اور مبادلہ کے خاص سکّے نقرئی محمودی کا چلن زیادہ تھا۔ یہ محمود بیگڑا (۱۴۵۸-۱۵۱۱ء) سے منسوب تھا۔ گجرات کا مظفری نقرئی روپیہ جو بہت بعد میں رائج ہوا اس کے آگے تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ انہیں علاقوں میں بیرونی تجارت اور بین الملکی زرمبادلہ کے پیش نظر بدیسی سکّوں اور سونے کے مُہر شدہ توڑوں کا رواج بھی تھا ان میں ریال عباسی اور ایرانی لارن (جس کی قدر اکبری روپیہ کے نصف سے بھی کم تھی) اطالوی ڈوکاٹ (۴ اکبری روپیہ کے برابر)، وینس کا سیکوین (ایضاً)، ہسپانوی ریال ہشت (۲ اکبری روپیہ کے مساوی) وغیرہ شامل تھے۔ طلائی پگوڈا ۴ روپیوں کے برابر تھا۔ پرتگیزوں نے جب ۱۵۵۶ء میں ہرمز پر قبضہ کر لیا تو ہرمزی نقرئی

۱: ہند کی معاشی حالت صفحہ ۶۹

۲: Tavernier, Travels in India II pp. 70, 71

۳: سکے در نیپے۔ صفحہ ۷۰-۷۱

[ریال] نے بھی رواج پایا۔ مغلیہ تسلط کے بعد دکن میں شاہ جہانی اور عالمگیری روپیوں نے منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ مگر سلاطین دکن کے بھی سکے مروج رہے۔

روزمرہ کی زندگی کی سب سے معمولی ضرورت کی خرید کے لئے ساحلی علاقوں میں کوڑیوں کا رواج تھا، ایک پیسہ میں اسی کوڑیاں ملتی تھیں [یہ جزیرہ مالدیپ سے حاصل کی جاتی تھیں]۔ فلزاتی ڈھلا ہوا سب سے قلیل ترین قدر کا سکہ تانبے کا دام ہوتا تھا۔ دام کے رواج نے قدیم تانبے کے سکے "تنکہ" کو تنکے کی طرح بہا دیا۔ جس کی قیمت دو پیسے کے برابر تھی۔[1] مغلیہ سلطنت کے ایک روپے میں کم از کم پندرہ تنکۂ سیاہ اور کچھ دام آتے تھے۔ سرکاری حسابات میں چالیس تانبے کے دام ایک روپے کے مساوی تھے۔ مگر یہ دام اکبری عہد کے دفتری اعداد و سیاق کا وہ دام نہ تھا جس کے حساب سے جاگیر تنخواہ دی جاتی تھی۔ روپیہ کو جہانگیر کے عہد میں جلیتی بھی کہتے تھے۔ مگر یہ معیاری مروجہ روپیہ "خزانہ" سے اعلیٰ قدر کا حامل ہوتا تھا۔[2] گجرات میں بھی جلیتی کا چلن تھا۔ اس کے بیچ سوراخ ہوتا تھا۔ مہاراشٹر کی منڈیوں میں جو دیگر نقرئی سکے سترھویں صدی کے آخر تک رائج تھے ان میں محمودی، چنگیز خانی، مظفری، میر انشاہی، جلیتی، اورنگ شاہی، خزانہ، براری، گولکنڈہی، اور علمگرائی شامل تھے۔[3] نثار کرنے کے لئے چاندی یا سونے کے خاص سکے "نثاری" ضرب کئے جاتے تھے۔ مندرجہ ذیل جدول سے روپے کے

---

[1]: تاریخ فرشتہ کے مطابق

[2]: مرأت احمدی۔ ج ۲۔ ص ۱

[3]: منتخب وقائع دکن۔ (انگریزی) صفحہ ۱۰۹

معاون فلزآتی سکوں کی قدروں اور اکائیوں کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔

۱۔ دمڑی = ۲ ادھیاں

۲۔ دمڑیاں = ۴ ادھیاں = ۱ ادھیلا

۴۔ دمڑیاں = ۸ " = ایک پیسہ (اسے جیتل بھی کہتے تھے)

۸ " = ۱۶ " = ایک ٹنکہ یا ادھنّا

۲ ٹنکے = ۲ ادھنے = ۱ آنہ (شاہجہاں کے عہد سے گولکنڈہ اور دکن میں اس کا چلن ہو چکا تھا) اسے چھدام (روپے کا $\frac{1}{16}$ حصہ) بھی کہتے تھے۔

۱۶ آنے ایک روپیہ

۲۵ دام = ایک پیسہ

۵۰ دام = ایک ٹنکہ

مفلس ترین طبقوں کے حق میں سنہ ۱۶۰۰ء کا ایک روپیہ سنہ ۱۹۱۲ء کے سات روپیوں کے مساوی قدر اور قوتِ خرید رکھتا تھا اور یہی روپیہ متوسط طبقوں کے لئے پانچ روپیوں کے[1] برابر تھا سلاطین دکن کے عہد میں محتسب قصبہ اور شہر کی منڈیوں کا نگراں ہوتا تھا۔ جو "مواقع ضابطہ" زرِ مبادلہ کی شرحوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ وقائع نویس بازار کا نرخنامہ [illegible] داروغہ اور محتسب کی نگرانی

---

[1] ہند کی معاشی حالت صفحہ ۷

میں تیار کر کے صوبائی یا مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا۔ ۱۶۶۱-۶۲ء کے درمیانی زمانے کے چند نرخنامے جو دستیاب ہیں عادل شاہی مملکت کی مختلف منڈیوں کی تجارتی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چونکہ اسی عہد میں نظام شاہی کے خاتمے (۱۶۳۶ء) کے بعد تھالکوکن بھی عادل شاہی سلطنت میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اسی لئے گو یہ نرخنامے[1] رامگیر، اودگیر، دھاڑور دکن کے اضلاع پرینڈہ [اور مغلیہ مقبوضات] بگلانہ اور اورنگ آباد کی منڈیوں سے متعلق ہیں، مگر کوکن کی معاشی حالت اور منڈیوں: دابھول، کھارے پاٹن، دنیگرلا اور چول کے "بازار بھاؤ" کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں:

---

[1] منتخب وقائع دکن صفحہ ۲۹، ۶۱-، ۸۹، ۱۰۵، ۱۲۳-

(ب) نرخ ... سنہ ۱۲۶۲ء

نام جنس	رام گنج		پرینڈہ	دھ...
غلہ	خرید	فروخت	فی روپیہ	قسم ا...
چاول (پختہ)	—	۱۱ سیر	۱۷ سیر	—
چاول (بھات)	۱۶ سیر	۱۵ سیر	—	۱۶ سیر
" [ناگلی]	۲۴ "	۲۳ "		"
" [قسم معمولی]	۲۵ "	۲۴ "		"
" [ہرک]	۱۰ من "	۷½ من "		—
" شالی	۳۲ من "	۳۰ من "	—	۵ پا...
ایندھن			۱۳ من	

کپاس (پنبہ) ۲۵ سیر

نام جنس	رام گنج		اودگیر	
شکر	خرید	فروخت	قسم اول	قسم دوم
چینی (اکیوڑی)	-	-		
" (بھوڑی)				
" (رائے پوری)	۱۴¾ سیر	۱۴½ سیر		
(سورتی)	۱۶ سیر	۱۵ سیر		
شکر سرخ	-	-	-	-
قند سیاہ	۱۷ سیر	۱۶ سیر	۱۴ سیر	۱۶ سیر
مصری	-	-	-	-
نمک	من	۲۷½ سیر	۲۶⅞ سیر	۳۱⅞ سیر

آفات سماوی:

کوکن کی زرخیزی اور بارش کی فیاضی نے اِس سرسبز خطّہ میں ہمیشہ قحط کو قدم رکھنے سے ہمیشہ روکا ہے صرف ۱۶۱۸ء میں ایک مرتبہ پرتگیزی بسین میں کال نے اپنا بھیانک چہرہ دکھلایا تھا اور جب کنگال ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض مسلمان بیوپاریوں کے ہاتھوں بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر پادریوں نے کالی بھیڑوں کے ریوڑ میں اضافہ کرنے کے لئے ایسے بچوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس طرح انسان فروشی کی انسداد کے لئے انہوں نے کافی جدّوجہد کی تھی۔ اسی سال بسین اور تھانہ میں طوفانِ باد و باراں نے الگ قیامت مچادی تھی۔

ابھی ذہنوں میں بارہ برس پہلے کے قحط کی قہر انگیزیاں تازہ تھیں کہ دکن اور گجرات میں ایک ایسے ہولناک کال کے عفریت نے اپنا منہ کھولا جو دو برس تک لاکھوں انسانوں کو نگلتا رہا۔ قحط کی ہلاکت خیزیوں کی جلو میں ہمیشہ کی طرح طاعون کی تباہ کاریاں بھی ساتھ آئیں۔ ہجرت کے راستوں پر موت راستے روکے کھڑی رہتی تھی۔ اور بھوکے کنگالوں کے قافلوں کے سامنے سڑی گلی مُردہ لاشوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے مفلوک الحال تو ہمیشہ سے بدحال تھے مگر اکال نے خوش حالوں کو بھی اپنی موت کے جال میں پھنسا لیا۔

---

[۱] تھانہ گزیٹر۔ حصہ[۱] صفحہ ۳۰۲

بھوک جب اندھی بن گئی تو انسان اور جانوروں میں بھی تمیز نہ کر سکی کتوں کا گوشت تک گلے سے اتر گیا۔ مرداروں کی ہڈیاں تک نہ چھوڑی گئیں، انسانی ڈھانچوں کو پیس کر آٹے میں ملا کر بیچا جانے لگا۔ اور جب انسان بھوک سے درندہ بن گیا تو مردم خوری کے واقعات پہلے عجوبہ بنے پھر عام ہو گئے۔ کنویں، باؤلیوں اور نہروں کی طرح ماما کے سرچشمے سوکھ گئے اور پھر باپ کی محبت نے بھوکوں کی طرح دم توڑ دیا۔ بچے بے مول بازاروں میں بکنے لگے اور انسانیت کا کشکول۔ ننگے خالی پیٹ کی مانند ہر قسم کی انسانی لطافت، جذبہ اور احساس سے تہی رہ گیا۔ صرف احمد نگر کی نظام شاہی مملکت میں لگ بھگ دس لاکھ انسان اکال کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ا: Commissariat, Hist of Gujarat - Vol II
p. 312 & Chapt XXVIII

ساتواں باب

طرزِ معاشرت اور معیارِ زندگی

ریوتی دیپ کی ساحلی بستیوں کا تجارتی رابطہ افریقہ اور عرب ممالک سے نہایت قدیم تھا۔ یونانی جغرافیہ داں، پیریپلس (۲۴۷ء) نے قزاقوں کے دیس "آریاک" کی ساحلی تجارتی منڈیوں میں یہاں کے کھیتوں کے چاول اور دیگر اناج، گھانیوں سے نکالے ہوئے تِل کے تیل، مکھن، اُدکھ باڑیوں (اکھاڑیوں) کے رسیلے گنّوں اور مقامی کرگھوں پہ بنے ہوئے نفیس اور موٹے کپڑوں کی تجارت کے بارے میں اپنے ہم وطن سوداگروں سے سُنا تھا۔[1]

تجارت، صنعت و حرفت : بہمنی عہد میں عرب و عجمی سوداگر مکّہ، عدن، اد

---

[1] Vincent's Commerce of The Ancients, II, 282, 423 :

ہرمز سے اپنی لمبی چوڑی بادبانی کشتیوں میں تانبا، پارہ، شنگرف اور گھوڑے جنیز اور بیجاپور طرفوں کی بندرگاہوں میں لاتے تھے۔ دابھول جسے بہمنی دور میں مصطفٰے آباد یا خضر آباد کہتے تھے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ تجارتی قافلے یہیں سے چپلون اور کھیبڑ ہوتے ہوئے آمبولی درہ سے گزر کر پایۂ تخت بیدر (محمد آباد) میں پڑاؤ ڈالتے تھے۔ بانکوٹ کی کھاڑی کے ذریعے مہاڑ کی منڈی سے تجارت کا سلسلہ اندرون ملک تک قائم ہو چکا تھا۔ محمود گاواں کے عہدِ وزارت میں جب روسی سیاح افناسی نکیتن دکن آیا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ آفاقی تاجر تجارت کے اجارہ دار بن گئے تھے۔ اور محصول تک سے مستثنیٰ قرار دیئے جا چکے تھے[۲] دکن کی تجارتی شہرت نئی تن کے عہد میں سارے مشرق وسطیٰ کی منڈیوں کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔ عادل شاہی دور میں جب بیجاپور دارالسلطنت بنا تو تجارتی کاروان ان نئی منزل کا رخ کرنے لگے۔ پان کی لہراتی بیلوں کے درمیان بہتی ہوئی نیج کنڈی کی لہروں پر ساتولی تک کھمبایت، دیو اور ملیبار کی ساحلی کشتیاں دوڑنے لگیں۔ اور تجارتی اسباب آمبہ یا وشال گڑھ درے سے پنھالہ (کولہاپور) کے راستے بیجاپور اور گولکنڈہ بھیجے جانے لگے۔ اسی کولہاپور اور باؤڈہ کی گذرگاہوں سے راجہ پور اور جیتاپور کی ساحلی بستیوں کا ناطہ بیجاپور سے بندھا ہوا تھا[۳]۔

۱: Nairne, Indian Antiquities, II, P 282

۲: P.M. Kemp: Bharat-Rus (Delhi, 1958) P.P. 19, 25

۳: Nairne, Ind. Ant III, 318, 320

عادل شاہی دور میں بھی خلیج فارس اور بحیرۂ احمر سے لین دین کا سلسلہ جاری تھا۔ امراء اور جیانگرم کے مہا منڈلیشوروں کے اصطبلوں میں انہیں دلیسوں سے منگوائے ہوئے اصیل گھوڑے تھان پر بندھے رہتے تھے۔ دکن کی چھینٹ، سنہری گوٹے ٹھپوں والے نفیس کپڑے [چول کے کارخانوں میں تیار کئے گئے ریشمی پارچے] ' راجہ پور اور مضافاتی بستیوں میں بنے گئے ململ' اور ہندوستان' کاروِمنڈل اور گولکنڈہ کے کارخانوں میں تیار کئے گئے بیر میہ پارچے ایران اور بحیرۂ احمر کی منڈیوں میں کوکن کی بندرگاہوں سے بھیجے جاتے تھے: ملیبار کے ناریل، مسالے اور ادویات بھی یہیں سے عرب و عجمی سوداگر لے جاتے تھے۔ ملیباری اور موپلا تاجر اپنے بگلے اور پرتگیزی جہازوں میں "سونے کا پھل" ۔ ناریل سپاری مسالے، تانبا اور پارہ یہاں لے کر آتے تھے اور ان کے بدلے دکن اور کرناٹک کے نفیس سوتی کپڑوں کے تھان اور گیہوں بھر کر لوٹتے تھے۔ گجراتی بنئے اور ہندو بیوپاری جن کی بڑی تعداد دابھول میں بس گئی تھی۔ ملابار اور عرب سے لائے گئے۔ تانبے کی سلاخوں اور پارہ کھمبایت اور دیو کی منڈیوں کے لئے یہیں سے حاصل کرتے تھے۔ اُورن اور سالشٹی کے نمکزاروں کا نمک فتح ماری اور مہاگری کشتیوں کے ذریعے دکن کی ملاحت کو ابھی تک نمکین بنا رہا تھا۔ دابھول کا سیاہ مرچ سنگمیشور سے باہر بھیجا جاتا تھا یہیں سے لوہا بھی دساور جاتا تھا۔ رتنا گیری اور رنج کنڈی

۱: Tavernier (Harris) II, 360

۲: تاریخ فرشتہ Mandelso's Voyages, I, 107

۳: باربوسا ۱۷۶، ۱۷۳

کے کناروں کے ساگوانی شہتیر عرب سوداگر زنجبار لے جاتے تھے۔[۱] مج کنڈی کے کنارے پان کی اتنی ساری باڑیاں تھیں۔ اور وسیع باغات پھیلے ہوئے تھے کہ اسے "پان ندی" کہنے لگے تھے۔ پان کی گٹھریوں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں (ہوڑی، بارکن، تونی، شیلی اور کنیو) کے ذریعے ساحلی بستیوں اور منڈیوں میں پہنچایا جاتا تھا۔ ملک کی تجارتی اقتصادیات میں پان کی چنگی نہایت اہم سرخی رکھتی تھی۔[۲] ساحلی کشتیاں مچھوے اور سُوال کھارے پاٹن کی باڑیوں کی سبزیوں اور ترکاریوں سے لدے پھندے اور سستے چاول کی بوریوں کا بوجھ اٹھائے ملیا رتک جیوؤں کے سہارے سمندر کے سینے پر سرسراتے رہتے تھے۔ بانکوٹ کی کھاڑی کے کنارے کے خمیدہ ساحل کے گھنے جنگلوں سے اتنا شہد اکٹھا کیا جاتا تھا کہ یہ دوسرے دیسوں لوگوں کے کام و دھن میں چاشنی گھولتا تھا۔ یہیں سے گیہوں اور دیگر اجناس کی بھی تجارت ہوتی تھی۔ سن کی رسیوں کی دستکاری نے بانکوٹ کا تجارتی رشتہ باہر کے ملکوں سے باندھ رکھا تھا۔[۳]

جس کی بہار یہ ہو ...!!

سترہویں صدی کی کونپل پھوٹی تو اُس نے دیکھا کہ کوکن کے چمکتے ساحلوں

۱: Forbes, Oriental Memories I 190

۲: باربوسا۔ ص۴۳

۳: رتناگیری گزیٹیر ص۱۷۵، ص۳۲، ص۳۲۱

پر سے پرتگیزی تسلط کا سایہ ڈھلنے لگا تھا۔ پت جھڑ کے سوکھے پتوں کی طرح فرنگی استبداد کے بیڑوں کے لنگر ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے اور اب انگریز، ڈچ، فرانسیسی مہم باز اور ولندیزی تاجر اپنے جنگی جہازوں کے آہنی لنگر دابھول، راجہ پور اور وینگرلہ کے بندروں میں ڈال رہے تھے۔ سمندر اور سیاست کی بے قرار لہریں اب ان کے اشاروں پر بہنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔

دابھول کا دبدبہ نیل اور کپڑے کی تجارت پر سے اُٹھ چکا تھا مگر ۱۶۳۹ء تک سیاہ مرچ کا تیکھاپن اور ملیبار کے گرم مسالے کا ذائقہ بدیسی بیوپاریوں کو یہاں تک کھینچ لاتا تھا مگر یہ تجارت بھی خاص خاص تاجروں کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ صرف "اُور نو نبارہ" (اورن ممبئی) سے درآمد کئے ہوئے نمک کی تجارت چمک اُٹھی تھی۔ دابھول کی ڈوبتی بدیسی تجارت کو اُبھارنے کے لئے یہاں کے سیدی تھانیدار نے (۱۶۱۱-۱۶۱۲ء) میں انگریزوں کو تجارتی مراعات کی پیشکش بھی کی تھی۔ مگر ان نئے سیاسی اجارہ داروں کو دابھول کا شہر ایک سلگتا ہوا۔ مایوس کن ویرانہ لگتا تھا۔ جسے پرتگیزوں نے برسوں اپنے آتش ظلم کا نشانہ بنائے رکھا تھا۔

یہاں مسلمان تاجروں کی سب سے بڑی تعداد آباد تھی اور جو ایک سو چھتیس فٹ طویل، اکتالیس فٹ عریض ساڑھے انتیس فٹ گہرے اور بادہ

۱۔ Middleton in Harris, I, 107 & Mandelso's voyages 1222

۲۔ مڈلٹن - ایضاً۔

ٹن وزن کے محمودی جیسے دیو پیکر جہازوں کے خدا اور ناخدا تھے[1] مگر ۔ جو خدائے سیاست کی بندگی میں اتنے مجبور اور بے بس اپنے آپ کو محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان کے ہاتھوں میں عربی تلواروں اور ایرانی نیزوں کی بجائے جھول میں بنے ہوئے تسبیح کے دانے ہوتے تھے جن پہ "یہ کشائیشِ روزگار" اور "فتح وظفر" کے لئے دعائیں پڑھ کر دم کرتے تھے ۔

اور اب وینگرلہ ۔ ولندیزیوں کا فنگرلہ تاریخ کے نقشہ پہ اُبھر کر سامنے آتا ہے ۔ سمندر کے کنارے دُور تک پھیلا ہوا یہ ایک ایسی شاہراہ پہ واقع تھا جو قرونِ وسطیٰ کی عظیم ترین شاہراہوں میں شمار کی جاتی تھی ۔ یہاں ۱۶۳۸ء میں ولندیزیوں کی ایک تجارتی نوآبادی قائم ہو چکی تھی ۔ اور تین سال بعد تجارتی کوٹھی کی بھی نیو پڑ گئی ۔ لو جب یہاں کے باغوں میں آگنے والی الائچی ۔ جو گراں اور نایاب تھی اپنی مہکار سے سورت کی انگریزی کمپنی کے مشام جان کو معطر کرنے لگی تو راجہ پور میں (۱۶۴۹ء) میں ایک انگریزی کوٹھی بھی کھڑی ہو گئی[2] ۔ وینگرلہ کی بندرگاہ نہایت کار آمد محفوظ اور قابل دسترس تھی ۔ یہاں جزائر شرق الہند سیلون، بنگال، سورت، ایران اور بحیرۂ احمر کے جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی ۔ یہاں کے جنگلوں کی لکڑیاں ایندھن کا کام دیتی تھیں اور یہاں کا میٹھا پانی جہاز کے مسافروں کی پیاس بجھاتا تھا ۔ وینگرلہ کی تجارتی منڈی گیہوں، چاول اور دیگر اشیائے خوردنی کے انباروں سے بھری رہتی تھی ۔ کالیکٹ

---

۱ : Orme's Historical Fragments, 325

۲ : Tavernir in Harris II 360

کی چھینٹ [تھانہ اور کلیان ۔ اسلام آباد] میں بُنے ہوئے ریشمی اور نفیس سوتی پارچے اور دکن کے کناری والے موٹے کپڑوں کی تجارت کے نارو پُودیاں سے دُور دور تک پھیلے ہوئے تھے ۔ [ناریل) کی کھُردری چٹائیاں بھی بنتی تھیں جو پنساروں اور گٹھوں کے باندھنے میں کام آتی تھیں[1]۔

عادل شاہی تالکوکن کے شہروں اور تجارتی منڈلیوں میں ہندوستان کارومنڈل اور گولکنڈہ کے کارخانوں میں تیار کئے گئے بیرمیہ پارچے اور چھینٹ کی بڑی مانگ تھی ۔ یہیں ہفتہ وار بازار بھی لگتے تھے جن میں مقامی بیوپاری تجارتی اسباب' اشیائے خوردنی اور دیگر اجناس بیچنے کے لئے لاتے تھے۔ ان بازاروں میں چاروں کھونٹ سے خانہ بدوش قبیلے اپنے باربردار مویشیوں کے قافلوں کے ساتھ جن میں تین سے لے کر دس ہزار تک چوپائے ہوتے تھے تجارتی اسباب لے کر آتے تھے[2]

چیُول کا چل چلاؤ :

عہد قدیم میں سیاست اور تجارت نے چیوکی کو اتنی وسعتیں بخش دی تھیں کہ یہ اپنے دامن میں کئی بستیوں کو سموئے رکھتا تھا ۔ دَید زمانے میں اس کا سایہ پوڈنڈا کی اُس پراچین بستی پر زیادہ گہرا تھا ۔ جسے کرشن جی کے بھائی بالارام کی بیوی

ٹا : بڈلٹن ۔ Tavernier in Harris II 360

ٹا : Ogilbys Atlas, V, 249

کے نام پر "ریوتی شتر" کہتے تھے۔ اور جو صدیوں سے بدیسی بیوپاریوں کی منڈی بن چکا تھا عربوں نے چیمور کے ماحول کو سنسان ممبئی کے ایک آباد جزیرے تروممبہ تک پھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب پرتگیز نوآبادیاتی نظام کی بیوپڑی تو قدیم چیول کی مسلم بستی تو کھاڑیوں اور سمندر کے سنگم سے ڈیڑھ میل دور اندرونی علاقے میں سمٹ کر رہ گئی اور اس کی بندرگاہ کے دہانے پر اجنبی ہاتھوں نے جبر و استبداد کی مُہر لگا دی اور کور کے مالوکی نوآباد بندرگاہ کا منہ کھول دیا جس نے تالکوکن کی تجارت کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا کیونکہ تجارتی جہازوں کو قدیم چیول کی بندرگاہ تک پہنچنے کے لئے پرتگیزوں کے ترجمانوں کے سالیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ۱۵۱۴ء میں جب[2] دوارت باربوسا چیول آیا۔ تو یہ گھاس پھوس کی چھتوں کی پوشش والے پختہ مکانات کا چھوٹا سا شہر تھا۔ جس کی رونق سال کے موسموں کے حساب سے ڈھلتی بڑھتی تھی۔ اس کے برعکس آنے والے دور میں پرتگیزی مقبوضہ بستی اور نوآبادی میں نئی معاشرت اور تہذیب سربلندی حاصل کر رہی تھی۔ اور یہاں رنگ برنگ کے ڈیزی، ڈالیا پھولوں اور رسیالوی گلابوں سے بھرے باغات بہار دکھلا رہے تھے۔ پرتگیزی طرز کی ٹوپے دار چھتوں سے ڈھکی، یورپیئو اور غلام گردشوں سے گھری ہوئی ولائیں اور حویلیاں تھیں جن کی دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

---

[1] : دے کنہا۔ لنشہ ا طالوی سیاح سیزر فریڈرک کا بیان (۱۵۶۲ء)

[2] ایضاً صد ۴۳

[3] ایضاً صد ۴۷

اور جب بدیسی استعماریت کی امر بیل نے نظام شاہی سلطنت کے تاروپود کو جکڑ لیا تو اُن عرب اور عجمی سوداگروں کا دم گھٹنے لگا جو تالکوکن کی کسی اُجڑی بندرگاہ میں اپنی تجارتی کشتیوں کا لنگر ڈالے صوفیوں کی طرح اس دُنیا کی بے ثباتی اور نیرنگیوں پر غور کرتے رہتے تھے اور جب اپنے اجداد کے عہد کے سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے بیٹھتے تو ان کے تصوّر میں تاریخ کے بادبان کھل جاتے اور ماضی کے سمندر کے سینے پر وہ غراب کشتیاں دوڑنے لگتیں جن میں بیٹھ کر اُن کے اجداد "صیمور شہیر وال" کی شہرت سن کر یہاں آیا کرتے تھے۔ اور اُن کے مشامِ تخیّل میں "صیموری عود" اور پہاڑیوں پر اُگنے والی خوشبودار جڑی بوٹیوں کی نکہتیں گھل جاتیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے ان کے اجداد اپنی بادبانی کشتیوں کے سکّان کا رُخ صیمور کی طرف موڑ دیتے تھے۔

اور اب اُنہیں عرب و عجمی تاجروں کی اولاد پرتگیزوں کے دیو ہیکل جہازوں کے سامنے اپنی کشتیوں کو تنکے کی طرح بہتا ہوا دیکھ رہے تھے اور مصر سے لے کر گجرات کے اشتی بندرگاہوں تک مسلمانوں کا بیڑا غرق ہوتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک شکست کھائی ہوئی قوم کا احساس پسپائی تھا۔ جو ایک نئی ابھرتی ہوئی تہذیب کی برتری کا اعتراف کرنے لگ گئی تھی۔ اور یہ اعتراف ان کے احساسِ کمتری کا نتیجہ تھا۔

اب ان مسلم تاجروں کو چیول کی باڑیوں کے اردگرد ع
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی تھی حنا[1] کہیں

---

[1] : ادریسی کا بیان۔ ایلیٹ۔ (لندن ۱۸۶۷ء) ج ۱ صفحہ ۸۶-۸۵

نظر آتی تھی جس کا ذکر ادریسی (۱۱۵۳ء) نے اپنی تصنیف "نزھتہ العشاق"
میں کیا ہے۔ اب انسانی خون سے حنابندی کی جاتی تھی اور نم آلود اور مرطوب
فضاؤں میں انہیں حنازاروں کی بو گھلی ہوئی تھی۔ اور شور مچاتے ہوئے سمندر کی
بے قرار لہریں جلترنگ کی بجائے لہو ترنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ع
"دل تا جگر کہ ساحلِ دریا خوں ہے اب"

تانے بانے!

ادریسی نے بلھارا (سلھارا) راج کی گھنی آبادی، شادابی اور خوش حالی کا ذکر
کیا ہے۔ صیمور میں چاروں طرف دھان کی کھیتیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔
یہاں جو اور جوار کی کھلیانیں تھیں۔ ہر قسم کی تر و تازہ ترکاری [مٹر] اور سبزی جات، پیاز
ادرک، اور مختلف دالیں (ادنیٰ قسم کی) بافراط دستیاب تھیں۔ تیل مکھن اور
شہد کی تجارت ہوتی تھی۔ کنجد (تِل) ناریل اور ارنیڈی سے تیل نکالنے کی گھانیاں
تھیں۔ مسلمان عصاروں کے علاوہ بنی اسرائیلی یا سنوار (سینیجری) اور سوموار تیلیوں
کے بیوپار کا بھی چراغ جلتا تھا۔ تِل کے بیج دکن[۱] سے لائے جاتے تھے۔
دکن کی پارچہ بافی کی صنعت کو سیاحوں نے اکثر سراہا ہے۔ فیضی نے جو
عرضداشت دکن اور خاندیس کی سفارت سے بھیجی تھی۔ اس میں اس نے ساروں
کی دستکاری (محترفۂ زرگران) کے ساتھ "پارچۂ بافانِ بے بدل" کا ذکر بھی کیا ہے۔

۱: دیکھئے پچھلے صفحات

" از ہمہ چیز دکن پارچہ است کہ می توان گفت کاغذ و پارچہ خوب در دو جای سا نند و می بافتہ یکی در پٹن[1] دو دیگری در دولت آباد "

چنول میں پارچہ بافی کی صنعت کے تار و پود قدیم ماضی سے ملے ہوئے تھے۔ [کلیان اور غالباً اسلام آباد ۔ بھیمڑی میں سوتی کپڑوں کے کر گھے بھی اتنے ہی قدیم تھے اور یہاں کی پارچہ بافی کی نفاست پر سارے دکن کو ناز تھا][2] چنول میں کئی قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ ریشمی ملبوسات کی دستکاری میں چین کے نور باف بھی چنول کے بنکروں کا ہاتھ پکڑ نہ سکتے تھے۔ خام مال اسی ملک سے درآمد کیا جاتا تھا[3]۔ عورتوں کے دوپٹوں کے لئے نفیس ململ بھی یہاں کے پارچہ باف تیار کرتے تھے گو بیرمیہ کپڑا (جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ[4] میں کیا ہے) ہندوستان کارومنڈل اور گولکنڈہ کے کارخانوں سے کوکن (دابھول وغیرہ) روانہ بھیجنے کے لئے منگوایا جاتا تھا مگر مرتضیٰ آباد کے ماہر کاریگروں نے اسی نوع کا کپڑا

---

[1] : پٹن بھالی پٹن تھوک فروشی کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ منتخب وقائع ص ۱۵۱

[2] : ڈاکٹر جان فرائر۔ کارنجہ (اورن) سے ناسک کے بزاز پارچے خرید کر دکن کی منڈیوں تک بیچنے کے لئے جاتے تھے۔ منتخب کاغذات عہد شاہجہاں (حیدرآباد دکن ۱۹۵۰ء) صفحہ ۱۱۸

[3] Jean Hugues, Navigation 17, 20, 21, 73

[4] :- ابن بطوطہ ۔ باب ۲ ۔ فصل ۱ ص ۳۶ ــ ۲۳۵

براۃ کے نام سے (سولھویں صدی یا غالباً اس سے قبل) بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی طیار میں بڑی مانگ تھی۔ یہاں کلابتون یا زرتار تیطون (لیس) بنانے کی گھریلو دستکاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے علاوہ رنگین تافتہ بھی تیار کیا جاتا تھا جنہیں رقاصائیں استعمال کرتی تھیں[۱]۔

پرتگیزوں نے تانبا، پارہ، شنگرف اور دیگر خام اشیاء ہندوستان میں برآمد کر کے اس ملک سے کافی فائدہ اُٹھایا[۲] اور ہندوستان کی منڈیوں میں اپنی مصنوعات کی اجارہ داری قائم کر لی۔ اس طرح مقامی مصنوعات کی مانگ اور پیداوار گھٹ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہاں سے سستے داموں سوتی کپڑے اور شیشے کے مہرے حبش لے جاتے تھے اور وہاں سے زر، عنبر اور ہاتھی دانت کے علاوہ کافر غلام بھی لاتے تھے[۳]۔ اس طرح ہندوستان کی معاشیات اور کئی صنعتوں کو سخت دھچکا پہنچا۔ بارلوسا کے عہد (۱۵۱۴ء) میں جن مقامی کپڑوں کی مانگ تھی ان کے تانے بانے ولندیزی سیاح ژاں ہیوگو کے قیام ہندوستان (۱۵۸۳ء) کے وقت ٹوٹ رہے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں سے ہندوستان کے مختلف شہروں، جزائر شرق الہند مشرقی افریقہ، پرتگال اور خلیج فارس کو سوتی کپڑوں کے گٹھے بھیجے جاتے تھے۔ ان

۱: باربوسا کا بیان، ۷۰-۷۱-۶۹ Viagem de Francisco Pyrard (Nova Goa) Vol ii PP. 227-228.

۲: باربوسا کا بیان ایضاً

۳: Robt. Kerr's Collection of Voyages (Edin 1824 Vol iii PP. 153-206

میں رنگین چھپے ہوئے چھینٹ اور سفید پارچے ہوتے تھے۔ ریشمی پارچہ بافی کی صنعت اس عہد میں بے حد عروج پر تھی۔ اور مسلم حکومت میں پرتگیزوں کی زیر سرپرستی مقامی بنکراپنی دستکاری کا ایسا کمال دکھا رہے تھے کہ چین کے ریشمی بافندے بھی حیرت سے دانتوں تلے انگلی دبالیں۔ ان ریشمی کپڑوں کو گوا اور ہندوستان کی دوسری منڈیوں میں بڑی مانگ[1] تھی۔

واضح بنکر فرقہ:

مقامی بنکروں میں سالی اور کھتری جاتی کے لوگ تھے۔ کھتری ریشمی اور سنہری گوٹے ٹھپے کے کاموں میں مہارت رکھتے تھے۔ اس فرقے کی ایک بڑی تعداد عیسائی مذہب اختیار کر چکی تھی۔ مسلمان بنکروں میں آنے والے دور میں ایک نومسلم مہاجر فرقہ کا اضافہ ہوا۔

مقامی لوگ انہیں "واضح" کہتے تھے۔ اس لقب کی وجہ تسمیہ غالباً ان نومسلموں کا اپنے لئے مذہب کی واضح پیروی تھی یا پھر نوائیتیوں اور ان کے درمیان واضح نسلی اور سماجی امتیاز نہ تھا۔ کیونکہ گو یہ اُن سے معاشرتی میل جول رکھتے تھے، ان کی طرح کچھ فقہ شافعی کے مقلد بھی تھے۔ اور اُن کی کوکنی بولی بھی بولتے تھے۔ مگر یہ بولی گجراتی آمیز تھی۔ جو ان کی گجراتی قومیت کی شہادت دیتی ہے۔ اور پیشے کے اعتبار سے بھی

---

[1]: تراں ہیوگو الیناسیزر فریڈرک (ہکلویٹ): Voyages II 344.

[2]: فرانکو پائرارڈ۔ NOVA. GOA (۱۸۹۲ء) ج ۲۔ ص ۲۲۷

یہ عام نوابیتوں سے بے حد مختلف تھے۔ تھانہ، ماہم، وسئی اور اسی شہر کے مضافات میں پاپڑی، بولنج اور سوپارہ [اور بعد میں باندرہ جزیرے میں] "وانجہ" یا "واجہ" ـ بُنکروں کے گھرانے آباد[1] ہو گئے۔

مسلم چیول میں دستکاروں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ ان میں سُتار اور بڑھئی نمایاں حیثیت رکھتے تھے کیونکہ یہ منقش چوبی کام کرنے میں بے مثال تھے منبت کاری سے مُرصّع صندوقچے اور الماریاں چینی طرز کی یاد دلاتی تھیں۔ مسہریاں اور صوفے (صُفّے) بھی بیروزہ دار روغن سے رنگے ہوئے۔ ان کی مشاقی، نفاست اور کاریگری کے رنگ دکھلاتے تھے۔ اس پیشے میں مرہٹہ مالی، مسلمان اور بنی اسرائیلی سُتار شامل تھے۔ ان کے علاوہ کاٹاری بھی تھے جو (عموماً) پامیر کے درخت کے سوکھے تنے سے) مختلف ساز و سامان بناتے تھے[2]۔

سونے کا درخت :

ناریل کا درخت جس کا ذکر ادریسی نے بھی کیا ہے کوکن کا سونے کا درخت تھا۔ اور جو آنے والے دَور میں ہر سیّاح کی آنکھوں میں کُندن بن کر چمکتا رہا۔ اطالوی سیّاح سیزر فریڈرک کے بیان کے مطابق یہ اتنا کارآمد پیڑ ہے کہ اس کا نہ تو کوئی ہمسر دنیا میں موجود و معلوم ہے۔ اور نہ اس کا کوئی حصّہ ایسا بے کار ہے جسے جلایا جا

---

[1]: تھانہ گزیٹیر ج ۱۳ ۔ ح صفحہ ۲۱۷، ۲۴۳
[2]: قلابہ گزیٹیر ۔ ص ۲۴۲ (فٹ نوٹ)، ص ۲۷

سکے ۔ یہ درخت ملایا کے بنوں سے اپاس کے کسی یگ میں جمبو دیپ لایا گیا تھا (جیسا کہ ناسک گپھا کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے) ناریل، تاڑ، نخل اور پامیر کی قبیل کے پیڑوں کی زمردیں چھاؤنیاں گو آسے لے کر کوکن کی آخری منزل تک لامتناہی ساحل کے کنارے کنارے پھیلی ہوئی تھیں جن کے گہرے سبز سایوں میں مسافر اپنا پڑاؤ ڈالتے تھے ۔ گرم دوپہروں میں ان کا ٹھنڈا سایہ سیّاحوں کو آرام کی آس دلاتا تھا ۔ اور ناریل کا میٹھا پانی تشنہ کاموں کی پیاس بجھاتا تھا ۔ درخت کی اونچائی پر لٹکائی ہوئی ہانڈیوں میں اس کا رس قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا تھا ۔ اور یہی کشید ہو کر شراب بن کر جام و مینا میں چھلکنے لگتا اور کھوپڑے کی "کھوپڑی" میں بھر کر بھنڈاری فرقے کی تقریبوں اور تہواروں میں بانٹا جاتا تھا ۔ اس کے رس [تاڑی] میں شراب کی بُو باس بھی تھی [اور نیرا میں] شیرہ کی مٹھاس بھی تھی ۔ جب اس کا پیڑ سوکھ جاتا ۔ یا اس کی زندگی کی شہ رگ کاٹ دی جاتی تو مختلف جون میں اس کا دوسرا جنم شروع ہوتا تھا ۔ طویل قامت تنہ شہتیر بن کر عمارتوں کو سنبھالا دیتا اور اس کے ترشے ہوئے تختوں کو اسی کے نرم لچکدار ریشوں کی بٹی ہوئی سن سے زیادہ مضبوط اور پائیدار رسیوں سے جوڑ دیا جاتا تھا تو یہ پڑاؤ بن کر ڈولنے لگتے ۔ پتوں کو اس طرح بُنا جاتا تھا کہ بادبان بن کر پھڑپھڑانے لگتے یا چٹائی بن کر عرش کی بلندی سے نیچے فرش پر بچھ جاتے تھے ۔ ٹہنیوں کو کاٹ چھانٹ کر مسہریاں اور الماریاں بناتے تھے ۔ کھوپڑے کی چھال کو جھوبجھے کی طرح بٹ کر جہازوں کے درازوں کو بند کرنے کے کام

مراٹھی دے کتھا ص۵۹-۵۰

میں لایا جاتا تھا۔ گودا سوکھ جاتا ہے تو کھوپڑا کہلاتا ہے۔ اور جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ جو آج بھی پکوانوں کا لازمی جزو ہے۔ کاسہ، کاسۂ گدائی بن جاتا یا پھر پیالہ۔ اسی سے چمچے اور دیگر ظروف بھی بناتے تھے۔

چیول میں معمولی شیشے کے موتی دانے بھی ڈھالے جاتے تھے۔ ان بلوری مہروں کو تسبیحوں میں پرو دیا جاتا تھا۔ (جن پر عیسائی راہب اور راہبائیں "اے ہمارے باپ" کی مشہور دعائے قنوت کا ورد کرتے تھے تاکہ یسوع مسیح کی بھیڑوں میں اضافہ ہوتا رہے) ـــــ اور اپنے گلے میں کالی بھیڑوں کی تعداد بڑھانے کے لئے ان مہروں کی مالائیں سفید فام بردہ فروش حبش کے سیاہ فام قبائلیوں کے گلوں میں ڈال دیتے تھے اور یہ مالائیں زنجیریں بن جاتیں۔ زیر دام آئے ہوئے بھولے بھالے انسان غلام بن کر کوکن کی منڈیوں میں بے مول بک جاتے تھے۔ اہل کوکن ان حبشی غلاموں کو "کافر" کہتے تھے۔ یہی افغان فروش پرتگالی۔ چیول کے کرگھوں پر بنے ہوئے سوتی کپڑوں کو سستے داموں خرید کر کافروں کے دیس میں بیچ ڈالتے تھے اور عوض میں سونا، عنبر اور ہاتھی دانت حاصل کرتے تھے[۲]۔

کھمبایت کے [جین] جوہری اور گجراتی بنیئے جو چیول کی خوشگوار اور صحت مند آب و ہوا میں پل رہے تھے۔ فرنگی شعبدہ بازوں کی "سیمیائی نمود" سے اپنی آنکھیں خیرہ کر بیٹھے تھے۔ ان سے یہ ہیرے جواہرات کا لین دین رکھتے

۱۔ اسپنر فریڈرک Kerr's Collection of Voyages (Edin. 1824) viii 153, 206

۲۔ ایضاً

سے تھے[۱] اور ان کی بے حد رنگین دو باشیاں پرتگیزی چیؤل کی مقبوضہ کھاڑیوں میں دوڑتی رہتی تھیں۔ چیؤل کی پرتگیزی اور نظام الملکی بندرگاہوں میں دور دیسوں سے جہاز آکر لنگر انداز رہتے تھے۔ بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے عرب و عجمی تاجر جو کئی جہازوں کے مالک ہوتے تھے۔ ابھی تک [۱۵۸۳ء] چیؤل کی تاجرانہ زندگی پر اپنا حق جتانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے۔ حالانکہ بحری تجارت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی اور اب یہ ہاتھ ملتے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ ہرمز مکہ اور [مسقط] کے شنگرف، سیماب، تانبا، اطلس اور مخمل کی تجارت کس طرح فرنگی اجارہ داری کی بھینٹ چڑھ رہی تھی، اور اب یہی مال ملیباری دمن اور چیؤل کی پرتگیزی تجارتی کوٹھیوں سے خریدے نے لگ گئے تھے[۲]۔ چیؤل کی بندرگاہوں میں سندھ کے دو مستولوں اور دو بادبانوں والے پڑاؤ لنگر انداز رہتے تھے۔ بنگال سے آئی ہوئی بڑی بڑی ڈونگیاں ڈولتی رہتی تھیں۔ جزائر شرق الہند اور چین کے بھاری بھرکم 'جنک' جہاز ریشمی لچھوں کی گانٹھیں اور کپڑوں کے تھان پرتگیزی چیؤل کی بندرگاہ کے دہانے میں اگلنے کے لئے تیار کھڑے رہتے تھے۔ چیؤل میں ممالک نظام الملکی کی پیداوار اور پرتگیزی مقبوضات کی مصنوعات کا دھندا زوروں پر ہو رہا تھا۔ اور یہاں سے اناج افیون، تیل، سہاگہ، لوہا، ہر قسم کے ریشمی پارچے سادہ اور سفید کپڑے [ململ] اور رنگین چھپی ہوئی چھینٹ اور [بیرینہ تافتہ] بنیا مذکورہ بالا تمام ملکوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ہندوستان کے ساحلی شہروں سے یہاں

---

[۱] سیزر فریڈرک ...... Fitch in Harris II 207

[۲] فچ - ایضاً - اور Kerr's Voyages VI 153, 206, 474

ادویات، گرم مسالے اور ناریل لائے جاتے تھے۔ اور فرنگی چینوں کی کشادہ سڑکوں پہ نئے وضع کی دوکانوں میں ساگوانی الماریوں میں سجائے ہوئے چینی ظروف کھنک کھنک کر گاہکوں کو صدائیں دیتے تھے اور چینی ریشمی ملبوسات اور مغربی وضع کی سلی ہوئی پیراہنیں مسلمان امراء، دکھنی اور مغل منصبداروں[۱]، نوابطی تاجروں اور ہندو سرداروں کا دامن اپنی طرف کھینچتے رہتے تھے۔ چینی چندن کی مہکار نے تیموری عود و عنبر کی نکہتیں اڑالی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کے معاشی و اقتصادی حالات کا جو نقشہ اس دور کے مختلف بدیسی سیاحوں نے کھینچا ہے۔ اُس کے خطوط سے صرف ایک ننگا بھوکا ہندوستان اُبھرتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں اس کی برہنگی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ جب ہم اُس عہد سے متعلق "معاشی جائزوں"[۲] کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔ جو بیسویں صدی میں یورپ اور ہندوستان میں مکمل کئے گئے ہیں۔ اِن جائزوں میں زندگی [آج کی طرح] اپنی تمام سماجی و اقتصادی تضادات کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ایک طرف محنت کشوں کی افلاس زدہ زندگی تھی اور دوسری جانب [متوسط طبقہ کی معیاری] اور اہلِ ثروت و اقتدار کی انتہا پسند زندگی تھی۔

۱؎ ایضاً اور Kerr's Voyages VI 153, 206, 474

۲؎ یہ ۱۵۸۶ء کے سیزر فریڈرک کا بیان ہے۔ اسی سال مغل امیر خان اعظم مرزا عزیز کوکہ صوبیدار مالوہ نے براَنگ دھاوا مار دیا تھا۔

۳؎ دیکھئے: ہند کی معاشی حالت۔ ترجمہ) Moreland; India At The death of Akbar اور Irfan Habib, Agrarian System of Moughal India.

درد کا شجر:

نکی تن افانسی روسی سیاح نے ۱۴۷۰ء میں بہمنی دکن اور وجے نگرم کے بارے[1] میں جو کچھ لکھا ہے گو اُس سے اُس کی مسلم دشمنی کی سیاہی ٹپکتی ہے مگر اسی سے بہمنی مملکت کے نچلے طبقہ کی زندگی کے وہ سیاہ پہلو بھی نظر آجاتے ہیں جن پر [مسلم] معاصر مؤرخین نگاہ ڈالنے سے کتراتے ہیں! اور اسی سے وجے نگر کی معاشی فوقیت اور مذہبی رواداری کا [کم از کم نکی تن افانسی کے عہد تک] اندازہ بھی ہوجاتا ہے۔ گو اس ہندو راج میں بھی حاکموں اور محکوموں کے درمیان دولت و محنت کی وسیع اور گہری خلیج پھیلی ہوئی تھی۔

افانسی نکی تن جب بہمنی سلطنت کے اہل اقتدار کی طاقت و شوکت اور عسکری تنظیم کی طرف دیکھ کر اپنی نظریں خیرہ کر بیٹھتا ہے تو فوراً محنت کش طبقہ کی معاشی و سماجی زندگی اس کے سامنے ننگی ہو کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ دکن کی چلچلاتی دھوپ میں دستکار اور ہنر مند ۔ اور کوکن کی موسلا دھار بارش میں کاشتکار — اپنے خون اور پسینے سے اُس "درد کے شجر" کی آبیاری کرتے رہتے تھے۔ جس کے برگ و بار امراء کا نصیب بن چکے تھے۔ اور جس کے سائے میں تن آسان جاگیردار پھولوں کی سیج بچھا کر سوتے تھے [ہندو اور مسلمان] رعیت کی معاشی ابتری کا سبب وہ معاشی استحصال تھا جو حکمراں طبقہ کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ گو یہ بہمنی حکومت کا زمانۂ عروج تھا۔ مگر ساحلی راجاؤں کی سرکوبیوں، کوکن کی مہمات اور وجے نگر

---

[1]: بھارت - روس - صد ۲۵ - ۲۰

سے مسلسل جنگوں نے سرکاری خزانوں کو بھوکوں کی پیٹ کی طرح خالی کر دیا تھا۔ امراء جو تجارت بھی کرتے تھے حکومت کے طفیلی بن چکے تھے۔ ملکی توسیع پسندی نے مقامی معاشیات کو ناکافی بنادیا۔ اور مال غنیمت میں آئے ہوئے جنگی قیدیوں کی بھرما نے آبادی کے تناسب کو بڑھادیا تھا اور امراء اور متمول لوگوں کی معیار زندگی کو اونچا کر دیا تھا مگر اس سے گھریلو اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا تھا اور محدود معاشیات ایسے وقت میں معاشی استحصال کا سہارا لیتی ہے اور دولت مندروں اور تہہ خانوں کے دفینوں میں پناہ لینے لگتی ہے۔

نکی تن افانسی کو بڑی حیرت ہوتی تھی جب وہ بازاروں میں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء کو بے حد ارزاں پاتا تھا۔ عوام خصوصاً ہندو بڑی حد تک جزرس تھے۔ مگر انسانی زندگی بیحد ارزاں تھی اور منڈیوں میں "کالے غلام" سستے داموں بکتے تھے مگر کنیزوں کے مول اونچے تھے جنس کی ارزانی کیساتھ جنسیاتی تعیش بھی بحد سستی تھی۔

نکی تن کو ہندو اور مسلم عوام کے درمیان مذہب اور دھرم کی دیوار دیکھ کر اتنا تعجب نہیں ہوا جتنا اچنبھا اسے بیدر کے عالیشان محل کے سامنے کنگالوں کے ٹھٹ، مسلم امیر شہسواروں کی جلو میں ننگے پیروں ہندو پیدل دستوں اور کھیتوں میں افلاس زدہ کسانوں کو دیکھ کر ہوا تھا۔ عوام کی مفلوک الحالی، مقامی باشندوں (خصوصاً ادیباسیوں کی) پسماندگی اور عام رعیت کی مظلومیت کے نظارے ہندوستانیوں کے لئے نئے نہ تھے

۱: بھارت روس ص۲۵۔ ۲۴

۲: بھارت روس ص۲۱۔ ۲۰ ۔ دسے کنھا ص۱۸

اور نہ تو جنیر، بیدر یا وجے نگرم کی شاہراہوں پر لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے
افلاس کبھی تن کو نظر آسکتے تھے۔ بھگتوں، سنتوں اور صوفیوں کی شاعری کے سوا عوام کا
افلاس عام موضوع سخن کبھی نہیں بن سکا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے عام انسان کی زندگی کے سفر میں دو ہی نہایت اہم موڑ آتے
تھے۔ حالات سے سمجھوتہ کر کے اس کی غلامی قبول کر لینا یا فرار کا راستہ ڈھونڈ کر
دھرم کی شرنڑ، مذہب کے حصار یا انفعالی تصوف کے گوشۂ عافیت میں پناہ لے
لینا۔ ایسی زندگی قناعت و توکل کی بیساکھیوں کے سہارے تسلیم و رضا کے راستوں پر
چلتی ہے۔ ایسی کسی عوامی بغاوت سے تاریخ اُس وقت تک ناآشنا تھی جو براہِ راست
معاشی ابتری یا سماجی انتشار کے خلاف کی گئی ہو۔ عوامی بے اطمینانی اور احتجاج نے
تصوف یا بھگتی تحریکوں میں اپنا اظہار کیا ہے۔ دبا دبا احساس دوہوں اور شعروں میں ڈھل
کر کراہ اُٹھا ہے۔ کھلی بغاوت مفاد پرست کرتے تھے۔ جس کی نوعیت ہمیشہ ملکی یا سیاسی
رہی ہے۔

بہمنی قوت جب پانچ مرکزوں میں بٹ گئی تو افلاس بھی بٹ گیا اور اس طرح دکھ بھی
گھٹ گیا۔ بہمنی حکومت کی مادی برکات سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ مگر نئی سلطنتوں
کی سرپرستی میں مذہب اور جاتی کے تفرقے کی دیواریں آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگیں۔ ایک نئی
مشترکہ تہذیب کا خمیر بننے لگا۔ عوام کے ننگے پیروں کے کانٹے نکل گئے اور جراحتِ دل
کا کسی حد تک مداوا مل گیا۔ مگر سارے معاشی مسئلے حل ہو گئے۔ ایسا پھر بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ

امیر و غریب کے درمیان جو ازلی اور ابدی خلیج حائل تھی وہ تاریخ کے کسی دور میں پاٹی نہ جا سکی اور آج تک چند ملکوں کو چھوڑ کر یہ خلیج ابھی تک کئی دیسوں کے انسانوں کو دو رویہ قطاروں میں کاٹتی گذر رہی ہے۔

اسی لئے چاہے وہ عادل شاہی دور کا دکن ہو یا مرا ہٹہ سوراجیہ کا حصہ محنت کش طبقہ غریبی اور مفلسی کے دلدلوں میں ڈوبا ہی رہا۔ ساحل اور کھاڑیوں کے کنارے آباد آگری اور کنبی اُس وقت بھی دھان کی کاشت کر کے جواری کی چپاتیاں کھاتے تھے۔ اور ماہی گیر مچھلیاں پکڑ کر گذارا کرتے تھے جب ۱۶۷۵ء میں اوگلبی رتناگیری آیا۔ اور اُس سے پہلے بھی وہ کنگال ہی تھے۔ اور ان تہیدستوں کے دامن موتی مونگوں سے سدا خالی ہی رہے۔ کھنڈوری اور دال ملی ہوئی کھچڑی عام خوراک تھی (گو بادشاہ بھی۔ جیسے شاہجہاں کھانے کا مزہ بدلنے کے لئے کھچڑی تناول فرمالیتے تھے) اکبر کے عہد میں اسے صوفیانہ کہتے تھے۔ جبکہ اُمراء کے دسترخوانوں پر کابلی اور بریانی روزانہ کی خوراک تھی[۱] مسلمانوں کی کثرت آبادی میں جہاں گوشت ملتا تھا وہ یہ گوشت خور تھے ورنہ سبزی اور ترکاری پر گذارا کرتے تھے۔ اور ڈاکٹر جان فرائر بھی اوگلبی ہی کے زمانہ میں جب کوکن سے گذرا تو اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لوگ معمولی سوکھے کے دنوں میں جڑی بوٹیاں کھا کر گذارا کر لیتے[۲]

---

(۱) رقعات عالمگیری۔ اور دیکھئے عالمگیر کے خطوط بنام شہزادہ محمد اعظم۔ کابلی ایک قسم کا گوشت کا پلاؤ تھا جس میں چنا نمک پیاز، ادرک اور سیاہ مرچ ڈالتے تھے۔ عالمگیر کو بے حد مرغوب تھا کھنڈوری کا ذکر فیضی نے اپنی تصنیف لطیفۂ فیاضی میں کیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر جان فرائر ج ۲ ص ۱۱۹

نے ورنئے۔ ج ۲ ص ۲ ۔ برنیئے ص ۳۰۳۔

سے تھے۔ بار کوسا اور ورتھما نے ساحل ملابار کے جس افلاس کا ذکر کیا ہے وہی افلاس کوکن کے ساحل پر دانت نکو سے کھڑا تھا۔ نکوتن جس کے مشاہدات ان معاشی حالات سے متعلق ہیں جن سے ۱۵۸۰ء اور ۱۵۹۰ء کا درمیانی وقفہ دوچار تھا گووا کے عام ہندوستانیوں کے افلاس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے: "یہ لوگ نہایت مفلسانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ برہنہ پھرتے ہیں اور اس قدر خستہ حال ہیں کہ ایک پائی کی خاطر کوڑے برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس قدر کم کھاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہوا پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اکثر و بیشتر نہایت پستہ قامت اور کمزور اعضا کے ہوتے ہیں[1]"

تمدّن اور برہنگی:

افانسی نکی تن اپنے ملک روس کے جاگیرداری نظام کا پروردہ تھا جب منگول تاتار تظلم و استبدادیت کے مقابلے میں مقامی خوانین اور خانوادوں کا اتحاد "جذبۂ حریت اور قومی حمیت کے پرچم تلے سینہ سپر ہو چکا تھا۔ انہیں نئی "خانی حکومتوں" کی سرپرستی میں گھریلو صنعت و حرفت اندرونی تجارت چودھویں صدی سے سربلندی حاصل کرنے لگ گئی تھی[2]۔ اس کے وطن کی دیہی زندگی کی خوشحالی یا اقتصادی برتری شہری زندگی کی برکتوں اور سماجی بلندیوں نے غرور کا سر اٹھا کر جب ہندوستان کے محنت کش طبقے کی مفلسی کا زرد چہرہ اور سماجی پسماندگی کو گھسٹتے دیکھا تو نکی تن کو ایسا محسوس ہوا جیسے

---

[1]: ہند کی معاشی حالت ص ۲۵۲

[2]: بھارت۔ روس ص ۲۵-۲۱

وہ "جی نوکی" میں نہیں بلکہ اپنے دور سے بہت پیچھے ایک ایسے یُگ میں آن پہنچا ہے جہاں اُس وقت تک معاشرت ننگی تھی اور ننگے پیروں چل رہی تھی۔ کوکن میں اُس نے [کنبی، کا تھوڑی اور کولی] ادیباسیوں کی ایک عجیب خلقت دیکھی۔ ان کی رنگت انکی سیاہ بختیوں کی طرح کالی تھی۔ یہ نیم برہنہ جنگلی باشندے کھلے سینہ اور کھلے سر۔ کھلے بندوں گھومتے تھے سر پر چوٹی ہوتی تھی اور کمر سے نیچے ڈھائی انگشت کی لنگوٹی" امراض کے تنوروں سے ان کے جسم نکلے ہوئے اور [مسلسل فاقوں اور بیماریوں کے باعث] پیٹ پچکے رہتے تھے اور سال پیدا ہونے والے بچے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے نظر آتے تھے۔ یہ سن بلوغ کو پہنچنے تک ستر پوشی سے محروم رہتے تھے۔"[1]

بابر بادشاہ نے اپنی تزکِ بابری میں گو شمالی ہند کے تمدن و معاشرت کے بارے میں اپنے مشاہدات قلمبند کئے ہیں۔ مگر ان سے ہندوستان کے سارے غیر مہذب قوموں کی نیم برہنگی جھانکتی نظر آتی ہے۔ کوکن خطّے کی معاشرت اور معاشی حالات کی تفصیلات سولہویں تا سترہویں صدی کے فرنگی سیاحوں کے سفر ناموں میں ملتی ہیں۔ کاریری نے بھی سالسٹی کے پسماندہ اقوام کی جو تصویریں کھینچی ہیں اُن کے پردوں سے بھی کوکن کے اصلی کوکن عریاں ہی نکلتے نظر آتے ہیں۔[2]

دکن کے ہندو طبقہ کی برہنگی بدنام ہو چکی تھی۔ لیکن دھنوان اور تعلیم یافتہ یا مہذب افراد ذوقِ پوشش بھی رکھتے تھے۔ اور شوقِ حاصل بھی۔ مگر وہ "جزرسی" جس کا ذکر فانسی نیکی تن اپنے سیاحت نامہ میں جا بجا بڑی فراخدلی سے کرتا ہے۔ ہندو پونجی پتیوں

---

[1]: دے کُنہا۔ صلا

[2]: کاریری۔ صد۱۷۹

کو مسلمان امراء کی طرح "توشہ خانوں" کے اسراف سے باز رکھتی تھی۔ ایک تو یوں بھی کپڑوں کے بدیسی اقسام کئی تھے اور یہی مہنگے بھی تھے اور مروجہ چلن کا معیار بھی۔ اشیائے درآمد میں کپڑا اور لباس سر فہرست نظر آتے ہیں[1]۔ کپڑوں کی مانگ اور مہنگائی نے جہاں پارچہ فروشی کی ساکھ اورنگ آباد، داجول اور چیول کی منڈیوں میں قائم کر لی تھی وہاں اُس نے چوروں کے "جذبۂ دزدیدگی" کو اتنا ابھار دیا تھا کہ سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں چوری کی جتنی وارداتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر بزازوں اور پارچہ فروشوں کے یہاں ہی ہوتی رہیں[2]۔

کپڑوں کی طرح پوشاک اور ملبوسات کی بھی متعدد قسمیں تھیں۔ ان میں سے بعض پیراہن وسطی ایشیا کے طرزِ معاشرت سے دامن گیر تھے جیسے خلعت، سراپا، قبائے اطلس، جبہ، دار، سوتی ریشمی کپڑوں کی سلی ہوئی قطنی۔ پائجامہ اور اسی طرز کے تنگ پائینچے کی سراول [سراویل] اور دیگر ملبوسات شامل تھے۔ قوطہ یزدی۔ بظاہر یزد کے کسی پیراہن کے طرز وتراش کا نمونہ تھا۔ ورنہ "قوطہ" مقامی کرگھوں پر بنا ہوا اپٹے والا کپڑا تھا، دگلہ، ترکی فرغل کا ہندوستانی نام تھا مگر اس کا استعمال دکن کی معتدل اور مرطوب آب و ہوا میں شاذونادر ہی ہوتا ہوگا۔ گرتی اور دوخوتی (اوورکوٹ) کا ۶۲-۱۶۶۱ء کے وقائع میں ذکر شہادت دیتا ہے کہ فرنگی تہذیب کا لبادہ ہندوستانی تمدن کو آہستہ آہستہ ڈھانپ رہا تھا۔ صافہ یا چیرہ باندھنے کا عام دستور تھا۔ نکی ترن۔ چی ول کے امراء کے پہناوے میں

---

[1]: ہند کی معاشی حالت ص ۳۳۷

[2]: منتخب وقائع دکن۔ جابجا

[3]: منتخب وقائع دکن۔ ص ۱۲۷، ۱۲۵ اور ۱۲۰

"بھنا" کا ذکر کرتا ہے۔ یہی چھیٹہ کاندھے پر رومال بن جاتا اور اسی کو خدمت گار کمربند کی طرح استعمال کرتے تھے[1]۔ زربفت دستار بندی کے لئے دستیاب تھا۔ عیدین یا کسی حاکم (مثلاً فوجدار) کی صحت یابی کے موقع پر قاضی شہر کو زری دستار دینے کا دستور تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھینٹ کی فرجی بھی دی جاتی تھی۔ دستار پر کلگی باندھتے تھے جو ایرانی نوجوانوں میں مقبول تھا۔ کلغی کے علاوہ طرۂ مرصع کاری لگانے کا طریقہ رائج تھا[2]۔

ہندوستانی پیراہنوں میں "سیلہ" "کرتا" لہنگا دامنی (سفید) لنگری (؟) اور پائجامہ مقبول تھے۔ (قطب شاہی دور[3] کی چند تصاویر سے دکن اور کوکن کے طرز معاشرت کا نقشہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ) ہندو مرد دھوتی کا استعمال کرتے تھے ساڑی (عموماً ڈنگین) ہندو عورتیں اور نوائطی مستورات سے دامن گیر تھی۔ مرہٹہ عورتیں ساڑی کو پیچھے سے ٹوپ دیا کرتی تھیں۔ چولی۔ ساڑی کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ عام مسلمان خواتین سر پر دوپٹہ لیا کرتی تھیں (چولی میں دوپٹے کا کپڑا بنا جاتا تھا) مسلمان لمبی قبا زیب تن کرتے تھے۔ آستین جس کی تنگ ہوتی تھیں۔ نوائطی قمیص کو ترجیح دیتے تھے۔ بعض اوقات ایک نیم آستین صدری قبا کے اوپر پہنتے تھے۔ پائجامہ تنگ پائینچوں کا بھی ہوتا تھا اور گھیر دار بھی بعض مسلمان خواتین لہنگا دامنی اور چولی کا استعمال

---

[1]: دسے کنھا ص۱۸۱

[2]: منتخب وقائع دکن ص۱۲۷

[3]: خاور نامہ رستمی (عہد تصنیف ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ تا ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶) ص۵۶-۲۵۵ (مخطوطہ انڈیا آفس)

عام طور سے کرتی تھیں (پیٹ صاف طور سے نظر آتا تھا۔ علاقہ مدراس میں مسلمان عورتوں کا آج بھی یہی لباس ہے) عورتیں بعض دفعہ سینے کے اوپر کا حصہ کھلا رکھتی تھیں۔[1] جزائر بمبئی کے اعلیٰ ہندو طبقوں میں "پربھی" اور "بھٹی" دو طرز کے ملبوسات کا چلن تھا۔

ملبوسات تیار کرنے کے لئے کپڑوں کے قسموں کی کمی نہ تھی۔ قصب (ململ)، کھادی، ڈوریا اور چھینٹ سے کوکن (اور دکن) کی منڈیاں بھری رہتی تھیں۔ چھینٹ کی بوقلموں قسموں میں چھاپہ "جو کرتہ یہ" اور "پارچہ قلمکاری" زیب و آرائش کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ تنبو (اور غالباً قنات اور راوٹی یا چھولداری) کے پردے بھی چھینٹ ہی کے ہوتے تھے۔[2] ان پر قلمکار بیلوں کی رنگین تصویریں کاڑھتے اور چھاپتے تھے۔[3] پلنگ پوش اور رومال بھی عموماً چھینٹ ہی کے استعمال ہوتے تھے۔ کھادی کا کپڑا ٹاٹ کی طرح عموماً تھیلے، زنبیل (خورجین) اور بقچے بنانے کے کام میں آتا تھا۔ سوتلی کا بھی ذکر اسی ضمن میں آسکتا ہے (بانکھٹ میں سن سے سوتلی بٹی جاتی تھی) زردوزی اور کلابتونی کام کرنے والے تھانہ، چیول اور (اورنگ آباد) میں کثرت سے آباد تھے کلابتون کپڑے اورنگ آباد کے چوک میں بیچے جاتے تھے۔[4]

فن مشاطگی اور زیبائش قدیم تہذیبی دور میں بھی نکھرا ہوا اور نمایاں تھا۔ بیا

۱: خاور نامہ رستمی۔ اور تھانہ گزیٹیر۔ ج ۳۔ خ۔ ص ۹۶-۹۵

۲: منتخب وقائع دکن ص ۲۱، ص ۲۱

۳: لطیفۂ فیاضی (عرضداشت بنام اکبر از خاندیس)

۴: منتخب وقائع دکن ص ۱۵

کہ اجنتا کی دیواری تصویروں سے جھلکتا ہے۔ سولہ سنگار کے سامانِ آرائش میں صابون کی کمی کو وسطی ایشیا سے آئے ہوئے حکمراں طبقہ نے پورا کر دیا تھا جہاں اس کا استعمال قدیم دور سے عام ہو چکا تھا۔ (تیموری عہد سے ایران میں صابن کی صنعت پر محصول لیا جاتا تھا) زیرِ بحث دور میں دکن کے وقائع میں صابون کا ذکر ملتا ہے [۲] پھولوں اور خوشبوؤں کی شوقین مہذب مسلمان مستورات ہی نہیں تھیں بلکہ مالوَن اور دننگیوں کی ہندو اور عیسائی عورتوں میں سُرخ وزرد (گیندے، سُرنگی، کیوڑا، شیونتی وغیرہ پھولوں) کے گجرے جوڑوں میں باندھنے کا شوق قدیم رسوم میں داخل ہو چکا تھا اور یہ رسم گووا سے منسوب تھی [۳]

زیورات کا شوق گنوار اور پسماندہ اقوام کی عورتوں کو بھی تھا مگر یہ لونگ کی مالا گلے میں ڈال کر اپنے شوق زیبائش کی تسکین کر لیتی تھیں [۴]۔ اس لئے کہ سوائے تانبے کے چاندی سونے کے گہنے پاتے ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ جبکہ امیر خواتین کی دسترس میں پہنچی (حلقۂ دست) اور یاقوت کی انگشتری بھی تھی اور مروارید کی مالا بھی گلوبند (جڑاؤ) اور طلائی زنجیر ان کے گلے کا ہار بن جاتی تھی [۱] ۔ اَڈریسی۔ ایک قسم کا جڑاؤ زیور تھا۔

---

[۱]: تسلیۃ الاخوان (مخطوطہ دانشگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مرتبہ ڈاکٹر مومن محی الدین (غیر مطبوعہ)

[۲]: منتخب وقائع دکن

[۳]: رتناگیری گزیٹیر ص ۱۱۱۔ (فٹ نوٹ بھی دیکھئے)

[۴]: "مغل ہندوستان کا زرعی نظام" عرفان حبیب۔ ص ۹۳

انگوٹھی بھی مردوں کی اُنگلی پکڑے ہوئے تھی۔ انہیں کے ہاتھوں میں چھڑی طلائیہ گلے میں مروارید کی مالا اور کمر میں نقرئی کمر بند شانِ امارت دکھلاتے تھے گہنے اور دفینے بھی زر اندوختہ کی حفاظت کے بہانے بن چکے تھے۔ زیورات کی مرصع کاری معیار زرگری اور دستکاری سمجھی جاتی تھی۔ اور احمد نگر کی مملکت میں فیضی (اکبر کے رتن، ملک الکلام اور خاندیس کے سفیر) کے بیان کے مطابق[۱] چابکدست زرگروں کی کمی نہ تھی ہندوؤں میں پربھوؤں کو زیورات پہننے کا خبط تھا۔[۲]

غریب کا گھر تو اس کے دل اور چراغ کی مانند بجھا بجھا اور بے رونق رہتا تھا جبکہ امیروں کے ایوانوں اور توانگروں کے شبستانوں میں دگدگیاں (فانوس) اور کافوری شمعیں فروزاں رہتی تھیں۔ مفلس کا گھر سامان خانہ داری سے اس کے پیٹ کی طرح خالی اور برہنہ رہتا تھا۔ ایک کھری چارپائی، مٹی کے چند برتن اور دو تین چوکیاں (پیڑھیاں)، یہی کل اثاثہ تھا۔ اس کے برعکس ایک متوسط گھرانے کے اثاث البیت میں پیتل اور تانبے کے ظروف شامل رہتے تھے۔ تانبے کے ظروف کی کثیر تعداد دھات کی قدر کے حساب سے[۳] تھی۔ ایک مغربی سیاح نے مغربی ساحل کے بارے میں لکھا ہے کہ "لوگوں کا اسباب خانہ داری بیتوں کی چٹائیاں ہیں۔ جن پر وہ بیٹھتے بھی ہیں اور لیٹتے بھی ہیں۔ اور یہ کہ ان کی میزیں، میز پوش اور رومال

---

[۱] : منتخب وقائع دکن۔ جابجا۔ منتخب کا غذاتِ عبدالشاہجہاں (حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء) : صہ ۱۱۵

[۲] : عرضداشت فیضی بنام اکبر۔ لطیفۂ فیاضی۔ تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ ح ۱۔ صہ ۱۰۸-۹۸۔ پربھوؤں کا بیان اور دیکھیے رتناگری گزیٹیر صہ ۱۱۲

[۳] : ہند کی معاشی حالت۔ صہ ۵۹-۳۵۸

چھلے کے پتوں سے بنائے جاتے ہیں[1] مہذب گھرانوں میں پلنگ (عموماً رنگین) چھینٹ کا پلنگ پوش، چادر غلاف (الخ) اور کمل وغیرہ نظر آجاتے تھے[2]۔ باربوسا نے راندیر کے مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اچھا لباس پہنتے تھے اور عمدہ مکانوں میں رہتے تھے جو نفیس طور سے آراستہ رہتے تھے" ایک دوسرے سیاح ڈیلاویل کے بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان تاجروں کو جو مراعات حاصل تھیں، وہی ان کی خوشحال معیاری زندگی کی ضامن تھیں[3]۔

کوکن کے افلاس زدہ باشندے جہاں کھیل کود سے ہنگامی مسرت حاصل کر لیتے تھے وہاں یک گونہ بیخودی" کے لئے تاڑی سے بھی تازگی حاصل کر لیتے تھے اور تمباکو کے دھوئیں میں اپنے دکھوں کو پھونک کر اڑا دیتے تھے۔ ڈاکٹر جان فرائر نے مغربی ساحل کے علاقے میں "ادنیٰ لوگوں" کو بھی تمباکو نوشی کا عادی پایا تھا۔ پان محفلوں کی جان تھا، اس لئے چلچی برنجی اور پیکدانی خانہ داری کے ظروف میں نظر آتے ہیں[4]۔ باربرداری کے لئے بیل اور چھکڑے تھے اور سواری کے لئے کہاروں کی ہتھیلیاں غریبوں کا بوجھ اٹھا لیتی تھیں[5]۔

۱: ہند کی معاشی حالت ص ۳۵۸

۲: منتخب وقائع دکن ۔ جابجا

۳: ہند کی معاشی حالت ص ۳۴۷

۴: ڈاکٹر جان فرائر ج ۳ ص ۱۱۹ ۔ عرفان حبیب ص ۹۴

۵: منتخب وقائع دکن ص ۱۳۴ ۔ ص ۱۶۴

اسبابِ سطوت:

دکن میں اسلامی دورِ حکومت کے معاشی حالات کا جب ہم دوسرا رخ دیکھتے ہیں تو اُمراء اور اہلِ اقتدار کی ایک نہایت ہی رنگین اور تن آسان زندگی کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں۔ یہ زندگی حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی اور مشک و عنبر کی لپٹوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس زندگی پر شمالی ہندوستان کے تہذیبی ماحول کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اور یہ تہذیب خود وسطی ایشیا کے مدنی تصورات اور ایرانی ثقافتی قدروں میں ڈھلی ہوئی تھی۔ عہدِ سلاطین کی اس تہذیبی زندگی نے دلی کے گہوارے میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اور عہدِ مغلیہ میں آگرہ اور فتح پور سیکری کے مرمریں محلوں میں جوانی گذاری تھی۔

—— بہمنی دور میں اسی تہذیبی زندگی کی داغ بیل دکن میں ڈالی گئی۔ اور محمد آباد (بیدر) سے جب یہ شہر بدر ہوئی تو اسے بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھاؤنیوں میں پناہ ملی۔ یہیں یہ دکھنی کلچر سے دوچار ہوئی اور پھر سمرقند و شیراز کی صباحت میں دکن کی ملاحت ایسی گھلی کہ ایک مشترکہ تہذیب نے رنگ نکالا جس کی رنگت آج تک پھیکی نہیں پڑی ہے۔

ایک ایسی ہی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی جلو میں دورِ سطوت و ثروت کے جلوس میں امراء اور دستوانوں کی تعیش کوش زندگی بڑے طمطراق سے مغربی ساحل پر گوا تک سرگرم سفر تھی۔ جاگیرداری نظام کے ان علمبرداروں کو زندگی کی ساری نعمتیں اور راحتیں میسر تھیں۔ مگر یہ محنت کش طبقہ کے دردِ شجر کا ثمرہ اور غلاموں کی محنت کی رہینِ منت تھیں۔ غلام، امیری اور رئیسی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔

اور ظاہری شان وشوکت اور تنعّم وتعیش کی علامت بن چکے تھے۔ کثیر التعداد غلاموں کی پرورش اور خدمت گذاروں کی سرپرستی معاشی زندگی کی نمایاں حقیقت بن چکی تھی۔ ابوالفضل (مصنف آئینِ اکبری) کے بیان کے مطابق ایک امیر کے گھر میں کم از کم سیکڑوں خدمت گار ہوتے تھے[1]۔ ان حاشیہ برداروں میں: باربردار، مشعل بردار، چھاتہ بردار، مگس ران، یساول، خیمہ دوز اور خیمہ زن (خیام) اور اسی قماش کے سیکڑوں خدمت گذار ہوتے تھے جو سفر و حضر میں حاضر حضور رہتے تھے[2]۔ دکن اور کوکن کا ہر ذی مرتبت اظہار شان وشوکت کے لئے بغیر کثیر التعداد، ہمراہیوں، خدمت گاروں، حبشی اور گرجی غلاموں اور قلماق کنیزوں کے اپنے عشرت کدے میں یا گلی کوچوں میں نظر نہیں آتا تھا۔ غلام سستے داموں مل جاتے تھے، اور نوکروں کی اجرتیں اتنی قلیل ہوتی تھیں کہ قصبے کے معمولی عصار (تیلی) کے لئے بھی غلام رکھنا معاشی بوجھ نہیں تھا۔

اہلِ اقتدار کی تن آسانیوں کی خانہ پُری آبدار خانے، برف خانے اور توشہ خانے سے کی جاتی تھی، سواری کے لئے زرّین زین پوش ترکی اور بدخشانی گھوڑے ہوتے تھے۔ ارابہ (عرابہ) میں گائے جوتی جاتی تھی اور باربرداری کے کیلئے بیل تھے اور بیل گاڑیاں تھیں طویل سفر کے لئے مزین بہلیاں تھیں اور گشت کے

۱: ہند کی معاشی حالت باب، دوسری فصل ص ۳۴۴-۳۴۴

۲: خاورنامہ۔ ایضاً ہند کی معاشی حالت۔ ایضاً اور منتخب وقائع دکن۔

۳: ہند کی معاشی حالت باب۲۔ چوتھی فصل ص ۱۱۱-۱۱۰۔ منتخب وقائع دکن ص ۹۵

لئے ارغوانی (سقرلاط) گاؤتکیوں سے آراستہ پالکیاں اور ڈولیاں دہلیز پر کہاروں کے کاندھوں پر تیار کھڑی رہتی تھیں۔ اصطبل میں سونے چاندی کی کنڑیوں میں طلائی اور نقرئی زنجیروں میں جکڑے ہاتھیوں کے دَل جھومتے رہتے تھے[1]۔ امراء کی ضیافتوں میں صرف[2] کام و دہن کی آزمائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ غلغلہ ہائے ناؤنوش سے گونجتی ان جنت نظر اور فردوس گوش محفلوں میں زہد و پارسائی کا امتحان بھی ہوتا تھا۔ نازک اندام کنیزیں اور سیماب بدن رقاصائیں رُخ روشن پر رنگین باریک حریری نقاب ڈالے "عشوہ و غمزہ و ادا" کے اسرار کھولتی تھیں[3]۔ زندگی سے زیادہ تلذذ حاصل کرنا بعض امراء کا مقصدِ حیات بن چکا تھا۔ تھامس رو طبقہ امراء کو "شہوت پرستی اور دولت ہندی کا ایک پریشان کُن مجموعہ[4]" کہتا ہے [ایسا کہتے وقت یہ بدیسی سفیر ان حقائق سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے جو جاگیردارانہ نظامِ معیشت کے محاسنِ عصری بن چکے تھے۔ اس طبقہ کی تعیشات کے لئے جو لوازمات درکار تھے۔ وہ اقتصادی ماحول اور معاشی پیداوار کا جزو بن چکے تھے۔ امراء کی زندگی ظاہری شان و شوکت سے مزین اور تکلفات سے مرصع رہتی تھی۔ اس کے طرز و آرائش کے لئے دن رات چرخیاں تانے بانے بنتی رہتی تھیں اور ماہر بنکروں کے ہاتھ زرتار

۱: منتخب وقائع دکن۔ صہ ۱۳۳ بہ ۱۶۶ و ہند کی معاشی حالت صہ ۳۳۹ ۔ ۳۴۰

۲: ہند کی معاشی حالت صہ ۳۳۷

۳: بائرلاڈ۔ سفر نامۂ گووا (انگریزی ترجمہ) (۱۸۶۲ء)۔ ج ۲ صہ ۲۲۷

۴: ہند کی معاشی حالت۔ صہ ۳۴۱

اور سلابتونی ملبوسات کو سنوارنے میں مصروف رہتے تھے۔ دستکاروں کے پارس ہاتھوں میں تانبے، چاندی اور سونے کی دھاتیں فن کی آنچ سے پگھل کر کندن بن جاتی تھیں۔ شاعروں نے متمول سرپرستوں کی دستگیری سے عروس سخن کو تشبیہات و استعارات کے زیوروں سے سجایا اور کویوں نے ساہتیہ اور کویتا کو المکار کا گہنا پاتا پہنایا۔ مصوروں نے فن کے شہکاروں کی تخلیق کی اور شلپ کاروں کی پتھر کی رچنائیں اور کلاروں کی کاوشوں اور سلوں سے تراشی اور ڈھالی ہوئی مورتیاں کبھی بولنے لگتیں اور کبھی ناچنے لگتیں۔ ہر دور میں فن و ادب کی سب سے نفع بخش منڈیاں سلاطین اور امراء کی ڈیوڑھیاں ہی ہیں جہاں تملق اور خوشامد کے وزن سے اور غلو و مبالغہ کے ترازو پر روٹیاں تولی جاتی تھیں[1]۔

سطوت و ثروت نے اپنے استحکام و استقلال کے لئے سنگین ستونوں اور مرمریں سلوں کا بھی سہارا لیا تھا۔ "اس زمانے کے رواج کی وجہ سے علمی فائدے کے کاموں پر اس قدر روپیہ صرف نہیں ہوتا تھا جس قدر کہ مقبروں پر یا ان عمارتوں پر جو یادگار کی غرض سے تعمیر کی جاتی تھیں[2]۔ مگر رفاہ عام کی غرض سے چاہ، حوض اور تالاب ضرور بنائے جاتے تھے۔ ساحلی علاقے میں[3] (راندیر سے لے کر) گوواتک ناریل کے سربلند درختوں

---

[1]: علاؤالدین عطا ملک جوینی۔ ڈاکٹر مؤمن محی الدین "مجلۂ علوم اسلامیہ"
(جون ۱۹۶۱ء) ص ۶

[2]: ہند کی معاشی حالت ص ۳۴۳

[3]: ایضاً۔ ص ۳۴۶

سے ڈھکے نوائطی سوداگروں، مرہٹہ سرداروں اور براہمن وطن داروں کی واڑیاں سنگین حویلیاں اور [بعد میں پرتگیز فدالگو (امیروں) کی ولائش] اپنے مکینوں کی خوشحال زندگی کی شہادت دیتی تھیں۔ نوائطیوں کی حویلیاں ترشی ہوئی سلوں کی بلند بنیادوں پر استوار، نیل کے آبی رنگوں سے منقش اور بیل بوٹوں سے مزین چوبی ستونوں پر کھڑی کی جاتی تھیں۔ چبوترے (اوٹے) کی سلوں میں دونوں طرف لوہے کی کڑیاں (حلقے) یا بجر یا گھوڑے باندھنے کے لئے ضرور لگائی جاتی تھیں۔ نیم تاریکی میں ڈوبے لمبے چوڑے ایوانوں میں قالین، پلنگ، آئینے اور ظروف کی افراط رہتی تھی[۱]۔ بغیر برآمدے کے ان یک منزلہ پھیلے ہوئے پختہ مکانوں کی کھڑکیاں زندگی کے روزمرہ کے ہنگاموں سے بے نیاز ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھتی تھیں [صرف یہ اپنے بوجھل پپوٹوں کو اُٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے اسی وقت باہر تاکتی تھیں جب کسی کا جنازہ یا برات یا عیدین پر قاضی وخطیب کا جلوس کچی سڑک سے گزرتا تھا! اور پھر چلمن کچھ دیر کیلئے رنگین ہو جاتی تھی]

دھرم کا سایہ:

مکانوں کے طرز تعمیر اور مکینوں کے رہن سہن میں جو امتیازی خصوصیات برتی جاتی تھیں (اور آج بھی جو نمایاں ہیں) اُن پر مذہب یا دھرم کی چھاپ لگی رہتی

---

[۱]: ہند کی معاشی حالت ص ۴۳

تھی! اور معاشی حالت کا اندازہ بھی ظاہری آثار سے ہو جاتا تھا۔ مقامی باشندوں کی پناہ گاہیں "انتہا درجہ حقیر، چھوٹی اور مبتذل" جھونپڑیاں تھیں۔[1] اسی طرح پربھوؤں کے دو منزلہ مکانوں میں "اوسری"، "د تھان" اور "وڈارے" یا مردانہ اور زنانخانہ بھی اہمیت رکھتے تھے۔

عام ہندوؤں کے گھروں میں نیم تاریکیاں ڈولتی رہتی تھیں۔ مارکوپولو کے بعد رالف فیچ دوسرا بدیسی (انگریز) سیاح اور تاجر ہے جس نے (جہول کے) ہندوؤں کے رہن سہن کے بارے میں (۱۵۹۰ء) میں لکھا ہے: "یہ لوگ گائے کی پوجا کرتے تھے اور اس کے گوبر سے دیواروں [اور کاٹھ سے بنی ہوئی ٹیوں] کو لیپتے[2] اور پچی کرتے تھے۔" (گوبر کے اپلے بھی تھاپے جاتے تھے)۔ پربھوؤں اور مرہٹہ وانیوں کے گھروں میں "اوٹے" "کوٹری" اہمیت حاصل تھی۔ کھپریل کی چھت والے یک منزلہ مکان کے سامنے آنگن، اندرونی حصے میں ماج گھر" (مرکزی ایوان) جس کے طاقوں میں مٹی کے بت سجائے ہوئے[3] اور پچھواڑے تلسی کے پودے۔ ہر وانی کے گھر کے بساط کی مختصر کہانی تھی مسلمانوں نے گوبر سے فرش لیپنے کا طریقہ ہندو پڑوسیوں سے سیکھا مگر اپنے گھروں میں چونے سے سفیدی کروانے میں غالباً اپنے اجداد کی تقلید کرتے تھے۔ ان کی

۱: ہند کی معاشی حالت، ص ۳۵

۲: دے کنہا ص ۵۹

۳: تھانہ گزیٹیر ج ۱۳۔ ح ۱ فصل "آبادی" پربھوؤں کا بیان۔ کولابہ گزیٹیر ص ۸۵-۸۴

درگاہوں، مسجدوں اور قبروں پر بھی چونے سے سفیدی کی جاتی تھی۔
ساحلی علاقے میں (بالخصوص رتناگیری میں) چتپاون براہمنوں کی بستیاں قرونِ وسطیٰ کی دیہی زندگی کی معیاری عکاسی کرتی تھیں۔ کوکنیوں (نوائطیوں) کی طرح یہ بھی صفائی اور سگھڑپن کے عادی تھے۔ ان کے صاف ستھرے گاؤں کھاڑی کے کنارے ناریل اور تاڑ کے گھرے سبز سایوں میں آباد تھے۔ کبھی جوہڑ کے کنارے جس میں نیل کمل کی ہریالی نیائیں ڈولتی رہتی تھیں۔ آم، کٹھل اور کیلے کے چھتنارے سائے میں کھپریل کی چھت والی واڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ کروندے اور تھوہر کی جھاڑ جھنکاڑیوں کے درمیان سے سایہ دار پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی گاؤں سے گذرتی تھی۔ اینٹ اور پتھر سے بھری ہوئی اس پگڈنڈی پر چھکڑا بھی مشکل سے چل سکتا تھا۔ کھنڈوبا، مہادیو، بالاجی یا مہالکشمی کے مندر کے پاس کنوئیں پر گدرے جسم یا (گھارے، آنکھوں والی چتپاون کنیائیں پانی بھرتی نظر آتی تھیں۔ ان کے پیروں کی نقرئی پازیبوں (ساکھلیہ) کی جھنک اور پیتل کے چمکتے گگروں کی کھنک سے باؤلی کا ہین گونجتا رہتا تھا۔ جب دونوں وقت ملتے تو ہری بھری پہاڑیوں کی اور سے ڈھور ڈنگر گھر لوٹتے نظر آتے (کوکن میں مویشیوں کی کمی تھی) غبارِ راہ سے جب سرمئی دھندسا رے پر چھا جاتی تو مندروں سے گھنٹوں کی نقرئی صدائیں بلند ہوتیں۔ کبھی شہنائی کی تانوں میں اور مردنگ کی تال پر نامدیو (۱۲۷۰-۱۳۵۰ء) کے مرہٹی "ابھنگ" (مناجاتوں) کا روحانی کیف فضاؤں پر چھا جاتا۔ گورا کمہار، نرہری سنار، کرم داس کے بھگتی رس میں ڈوبے ہوئے لوک گیتوں، پاوڑوں، اور ایکناتھ (۱۵۴۸ء) کے شلوکوں کی سنگیت

اور مدھرتا کے کارن انوں کے ساتھ بھگتی مارگ پرمن بھاؤناؤں کی پالکیاں چلنے لگتیں، کڑوے تیل کے جلتے ہوئے دیوں کی روشنی میں "پانڈورنگ" کا نورانی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔"

سارے کوکن میں مسجدوں کی بلند اذانوں کے ہم آہنگ ناقوس کی صدائیں بھی تھیں۔ اور کلیساؤں سے اُبھرتی ہوئی تیز آوازوں میں یسوع مسیح کی حمد اور یہودی مسجدوں سے ربیوں کی دعائے قنوت بھی سنائی دیتی تھی۔ کلیان، بیجاپور، سبحان اللہ نورگل کے آتشکدوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کی تیز روشنی میں سفید دستار پہنے ہوئے موبد دولت آباد کے کارخانوں میں بنے ہوئے کاغذوں پر لکھے ہوئے اوستا اور گاتھا کے گیت گاتے نظر آتے تھے۔

منبرٹ رتناگیری گزیٹیر صفحہ ۱۱۲-۱۱۱

آٹھواں باب

اسلامی ثقافت اور مدنیت

عرب و عجمی تہذیب اور مسلم ثقافت نے کوکن (اور دکن) کے ذہنی و فکری سفر کے لئے ایک ایسا راستہ کھول دیا تھا جس پر صدیوں تلک علم و دانش کے چراغ جھلملاتے رہے ہیں۔ اور علوم و فنون کے گنجینوں سے ہر قدم پر گہر افشانیاں ہوتی رہی ہیں لیکن ہندوستھا اور پرمپرا نے بھی اس طویل تہذیبی سفر کے لئے اپنے دفینوں کے موتی مونگوں سے زادِ راہ کا اہتمام کیا تھا۔ اسلامی ثقافت اور ہندوستانی سنسکرتی کے سنجوگ نے تہذیبی قافلے کو ایک ایسے اہم موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا، جہاں سے ایک نئے دیسی کلچر کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ — دکھنی کلچر — تھا جس کے امیرانِ کارواں میں گولکنڈہ کا محمد علی قطب شاہ (۱۵۸۰—۱۶۱۱ء) اور اس کا معاصر بیجاپور کا ابراہیم عادل شاہ ثانی۔

(۱۵۸۰ء ـــ ۱۶۲۷ء) شامل تھے۔ دکھنی کلچر دراصل اس باہمی ثقافتی امتزاج و اختلاط کا نتیجہ تھا جس کے خدوخال اگر دکھنی تھے تو اس کے رخساروں پر ایرانی گلگونہ لگا ہوا تھا۔ اور اگر آنکھوں میں سرمۂ اصفہانی کی تیکھی تحریریں تھیں تو نظریں سانورے پیا کے درشن کی پیاسی تھیں تخیل فارسی کے تشبیہات و استعارات اور بلند خیالی پر کمندیں پھینکتا تھا لیکن زبان:

وے عربی بول نہ جانے ✽ نا فارسی پہچانے

یہ دیکھت ہندی بول ✽ پن معنی ہیں تپ تول

(شاہ میراں جی متوفی: ۹۰۲ھ / ۱۴۹۷ء)

دکھنی کلچر کا دِل حجازی تھا مگر روح مجازی اور سراسر ہندوستانی تھی۔

جذباتی ہم آہنگی:

مسلم دورِ حکومت میں اس تہذیبی راہ گذر پر ویدانت اور تصوف نے بھی روحانیت کا ایسا مینارۂ نور تعمیر کیا تھا جس نے بھگتی مارگ اور صوفی طریقت پر چلنے والوں کو زندگی کے اعلیٰ اقدار کی آگہی دی تھی۔ انسانیت اور آفاقی ہمدردی کا راستہ دکھلایا تھا اور ظلم و ستم کے خلاف خاموش جدوجہد کا سبق دیا تھا۔ مذہبی رواداری اور سماجی ربط و ضبط نے ہندو مسلمان دونوں کے مذہبی عقائد اور سماجی رسوم پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ "من تو شدم تو من شدی" کا نظارہ ہر میدان میں تھا۔ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے معتقدین میں غیر مسلم بھی تھے۔ اور اس لئے منکرین قبر پرستی، گلیسوشی اور نذر و نیاز کی مذمت کرتے وقت (اور حقیقتاً یہ بدعات

ہیں اور قابلِ انسداد) ان کے سماجی اور اقتصادی افادات کو انہاپسندی کے سبب قطعاً نظر انداز کرتے ہیں۔ اولیائے کرام کی درگاہوں کے تعمیر کے ساتھ رفاہ عام کی غرض سے تکیے، خانقاہیں، لنگرخانے اور مدرسے بھی بنائے اور قائم کئے جاتے تھے، اور آج تک کوکن کی متعدد درگاہوں کی تولیت ہندو گھرانوں[1] میں چلی آرہی ہے چڑھاوے میں غیر مسلموں کے نذرانے بھی شامل رہتے تھے۔ یہ حقیقت بذاتِ خود اس مذہبی رواداری، قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا ثبوت ہے جس نے دو قوموں کی مشترکہ تہذیب کی آبیاری کی ہے ورنہ ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مسلمان متقدمین شعرا بھی دیوی دیوتاؤں کے ذکر سے اپنا صنم کدۂ خیال سجاتے تھے۔ انیسویں صدی تک دیہاتی کوکنی مسلمان (جہالت کے سبب[2]) سیتلا دیوی کی پرستش کرتے نظر آتے تھے۔

[1]: مثال کے طور پر ضلع تھانہ میں درگاہ پیر صدرالدین (کھونڈی ضلع تھانہ) مجاور (۱۸۶۶-۱۸۷۰ء میں) دتہ پاٹل بن بال پاٹل۔ ڈھوکا (حاجی ملنگ): کلنجی بائی زوجہ گووند گوپال۔ رومابائی۔ پیر جمال شاہ (کلیان) رام چندر شیو رام گوکھلے۔ حاجی جلال شاہ (ٹٹوالہ) نارائن راؤ سیٹھ وانی۔ درگاہ حضرت پیر محمد حسین (ساولی سالسٹی) گنا پوپٹ۔ پیر شاہ پتنگ شاہ (کھنڈیا) ناگوگن پاٹل۔ پیر غیبی شاہ (بھیمڑی۔ ناگاؤں) کیشو بال کرشن۔ پیر غیبی شاہ۔ (شیلہ) دھاکلیا

[2]: رتناگیری گزیٹیر۔ ج ۲ ص ۱۳۳ بحوالہ مولوی سید احمد صاحب گلشن آبادی (حاشیہ نوٹ)

اور دکھنی مسلمان ہندوانہ رہن سہن اور پوشاک اپنانے کے ساتھ ریت رسم میں ہنوں کی تقلید کرتے تھے۔ بے بنیاد عقائد نے عوام کے ذہنوں کے ارد گرد بدعت، توہم اور تشکیک کے جالے بن دیئے تھے گو ان پر تقدس کا غلاف چڑھا ہوا تھا مرہٹہ دور میں ان کا اظہار بڑی شدت سے ہوا کس طرح دونوں مسلمان مدعی اور مدعا علیہ اپنا دعویٰ یا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کبھی کا تنج (پونہ) سے قریب رنجن گاؤں کی مسجد میں جاکر معینہ میعاد تک چراغ جلاکر بیٹھے رہتے تھے اور تیل کی مقدار ختم ہونے تک جس کا چراغ مسلسل جلتا رہتا اس کی بے گناہی یا اُس کا دعویٰ روشن ہو جاتا۔ خود ہندو بھی جیلون کی جامع مسجد میں جاکر "واتی جی کریہ یہ" یا "کری یہ دیو یاسیہ" کا عمل کرتے تھے۔ مسلمان۔ مندروں میں جاکر "شپت" یا قسمیں کھاتے تھے[۱]۔ محرم کی بدعات میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو عوام بھی خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاتے تھے۔

ہندو عقائد اور سنسکرتی کی روحانی کشش ایک حد تک مسلم ذہنوں کے لئے بے حد فکر انگیز ثابت ہوئی تھی بعاشرتی اختلاط کا سب سے حسین حادثہ دو دلوں کے اتصال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کی دکھنی شاعری میں کسی ترک شیرازی کی اجنبی اداؤں کی شرح ہیں ملتی بلکہ آندھرا پردیش کے ایک تیکھے نقوش والی نرمکی بھاگیہ وتی کی مدوراؤں اور بناؤں کی تفسیر ملتی ہے۔ غیر مذہب فریقوں میں باہمی

---

[۱]: بھانہ گزیٹر۔ ج ۱۲۔ ح۔ ص ۲۷-۲۳۵

[۲]: وہتل ترمبک گنے۔ دیکھئے انگریزی مقدمہ۔ ابن بطوطہ نے بھی شیخ سندو سے متعلق توہمات کا ذکر کیا ہے۔ (سفرنامہ۔ ص ۲۳۱)

شادیاں معاشرے میں بظاہر کسی جذباتی ہیجان یا سماجی شورش کا سبب نہیں بنتی تھیں۔ مگر اس قسم کے رشتے عموماً اعلیٰ اور حکمران طبقوں میں زیادہ وقوع پذیر ہوتے تھے۔ کیونکہ سلاطین وقت دوسری قوموں میں شادی کرنے کو "دلِ بدست آور" کا درجہ دیتے تھے۔ گو اس میں "رموز مملکت خویش" اور سیاسی مصلحت تھی۔ مگر علاحدگی پسندی کے بت کو توڑنے کے لئے اس قسم کی قومی سالمیت اور جذباتی یکجہتی کی حد درجہ ضرورت تھی۔ سماج اس قسم کی شادیوں کی ہمت افزائی نہیں کرتا تھا مگر قبول ضرور کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوکنی مسلمانوں کے قدیم قبیلوں میں غیر مسلم عورتوں سے شادیاں معیوب تصور نہیں کی جاتی تھیں۔ ایک مغربی سیاح نے لکھا ہے کہ "بین کے نوآیتی مسلمان مقامی [ہندو اور کولی] عورتوں سے بیاہ کر کے آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ تو انگر بھی ہیں اور باہمت سوداگر بھی"[1]۔

کوکن کے مسلمانوں کے رسم و رواج گو ایک طرف ایران و توران سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے مگر ان پر مقامی ریت رسم اور مہاراشٹرا نہ عقائد کی پرچھائیاں بھی پڑتی تھیں۔ ترکوں کی ساچق رسم ۔ یہاں برّی بن گئی ۔ آرسی مصحف، جلوہ، شب یا شہر گشت اور میلاد خوانی اگر اسلامی رسمیں ہیں تو مانجھا، ابٹن، مستی اور سہرا ہندوستان کے سولہ سنگار میں شامل تھے۔" میت کے رسوم میں قبروں کی زیارت۔ تیجا (سوم) قرآن خوانی اور گلپوشی کا ذکر ابن بطوطہ بھی کرتا ہے [اس لئے کہ اس کے ملک میں اور دیگر ممالک میں جہاں جہاں وہ گیا تھا اس قسم کا دستور نہ تھا] بسم اللہ کی مذہبی رسم جب بچہ یا بچی چار سال، چار مہینے اور چار دن کے ہو جاتے ہیں (مغلوں کے عہد

---

[1] : تھانہ گزیٹیر : ص ۲۳۲

میں بڑی سختی سے منائی جاتی تھی] کو کن کے سنّی مسلمان بھی مناتے تھے۔
القاب کے علاوہ کوکنی مسلمانوں کے اسماء کے لواحق و سوابق میں ہندستانیت کا دم چھلا لگا ہوا تھا۔ مثلاً عورتیں اپنے ناموں کے آگے "بی بی" کا بندھن ضرور باندھتی تھیں۔ باوا، میاں اور جی۔ احتراماً یا پھر رسماً ناموں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے (مرہٹہ سردار اپنے ناموں میں "جی"۔ جی جان سے لگاتے تھے) ہمام کا پرکھو حاکم، رائے قطب، دکن کی بہمنی بادشاہت کا بانی حسن گنگو پیر مٹھے۔ پیر باؤلے شاہ راجہ شاہ میراں جی، درویش پاٹل جیسے ہندو مسلم ناموں سے اس عہد کے جذباتی و فکری شعوروں اور سماجی قدروں کے ادراک کی نشاندھی ہوتی ہے۔ اور مقامولی کے فارسی اور مرہٹی ناموں کے سنگم سے: جیسے ماہن خورد (بمبئی) کھالنگ خورد (بھیمڑی) ھال بدرک (بزرگ) اُس عہد کے سماجی نقشے کا پس منظر معلوم ہو سکتا ہے۔

درویش سلطان:

قومی اتحاد اور جذباتی یگانگت کے سب سے بڑے پیوند کار۔ درد کے پیوند لگے ہوئے خرقوں میں ملبوس صوفی اور بھگت تھے۔ عہدِ تغلق میں جب حضرت شیخ منتجب الدین زر زری زر بخش (م ۷۰۹ھ) کے ہمرکاب عرفانِ حق کے زرو جواہر

۱: بھیونڈی سے لے کر کولون تک رہنے والے سون کولیوں کے سرپاٹل کا نام جسے دِلّی اور بیجاپور کے بادشاہوں کی جانب سے اس عہدے کی سند ملی تھی۔
(بحوالہ فرمانِ ابراہیم عادل شاہ (دوم)، مورخہ ۱۰۰۶ھ)

لٹاتے ہوئے سات سو پالکی نشین اولیاء آئے تو دیار دکن سے لے کر کوہساران کوکن تک خلفائے چشتیہ کی ہزاروں روحانی ولایتیں قائم ہوگئیں۔ انکی بارگاہیں وہ خانقاہیں تھیں جن میں عقیدت مندوں اور مریدوں کا دربار لگا رہتا تھا۔ ان کے تکیوں پر فقراء و مساکین کا تکیہ تھا۔ اور ان کے بلغور خانوں اور لنگر خانوں کے سہارے ہزاروں فاقہ مستوں کے سفینہ ہائے حیات چلتے تھے۔ اسلامی معاشرے کی روحانی و شعوری نمائندگی کرنے والے ان دانشوروں میں ایسے صوفی شاعر تھے جنہوں نے فارسی شاعری کی فرسودہ روایات کی نہ تو دریوزہ گری کی اور نہ اپنے ضمیر کی سوداگری۔ اس کے برخلاف "داخلی فتوحات فکر" کا آئینہ لے کر ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواکرتے ہوئے مقامی بولیوں (خصوصاً دکھنی) میں عوام کو محبت اور انسانیت کا درس دیتے رہے اور معاشرے کی بدعنوانیوں کے خلاف ذہنی زبان سے نعرے لگاتے رہے۔ شیشۂ دل کے مسیحاؤں کے اعجاز کے سبب اردو زبان نے اپنی زبان کھولی اور صریر خامہ نوائے سروش بن گئی۔

تاجداران عصر بھی ان خاکساران جہاں کی دلجوئی کے سامان ڈھونڈتے رہتے تھے۔ ان کے لئے عبادت گاہیں اور درس گاہیں تعمیر کی جاتی تھیں۔ تکئے قائم کئے جاتے تھے اور لنگر خانے جاری کئے جاتے تھے۔ مشائخین کی درگاہیں آج بھی شاہوں کے مرمریں محلوں اور پرشکوہ مقبروں سے زیادہ مقبول اور مرجع خلائق ہیں۔ کوکن (چیول ۔ داابھول) میں یتیم خانوں اور مکتبوں کی تعمیر کا سلسلہ محمد شاہ بہمنی (دوم) نے شروع کیا تھا۔ محمد عادل شاہ کے عہد میں صرف دارالظفر بیجاپور میں ایک ہزار چودہ تکیئے اور اسلامی علوم کی متعدد درسگاہیں

مع اقامت گاہیں موجود تھیں۔ ہر سال کوکن سے بڑی تعداد میں حفاظ دارالسلطنت بلائے جاتے تھے۔ مکتبوں میں ملا درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور صوفی اپنی خانقاہوں کی خلوتوں میں علم و دانش کے چراغ روشن کئے۔ حافظ شیرازی کے اس شعر کا ورد کرتے رہتے ؎

چوں حافظ در قناعت کوش و ز دنیای دون بگذر
کہ یک جو منت دونان دو صد من زر نمی ارزد[۱]

خطۂ کوکن کے اولین مبلغین میں حاجی عبدالرحمٰن عرب کا نام نمایاں ہے عوام میں حاجی ملنگ بابا کے خطاب سے مشہور ہیں۔ تاریخی روایت آپ کا رشتہ کلیانا کے کسی راجہ نل سے جوڑتی ہے جس کی ایک راجکماری ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔ کلیان کا نل گھرانہ چونکہ ظہور اسلام سے قبل وجود میں آیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ عبدالرحمٰن عرب صاحب کے عہد میں اسی قبیلے کا کوئی نام لیوا اس علاقہ پر راج کر رہا ہو گا۔ جبکہ یہ بھی صحیح ہے کہ کلیان اس عہد (غزنویہ میں) سلاھاروں کی راجواڑی میں شامل نہ تھا۔ اور نہ تو کسی وان پتر، شاسن لیکھی یا شیل لیکھی پر کلیان کا نام ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ یوں بھی سلاھاروں کی عرب دوستی نے نہ جانے

---

۱ : دیورے مختصر تاریخ ادبیات فارسی (انگریزی) ص ۱۵

۲ : امداد نامہ (قریب ۱۲۰۰ھ) میں ایک طویل منظوم مخمس میں صاحب کشف و کرامات اولیاء اللہ سے مدد چاہی گئی ہے۔ (ہر بند کا آخری مصرعہ ہے مشکل ہری آسان کرد) اسمیں کوکن کے شاہ ملنگی جس سے یقیناً حاجی ملنگ شاہ مراد ہے اور شاہ مخدوم [مہائمی] سے بھی التجا کی گئی ہے دیکھیے مخطوطہ نمبر ۹۴۹ تذکرہ مخطوطات۔ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء)

کتنے عزلوں کو دکن کی جانب ہجرت کرنے پر اُکسایا ہوگا۔

شاہ بدرالدین چشتی (م ۱۲۴۱ء؁) جو پالکی کے ساتھ دکن آئے تھے حضرت سلطان المشائخ شاہ نظام الدین اولیاء کے مرید و خلیفہ تھے۔ سیہادری کی گود میں آباد سانکھشی (بین) بستی میں جب آپ نے رشد و ہدایات کا بازار گرم کیا تو اُس بستی کا بانی راجہ سانچہ کفر کی ساکھ اکھڑتی دیکھ کر سینہ سپر ہوگیا۔ شاہ بدرالدین بھی قرون وسطی کے مبلغوں کی طرح مجاہد تھے! ایسی سرفروشی دکھلائی کہ سر کٹ کر سانکھشی قلعہ میں سپرد خاک ہوا اور تن ــــ پریڈہ (ضلع عثمان آباد) جہاں تک آپ صاحب سیر اولیاء کے بیان کے مطابق بغیر سر کے لڑتے چلے گئے تھے ــ نقل کفر کفر نباشد) دفن ہوا۔ شاہ صاحب کے ساتھیوں کی جوانمردی سے سانکھشی کا قلعہ اور راجہ دونوں سرنگوں ہوگئے شاہ بدرالدین کے نام کا سانکھشی کے ساتھ ایسا گہرا سمبندھ ہوگیا کہ عوام میں یہ قلعہ "بدرالدین - چیہ" یا "درگاہ چیہ کلّہ" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ سانکھشی قلعہ کے دشوارگذار

---

۱ : دیکھئے : واقعات مملکت بیجاپور ۔ ج ۲ ۔ ص ۱۳۳۔

۲ : گزیٹیر ضلع تھانہ ص ۸۰-۲۸۳ ؛ بدرالدین اور سالانہ عرس کے اخراجات کے لئے (بہمنی و عادشاہی حکومتوں سے کئی دیہات وقف تھے (دیکھئے بحقل ترمیک گنے محضر مرہٹی) انگریز نے چالیس ایکڑ قابل زراعت اراضی انعام میں دی تھی۔ روڈ ہی ہیں جسے تورہ بھی کہتے ہیں۔ ۲۵۰ ایکڑ دھان کے کھیت اور تین سو ایکڑ پر مشتمل جنگلات بھی درگاہ کے اوقات میں شامل تھے۔ یہ مسلمان حکمراں کے عطیئے تھے ۱۸۶۲ء میں درگاہ کا مجاور اور اوقاف کا متولی محی الدین علی ابن یوسف علی تھا عرس کے موقع پر ہندو جوگیوں اور بھکاریوں کو اسی طرح خاطر تواضع کی جاتی تھی جس طرح مسلمان فقیروں کی میزبانی کی جاتی تھی۔ نواب جنجیرہ کی طرف سے عرس کے موقع پر نقد کے علاوہ شامیانہ کے لئے غلاف بھی بھیجا جاتا تھا۔ درگاہ کی نواحی مسلمان بستی میں جنجیرہ کے ایک مسلمان سردار اگر کا سنگین مقبرہ تھا جس کی تراشیدہ سلوں پر نقش و نگار کھدے ہوئے تھے اور ایک کتبہ بھی تھا۔ مگر اب یہ سارے معدوم ہوتے جارہے ہیں۔

درہ پر چٹانوں سے تراشے ہوئے سنگین حوض جو غازی شاہ سے منسوب ہیں، غازی شاہ کا مقبرہ، اور دیگر آثار باقیہ مثلاً یہ دھان محال کے سطح مرتفع اور ہمر آپور دیہات میں ترابلند قبروں کے نشانات۔ نہ صرف اس گنج شہیداں کی شہادت دیتے ہیں۔ بلکہ اس سنگین حقیقت کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ قدیم مسلمانوں اور مقامی کاتھکاری باشندوں میں مسلسل جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ اور یہ کہ مسلمان۔ فاتح قوم کی حیثیت سے اس سارے علاقے میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ تراشیدہ اور منقش ہیماڈپنتی سلوں سے سجائے ہوئے دیوتاؤں کے گھر جب سمار ہوئے تو ان کے کھنڈروں پر شاہ بدرالدین کی درگاہ تعمیر ہوئی اور جامع مسجد کی بنا ڈالی گئی۔

پندرھویں صدی کی ڈھلتی شام میں جب گجرات کا مسلم اقتدار سیاسی دھندلکوں کو چیر کر دھانو، اگاشی، ڈانڈا (کلوہ۔ جہام) ارنالہ، سوپارا، مہاہم ممبئی۔ تھانہ، کرنالہ، اور سانکھشی تک پھیل گیا۔ اور کلیان کی کھاڑی سے لے کر ناگوٹھنہ کی کھاڑی تک اس کی "جل سیما" عادل شاہی اور نظام الملکی سرحدوں سے ٹکرانے لگی تو اسلامی ممالک سے آئے ہوئے مشائخین دین اور علمائے کرام کے دلوں میں بھی اشاعتِ اسلام اور ترویج علوم اسلامی کے جذبات موجزن ہونے لگے۔ ایسے بہت سے مردانِ خدا اور پیرانِ طریقت کی یادگاریں آج بھی قائم ہیں مگر ان میں وہ مسلم مجاہدین بھی تھے جنہوں نے بغرض ترویج دین۔ مسلمان فرقے کے دفاع یا مسلم معاشرے کی روحانی یا مذہبی قدروں اور روایتوں کی حفاظت کے لئے تلواریں اٹھائی تھیں یا جانیں قربان کی تھیں۔

اسی عہد میں جب ترویج دین کے لئے کوکن کی فضا سازگار بن گئی تو

سید عبدالقادر جیلانیؒ سے سلسلۂ نسب جوڑنے والے ایک اور مبلغ کوچہ کوکن میں شکستہ دلوں کو جوڑنے کی غرض سے وارد ہوئے۔

شاہ عجب بابا قادری۔ جو عوام میں شیخ بابو صاحب بغدادی کے نام سے مشہور ہیں۔ دکن اور گجرات میں اشاعت اسلام کے بعد دھانو تشریف لائے۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔[1]

ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بھی گذری ہیں جو نہ کٹر مذہب پرست تھیں۔ اور نہ روحانی پیشوا۔ حالانکہ ان کے ماننے والوں میں ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ شامل تھے۔ کیونکہ ان لوگوں نے ذات پات کے بھید بھاؤ سے دور ہٹ کر یا تو اپنے بلند اخلاق اور نیک کردار سے عوام کے دلوں کو موہ لیا یا سماج کی فلاح و بہبود اور رفاہ عام کی غرض سے تعلم اور کاعد کے ذریعہ یا ریت اور پتھر کے سہارے ایسے تعمیری کارنامے سرانجام دیئے کہ ہر فرقہ کے لوگوں نے مل جل کر ان کی

---

[1]: دھانو میں مقیم سادات اپنا سلسلۂ نسب شاہ بابا سے ملاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں پیرزادہ سید مرتضیٰ کی کوششوں سے عرس کا انتظام باقاعدگی سے ہونے لگا۔ عرس کے موقع پر بابا صاحب کے مریدین سجادہ نشین کی رہبری میں آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر طواف کی صورت میں ڈھولکیوں کی تال پر گھومتے ہیں۔ اسے "راتب" کہتے ہیں۔ اور ساتھ میں پیران پیر دستگیرؒ اور شاہ بابا کی منقبت میں اشعار پڑھتے ہیں۔ اور بعض [رفاعی فقیر] نوکدار آہنی سلاخوں سے اپنے سر کو ضرب لگاتے ہیں اور آنکھوں کو چبھوتے ہیں۔ مگر [روایت کے مطابق] عقیدت کے طفیل اور پیر صاحب کی کرامت کے سبب ان کو کسی قسم کی گزند نہیں پہنچتی (تھانہ گزیٹیئر۔ ج ۱۳۔ خ ۲ ص ۲۳۰-۲۳۱)

سماجی خدمات کے اعتراف میں اور اظہارِ عقیدت کے طور پر خود ان کی یادگاریں قائم کی ہیں۔ اور انہیں ولی۔ پیر یا سنت کا درجہ دیا ہے۔ ایسی ہی ایک ولی صفت ہستی سید چاند علی بخاری فقیر ــــ کی تھی۔ جو چاند بن کر پندرھویں صدی کے ہنگام غروب میں بخارا میں ڈوبے اور رتناگیری کے ایک قدیم غالب مسلمان بستی۔ لانجے میں ولی بن کر نمودار ہوئے [گو چاند اور فقیر سے ان کا ہندوستانی ہونا روشن ہے] چاند علی فقیر کے ماننے والوں میں ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی عرس کے موقع پر ہندو اور مسلمان عقیدت مندان رسم غلاف پوشی اور صندل پاشی میں یکساں شریک رہتے ہیں (عرس کی بدعات میں اگر ہندو مسلم اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کے ایسے مظاہر نظر آتے ہوں تو انہیں دھوکے میں نجات کا راستہ سمجھ کر بدعات حسنہ کا درجہ دینا چاہئیے۔ مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو خارجی زندگی کے ایسے "مذہب نواز" نظارے عام ہو جاتے ہیں]

بھیڑ علی شاہ ــ شاہ خرچ تھا۔ مگر پیر نہ تھا۔ سخاوت کی کرامت نے پیر بنا دیا۔ اور اس کی درویشی نے عوام سے شاہ کا خطاب دلایا۔ یہ پہلا مسلمان تھا جس نے سب سے پہلے رام ناتھ کے اس غیر آباد قطعۂ اراضی پر قدم رکھا جو ساکھر کھاڑی کے کنارے۔ وقت کی رفتار اور تاریخ کے سفر سے بے نیاز۔ ناریل اور تاڑ کے جھنڈوں کے دبیز سائے میں صدیوں سے سستا رہا تھا۔ بڑ اور پیپل کی چھاؤں تلے اس نے کئی کنوئیں کھدوائے۔ (کھیتی باڑی اور پیپل باڑی سے آج بھی اس کی آبرو قائم ہے) [اس طرح آب رسانی کا انتظام کر کے علی نے افتادہ لائق زراعت زمینوں کی سینچائی کر کے] باغات لگائے اور جب آم، ناریل، تاڑ، اور بادام کے پیڑوں سے بھرا ہوا

علی کا باغ لہلہانے لگا تو دور دور سے نو آباد کار ــــــ علی باغ میں آکر آباد ہونے لگے۔ (سترھویں صدی میں جب انگریز نے علی باغ کو اپنا مرکز بنایا تو جہاں علی کے باغات تھے وہیں موجودہ علی باغ کی بستی وجود میں آئی[1]) علی باغ ہی میں:

پیر سدّی سات غازی ــــــ کی درگاہ بھی ہے جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے۔ سات ــ سے پیر صاحب کی سُرخ قامتی کا اندازہ ہوتا ہے اور غازی ۔غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی غمازی کرتا ہے۔ شہادت نے سدّی صاحب کو پیر[2] بنا دیا۔

مولانا شیخ شکر شاہ ــــــ کا شمار ایسے بزرگانِ دین میں ہوتا ہے۔ جو علم و فضیلت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے فیضانِ علم سے ذہنوں میں نورِ عرفان، جذبات میں طہارت و پاکیزگی اور دلوں میں ایمان و صداقت کی آگ بھر دیتے تھے۔ مرنے کے بعد ان کی یادوں کے چراغ عوام کے ذہنوں میں جھلملاتے رہتے تھے۔ مولانا شکر شاہ نے عرصہ دراز تک احمدنگر کی نظام شاہی مملکت کے قدیم قصبہ اسلام آباد (بھیمڑی) میں ایک تالاب کے کنارے اپنی مسجد سے متصل مدرسہ میں علم و عرفان کی شمعیں جلائے رکھیں۔ ایک سچے صوفی ہونے کے ناتے معرفت و حقیقت کے حصول کے لئے تمام زندگی زہد و ورع اور اذکار و اشغال میں بسر کی۔ بڑے

---

[1]: قلابہ گزیٹیر صفحہ ۲۵۵

[2]: ایضاً صفحہ پیر سدّی سات غازی کی درگاہ و عرس کے اخراجات کے لئے پد چیلے گاؤں کی آمدنی کا نصف حصہ وقف تھا جو جنجیرہ کے جلشیوں (سدّیوں) کی تولیت میں عرصہ دراز تک رہا۔

کاملین[1] سے ہوئے" جامع علوم وفنون تھے۔ تفسیر وحدیث وفقہ وتصوف میں
علامۃ المثل اور تحریر وتقریر میں ادیب بے بدل تھے، ملک دکن میں آپ کے علم وفضل
کی بڑی شہرت تھی قصبات ودیہات کے طلبا آپ کی خدمت میں جوق در جوق آتے
تھے"[2] جب قیل وقال سے جی اکتایا تو زہد وعبادت کا چراغ جلایا اور صرف تصوف
کا درس دیتے اور سلوک وطریقت کی نشاندہی کرتے رہے۔ فصوص الحکم (تصنیف شیخ اکبر)
کتب مدرسیہ میں شامل تھی۔ "متقی و پرہیز گار تھے اور متشرع وزیں دار" قوم نوائط
سے ناطہ تھا۔ اور ممکن ہے کہ نوائطیوں کی قدیم البستی اسلام آباد کی خاک ہی
سے آپ کا خمیر اٹھا ہو، جہاں کی خاک تیرہ آج بھی اس "گوہر" کی نگہداری کر رہی
ہے۔ گلزار ابرار کے بیان کے مطابق ۹۷۰ھ میں [بعہد حسین نظام شاہ] آپ کی
وفات ہوئی [مزار پر ایک کتبہ فارسی قطعۂ تاریخ معہ آیات کریمہ۔ قدیم رسم خط تعلیق
میں ہے اور یہی اس لوح مزار کی قدامت کی سند ہے اسی لئے یہ معاصر کتبہ بھی معلوم
ہوتا ہے۔ اس کے نقوش اب معدوم ہو چکے ہیں]

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

قرون وسطیٰ کے صوفی اور مشائخ جن مروجہ سلسلوں (چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ)
پر بیعت رکھتے تھے۔ ان کے روحانی نظام کے سخت پابند بھی تھے۔ فلسفیانہ نکتہ

---

[1]: تاریخ الاولیاء۔ سید امام الدین احمد ابن مفتی عبد الفتاح گلشن آبادی (المعروف
بہ مولوی سید اشرف علی الحسینی القادری۔ پیرزادہ گلشن آبادی (۱۳۲۹ھ) ص ۴۲

[2]: ایضاً

پیرائی اور شاعرانہ خیال آرائی کے علاوہ تصوّف کا علمی پہلو بھی تھا۔ اکتساب معارف اور مشاہدۂ حقائق بھی کم فکر انگیز نہ تھے۔ اتباع شریعت اور تقلید طریقت کے ہر کاب بہتیرے "راہ ورسم منزلہا" بھی تھیں جن سے سالک بے خبر نہیں ہوتا تھا۔ عمل صالح تزکیۂ نفس اور زہد وریاضت کے ذریعے وہ تصوّف کے ارفع مقامات تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ اور جب علم باطن کے ذریعے اُسے معرفت حاصل ہو جاتی تو عرفان کی روشنی میں اُسے اُلوہیت کی تجلّی نظر آجاتی۔ اس کی ذات اور اس کے نفس کی دوئی حقیقت کی بیکراں وسعتوں اور ذاتِ حقیقی کی وحدت میں گم ہو جاتی۔ "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" مگر یہ اتحادِ کامل کا منفی پہلو تھا۔ اور جب یہاں تک پہنچے کہ اب ہم اپنی قسم ہونے کی منزل آخر آتی تو "ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے" کا مثبت پہلو سامنے آجاتا۔ یہی وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے کائناتی شعور اور ناحیاتی زندگی کا نظریہ تھا۔

تصوف کے اس ماورائی نظریئے اور سلوک وطریقت کے کڑے کوس کے خلاف جب پہلی عقلی بغاوت ہوئی تو وہ متکلمانہ عقلیت سے پیدا ہونے والی دہریت اور لاادریت تھی۔ پھر جب عقلی سرکشیوں اور عملی سرتابیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو دیگر کئی سلسلوں نے سر اُٹھایا۔ ان میں وہ فرقے بھی تھے جن کے بانی گو متشرع[۲] صوفی تھے۔

۱: اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر۔ ڈاکٹر تارا چند (اردو ترجمہ) (دلی ۱۹۶۶ء) صفحہ ۸۶، صفحہ ۱۰۵

۲: ڈی ساسی ایک فرانسیسی مورخ نے شیخ حیدر خراسانی کے بارے میں لکھا جو کہ درویشوں کے ایک فرقہ کے بانی ہیں۔ اور بھنگ کے استعمال کے موجد ہیں۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق "فرقہ حیدری کے بانی شیخ قطب الدین حیدر ہیں۔ رفاعی یا احمدی۔ شیخ احمد رفاعی کی طرف منسوب ہیں۔ مداری۔ شیخ بدیع الدین مدار کی جانب جلالیہ سید جلال بخاری اور قلندر۔ شیخ جمال مجرد سے سلسلۂ نسبت رکھتے ہیں یہ کل فرقے جاہل اور غیر مہذب ہیں۔ نہ تو وہ جس شیخ کی طرف منسوب ہیں ان کی تعلیم کے مقلد ہیں اور نہ شرع کے پابند۔ یہ ضرور ہے کہ ان فرقوں میں بعض مہذب اور عالم فقیر بھی ہوتے آئے ہیں ... سفرنامۂ ابن بطوطہ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳

مگر ان کے پیروکار سب شرع امر و نواہی سے قطعی نابلد، مذہب سے لاتعلق اور معاشرہ کی اخلاقی پابندیوں اور سماجی روایات و ضوابط کے منکر تھے۔ یہ "وجودی" تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی روحانی زندگی کو "تجریدی آرٹ" کی شکل دے دی تھی۔ جس کے ٹیڑھے ترچھے خطوط میں روحانی تعیش کی بنگ رائی تھی۔ بھنگ (چرس اور گانجے) کے سرور میں یہ "ہپی صوفی" اپنی دانست میں ماورائے ادراک کی سرحدوں کو چھو لیتے تھے۔ انفعالی تصوف کی پناہ گاہ میں انہوں نے جہدِ حیات سے فرار کا ایک چور دروازہ ڈھونڈھ لیا تھا۔ یہ لوگ معاشی طور پر معاشرہ کا مفلوج حصہ بن چکے تھے۔ جو تسلیم و رضا کی ہوا پر جیتے تھے۔ اور قناعت کی سوکھی روٹی کھاتے تھے۔ فقیری بزعم درویشی ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ چونکہ نچلے طبقے سے تعلق تھا۔ اس لئے نہ تو سادات و شیوخ کی طرح نسب و حسب کا حساب یاد تھا اور نہ ان کے جیسے اوصاف رکھتے تھے (لیکن جب کوئی "وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَر" پر عمل نہ کرتے ہوئے کسی فقیر کو جھڑک دیتا تو اسکی رگ حمیت اگر پھڑک اٹھتی تو وہ اپنے خود ساختہ شجرۂ نسب کا طومار کھول دیتا) (ہندوستان کے بیشتر مسلمانوں کے حسب و نسب میں صرف معاش اور پیشہ کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ معاشی نظام کی اتھل پتھل کے سبب بھی اونچ نیچ ہوتی رہتی تھی جیسا کہ اس شعر سے بھی اندازہ ہوگا ؎

اوّلاً نداف بودیم بعد ازاں گردیم شیخ
غلہ چوں ارزاں شود امسال سید می شویم

اس گروہ سے تعلق رکھنے والے بابا "یا سائیں" اور [بزعمِ خود] اللہ والے

چونکہ فعال صوفیانہ زندگی کی تنظیمی سختیوں اور مجاہدہ و ریاضت کی "روحانی و جسمانی صعوبتوں" کو سہار نہیں سکتے تھے اسی لئے سبز عماموں اور سیاہ خرقوں کے پردے میں اپنی درویشی کا بھرم بنائے رکھتے [مگر ان میں کچھ ایسے دکھی بھی تھے جن کی زندگی کے لبادوں میں درد کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ اور جن کی آرزوؤں کے کشکول میں نامرادیوں کی بھیک رہتی تھی ۔ اور کچھ ایسے قنوطی بھی تھے جو اپنی موجودہ زندگی سے سمجھوتہ نہ کر سکنے کے سبب فقیری میں فرار ڈھونڈھ لیتے تھے] کوکن میں فقیروں کے دو گروہ تھے۔ جن میں کوکنی فقیروں کے علاوہ دکن اور شمالی ہند کے گداگروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں با شرع بھی تھے اور باشرع بھی ۔ بے شرع ۔ فقیر مذہب سے بیگانے اور مسکرات کے دلدادہ تھے ان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ گھرانا، اس لئے کہ زندگی کے حسین تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نہ ان کے پاس وسائل تھے اور نہ تو اہلیت ہی تھی۔ ملنگی فقیر۔ شاہ مدار کے مرید تھے ۔ یہ اور ان کے دینی بھائی ۔ مداری فقیر "۔ اپنے مرشد کے نام پر قائم کئے گئے تکیوں "چلہ مدار" میں چلّے کھینچتے اور [سلفے کا دم لگاتے تھے ۔ کوکن کے کئی قصبات میں "مدار چلہ" نام کے تکیے آج بھی موجود ہیں] چار ابدؤں کا صفایا کئے [کوئی مستان شاہ بنا ہوا وجد میں آکر "اللہ ھو" کی ضرب لگاتا پھرتا تھا جلالی جلال میں آکر بڑ۔ ہانکتے [اور سادہ لوح عوام اس میں دعاؤں کے

---

۱ : تھانہ گزیٹیئر۔ ج ۱۴ - ح ۔ ص ۲۷ - ۲۲۶

۲ : تذکرۂ حضرت دیوان شاہ ۔ ڈاکٹر مومن محی الدین ۔ ص ۲۰ - ۳۶ - ۳۵

پوشیدہ معانی کی جستجو کرتے تھے] یہ سارے دریوزہ گر تھے۔ اور خود اپنے سے اُونچے درجہ کے درویشوں کے دستِ نگر تھے [ان میں سے بعض سوالی بن کر کسی کے گھر کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ جاتے اور "زمین جنبد نجنبد گل محمد" کے مصداق جب تک سوال پورا نہ کیا جاتا ٹس سے مس نہ ہوتے] رفاعی عموماً ان عامیانہ فقیروں سے مہذب تر اور خواندہ ہوتے تھے اور بعض سلوک و طریقت کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ مگر یہ رفاعی اپنی جسمانی اذیت کوشی کو ایک طرح کی "خود فنائی" اور نفس کشی پر محمول کرتے تھے۔ [ان تمام قسموں کے فقیروں میں سے آج بھی کئی "بابا" بن کر ہندو مسلم اتحاد" کا مظہر بن چکے ہیں] مگر قرونِ وسطیٰ میں انہیں "خاکسارانِ جہاں" میں شاہ شرف بوعلی قلندر (م ۷۲۴ھ) جیسے آزاد منش اور درویش طبع بزرگ بھی شامل تھے جن کا دعویٰ تھا ؎

ہست در سینۂ ما جلوۂ جانانۂ ما
بت پرستیم و دلِ ماست صنم خانۂ ما

اور شاہ سرمد (م ۱۶۶۰ء) جیسے نو مسلم "مجذوب" بھی تھے جنہوں نے "حکیمانہ خیالات۔ حقایق و معارف۔ صلح کل اور آزاد منشی کے مضامین اپنی رباعیات میں نظم کئے ہیں" تقریباً اسی قسم کے اونچے درجہ کے فرقہ فقراء سے وہ ہندو درویش بھی تعلق رکھتے تھے جنہیں عرفِ عام میں "شاہ" کہتے تھے۔ یہ کون کا وہ درویش

۱: نوائے ادب۔ (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۵۲-۱۹۵۱ء)

۲: ارمغانِ پاک شیخ محمد اکرام ص ۹

فرقہ تھا۔ جو باشرع تھا اور ایک علاحدہ تنظیم رکھتا تھا۔

درویشوں کی تنظیم :

کوکن میں چشتیہ اور قادریہ فقیروں کی تنظیمیں عرصہ دراز سے قائم تھیں۔ تنظیم کے سربراہ کو سرگردہ کہتے تھے۔ جو اپنے منسلکہ سلسلہ کے پیران طریقت کی تعلیمات کا مرشدِ اعلیٰ بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ وہ محور تھا جس کے گرد صوفی زندہ سُنّت کی ساری کائنات گردش کرتی تھی۔ اِذنی۔ یا نقیب۔ فقیروں کی پنچایت یا اجلاس کے انعقاد کا اعلان اور ضروری کارروائیاں کرتا تھا۔ بھنڈاری کی حیثیت خزانچی کی تھی۔ یہ بھنڈار یا لنگر کا مہتمم ہوا کرتا تھا۔ اور جلسہ کے روز فقیر برادری کے "حقہ پانی" کا انتظام کرتا تھا۔ تنظیم میں شامل فقیروں کے دو درجے ہوتے تھے۔ (۱) مرشد اور (۲) خادم یا بالک۔ ہر نئے بالک کو فقیروں کی ٹولی میں شامل ہونے سے پہلے کسی درویش مرشد کے آگے زانوائے تلمذ تہہ کرنا پڑتا تھا۔ تعلیم۔ پیرانِ طریقت کے شجرہ کی معلومات تک محدود تھی۔ کچھ دنوں بعد بیعت کی رسم ادا کی جاتی۔ نئے بالک کے چار ابروں کا صفایا کرایا جاتا پھر نہلا کر مرشد کے آگے بٹھا کر اُس سے شجرہ پڑھواتے تھے۔ اس طرح وہ تنظیم کا باقاعدہ رکن بن کر [اللہ کی راہ میں] بھیک مانگ سکتا تھا۔ [بعض ایک ہاتھ میں مورچھل اور دوسرے میں عود دان تھامے "ردِّ بلا" کا ورد کرتے اور جو دے اس کا بھلا۔ جو نہ دے

مـا: تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ خ ۱۔ ص ۲۷-۲۲۶

اس کا بھی بھلا۔ کی صدا دیتے تھے۔ فقیروں کی "صدائیں" بڑی حد تک روایتی اور گھسی پٹی تھیں جو معمولی طور سے خواندہ ہوتے تھے۔ وہ قدیم دکھنی مثنویوں کے اشعار گاتے تھے۔ اور اس سے پہلے صلوات پڑھنے یا ساتھی فقیر اپنی باری آنے تک ہاتھ میں پڑے ہوئے آہنی کڑوں کو چوبی ڈنڈے سے ضرب دیتا رہتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں خیرات دینے کا شائستہ طریقہ لگارا (نغارہ) تھا۔ قصبہ کے مختلف گھروں سے فقیروں کا روزینہ بندھا رہتا تھا۔ یہ طریقہ آج بھی کہیں کہیں رائج ہے مگر موذن اور پیش امام تک محدود ہو گیا ہے]

رات ڈیرے میں آکر بالک یا خادم اپنا سارا اندوختہ سرگروہ کے سپرد کر دیتا۔ وہ چونکہ تنظیم کے فتوح اور آمدنی کا سب سے بڑا حصہ دار اور تقسیم کار ہوتا تھا۔ اسی لئے اپنا حصہ اور تنظیم کے اخراجات کے لئے [یومیہ یا نقد میں سے متعینہ حصہ لے کر] باقی بالک کو بخش دیتا تھا۔

سرگروہ۔ شاہ: یہ سرگروہ اور مرشد (جن میں سے بیشتر آج "پیر" تسلیم کئے جاتے ہیں) نچلے طبقہ کے عامیانہ اور ناخواندہ گداگروں سے بہمہ اوصاف مہذب، مطہر اور ممتاز ہوتے تھے۔ یہ متشرع بھی تھے اور متقی بھی اور متاہلانہ زندگی بھی بسر کرتے تھے۔ اس طرح معاشرہ سے معاملہ رکھتے تھے۔ اور عوام سے رابطہ علم وفضیلت سے مالا مال ہوتے تھے اور صاحبِ کمال بھی ہوتے تھے۔ مگر قرونِ وسطیٰ کے مشاہیر مشائخین اور پیرانِ طریقت کی طرح

---

(۱) تھانہ گزیٹیر ج ۱۳- ج ۱- ص ۲۷-۲۲۶

دینی مناقب اور روحانی مرتبت میں اتنے بلند نہیں ہوئے کہ کسی سلسلہ کے بانی بنتے یا ہندوستان گیر شہرت حاصل کرتے۔ البتہ ان کی طرح چونکہ یہ بھی عوام کے دلوں پر حکرانی کرتے تھے اس لئے شاہ کہلاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ "شاہ" اول الذکر "اولیاء" کے ناموں کے آگے خطاب بن گیا ہے۔ اور ان پر دلتاری درویشوں" کے ناموں کے بعد لقب۔ یہ بھی اپنی خانقاہوں اور قائم کئے ہوئے تکیوں میں مریدوں اور فقیروں کا دربار لگاتے تھے۔ گو بظاہر فقیر تھے مگر دراصل اپنی فقیر برادری کے دستگیر تھے۔ سائل تھے مگر وسائل وسیع رکھتے تھے، اس لئے کہ حاکموں اور امیروں سے رسم وراہ تھی۔ گو خود انہیں جاہ ومال کی چاہ نہ تھی۔ خدا کی راہ میں جو کچھ ملتا تھا۔ اُسی کی راہ میں لٹا دیتے تھے۔ اپنے خلیفوں کو اراضی انعام دیتے تھے اور اپنے مرشدوں کے نام پر مسجدیں تعمیر کرتے اور تکیہ گاہیں قائم کرتے تھے اور رفاہِ عام کی غرض سے کنویں کھدواتے اور تالاب بناتے تھے۔ کوکن کے بیشتر تکیوں اور خانقاہوں کی تعمیر ایسے ہی غنی درویشوں کے جذبۂ رفاہیت اور شوقِ سخاوت کی رہینِ منت ہے۔ قادریہ سلسلہ کے فقیروں کا مرکز دھانو میں تھا اور چشتیہ درویشوں کا محور اسلام آباد کا قدیم قصبہ بن چکا تھا

دیوان شاہ بابا: سترھویں صدی وقت کے راستے پر آدھی سے زیادہ منزلیں طے کر چکی تھی۔ مہاراشٹر کے سیاسی صنمکدے میں مرہٹہ قوتوں کا ایک نیا بُت تراشا

ا۔ تھانہ گزیٹیر ج ۱۳۔ ج ۔ ص ۲۷-۲۲۶

جارہا تھا جو زوال آمادہ عادل شاہی حکومت کی وحدت کو شکست دینے پر تلا ہوا تھا۔ تھال کوکن کا قدیم قصبۂ اسلام آباد اب دارالحرب بن چکا تھا۔ بدامنی اور انتشار کے اس دور (۱۶۵۷ء) میں ایک مردِ خدا نے درباری زندگی سے اپنا سلسلہ توڑ کر خدا اور اس کے بندوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ یہ اس قصبہ کے روحانی نظام کے قطب ـــــ سید شاہ حسین قادری (المتوفی ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء) تھے، جنہیں عوام دیوان شاہ بابا کے نام سے یاد کرتے ہیں[۱] اور جو تالکوکن کے عہد دیوانی سے سبکدوش ہو کر محبوبِ حقیقی کے دیوانے بن چکے تھے۔ اور ہزاروں لوگ ان کے نام کے دیوانے بن گئے جن میں فقراء اور مساکین کے کئی گروہ اور کئی سرگروہ تھے اور جن کا تکیہ۔ ان کے بنائے ہوئے تکیہ بابا حسین پر تھا جس میں "باباصاحب کے داد و دہش کا لنگر چلتا تھا جس کے سہارے نجانے کتنے فقراء و مساکین کے سفینۂ حیات چلتے تھے۔ ان درویشوں میں سلسلۂ مداریہ کے فقیر اور چشتیہ سرگروہوں کی بڑی تعداد تھی۔" دیوان شاہ بابا کے سالانہ عرس کے موقع پر جو یافت ہوتی تھی اس کے "نقد چراغی میں فقرائے مداریہ و قادریہ کا بھی حق ہوتا تھا۔"[۲] اور تکیۂ چنگی شاہ کی "چنگی" بھی شامل تھی۔

تکیۂ باوا حسین کے اثر ات اور باڑیوں کے نواح میں پیر شاہد شاہ عرف

۱: دیکھئے راقم کا رسالہ: تذکرۂ حضرت دیوان شاہ صاحب (بگھیرٹی) مع خاندانِ سادات

۲: ایضاً۔ صفحہ ۲۰، ۶۴ وغیرہ

فاضل شاہ کا تکیہ تھا جن کو کوکن کے سرگروہوں میں بڑی فضیلت حاصل تھی اس لئے کہ یہ نہ صرف چشتیہ درویشوں کے سرگروہ اور مرشد تھے بلکہ ان کے دستگیر بھی تھے مدد معاش کے طور پر انعام یافتہ ایمہ زمینوں کے ۔ مالک تھے جس میں سخاوت کی کاشت کرتے تھے ! اور اپنے متوسلین درویشوں کی زندگیوں کو شاداب بناتے تھے چنانچہ پیر امین شاہ (تکیہ جنگی شاہ کے قریب) لطف علی شاہ فقیر (نیویل کے رہنے والے تھے، کاردلی بھیمڑی میں دفن ہیں) پیر خلخلے شاہ (جو بازار خورد یعنی مارکیٹ روڈ پر قاضی کمال الدین ابن قاضی علی اور قاضی غلام احمد کے گھروں کے قریب دفن ہوئے) پیر امیر شاہ (نظام پورہ) ۔ کو فاضل شاہ نے اپنے اوقاف میں سے زمینیں عطا کیں تھیں ۔ فاضل شاہ کے معاصرین میں قصبۂ اسلام آباد کے مندرجہ ذیل کوکنی حضرات کے نام ملتے ہیں ۔ علی صاحب نرزیل، قاضی بالو اور ابراہیم میر یکر ۔ فاضل شاہ کی درگاہ کے مجاور پہلے لطف علی شاہ فقیر تھے ۔ ان کے بعد ایمانی شاہ بنے جو سرگروہ فقراء مداریہ بھی تھے فاضل شاہ اور ان کے مذکورہ بالا متوسلین کے اوقاف کی تولیت کے علاوہ یہ نیویل کے کرم علی شاہ کی اوقافی جائداد کے بھی مہتمم تھے ۔ لوگوں میں امانی شاہ مشہور تھے اور سرکاری کاغذات میں امام شاہ باوا مجاور یا فقیر نظر آتا ہے ۔ ایمانی شاہ سرگروہ نے خود اپنے اوقاف میں سے جن متوسلین درویشوں کو کھیتی باڑی کے لئے زمینیں عطا کیں ان کے نام یہ ہیں ۔ پیر ماموں بھانجے، پیر غیبی شاہ (ناکا فل کے آگے) حنا فقیر ۔ پھنڈولے خاندان کے پانچ پیر ۔ پیر داؤد ۔ کوسلیا وغیرہ ۔ ایمانی شاہ کے

---

۱ : تھانہ گزیٹیر (دلچسپ مقامات) کے علاوہ انعام کمشن کے رجسٹر (ایضاً میں) بھی ان کا نام : امام شاہ باوا مجاور اور فقیر دیا گیا ہے ۔

معاصرین میں مندرجہ ذیل بزرگانِ دین کے نام ملتے ہیں۔ علاءُ الدین ڈوکلے۔ علاؤالدین کرنگیہ [اسی خاندان کے ایک فرد امیر صاحب کرنگیہ نے کرنگیہ مسجد کا تالاب تعمیر کرایا تھا] عبدالکریم شاہ۔ سید احمد شاہ ڈوکلے [جو شری وردھن کے قاضیوں کے پیر تھے] اور سید محی الدین مقری شاہ [جن کے مزار پر امساکِ باراں کے موقع پر دعاء استسقاء مانگی جاتی تھی۔ تھانہ گزیٹیر (۱۸۸۲ء) حصہ "دلچسپ مقامات" ص ۴۸)

ایمانی شاہ نے فاضل شاہ کی درگاہ کے احاطہ میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کا کتبۂ تاریخ یہ ہے[1]۔

أَلَا يَا طَالِبَ الْمَوْلَىٰ لِتَارِيخ	بِهٰذَا الْمَسْجِدِ بِالْاِعْتِنَاءِ
بَنَاهُ شَاهُ أَيْمَانِي بِجُهْدٍ	بِوَجْهِ الْخَالِقِ ذِي الْكِبْرِيَاءِ
فَقُلْ أَبْدَا لَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ	لِتَعْلَمَ مِنْهُ مَا عَامُ الْبِنَاءِ
۱۲۶۸ھ	۱۲۶۷ھ

ایمانی شاہ کا انتقال ۱۲۹۱ھ میں ہوا۔

تکیۂ ایمانی شاہ میں جہاں فقر و توکل کا درس دیا جاتا تھا۔ وہاں اسی میں قائم مدرسۂ ایمانی شاہ میں علم و عرفان کا چراغ بھی جلتا رہتا تھا۔ اس دینی درسگاہ میں متعدد دور سے علماء و فقہاء درس و تدریس کے سلسلے میں آتے تھے۔ ان میں ریاست ٹونک کے ایک سابق وزیر صفت علی شاہ تھے۔ جن کے علمی و دینی اوصاف نے انہیں عالم فقیر

---

[1] گزیٹیر میں امام شاہ لکھا ہے۔ اس کتبۂ تاریخ کے لئے میں عربی کے جیّد عالم جناب مولانا عبدالصمد صاحب کا ممنون ہوں۔

خوشنویس صوفی اور نستعلیق درویش بنا دیا تھا۔ فنِ خطابت میں کوئی ان کے منہ نہیں لگ سکتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے پدر بزرگوار مولانا خیر الدین اور مولانا محدث دہلوی بھی اسی سلسلۂ درس و تدریس میں مدرسہ ایمانی شاہ سے منسلک رہ چکے ہیں۔ مدرسہ و تکیہ ایمانی فقراء و مساکین کے لئے دارالامان۔ صوفیوں کے لئے دارالارشاد اور عوام کے لئے دارالشرع کی حیثیتیں رکھتے تھے۔ چنانچہ فقہی مسائل پر یہیں سے فتوے بھی صادر کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ "فیض محمود" نام کے ایک رسالہ سے ثبوت ملتا ہے جیسے" ابوالخلیل مسلم مشنری نے بھیمڑی تکیہ ایمانی شاہ سے شائع کیا تھا۔" (سنہ ۱۳۴۲ھ)

۲۶۵

"مری نگاہ مزاروں سے دور جاتی ہے"

مسلم دورِ حکومت میں کوکن درویشوں کا دیس بن چکا تھا۔ اور اس دیس کے قصبوں کے ارد گرد [مثلاً بھیمڑی اور اس کے قریب کارولی، کلیان، واشندی، سانکھشی وغیرہ میں] قبروں اور مزاروں کی قطاریں جہاں گمنام شہیدوں کی شہادت دیتی ہیں۔ وہاں ان مجاہدین کے کارناموں کی جانب اشارے بھی کرتی ہیں جنہوں نے مصافِ زندگی میں اپنے کردار کی بے باکی، عمل کی قوت اور نیکوں کی

---

(۱) مولانا خیر الدین عرصہ دراز تک بمبئی میں مقیم رہے اور شیعہ جماعتوں سے مقابلے اور مناظرے کرتے رہے ممکن ہے اسی دورانِ قیام میں بھیمڑی سے بھی تعلق رہا ہو۔ (دیکھئے۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ بہ روایت عبدالرزاق ملیح آبادی۔ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۳۹-۱۲۴)

طاقت سے ہر سماجی ناانصافی، سیاسی بدعنوانی اور معاشی بدحالی کے خلاف جہاد کیا تھا[1]
بھیمڑی میں دیوان شاہ بابا کے توسلین سادات کے مزارات کے علاوہ حضرت حاجی
کرم علی شاہ (۱۱۷۱ھ) اور نواحی مواضع میں مندرجہ ذیل "پیروں" کی درگاہیں موجود ہیں
(۱) کاشنہ میں ملک محمد شاہ [پیر]۔ (۲) کاٹھانی: پیر داؤد صاحب (۳) کھانڈپا: پتنگ شاہ (۴)
کھالنگ خورد: شاہد شاہ (۵) خوتی: پیر داؤد شاہ (۶) کونہ: پیر غلام حسین (۷) بوری
والا عرف سونالہ: ابراہیم شاہ فقیر (۸) جہالولی: شہادت [شاہد] شاہ (۹) مُرھا:
داول شاہ (۱۰) ناگاؤں: پیر غیبی شاہ (۱۱) ناگاؤں: پیر خلخلیا [اخ۔ غالباً یہ پیر خلخلے
شاہ ہے]۔ (۱۲) پڑگھا: پیر بیجا صاحب (۱۳) نیڈاس: مقطع [؟] شاہ (۱۴)
راہور: پیر غیبی شاہ۔ (۱۵) سائودھا: پیر مخدوم (۱۶) شیلار: پیر غیبی شاہ (۱۷)
تولی: پیر لالہ (۱۸) تولی: پیر عبداللہ (۱۹) شمبھولی: پیر[2] [؟] وغیرہ۔
ارنالہ میں شاہ علی اور حاجی علی کے مزارات گجرات کی مظفر شاہی دور کی
یادگاریں ہیں۔ بنوپل میں مولانا کرمانی [کرم علی شاہ] جمال شاہ اور کمال شاہ۔ اورن
(پیرواڑی ہیں) حضرت مقیم شاہ (م ۱۱۸۲ھ) تلوجہ میں: شاہ بدرالدین۔ رتناگری میں:
خواجہ شمس الدین بغدادی۔ کلیان میں: شیخ احمد مخدوم فقیہ (والد مخدوم مہائمی) سید
نظام الدین شاہ خاموش۔ امان اللہ شاہ عرف حضوری شاہ۔ شیخ سرور قادری اور

۱۔ تذکرہ حضرت دیوان شاہ۔ ص ۱۵

۲۔ ان درگاہوں اور مزاروں کے اوقاف [مع اوقاف دیوان شاہ درگوری پاڑہ۔ نارپولی مدنجول وغیرہ اور چنگی شاہ] امانی شاہ] پیشوا دفتر کے انعامی کمیشن رجسٹر میں ۱۸۶۲ء میں درج ہیں۔

جزیرہ معمورہ بمبئی میں سینکڑوں کی تعداد میں نوائطی سرگروہوں ۔ درویشوں ۔ عالموں اور بزرگوں کی قبریں ہیں۔ ان میں ہر سلسلہ کے فقیر بھی ہیں۔ مثلاً سید علی شاہ ملنگ مداریہ سرگروہ (۱۸۳۱ء) سید بدرالدین حسن حبیب اللہ رفاعی اور اسلامی ممالک کے علماء و فضلاء بھی شامل ہیں مشہور قصہ حاجی بابا اصفہانی کے مصنف میر فضل علی آورنؔ میں دفن ہیں۔

میلے ٹھیلے : کوکن کے نام چین مندروں کی چوکھٹ پر ہر سال یاتری اکٹھے ہوتے تھے۔ اسی طرح مشہور درگاہوں کے آستانوں پہ معتقدین اور زائرین کا اجتماع ہوتا تھا (گو آج کے انتہا پسند دینی مصلحین عرس کی روحانی اہمیت کی منکر ہیں۔ قبر پرستی، گلپوشی، غلاف پوشی، صندل پاشی، چڑھاوے اور منتیں تعلقی قابل انسداد اور لائق تعزیر ہیں) ۔ مگر مذہب اور دھرم کا دبیز غلاف اُٹھا کر دیکھا جائے تو ان میلوں ٹھیلوں کی سماجی اہمیت اور اقتصادی افادیت کا جلوہ نظر آ جائے گا۔

سائنسی دور سے پہلے ۔ جب عوام الناس کے وسائل شوق محدود اور لوازماتِ نشاط نا پید و نامعلوم تھے۔ میلے ٹھیلے ہی دل بہلاوے کے سامان مہیا کرتے تھے ۔ اس قسم کے عرس اور جاترے نہ صرف مقامی تہوار ہوتے تھے بلکہ قومی و معاشرتی زندگی کے معصوم اور دلآویز پہلو بھی ہوتے تھے۔ [اور بعض مثلاً: پھول والوں کی سیر، سترھویں کی سیر اور نوچندی کا میلہ ۔ قدیم قومی روایات اور ثقافتی اقدار کے حامل تھے]

معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ میلے ٹھیلے ہنگامی بازار اور عارضی منڈیاں بن کر دیہی دستکاری کی مصنوعات اور مقامی پیداوار کے نکاس

کا باعث بن جاتے تھے، یوں بھی گولکنڈہ میں ہفتہ واری بازار ہاٹ کا رواج تھا، اور ساحلی بستیوں (مثلاً چیول وغیرہ میں) خاص خاص موسموں میں تجارتی گہما گہمی عروج پر رہتی تھی۔ میلے سماجی اجتماع ہوتے تھے! اور عورتوں اور بچوں کے لئے تقریب بہر ملاقات، غریب دستکار اور محنت کش عوام بھی سال بھر کی پُرمشقت اور یکسوٗ زندگی سے تھک جاتے تو عُرسوں اور میلوں ٹھیلوں کی انتظار کرنے لگتے تھے۔

پیروں کے سنگِ آستاں پر سر پھوڑنے والے سادہ لوح عقیدتمندوں کے علاوہ وہاں تماشا گاہوں میں بہرِ تماشا وہ لوگ بھی آتے تھے۔ جو قرونِ وسطیٰ کی ہندوستانی سماجی زندگی کے طربیہ تمثیل کے خاص اداکار ہوتے تھے [مگر جن کی نجی زندگی سراسر المیہ ہوتی تھی] بازیگر کے آگے دنیا "بازیچۂ اطفال" نظر آتی تھی شعبدہ باز کھلا دھوکا دیتے تھے۔ سپیرا بین بجاکر "ناگن کے بابی" کو پاس بلاتا تھا۔ بھاٹ اور بھٹ گا کر مانگتے تھے تو مخنث ڈھول پر تھپکیاں دے دے کر سفلانہ جذبات کو ٹھوکے دے کر بیدار کرتے تھے ـــــــ اِن ہنگاموں سے پرے آستانے پر قوالوں کی چوکیاں نوبت بدلتی تھیں۔ والہانہ جذبات سے ہم آہنگ۔ وجد انگیز لَے میں اُبھرتی ہوئی عقیدت سے سرشار۔ دُھن سنائی دیتی تھی کہ ع

من قبلہ راست کردم برطرفِ کجکلاہی

سنگیت کا سرگم:

قوالی کی دھن تو امیر خسرو کے زمانے سے گونج رہی تھی اور جب صوفی شاعروں نے ہندوی میں مخمس اور مسدس کے شعری زاویے بنانا شروع

کئے تو اس کی تان اور اونچی ہو گئی۔ تصوّف کے فکری ارتقاء اور ادبی وسعتوں کے ہمرکاب ہندوستانی سنگیت کا پھیلاؤ بھی بیکراں بنتا جا رہا تھا۔ کیونکہ تصوّف میں صرف زہد و تقویٰ کی خشکی اور ریاضت و عبادت کی گہرائی نہ تھی، زخمہائے دل کے مداوا کے ساتھ ساتھ اس کی روحانیت کی ان دکھی انگلیوں میں زخمۂ ساز بھی تھا جو انسانی زندگی کے لطیف جذبات کے تاروں سے ترنم پیدا کرتا تھا۔ موسیقی، محبت اور شاعری تصوف کی خارجی زندگی کے جمالی پہلو تھے۔ سماع کے ساتھ ساتھ رقص یا حال (فرقۂ مولویہ) کے "روحانی کلچر" کا مظہر بن چکا تھا۔ درویشوں کے علاوہ سلطانوں نے بھی ہندوستانی سنگیت کے سُروں کو سنوارا ہے۔ عادل شاہی حکمرانوں کو اس فنِ لطیف میں جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا آوازہ آج بھی سنائی دیتا ہے۔ ابراہیم عادل ثانی اپنے کمالِ فن کے سبب "جگت گرو" کہلاتا تھا۔ اس بے نادر مرتبت بادشاہ کے رگ و پے میں سنگیت کے سُر اس درجہ رچ بس گئے تھے کہ سنگیت اس کی زندگی کا آدرش بن چکا تھا۔ اس کے ذوقِ سلیم اور تخیل پرستی نے ایک مثالی "شہرِ سرود" کا خواب دیکھا تھا۔ بیجاپور کے نواح میں بسائی گئی اس نئی بستی کا نام موسیقی کی مناسبت سے نورس پور رکھا گیا تھا۔ نورس محل عرف سنگیت محل کی بناء کے علاوہ نورس ایک قومی تہوار کا بانی بھی یہی بادشاہ ہے۔ اس کے اکیاون گیتوں کے مجموعہ کا نام بھی نورس ہے جنہیں اس نے مختلف راگوں اور راگنیوں میں باندھا ہے۔ درباری شاعر ظہوری نے اس نورس پر انشاءِ غنائیہ میں اپنا مشہور دیباچہ تحریر کیا ہے

۱؎ : شیخ بہاؤالدین برناوی موسیقی میں یگانۂ روزگار تھے۔ دیکھیے مضمون "اورینٹل کالج میگزین" لاہور ۱۹۲۷ء پروفیسر محمود شیرانی

نورستیوں میں آباد چار ہزار سنگیت سمراٹوں میں اکثر ہندو تھے ۔ اسی لئے "جمال و کمال ہمنشین" کا اثر اس پر گہرا پڑا تھا ۔ نورس کے ہندوی گیتوں میں کانور کی طرح گورے شیو کی مہکار بسی ہوئی ہے اور ابر نیاں کے پانی کی طرح صاف شفاف سرسوتی کے موتیوں کی جھنکار دکھائی دیتی ہے۔[1]

ابراہیم کے پوتے علی (۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء) نے بھی خاندانی روایت کی ہم آہنگی کو برقرار رکھا ۔ دکن کے امراء اور حکام بھی رقص و سرود سے یک گونہ بے خودی حاصل کرتے تھے ۔ عشوہ طراز رقاصائیں رنگین بافتہ کے حریری نقاب منہ پہ ڈالے ۔ وسطی ایشیائی رقصوں سے اپنے آقا کی ضیافت میں مدعو اجنبی سفید فام مہمانوں کا دل بہلاتی تھیں۔[2] کوکن میں کلاونتوں کی ٹولیاں بھی عام تھیں جیسا کہ داسندری (کلیان) اور چیول کی "کلاونت چی پہاڑیوں" کے نام سے ظاہر ہوتا ہے ۔

لوک گیت اور سنگیت :

انسان کی سماجی زندگی میں ایسے نشاط انگیز لمحے آتے ہیں ۔ جب اس کی من بھاؤ ولولوں کا جھرنا گنگناتا ہوا ابل پڑتا ہے ۔ اور وہ ایسے گمبھیر وقفوں سے بھی دوچار ہوتا ہے ۔ جب اس کے ساز احساس کے تاروں سے سسکیاں اور کراہیں بلند ہوتی ہیں "فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی اور نہ تو نالہ پابند نے ہوتا ہے" ۔ اسی لئے محنت کش طبقہ کے معاشی مسائل ، دکھ اور درد اور ننھی ننھی مسرتیں ۔ سیدھے سادے الفاظ کے پردوں

---

۱ : علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۵۳ ۔ ۱۲۵ تاریخ ملوکات بیجاپور ۔ ج صفحہ ۲۱۰، ۲۲۱، ۲۴۲

۲ : فرانسیکو پلیرڈ کا بیان ۔ ج ۲ ق ۲ صفحہ ۶۶-۱۶۵ ۔ قلابہ گزیٹیر صفحہ ۳۰۴ ۔ ۳۰۰

سوار لوک گیت بن کر اڑتے رہتے ہیں اور لوک سنگیت کے ترمل دھاروں
بہتے رہتے ہیں۔ ہر دیس اور قوم کے لوک گیتوں اور سنگیت کا اتہاس بیحد پرانا ہے
ناچیہ ـــــ کوکن کے کھیتوں میں کام کرنے والے کنبی ۔ نمکساروں میں نمکین سمندر
اسنے والے آگری ۔ بادبانوں کے پنکھ لگائے عرب ساگر کے پھیلے ہوئے سینے پر اڑتی
دی کشتیوں میں سوار ۔ کولی ۔ سہیادری کے گھنے جنگلوں میں لکڑیاں کاٹنے والے
ٹھکاری ـــــ اور کرگھوں پر بننے والے ڈانگ ـــــ اپنی محنتوں کے زخموں اور
دکھوں کے جراحتوں پر گیتوں اور نغموں کا پھاہا رکھتے تھے ـــــ رتناگیری میں
ہوئے، کھکاری ایک ہاتھ سے "تنتنے" (ایک تارا) کو چھیڑتے اور دوسرے ہاتھ میں
مشعل اٹھائے بھوانی کی مہما گاتے نظر آتے تھے۔ مرہٹوں، کھنڈاریوں اور کنبیوں
کے لگن منڈپوں میں امبابائی کے پرستار گوندھل تنتنے اور دوش لے کر قبائلی رقص
کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وارلی ملبی چوڑی "سنائی" (شہنائی) لے کر ڈھولکی
اور سمکتی پیٹتے ہوا گھیرا بنا کر ناچتے تھے۔ اور نومولود کی تقریبوں میں گاگا کر اپنے "دیوتاؤں
میں سے کسی کو بلاتے تھے" لوک ناچ، میت پر بین کرنے کا دستور تھا۔ اور بال کھول کر
ماتم کرنے کا رواج بھی تھا۔

محرم:

اور ماتم ۔ فن گیا اور عزاداری پیشہ ۔ جب تشیع عادل شاہی حکمرانوں کا مذہب

۱؎ تھانہ گزیٹیر ۔ صفحہ ۸۵، قلابہ ص۶۷، رتناگیری صہ ۱۸۵ - صہ ۱۹۷

بن گیا۔ اسماعیل عادل شاہ اور سلطان قلی قطب شاہ دکن میں شیعیت کے سب سے بڑے مبلغ اور مقلد تسلیم کئے جاتے تھے۔ ایران کے آفاقی شیعہ عادل شاہی فوج اور دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوکر سرخروئی حاصل کرنے لگے مگر ان کی مسابقت میں دکھنی امراء کی عظمتیں سرنگوں ہونے لگیں۔ سلطنت پر ایرانی مدنیت کا پرتو پڑا تو بیجاپور کی معاشرتی فضا اور فکری و ذہنی ماحول پر قزوین و اصفہان کا دھوکا ہونے لگا۔ فن تعمیر پر ایرانی شیعیت کی گہری چھاپ پڑنے لگی۔

ادبی مظاہر میں گو اس شدتِ شیعیت کی شہادت نہیں ملتی سوائے اس کے کہ مرثیہ گوئی کی ابتداء دکن سے ہوئی اور یہی دبستانِ لکھنؤ کا فن ٹھہرا لیکن ایران کی مرثیہ نگاری یا تعزیہ گوئی کے سامنے دکن کی فارسی شاعری ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ آذری اور قطب شاہی حکمران شاعروں کے مرثیوں میں محتشم کاشی کے مشہور ہفت بند کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ عزاداری کا رواج اسی عہد سے ہوا (اور اس کی بنیاد حیدرآباد میں ڈالی گئی تھی) ایران کی بدعات دکن کی روایات بن گئیں۔ چنانچہ ماہ محرم میں مجالس عزا منعقد کی جانے لگیں اور (خصوصاً محمد قلی قطب شاہ جو عزاداری کا بانی تھا) پابندی سے اس "مذہبی فریضہ"[1] کو ادا کرتا تھا۔ قطب شاہی حکمران اپنے رشتہ داروں کو ماتمی لباس یا سراپا عنایت کرتے تھے [عیدین کی تقریبات میں خطیب کو جو خلعت دی جاتی تھی اسے بھی سراپا ہی کہتے تھے[2]] ایلخانیوں کی تقلید اور صفویوں کی تائید میں

---

[1]: تفصیل کے لئے دیکھئے حدیقۃ السلاطین نظام الدین احمد

[2]: وقائع دکن ۳۹/۴ ۔ نمبر ۱

حیدرآباد میں تعزیئے اُٹھائے جاتے تھے۔ عَلَم ۔ سربلند ہونے لگے تو عقیدتمند سر جھکا کر منتیں مانگنے لگے اور سونے کی زنجیریں (لنگر) عَلَم پر چڑھائے جانے لگے۔۔ عاشور خانے تعمیر کئے جاتے تھے۔ جن میں حسینی عَلَم ایستادہ کئے جاتے تھے بارہ امام۔ یا امام باڑے۔ ماتم کدے بن گئے[1] تابوت اور شدّہ نکالنے پر[شیعہ سنّی] مناقشوں سے پرپرزے نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر جان فرائر کے بیان سے شہادت ملتی ہے کہ محرم کی ساری ماتمی روایات [یا بدعات جو آج دکن میں رائج ہیں] سترہویں صدی میں کم و بیش انہیں صورتوں میں موجود تھیں وہ لکھتا ہے کہ اہلِ بیت کے شیدائی دہکتی ہوئی انگیٹھیوں پر چلتے تھے۔ اور تلواریں سونتے ہوئے ناچتے اور کودتے تھے۔[اور شرارت سے یا شدّت جذبات میں] ناک بھی کاٹ ڈالتے تھے [اپنی یا کسی تماشبیں کی۔ واللہ عالم] اس ماتم انگیز اور تاریکہ مہینے میں اس قسم کا شدا پن عالمگیر جیسے راسخ الاعتقاد سُنّی مسلمان کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ خوافی خان لکھتا ہے کہ جب ۱۰۷۶ھ[1] میں برہانپور میں سخت قسم کا فساد پھوٹ پڑا تو عالمگیر نے تعزیوں کے جلوس پر پابندی لگادی تھی[2]۔

محمد قلی قطب شاہ نے سماجی ہم آہنگی اور تمدنی آمیزش کے پیشِ نظر دکن میں مذہبی اور غیر مذہبی تہواروں کو رواج دیا۔ عید میلاد النبیؐ اسی عہد کی یادگار ہے۔ ہر سال ماہ ربیع الاول میں [محرم کے مجالس عزا کی طرح] وہ مجالس میلاد بھی منعقد کیا

---

[1]: واقعات مملکاتِ بیجاپور۔ ج ۱ صہ ۵۱، صہ ۱۷۔ ۱۸، ۱۳ ۔ ج ۲ صہ ۵۴۵، صہ ۵۵۵

[2]: خزائن ج ۱ صہ ۷۵ - ۲۷۲۔ منتخب اللباب۔ ج ۲ صہ ۲۱۳

کرتا تھا خود بھی پابندی سے شرکت کرتا اور علمائے واعظین کو داد و دہش سے سرفراز کرتا تھا[1]
دکن کی یہ ساری روایات گو کوکن کے کناروں تک پہنچ چکی تھیں مگر اس خطۂ سرزمین پر تسنن
کا تسلط برقرار رہا۔ جبکہ خود دکن کے درباری اور فوجی عرب۔ کردی اور حبشی جنگ ہفتاد
و دو ملت سے کم ہی متاثر ہوتے اور اپنے آبائی مذہب پہ قائم رہے۔ لیکن محرم کے مظاہر
کوکن میں بھی نظر آنے لگے تھے۔ [اور جب ۵۷-۱۸۵۶ء کے سیاسی بحران کے دور
میں یو پی کے بنکر مومن۔ انصاری مہاجر کوکن آئے تو گو ان کی ایک بڑی تعداد وہابیت
کے زیر اثر تھی۔ مگر انہیں کے ذریعہ تابوت بنانے اور جلوس کی صورت اٹھانے کا
رواج عام ہو گیا]

تعلیم او اکھاڑا :

محرم کی بدعات حسنہ کا ایک حسین پہلو (کم از کم) آج تعلیم اور اکھاڑے کی
صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ محمد آباد (بیدر) جب تک بہمنیوں کا دارالسلطنت
رہا عسکری تعلیم و تربیت کا اڈا بنا رہا۔ یہاں نت نئے جنگی تجربے کئے جاتے تھے۔ احمد
نظام شاہ بہمنی جو خود تلوار کا دھنی تھا، انصاف کے طلب گاروں اور حقوق کے دعویداروں
کو آپس میں مبارزت کا حکم دیتا تھا موت منصف بن کر کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرتی تو
فاتح کی زندگی سے نہ تو مقتول کے لواحقین قصاص لے سکتے تھے اور نہ خون بہا۔ اور نہ تو ہی
تماشبین مداخلت اور مؤاخذہ کر سکتے تھے مبارزت کے روز عام منادی کرا دی جاتی [یا

---

[1] ایضاً علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص ۳۲۴ ص ۳۶۲

تھالی (نقرہ) پڑادی جاتی تھی جیساکہ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق دستور تھا] اور جب "غالب کے اڑیں گے پرزے" کی خبر پھیل جاتی تو تماشائیوں کے ٹھٹ شہر سے باہر لگ جاتے۔ عورتیں بھی بہر تماشا شریک ہوتی تھیں [حالاں کہ بقول سعدی : ؎

"ای تماشاگاہِ عالم روئی تو ٭ تو کجا بہر تماشا می روی"] اور

جب کوئی مضبوط و توانا جوان جان سپاری کر بیٹھتا تو عورتیں چلاتی ہوئی گھروں کو لوٹتیں کہ "خان بھائی جیتے۔ ہم ہارے"۔

جب اس قسم کے خونیں تماشے روز ہونے لگے تو کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری' والا معاملہ بن گیا۔ لہٰذا مبارزت کے قوانین و ضوابط مرتب کر دیئے گئے[1] اور جب یہ فن بن گیا تو اس میں وسعت پیدا ہوئی۔ تعلیم اور اکھاڑے قائم کئے جانے لگے جو جسمانی ورزش اور کرتب کے کنیل کانٹوں سے لیس رکھے جاتے تھے، سال بھر ان میں شاگردوں کو [خلیفے] عسکری تربیت دیتے تھے، اور ورزش و کرتب کے گر سکھاتے تھے۔ تعلیم سے ملحق ایک مدرسہ بھی ہوتا تھا۔ یوگ کی طرح ورزش اور کرتب کے ساتھ ساتھ تزکیۂ روحانی اور تہذیبِ نفس کے درس بھی دیئے جاتے تھے، اکھاڑے محرم میں اٹھائے جاتے تھے۔

یہ ادارہ شیعی عقائد کا مظہر تھا اور اس میں زیادہ تر اسی فرقہ کے شاگرد شامل ہوتے تھے مگر ہر مذہب اور عقیدے کے جوانوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ بیدر میں اس قسم کے چار اکھاڑے تھے جو اپنے جدِ بانی کے ناموں سے منسوب تھے مثلاً صدیق شاہ کا اکھاڑا اور نور خان کی تعلیم وغیرہ۔ ہر تعلیم یا اکھاڑے کا اپنا نشان ہوتا تھا مثال کے طور پر نور خان کا نشان شیر تھا۔ صدیق شاہ کا شیر یزداں اور کسی کا شرزہ ہوتا تھا[2]۔ یہ سارے حضرت علی کے القاب یا اوصاف تھے [اور حضرت علی کے علاوہ حضرت امام حسین کے نام کے نعرے بھی لگائے جاتے تھے]

۱: احمد نگر کی بادشاہت (انگریزی)

۲: دکن کے بہمنی (انگریزی)، ہارون خان شیروانی (مطبع حیدرآباد) ص ۲۱۸ (فٹ نوٹ) منتخب اللباب ج ۳ ص ۱۵۰-۱۵۷

نواں باب

کھونٹ کھونٹ کے لوگ

آبادیوں کی نقل مکانی ہر دور میں ہوتی رہی ہے، کبھی دولت کی حرص نے نو آبادیاں بسائیں تو کبھی سیاست کے جبر نے ہجرت کا راستہ دکھلایا۔ کونکن میں بھی نئے قبیلے اور گھرانے اپنے گھروند سے زندگی کی وسعت پذیر ساحلوں پر بناتے رہے ہیں جنہیں کبھی تاریخ کے دست استبداد نے توڑ ڈالا اور کبھی سیاست کے ریلے نے بہا دیا۔

گوا اور رتنا گیری کے قدیم باشندوں میں مہار، کولی[1] اور بھنڈاری قوموں

---

[1] برنیئر جو عہد شاہجہاں میں ہندوستان آیا تھا کولیوں کو بدترین ہندوستانی جاتی کہتا ہے۔ (اسی ذات کے کانجی کولی نے داراشکوہ کو ۱۶۵۵ء میں گجرات میں پناہ دی تھی)۔ مغربی ساحل بھی ادیباسیوں کو حقارت سے یاد کرتے تھے۔

میں نسلی قدامت کے کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں۔ کنبی اور کوکنی براہمنوں میں پارسیکاؤں کا نسلی اختلاط ماہر عمرانیات تسلیم کرچکے ہیں۔ جب دکھشن دیس سے پرسورام اپنا پرشو (تیشہ) لے کر کوکنی کے لئے کوکن کے کوہستانوں میں آیا تو اس کے ہمراہ چودہ[۱۴] مختلف براہمن گوتر یا گھرانے تھے جو غرق دریا ہو چکے تھے مگر جنہیں پرسورام نے نوجیون دیا تھا۔ براہمنوں میں ساٹھ قدیم قبائلی القاب رائج ہیں۔ چیلیوں کے نزدیک پرسورام ڈونگر کی وادی اور ساوتری اور دیوگرٹھ ندیوں کی گودی میں گوری رنگت اور بھوری (گھاری) آنکھوں والی اس سُندر جاتی نے پہلا ڈیرا ڈالا۔ یہ گربہ چشم قوم اپنی چالاکی اور ذہانت کے لئے مشہور ہے۔ ان کی بولی پر انُو سوَر (نون غنّہ) کا صوتی اثر غالب ہے۔ بھنڈاری، گابٹ، کھاروی اور کولی ساحلی قبیلوں کی سرکشی نے دو ریونوں کے دیس میں پلینی (۷۰ء)، بطلیموس (۱۵۰ء) اور پیری پلیس (۲۴۷ء) کو ان قزاقوں کے گڑھ "آری آک" کے بارے میں لکھنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان بحری ڈاکوؤں کی جانبازیوں نے اراولی پربتوں کے باسی چندربنشی اور سوریہ بنشی راجپوتوں کو بھی مہم بازی پر آمادہ کر دیا تھا۔ ریگستانوں کے یہ چاند سورج بھی سیہا کے پربتوں پر جھکنے لگے پھر ریگستان عرب اور صحرائے افریقہ کے حبشی مہم بازوں نے بھی "آری آک" میں اپنے جرگے بنا لئے۔ یہ حبشی بطلیموس کے نقشۂ ہند "میلی ڈی گیرس" میں بڑی تعداد میں آباد ہو گئے "میلی ڈی گیرس"۔ جیسے عربوں نے "جزیرہ" اور حبشیوں نے "حبشان" بنا دیا آج جنجیرہ کہلاتا ہے۔ خود بطلیموس کے ہم وطن یونن (یونانی)

۱: ڈاکٹر ولسن "ہندوستانی جاتیاں" (انگریزی)۔ ص ۲-۱۹

ساحلی علاقوں میں عرصۂ دراز سے بسے ہوئے تھے۔ نسطوری عیسائی کلیان اور سوپارہ میں تثلیث کے سائے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ یمن کے بنی اسرائیلی راجپوری میں گورے اور کالے "تیلیوں" میں تقسیم ہو کر تیل بیچنے اور نکالنے کا دھندا کرتے تھے۔ ان کے ربی "پانچوں توریت" کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ پھر اپنے خوشنما باغات، دلکش محلات اور مرمریں ایوانوں کو "ترانجد اسیر دیم" کہہ کر ایران سے پارسی مہاجر (۱) (۶۳۸ء) میں ہرمز اور دیگر میں پناہیں ڈھونڈھنے کے بعد (۱۰ء) میں سنجان (سلاعاروں کے ہمجان) اور بعد میں (نارگل۔ دھانو) میں لنگر انداز ہو گئے۔ سترھویں صدی تک ان کا پیشہ عام طور پر کاشتکاری رہا اس میں کھجور کی کاشت کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پرتگالیوں کے عہدِ عروج میں پارسیوں نے تجارت کی باگ ڈور سنبھالی جس میں انہوں نے بڑی شاندار کامیابیاں حاصل کیں (اور برطانوی عہد میں یہ قوم مغربی تہذیب و علوم اپنانے کے بعد حکمران طبقہ کے مساوی تسلیم کی جانے لگی، دولت و ثروت نے ان کے قدم چومے اور سخاوت نے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ یہ جہاں بڑے بڑے تجارتی اداروں اور جہازی شرکتوں کے مالک تھے۔ وہاں سینکڑوں خیراتی اداروں کے بانی بھی تھے)

سچ کہہ دوں اے برہمن!

ھند و ایران کے قدیم تعلقات کی داستانیں "دیومالا" سے اپنا رشتہ جوڑتی ہیں اور بعض ماہر عمرانیات (مثلاً دِ لفور ڈ وغیرہ) (۲) کو کئی براہمنوں کے خدوخال میں ایرانیوں کی

---

(۱): ہند کی معاشی حالت (ترجمہ) مورلینڈ (حیدر آباد) (۱۹۲۹ء) صہ ۲۸

(۲): ایشیاٹک ریسرچز۔ نواں باب صہ ۲۳۳

جھلکیاں دیکھتے ہیں۔ آگری اور بھنڈاری نسلوں میں بدیسی اقوام کا اختلاط گو اتنا گہرا نہیں ہے جتنا مرہٹوں میں ہے جو آج بھی پاٹھو (پہلوی) دلوی، مورے، شیلکے، جاگو (جادو) وغیرہ قدیم القاب کے نقاب میں اپنے نسلی امتزاج کے مختلف رنگ چھپائے ہوئے ہیں۔ بدیسی قوموں کے اثرات پلشے براہمن، پاٹانے پربھو، پانچ کلشی، چو کلشی، سوم ونشی کھتری اور دیگر دستکار جاتیوں میں بڑی حد تک نمایاں ہیں[۲] شینوی۔ گووا میں آباد تھے۔ مگر یہ وَنگا (بنگال) دیس کے باسی تھے۔ جیسا کہ ان کے بنگالی لب و لہجہ میں ڈھلی مرہٹی بولی سے اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں احتراماً "باپ" کہتے ہیں جو بنگالی "بابو" کا مخفف ہے۔ پرتگیزوں کے استبداد نے انہیں مالوَن اور دیگر ضلعے کی طرف ڈھکیل دیا تھا[۳]۔

پَرَبھو :

ابن الاثیر کی یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب محمود غزنوی نے سومناتھ پر (۱۰۲۵ء) میں حملہ کیا تو انھلواڑہ کی سلطنت سے مہاجر گھرانے سمندری راستے سے کوکن

---

[۱]: ایک مرہٹی کہاوت पाचकळशी आणि कोण म्हणेल आळशी سے اندازہ ہوگا کہ یہ براہمن طبقہ محنتی مشہور ہے۔

[۲] تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ ۱ ۔ ص ۶۲-۶۱

[۳]: رتناگیری گزیٹیر۔ ص ۱۱۶

میں پناہ لینے کے لئے آگئے۔ ان کا سالارِ کارواں انہلواڑہ کا ایک راجکمار بمب تھا۔
تیرہویں صدی کے دوران میں جب گجرات کی سولنکی سلطنت کے ستون اکھڑنے لگے
تو پاٹانے یا پاٹھارے (گری ہوئی) پربھو قوم اپنے القاب کی معنویت کی حامل بن کر اپنے
مرتبوں سے نیچے "گر پڑی" یہ پاٹھارے پربھو بمبا کین کی روایت کے مطابق [اور ابن الاثیر
کے بیان سے مختلف] بمب راج کمار کے ہمرکاب دیگر فوجی فرقوں کے ساتھ دمن اور
تاراپور سے گذر کر "بردبیت" کے اجاڑ جزیرے میں جا بسے۔ مقامی کولی اور واری
باشندوں کو زیر کر کے یہ مہاجر گھرانے کوکن کی ساحلی بستیوں پہنچے۔ تاراپور اشیری
کلوہ، مہائم، سالسٹی اور بردبیت میں پھیل گئے۔ بمب (بھیم) راجہ نے بردبیت
کے "ریگزار جزیرے" کو جہاں سے سامنے ممبئی کے جزیرے تک ببول پیڑوں
کے خارزار پھیلے ہوئے تھے۔ ناریل کی باڑیوں سے بھر دیا۔ بردبیت کا نیا نام مہی کاوتی
تھا۔ پھر جب دلی میں ترک غلاموں نے سلطنت کی بنیاد ڈالی کوٹ ڈنگر (گجرات) کے
ایک ملک نے بھیم راجہ کے گھرانے کے ہاتھوں سے مہی کاوتی اور سالسٹی جزیروں
کو چھین لیا۔ اور پاٹانے پربھوؤں نے سپہ گری کا آبائی پیشہ ترک کر کے ترکوں کی
کی بندگی میں تلواریں پھینک کر قلم اٹھا لیا۔ اور ملیکھ جاتی کا روپ دھارن کر لیا۔
ان پربھوؤں کی مرہٹی گجراتی آمیز ہے۔

کائستھ پربھو قبیلے بھی اودھ پوری سے اپنا ناتہ توڑ کر اور "ہندو دیومالا"
سے اپنے گوتر کا رشتہ جوڑ کر دکن کے راستے اس دیار میں داخل ہوئے۔ کلوہ مہائم

---

(۱): ایلیٹ "تاریخ ہندوستان" (انگریزی) ج ۲ ص ۲۶۹-۲۷۴؛ تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳ ح ۱ ص ۹۱

اور وسئی میں ان کے کئی کٹمب زندگی کے دن کاٹنے لگے بندرگاہوں کے جنجان جزیرے میں راجپوری کی بندرگاہ میں ۔ تالکوکن کی آخری بستی دمن میں اور الہاس کے کنارے آباد کلیان میں کاستھوں کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں اور جب انہوں نے اپنی ذہانت اور لیاقت کا دفتر کھولا تو مسلم حکومتوں میں وزارت کے اعلیٰ مرتبت تک رسائی حاصل کر لی (حبشیوں کا ایک وزیر پربھو تھا ۔ شیواجی کائستھ قوم کی ذہانت کا معترف تھا[1]) گو کئی حکومتوں میں وہ صدیوں پہلے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہ چکے تھے خصوصاً شری استھانک کے سلاھار راج میں پربھو ۔ پردھان بن چکے تھے گجراتی پربھو اپنے دیس کے پلشے اور پانچ کلشی براہمنوں سے تال میل رکھتے تھے ۔ مگر کوکنشت براہمن جاتی اور پربھو جاتی کے درمیان سماجی رقابت کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی ۔ اور آج سے ایک صدی ۔۔۔ قبل بین (قلابہ) میں نہ تو کوئی کائستھ مہادیو کے مندر میں قدم رکھ سکتا تھا اور نہ کوئی براہمن بھکشو (بھٹ) اُن سے بھکشا اور دان لے سکتا تھا ۔ اس نفاق نے پربھوؤں میں ایکتا کا وہ جذبہ پیدا کر دیا تھا جو مرہٹی کی ایک کہاوت کے مطابق صرف "کوؤں اور مرغوں میں نظر آتا ہے[2]"۔

مسعودی جب ۹۱۵ء میں کوکن آیا تو سارے ساحلی علاقے میں چیمور تک لاری بولی مروج تھی ۔ یہ لاری دراصل ساحلی گجراتی تھی ۔ اور جسکے بولنے والے تجارتی سلسلے میں تالکوکن میں آباد ہو چکے تھے ۔ اِن میں گوجر بنئے [خاص طور سے لاڈ بنیے جن سے غالباً یہ لاری یا

۱ : تھانہ گزیٹیر : ج ۱۳ ۔ ح ۱ صفحہ ۸۰

۲ : قلابہ گزیٹیر : صفحہ ۸۲ ۔ مرہٹی میں وہ کہاوت یوں ہے

काक
कुक्कुट. कायस्थ जातीचे पराचक

لاڈی منسوب ہے] تھانہ میں بس چکے تھے اور بعد میں آنے والے۔ گجرات اور کھمبایت کے جین جوہری اور بیوپاری بھی تھے جن کی بڑی تعداد دابھول اور چیؤل میں آباد ہو چکی تھی [جین مت کسی زمانے میں رتنا گیری کا "دیس دھرم" رہ چکا تھا۔ پانجر اپول کا تصور جین مت کی اہنساوادی سے پیدا ہوا] زکریا قزوینی نے بھی "اہنساوادی" اور سبزی خور جینیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ جین بنیئے چاول تیل اور روئی کی تجارت کرتے تھے۔ پرتگیزی عہد میں یہی ہیرے جواہرات کی سوداگری کرتے تھے۔ حساب کتاب (ریاضی) میں یہ بنیئے اتنے مشاق اور ہوشیار تھے کہ کوئی ہندوستانی یا پرتگیزی ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ہندو، جین اور گجراتی دانی ساحلی کوکن کی معیاری معاشرت میں ڈھل چکے تھے۔ گو ان میں سے اکثر گوبر سے لیپے ہوئے اور اسی سے نقش و نگار بنائے ہوئے کچے مکانوں میں[۱] رہتے تھے۔

قدیم مسلمان:

"ظہورِ اسلام کے بعد گوواکے کدمب اور تھانہ کے سلاہار راج میں عرب و عجمی مسلمان کوکن میں آباد ہو چکے تھے۔ صیمور اور سوپارہ کے علاوہ: دابھول، چیلون، باکوٹ اور راجہ پور کی قدیم بستیوں میں ان کے محلّے بس گئے تھے۔ چالوکیہ گھرانے کے راجہ جیہ کیشی (اول) نے مسلمان عربوں کو بڑی مراعات دے رکھی تھیں۔ گہلادیو (دوم)، جو کدمب راج کا "گنا" اور ساتوں ملایہ" کا ڈگ وجیہ تھا، اپنے ایک محسن محمود تاجی کو اپنا مشیر بنا لیا تھا جس نے

---

[۱] سیزر فریڈرک کا بیان دیکھئے - Hakluyt's Voyages, II p. 344

راجہ کو اتنی دولت دی تھی کہ کسی اور بادشاہ کو نصیب[1] نہ تھی۔ بہمنی دور کے آغاز میں ہنوور اور وجیانگرم کے علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے گوداوری کے نواح میں ایک نو آبادی کی نیو ڈالنے لگ گئے تھے۔ پل کے دیہات میں یہ بستی اتنی بڑھی کہ پرتگیزی عہد میں قدیم گووا کا حصہ بن گئی لیکن جب فرنگی استبداد کی سیاہ کاریاں بڑھیں تو بہت سارے قبیلے بھونڈی، کلیان، مہائم اور تھانہ ہجرت کر گئے۔ حجاز اور حضرموت کے سادات و شیوخ اپنی نسبی فضیلت اور دینی مرتبت کے سبب عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے[2]۔

---

۱ : کرمپ کل۔ جارج مورے۔ ایس (بمبئی ۱۹۳۱ء) ص ۱۷۲

۲ : محترم ڈاکٹر نائک کے توسط سے رتناگیری کے ایک قاضی خاندان کو جو چند اسناد دستیاب ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ رتناگیری کی معمولی بستیوں مثلاً بندر ابراہیم پٹن (قصبہ ہرچیری) وغیرہ میں بھی قاضی اور پیش امام عادل شاہی فرمان کے بموجب مقرر کئے جاتے تھے۔ ۱۰۰۹ء کے ایک نقل فرمان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قاضی ابراہیم بن قاضی احمد اور شریعت پناہ قاضی بابا بن قاضی محمد۔ بندرِ مذکور کی ایک مسجد میں پیش امامی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کے عوض انہیں ایک لاری یومیہ بموجب فرمان عطا ہوا تھا۔ یہ وظیفہ وزیر حکومت (عادل خانی) خان محمد اور علیا مراتب بڑی بی" (بڑی بی جو خان معزالیہ کی رشتہ دار تھی) کی سفارشات سے عمل میں آیا تھا۔ اسی خاندان کے ایک وارث "قاضی اسماعیل ولد یوسف باشندہ ابراہیم پٹن تعلقہ رتناگیری" کو "بندر ہرچیری محل ہرچیری تعلقہ مذکور ضلع رتناگیری" کی خدمت قضات پر "بحکم گورنر کونسل معین و مقرر" کیا گیا تھا۔ مورخہ دسمبر ۱۸۳۶ء (اصلی سند۔ انگریزی۔ فارسی اور مرہٹی میں ہے)

(عادل شاہی دَور میں قضات کے آبائی عہدہ پر سرفراز خاندانوں کی
سندِ قضا اور صرفِ مایحتاج کے طور پہ دی گئی یومیہ کی رقم برطانوی عہد
تک برقرار رکھی گئی تھی) ۔ نوائطیوں ہی میں سے پیش امام کا تقرر ایک لاری ۔
(عادل شاہی سکّہ) یومیہ پہ بموجب فرمان ہوتا تھا۔ نظام الملکی دَور میں کئی نوائطی
امراء سفارتوں سے متعلق رہ چکے تھے۔

کوکن (جزائر بمبئی، کلابہ اور تھانہ اضلاع) کے دکھنی مسلمان (جو تقریباً
نومسلم تھے) مسلم دورِ حکومت میں سات فرقوں میں منقسم تھے: عطّار، باغبان،
دھوبی، قصّاب، منیار، رنگریز، اور تنبولی: ان کی زبان دکھنی ہندوستانی۔
(دکھنی ھندوی) ؛ مرہٹی اور ہندوی سے مرکب تھی۔ بعض لباس اور رسوم
میں مرہٹوں کی تقلید کرتے تھے[1]۔ قدیم گلبرگہ (احسن آباد) میں مومن پورہ
کا قدیم محلہ اپنے آثار باقیہ [مسجد کلاں مومن پورہ] اور نام "مومن" کے
سبب اس مہاجر قبیلے کے قدیم بود و باش کی طرف اشارہ کرتے ہیں احسن آباد
کی قدیم صنعت پارچہ بافی بھی اس برادری کے آبائی پیشہ نوربافی سے تانے
بانے جوڑے ہوئی ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مومن بنکر بھی شمالی کے نو واردوں اور نوآبادکاروں کے
ہمراہ یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے قبولِ اسلام کا زمانہ بھی تقریباً تاسیس سلطنتِ دلّی
سے مطابقت رکھتا ہے۔ جیسا کہ عہدِ التمش کے اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ کس طرح
نومسلم نورباف وزارت کے عہدے تک پہونچ گئے تھے۔ جنید الملک اس کا وزیر کیا
بنکر خاندان سے تعلق رکھتا تھا[2]۔

---

[1]: تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ خ۔ ص ۲۱۶۔ ص ۲۳۵
[2]: واقعاتِ مملکتِ بیجاپور۔ ص ۴۵۔ ص ۵۱۱
[illegible]

اسماعیلی : بوہرے اور خوجے :

بنو امیّہ کے عہد میں ملتان اور سندھ اسلامی مملکت کے صوبے بن چکے تھے۔ بعد میں قرامطیوں کا غلبہ ہو جانے کے سبب اس خطّے کی مذہبی اور سیاسی تاریخ نے پلٹا کھایا۔ تسنّن نے شارع سے انحراف کر کے تشیّع کا راستہ اختیار کر لیا۔ اور شاہراہِ شیعیت پر قرامطی اور اسماعیلی داعیوں کے کارواں نظر آنے لگے۔ انہوں نے ہی اس خطّے میں اشاعت دین کی سب سے منظم کوششیں کی تھیں۔ ان کے داعی نویں صدی عیسوی ہی میں قاہرہ اور عراق سے ہندوستان آنا شروع ہوئے۔ ملتان اور منصورہ (موجودہ بھکّر) پر شیعیت کا غلبہ ہی محمود غزنوی کے لئے اس علاقے پر قبضے کا بہانہ بن گیا۔ مگر یہ غلبہ غزنوی سحابِ گذراں تھا۔ کیوں کہ حسن بن صباح قلعۃ الموت سے آندھی بن کر سارے وسطی ایشیا پر چھا چکا تھا۔ شیخ الجبال یا "ساحرِ الموت" کی ساحرانہ اور رومانی شخصیت
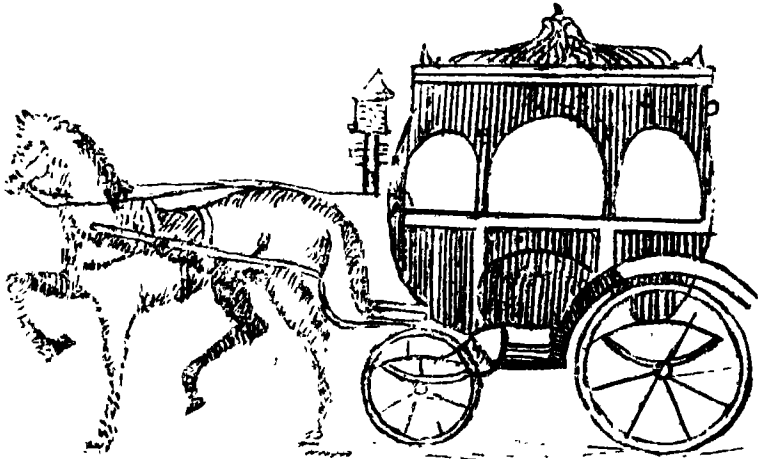
۱؎ : ضیاء الدین برنی۔ تاریخ فیروز شاہی۔ دورۂ التتمش

۲؎ : چشمۂ کوثر (ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ) شیخ محمد اکرم (دہلی ۱۹۴۲ء) ص ۵-۲۵۳

نے ہزاروں فدائیوں کو برگ حشیش کا عرق پلاکر "حشیشین" بنا دیا تھا اور برسوں تک نامور سیاسی شخصیتیں ان کے ہاتھوں موت کا ذائقہ چکھتی رہیں۔ ان میں سلجوقیوں کا مدبر سیاستدان حسن بن صباح کا ہم مکتب وزیر نظام الملک طوسی بھی تھا جس نے اپنے سیاست نامہ میں انہیں "ملاعین کا عدہ" لکھا ہے۔ سلطان محمد غوری جس نے ۱۱۷۵ء میں دوسری دفعہ ملتان۔ اسماعیلیوں کے قبضہ سے آزاد کرایا تھا۔ اُسے بھی ایک فدائی کے ہاتھوں اپنی جان فدا کرنی پڑی۔ اسلامی حکومت کا استحکام آنے والے دور میں اسماعیلی تحریک کے لئے زوال کا باعث بن گیا۔ اور جب تسنن دوبارہ حاوی ہوا تو۔ اُوچ اور ملتان کے تبلیغی مراکز بھی اپنے محوروں سے دور رہ گئے۔ کیونکہ اسماعیلی مبلغین اور مہاجرین گجرات اور کچھ کی طرف کوچ کر گئے۔ اسماعیلی مبلغوں کی پرامن تبلیغی کوششوں سے سب سے پہلے لاہور کی لوہانہ جاتی نے اسلام قبول کیا۔

مستنصر باللہ فاطمی خلیفہ کے ۱۰۹۴ء میں انتقال کے بعد اسماعیلی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ خلیفہ کے بھائی المستعلی کے جانب دار بوہرہ بن گئے اور جو اس کے بھائی نزار کے طرفدار تھے۔ وہ خوجہ کہلانے لگے [غالباً یہ تیموری عہد کے خواجہ کا مخفف ہے[1]] اس جماعتی اور عقائدی تفریق سے قبل زہ اولین مبلغین جو شیعیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ اُن پر دونوں جماعتوں نے اپنا حق جتلانا شروع کر دیا" بعض بوہروں کی روایت ہے کہ ہندوستان میں ان کے مذہب کی اشاعت سب سے

---

[1] : دیکھئے مشہور زمانہ روسی مورخ بارتھولڈ کی تصنیف : اُلغ بیگ : ج ۳ انگریزی ترجمہ۔ ذی منورسکی۔ لائیڈن ۱۹۵۸ء

پہلے عبداللہ یمنی نے کی جو ۱۰۶۷ء میں کھنبایت آئے لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ بوہروں کے پہلے مبلغ ملّا علی تھے جنہوں نے ۱۱۳۷ء میں وفات پائی اور جن کا مزار کھنبایت میں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔ بوہروں کو یمن سے خاص تعلق رہا ہے۔ اور عجب نہیں کہ بہت سے بوہرے عربی النسل ہوں[1] "یہ امر مسلّم ہے کہ اسی زمانہ (۱۰۶۷ء) میں شیعہ تاجروں کی بوہرہ برادری کے مذہبی پیشوا یمن سے گجرات آئے اور یہیں آباد ہو گئے اور نورالدین یا نورستاگر (۱۱۴۳–۱۰۹۴ء) نے کنبی، کھروے اور کولی اقوام کو گجرات میں مسلمان کیا۔[2] اس نورست گرو۔ یا نورستاگر یا نورساگر کو جنہیں بارہویں صدی میں قلعہ الموت سے گجرات بھیجا گیا تھا۔ بوہرہ روایت اپنے داعی مولائی نورالدین سے خلط ملط کرتی ہے۔ بہرحال ایک مبلغ نورالدین کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ جو ۱۰۶۷ء میں کھنبایت آئے۔ اور دکن میں برسوں اشاعتِ دین کرنے کے بعد اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔[3]

نورستاگر کے زمانۂ حیات کی تصدیق بوہرہ روایت کے علاوہ نوساری میں ایک خوجہ داعی کے مقبرے کے کتبہ سے بھی ہوتی ہے جس میں نورست گرو کا زمانہ ملل

---

[1]: چشمۂ کوثر۔ ص۲۵۴۔ ملّا محمد علی کو پیر پیر داز بھی کہتے ہیں۔ ان کا مزار کھنبایت میں آج بھی بوہروں کی مشہور زیارت گاہ ہے

[2]: اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر۔ ڈاکٹر تاراچند (مترجم چودھری رحم علی الہاشمی) (دلی ۱۹۶۶ء) ص۱۰۱

[3]: "بوہرہ۔ ایک مسلمان گجراتی فرقہ" (انگریزی) ڈاکٹر شمعون لوکھنڈوالا۔ مطبوعہ: STVDIA ISLAMICA (پیرس ۱۹۵۵ء) ص۱۱۹

۱۰۹۴ء درج ہے ۔ اور یہ زمانہ سدھ راج سولنکی (۱۰۹۴ء-۱۱۴۳ء) کے راج کا تھا جس کی مسلم دوستی اور مذہبی پاسداری کا ذکر محمد عوفی بھی کرتا ہے ۔ سولنکی راج سے اسماعیلیوں کا تعلق بہرحال قابلِ تسلیم حقیقت ہے ۔ اس کی نوعیت چاہے اس حد تک مبالغہ آمیز روایت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو جس کے مطابق سدھ راج جے سنگھ سولنکی راجہ اس کا منتری اور رکھاریاں کا جین گرو — تینوں حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے ۔ کاٹھیاواڑ کے بعض بوہرہ گھرانے اپنا سلسلۂ نسب بھارمل سے جوڑتے ہیں (اس قبیلے میں بوہروں کے تین نامور ولی گذرے ہیں[1])

گجرات کی مظفر شاہی حکومت میں جب تسنن کا تسلط تشیع پر دوبارہ ہوا تو کئی بوہرہ قبیلے شاہراہِ شریعت پر لوٹ آئے ۔ اس رہبری میں صوفیائے کرام اور سنی مبلغین کی کوششوں کا زیادہ دخل تھا ۔ شیعہ اور سنی بوہروں کی تفریق سلطان احمد شاہ گجراتی (۱۴۱۱ء-۱۴۴۲ء) کے عہد میں زیادہ نمایاں ہو گئی ۔ اس نے سیاسی مصلحت اور اقتصادی ضروریات کے پیشِ نظر بوہرہ جماعت کو پیشوں کی بنیادوں پر بانٹ دیا ۔ سنی بوہرے جن میں نو مسلموں کی تعداد زیادہ تھی "مولائے اسلام"[2] کہلانے لگے ۔ یہ زراعت پیشہ تھے مگر چونکہ راجپوتی خون رگوں میں دوڑ رہا تھا اس لئے

---

[1] : ڈاکٹر شمعون لوکھنڈ والا ۔ مقالہ ص ۱۱۹

[2] :۔ آج کل یہ "مولائے سلام گراسیہ" کے القاب سے موسوم ہیں ۔ داول شاہ (م ۹۰۸ھ) نے جو سلطان محمود بیگڑہ والی گجرات کے امراء میں تھے قوم گراسیہ کو مشرف بہ اسلام کیا تھا ۔ (چشمۂ کوثر ۔ ص ۲۵۳-۲۵۲)

پیشۂ آبائے سپہ گری پر ناز کرتے تھے۔ شیعہ اسماعیلی "دِہا دار" کے بہت سارے راستوں "بہوراہ" پر چلنے تو بہوراہ سے بوہرہ بن گئے۔[1]

سولہویں صدی سے بوہروں کی جماعتی تقسیم زیادہ واضح ہوگئی۔ ۱۵۳۵ء میں جعفر شیرازی کے حکم سے سنی بوہروں نے اپنی شیعہ برادری سے سماجی تعلقات یکسر منقطع کر لئے۔ عقائدی تفرقے کے دھاروں نے ان کے درمیان اور کئی خلیجیں حائل کر دیں۔ خود شیعہ بوہروں میں "جنگ اعتقاد و ملت" نے کئی صفیں کھڑی کر دیں۔ پیشوائی کے دعوے نے ان کے درمیان سلیمانی، داؤدی علیہ، ناگوشیعہ اور ہتیہ فرقہ بندیوں کی دلواریں چن دیں۔ مجموعی طور سے یہ یمنی اور ہندوستانی اقتدار کی جنگ تھی۔ گو داؤدی جماعت کے بیشتر داعیان یمنی حسب و نسب سے تھے مگر اکیاونویں داعی مطلق کے عہد سے ہندوستانی اقتدار مستحکم ہوگیا۔ داؤدی بوہرے داؤد بن قطب شاما اور سلیمانی، سلیمان ابن یوسف کی جانشینی کے قائل ہیں سلیمانیوں کے مرشدین سے تعلق رکھتے ہیں۔[2]

ہندوستانی ملّائیت کے پیروکاروں کی داؤدی جماعت زیادہ منظم اور متمول تھی۔ داعی مطلق "ملّاجی" تمام سماجی، مذہبی اور مالی معاملات کا "قطب" ہوتا تھا جس کے

---

[1]: بوہرہ کا مشتق "بہوراہ" (بیوپار) کے علاوہ بعض ہندو جاتی "بوہرہ" بتلاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے لوہے کا سامان، ظروف ٹن کے برتن۔ لالٹین، آئینے، ٹن اور سوتی رسیاں۔ تاگے کھیلے اور کاغذ کے بیوپاری رہے ہیں۔ (اقتباس گزیٹیر ۱۸۸۳ء) بھینڈی اور کلیان میں مٹی کا تیل بیچنے کے علاوہ انہوں نے لوہے کی بالٹیاں اور پیتل کے کنستر بنانے شروع کر دیئے تھے (تھانہ گزیٹیر۔ ج ۳۔ خ۔ ص ۲۴)

[2]: ڈاکٹر شمعون۔ ص ۲۴-۱۲۲

الاوگرد وہ سارے سیّارے گرم سفر رہتے تھے جنہیں مشائخ کہتے تھے۔ مشائخین عربی زبان میں مہارت اور اسماعیلی علوم پر قدرت رکھتے تھے۔ اور خود داعی مطلق کے زیرنگرانی تربیت یافتہ (یا سورت کی بوہرہ درس گاہ جامعۃ السیفیہ سے سندیافتہ)[1] ہوتے تھے۔ عامل جسے بھائی صاحب کے علاوہ "میاں صاحب" بھی کہتے تھے مختلف قصباتی آبادیوں میں جہاں بوہروں کی کافی تعداد بود و باش رکھتی تھی۔ جماعت کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس کی اجازت سے اور اسی کے ہاتھوں سے شادی بیاہ کی رسمیں انجام دی جاتی تھیں۔ یہی مُلّا صاحب، قاضی اور امام بھی ہوتا تھا۔ "مُلّا" (جو عرفِ عام میں بوہرہ کا خطاب بن چکا ہے) مکتبوں میں درس دیتا تھا مگر یہ تدریس صرف عربی زبان اور اسماعیلی علوم تک محدود رہتی تھی۔ فلسفۂ اسماعیلیہ کا درس اسماعیلی تحریک کے زمانے ہی سے ہمیشہ "تقیّہ" کے پردۂ راز میں رکھا جاتا تھا جیسا کہ "کتاب الاظہار" کی ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے جن کی رو سے اسماعیلی کتب نصاب کا اکتساب (جس کی طویل فہرست اس میں شامل ہے) صرف روحانی پیشوا کی اجازت سے اور خاص قاعدے سے کیا جا سکتا ہے (یہاں تک کہ دعائم الاسلام کا درس بھی) ان پابندیوں نے علوم اسماعیلیہ کے اکتساب کو محدود اور مخصوص کر دیا تھا) داعی مطلق جامع علوم اور منبع روحانیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس پر کلّی اعتقاد ہی ہر بوہرہ کا ایمان بن چکا تھا[2]۔ جماعتی تنظیم کا ایک عہدہ دار صاحب الدعوہ بھی ہوتا تھا جو داعی مطلق

---

(۱) ڈاکٹر شمعون ص ۱۲۰۔ یہ درسگاہ تینتالیسویں داعی عبدالعلی سیف الدین نے ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں قائم کی تھی۔

(۲) ڈاکٹر شمعون۔ مقالہ ص ۱۴۰

کے خاص نمائندے کی حیثیت سے بوہرہ آبادیوں سے زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر" جمع کرتا تھا۔ (بوہروں کی گھریلو بولی گجراتی کا ایک خاص لہجہ ہے) "صحیفۃ الصلوٰۃ" جو گجراتی اور عربی زبان کی تصنیف ہے داؤدی بوہروں کی کتاب الدعوات[1] ہے۔

بوہروں میں چونکہ نومسلموں کی خاصی تعداد شامل تھی اسی لئے قبائلی رسوم کے آثار باقیہ (آج بھی ناپید نہیں ہیں) گو بعض ہندوانہ رسموں کے وجہ جواز کی تاویل اسماعیلی تعلیمات کے تقیہ اور مصلحتوں کی روشنی میں کی جاتی تھی[2] لیکن دین کے معاملات میں دنیاداری غالب تھی۔ (چنانچہ وراثت کے معاملے میں شرعی پابندی سے گریز کیا جاتا ہے[3]) مگر بعض مذہبی فرائض کی ادائیگی میں یہ آج بھی عام مسلمانوں سے زیادہ متشرع اور متقی واقع ہوئے ہیں۔ مسکرات سے آج بھی پرہیز ہے پہلے سماع سے بے بہرہ تھے (مگر آج بہرہ ور ہیں) پابند صوم و صلوٰۃ ہیں لیکن چونکہ اکیسویں[21] امام۔ طیب ابھی تک روپوش ہیں، اسی لئے امام غائب کی وجہ سے جمعہ اور عیدین کے خطبوں کو منسوخ کر دیا گیا

۱: تھانہ گزیٹیئر۔ ج ۱۳۔ ح ۱ ص ۲۲۴-۲۲۳ (فٹ نوٹ) داؤدی بوہرہ روح کے تناسخ کے قائل ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق روح کا محاسبہ اور مجاہدہ کیا جاتا ہے، اس کی تہذیب ہوتی ہے اور جب تکمیل ترکیب ہو جاتی ہے تو یہ علم الہٰی کے علو مرتبت کو پہنچ جاتی ہے اور پھر کسی داعی یا امام میں حلول کر جاتی ہے۔ بوہرہ میت کے ہاتھ میں دفناتے وقت ایک کاغذی سفارشنامہ تھما دیا جاتا ہے جس میں آنحضرتؐ حضرت علی اہل بیت۔ اسماعیلی اماموں قائم آخرالزماں اور موجودہ داعی اور مشائخین کا واسطہ دے کر اس کے لئے استغفار کی جاتی ہے (ایضاً)، ۲: ڈاکٹر شمعون ص ۱۳۱

۳: حقیقت کوثر ص ۵۵-۲۵۴ ۱۹۳۷ء کے قانون شریعت کے نفاذ سے پہلے سنی بوہروں اور خوجوں کے دیوانی مقدمات قوانین عرفی کے مطابق طے کئے جاتے تھے۔

ہے اور "عوض الخطبہ" نمازوں میں چند رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ امام کے بغیر منبر کا بھی گذر نہیں چنانچہ نماز پڑھانے والا مقتدیوں سے مخاطب ہونے کی بجائے قبلہ رو ہو کر امام غائب کے حاضر ہونے کی دعا کرتا ہے۔ (اثنا عشری بھی نماز مغرب میں اسی لئے تعویق کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق مہدیؑ منتظر قائم آخر الزماں کبھی دونوں وقت ملتے اسرار کے دھندلکوں کو چیر کر ان سے آملیں گے)، ذی الحجہ کی اٹھارویں کو عید الغدیر منائی جاتی ہے۔ کیونکہ اسی روز شیعہ عقیدے کے مطابق آنحضرت صلعم نے حضرت علی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ محرّم کے مہینے میں یہ اپنے جماعت خانوں (یا امام باڑوں) میں مجلس عزاء منعقد کرتے ہیں۔

خوجے: دوسرا اسماعیلی فرقہ ہے جو ~~۱۰۹۴~~ ۴۸۷ھ میں مستعلی اسماعیلیوں سے منقطع ہو کر نزاری بن گیا۔ ہلاکو خان کے سیاہ اعمالنامے میں نیکو کاری کی یہ سنہری سرخی

لہ: بوہرہ آبادی میں ملّاجی شادی بیاہ کی رسمیں انجام دیتا ہے۔ ختنہ کرتا ہے اور میت کے آخری رسوم اسکے ہاتھوں طے پاتے ہیں۔ جماعت سے جو رقم ملتی ہے وہ بڑے ملّاجی کو سورت بھیج دیتا ہے (تھانہ گزیٹیر سابق ص ۲۴۷) انیسویں صدی کے اواخر تک قلابہ میں خوجوں اور بوہروں کی کوئی مسجد تھی صرف کلیان تھا اور بھیمڑی میں موجود تھیں۔ بمبئی اور مضافات مثلاً بھیمڑی وغیرہ کی مسجدیں اور جماعت خانے زیادہ تر ملّا قادر حسین کربلائی کے جذبہ تعمیر کی رہین منت ہیں۔ بھیمڑی کے نو وارد نوربا قوں نے جو اعظم گڑھ اور مبارکپور سے ہجرت کر کے روزگار کی تلاش میں آئے تھے جب ملّاجی سے ملے تو گویا اثنا عشری تھے مگر ۱۲۹۱ء میں "حیدری مسجد" ملّاجی نے ان کے لئے بنوا دی دیکھئے "ہدایت پرکاش" (گجراتی) (مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۰ء) ۔ ص ۹۷ - ۸۵

بھی نظر آجاتی ہے کہ اُس نے باطنیوں کو برباد کر کے دریدہ بدعت و الحاد کی لحد کھود ڈالی تھی"۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہبی اور سیاسی تحریک کا ہلاکو کے ہاتھوں استیصال راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک اسی کا قابلِ تحسین اقدام تھا[1]۔ جب ۱۲۵۵ء میں حسن بن صباح کی تعمیر کی ہوئی جنت جو چارۂ افسردگی دل کرتی تھی۔ ویران ہو گئی تو قم کے قریب کہنگ اسماعیلیوں کا مرکز بن گیا جس کی خاک سے جعفر بن صادق کے پسر زادے اور اسماعیلیوں کی تحریک کے محرک "اسماعیل" اٹھے تھے۔ ہندوستان میں ملتان اوچ اور منصورہ اسماعیلیوں اور قرامطیوں کے تبلیغی اور سیاسی مراکز بہت پہلے رہ چکے تھے۔ اسماعیلی مبلغین گجرات کے ساحلی علاقوں میں گیارہویں صدی سے تبلیغی کوششیں کر رہے تھے اور ۱۳۴۲ء میں جب ابن بطوطہ کا گذر کھنبایت میں ہوا تو اُس نے "خوجہ بوہروں" کی ایک بڑی تعداد کو آباد پایا، گو بعض خوجے گھرانے ایرانی النسل ہیں مگر بیشتر تعداد نومسلموں کی ہے جنہوں نے خوجوں کے سب سے مشہور پیر شیخ صدرالدین کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ پیر صدرالدین نے اپنے فرقہ کے طریق تبلیغ کی تقلید میں اپنا نام ہندوانہ رکھا تھا۔ واسطہ چونکہ ہندوؤں کی نچلی جاتیوں سے تھا اسی لئے پیر صاحب نے اپنی تعلیمات میں ہندوانہ عقائد کو اس طرح سمو دیا تھا کہ اسماعیلی مذہب۔ ہندو دھرم کا "اوتار" بن گیا چنانچہ پیر صدرالدین کی کتاب "دس اوتار خوجہ قوم کی مقدس کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ جس میں رسولِ اکرم صلعم

---

[1]:۔ ڈاکٹر مومن محی الدین ۔ مقالہ "علاؤ الدین عطا ملک جوینی" مطبوعہ۔ مجلہ علوم اسلامیہ۔ (علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء) ۔ ص ۳

برہما۔ حضرت علیؑ کو وشنو اور حضرت آدم علیہ السلام کو شیو سے تعبیر کیا ہے۔"[۱]

خوجوں کی جماعتی تنظیم دوسری جماعتوں اور برادریوں کے لئے ہمیشہ سے لائق تقلید رہی ہے۔ اور ان کا تمول قابلِ رشک تھا۔ اس لئے کہ یہ تاجر پیشہ[۲] جماعت تھی۔ نیز بوہروں کی طرح خوجے بھی ہمیشہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود مقدم رکھتے ہیں۔ ایثار و خلوص اور قومی مفاد کے جذبے دراصل اسماعیلی تعلیمات، تحریک اور تقیہ کی دین ہیں۔ دنیاوی جاہ کی چاہ تھی جس نے کچھ کی لیوکنبی جاتی کو نئے دین سے روشناس کرا کے اسے خوجہ جماعت میں شمولیت کی راہ دکھلا دی۔ یہ نیا فرقہ مومنہ کے نام سے موسوم ہوا[۳] (اس کا درجہ خوجہ جماعت میں کمتر تسلیم کیا جاتا ہے) خوجے گھروں میں کچھی لوہانی بولتے ہیں۔

---

[۱]: نقل بیان از چشمہ کوثر ص۲۵۶ حضرت علیؓ کو وشنو کا دسواں اوتار جسے ہندو کلنکی سے تعبیر کرتے ہیں کہا گیا ہے۔ تھانہ گزیٹیئر، ایضاً ص۴۲ - ۲۴۱ قلابہ گزیٹیئر ص۸۵

[۲]: قلابہ اور تھانہ کے اضلاع میں خوجے عموماً (انیسویں صدی تک) پرچون فروش تھے۔

[۳]: مومنہ سید امام الدین عراقی کے پیروؤں کو بھی کہا جاتا ہے۔ سید صاحب کا مزار احمد آباد سے قریب موضع کرمنہ میں موجود ہے۔ مومنہ جماعت کا انتظام سید صاحب کے جانشین کے ہاتھ ہے۔ ان کا کاکا کہتے ہیں جو کوئی ہندو ہوتا ہے (چشمہ کوثر ص۴۹ ۲۴۸) تھانہ گزیٹیئر (ج ۱۳ خ ص۲۲۵) سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۷ میں بھیمڑی (اور تھانہ) کے شیعہ نوربانی (غالباً وہی جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے) کے تقریباً تیس گھرانوں نے خوجہ جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اور پانچ سال بعد علی الاعلان اس کا اعتراف کر دیا تھا۔ اس زمانے کے آغا خان (آغا علی شاہ کے والد) نے ان کے لئے ایک مکھی مقرر کر دیا تھا اور ایک علاحدہ مسجد تعمیر کرا دی تھی۔ تھانہ اور قلابہ کے خوجے شادی کے رسوم ادا کرنے یا تنازعات کے تصفیے کے لئے بمبئی جماعت کے سردار کے پاس جاتے تھے۔ اسے کامڑیا اور مکھی کہتے تھے۔ (تھانہ گزیٹیئر۔ ایضاً ص۲۲۵ قلابہ گزیٹیئر۔ ص۷۹)

خوجوں کے مذہبی پیشوا کو (برطانوی عہد) سے "آغا خان" کہتے ہیں یہ "امام مکشوف"[1] کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی حاضری تمام مذہبی و سماجی تقریبات میں باعثِ برکات اور نعمت غیر مترقبہ تصور کی جاتی ہے۔ آغا خان کا عہدہ موروثی ہوتا ہے اور یہ ابھی تک اُسی خاندان میں ہے۔ جس کا شجرۂ نسب اوّلین اسماعیلی اماموں سے ملتا ہے خوجوں کو اسی مناسبت سے آغا خانی بھی کہتے ہیں[2]۔

میمن:

مؤمن کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور ایمان لانے والے اُن نومسلموں کا لقب بنا جو سندھ کے لوہانہ (اور کچھ کے) کاچھیہ ہندو تھے اور جو ۱۴۲۲ء میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک مبلغ یوسف الدین کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ ایمان لانے کے اکیو نبیں[12] برس بعد یہ نومسلم تاجر طبقہ سندھ سے کوچ کر کے کچھ آیا اور پھر وہاں سے گجرات میں آباد ہو گیا۔ گجرات کی مظفر شاہی سرپرستی میں جس طرح دیگر نومسلم جماعتیں۔ بوہرہ تاجر طبقہ اور خوجہ جماعتیں جزائر بمبئی میں مہائم اور ساحلی بستیوں میں بس گئی تھیں اسی طرح میمن بھی کوکن سے وابستہ ضرور رہے ہونگے۔ (اس لئے کہ یہ کوکن کی سوکھی مچھلیوں کے دھندے میں اپنی ایک مدت دور تک قائم

---

[1]: تھانہ گزیٹیئر۔ صد ۲۴۱

[2]: تقسیم ہند سے قبل شمالی [illegible] اور چترال میں خوجوں کی ایک دوسری جماعت بھی تھی جو غالباً ملتانی خوجوں اور وسطی ایشیا کے ناجز اسماعیلی "مولائیوں" کی باقیات تھے۔

کر چکے تھے[۱]

میمنوں میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ کچھ کے کچھی اور ھالار (کاٹھیاواڑ) کے ہلائی دونوں حنفی فقہ کے مقلد ہیں۔ (انیسویں صدی کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ میمن متشرع اور مخیر واقع ہوئے ہیں) میمنوں کی بولی کچھی ہے جو گجراتی اور سندھی کی آمیختہ ہوتی ہے مگر لہجہ میں سندھی زبان کا اثر نمایاں طور پہ غالب رہتا ہے جو ان کی سندھی اصلیت کا ایک لسانی ثبوت ہے۔

حبشی: حبش کے "کافر" غلاموں کی تجارت کاٹھیاواڑ اور کرناٹک میں عرصۂ دراز سے جاری تھی۔ بہمنی دور میں یہ عموماً بحری بیڑوں میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ پہلے

---

[۱]: تھانہ گزیٹیر (ایضاً صفحہ ۲۴۰) میں لکھا ہے کہ میمن برطانوی عہد میں تھانہ آئے (مگر اس سے پہلے ساحلی علاقوں میں ضرور آباد ہو چکے ہوں گے) قلابہ میں یہ تیل اور پرچون کا دھندا کرتے تھے۔ مگر تھانہ میں ناریل، تیل اور سوکھی مچھلیوں کا بیوپار انہیں کے ہاتھوں میں تھا اور یہاں سے سوکھی مچھلیاں (پونہ، ناگپور، مانڈل، اور سوڑا) مالوہ، گجرات، برار، جبلپور، خاندیش اور دکن کے دیگر شہروں تک جاتا تھا۔ ایضاً ضلع تھانہ میں ۱۸۸۲ء میں سوکھی مچھلیوں کا سب سے بڑا بیوپاری آبا کچھی ایک میمن تاجر تھا (ایضاً صفحہ ۵۹-۲۵۸)

[۲]: ریاض الانشاء۔ مسالک الابصار کا مصنف جو ابن بطوطہ کا معاصر تھا غلاموں کی تجارت کے بارے میں لکھتا ہے کہ ہندوستان میں کنیز کی قیمت آٹھ تنکے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اور جو حرم میں داخل کئے جانے کے لائق ہوتی تھی وہ پندرہ تنکے تک ملتی تھی، غلام دو تنکے میں خریدے جا سکتے تھے جسین اور مہذب باندی کی قیمت دو لاکھ تنکے تک ہوتی تھی۔ ہندوستان کی اولین فارسی تاریخ فخرالدین مبارکشاہی میں غلاموں کی تجارت اور بیگار کا ذکر ملتا ہے۔

ا بردہ فروشی کرتے تھے پھر پرتگیزوں نے حبشی غلاموں کی تجارت میں اجارہ داری
رلی اہنیں اپنے نئے جاگیرداری سماج کی آبیاری کے لئے انسان کے خون اور محنت
پینے کی ضرورت تھی تاکہ گوآ اور بسین میں ان کی ناریل کی باڑیاں ہری بھری رہیں اور
بایم" میں ان کے امراء [فدالگو] کے طویل اقطاعوں [فارموں] کی شادابی برادس
جائے۔ اور ان کے "ولاٗوں" میں خدمت گاروں کی کمی نہ رہے۔ اس لئے ان کا فرغلاموں
بیگار لی جاتی تھی [یہی طریقہ قرونِ وسطیٰ میں چنگیز خان کے عہد میں اور پھر خوارزم
مانی حکومتوں" میں رائج رہ چکا تھا] مرہٹوں کے دَور میں ان کی غلامانہ حیثیت
زمینداروں (پانڈھرپیشہ) کے امراء پر برقرار رکھی گئی تھی[1]۔ ساشٹی کے عیسائیوں
لبی مسلمانوں کے چند قبیلوں پر ان کے نسلی اختلاط کے اثرات غالب رہ چکے ہیں۔
دوں میں کاتھکاری (کاٹھوڑی) ذات میں سِدّی نام کے ادیباسی ملتے ہیں مسلمان
ین کو عرف عام میں سِدّی ہی کہا جاتا ہے (جو غالباً سیّدی کی بگڑی ہوئی شکل ہے[2])
عادل شاہی میں کھوت، کاشتکار اور دستکار دکن سے دیارِ کوکن میں داخل ہوئے۔

گذارشِ احوالِ واقعی:

موجودہ دَور کے ایک اردو مرہٹی لیکھک نے اپنی ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ
ی مسلم حکومتوں میں اعلیٰ طبقہ کے تعلیمیافتہ ہندوؤں بالخصوص براہمنوں کی شخصی

---

[1] تھانہ گزیٹیر۔ ج ۱۳۔ خ ۱ص ۶۴، ص ۱۵۹

[2] ایضاً ص

آزادی برقرار نہ رہ سکی تھی۔ اسی لئے بعض قبیلے ہجرت کر گئے۔ اگر کرپا ڈاو پیتھن کے چند براہمن کنبے ترکِ وطن کر کے کاشی چلے گئے۔ [دیوتاؤں کی سرپرستی میں] یا وجیانگر کی سرپرستی میں آگئے" [اعلیٰ عہدوں کی لالچ میں] تو اُن لاکھوں غیر مسلموں کے بارے میں مؤرخ کا قلم لکھنے سے کیوں لڑکھڑاتا ہے جو مسلم دورِ حکومت میں اس کے آغاز تا انجام ہمیشہ اکثریت میں رہے [اور دکن کے مسلمان عہدِ عالمگیر میں بھی کبھی اقلیت کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے] اس حقیقت کو ہم تسلیم کرتے ہیں [چاہے وہ روسی سیاح افاناسی نکیتن کا متعصبانہ انکشافِ حقیقت ہی کیوں نہ ہو] کہ ہندو نچلا طبقہ بہمنی دور میں مغلوب رہا جبکہ معاصر وجے نگر میں مسلمان اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور بیدر کے ہندو پیدل فوجیوں کے پیروں میں چپل تک نہ تھے۔ مسلمانوں کا محنت کش طبقہ بھی کچھ اتنا خوشحال نہ تھا بلکہ دکھنی امراء اور مقامی [مسلمان تجار] بھی بڑی حد تک اُن سیاسی، سماجی اور تجارتی مراعات سے محروم ہی تھے جن پر محمود گاواں کے عہدِ وزارت تک آفاقی اہلِ اقتدار کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی ١۔

اگر [بقول نکی تن] وجیانگر راج میں مسلمان اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔ تو بہمنی سلطنت میں ہندو کہاں نامحروم تھے؛ یہ مسلّم ہے کہ وجیانگر کی تجارتی منڈیوں میں روسی سیاح کو بھانت بھانت کے پردیسی تاجروں کی گہما گہمی دیکھ کر دھوکا ہیں ہوا اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ وجیانگر میں بدیسی سوداگروں کو داخول اور

١:- بھارت۔ روس (انگریزی)۔ افاناسی نکیتن کا بیان ص ۲۴ - ۲۲ - ۲۰ - ۱۹

چیتوں سے زیادہ مراعات اور سہولتیں حاصل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ گھوڑوں کی تجارت کی ساکھ وجیانگر میں قائم ہو چکی تھی۔ اور یہی اس راج اور بہمنی حکومت کے مابین وجہ نزاع بن چکی تھی۔ وجیانگرم کا علاقہ پندرھویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک بڑی کثرت سے آباد تھا۔

دکن کی مسلم شاہیوں کی وطن پرستی اور ایک نئے دکھنی کلچر کے فروغ پر تاریخ کا ہر ورق گواہی دیتا ہے۔ قطب شاہی، نظام الملکی اور عادل خانی درباروں کی چوکھٹ پر نہ جانے کتنے تلنگی، دکھنی اور کونکنی براہمن اور پربھو سر جھکائے رہتے تھے اور سربلندیاں حاصل کرتے رہے۔ ابراہیم قطب شاہ کی فیض گستری سے جہاں اولین دکھنی شعراء وجہی، محمود اور فیروز فیضیاب ہوتے رہے وہاں کئی تلنگی نیایک، ساہتیہ کار اور کوی بھی اپنا کشکول بھر لیتے تھے۔ اور جنہوں نے اپنے مربی کی سخاوت اور علم دوستی کی یادگاریں الفاظ و عبارات کے ایسے بت تراشے ہیں جو تلنگی ادب کے صنم خانوں میں آج بھی موجود ہیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کی مداح اور ہما میں تلگو کویوں نے مختلف موقعوں پر جو نظمیں لکھی ہیں۔ وہ آندھرا پردیش کے عوام کو اب تک یاد ہیں۔ تاریخ کی سرسری ورق گردانی ہزاروں ہندو ناموں کی گردان کرنے لگتی ہے۔ جو مرحمتِ خسروانہ کے بوجھ سے گردن اکڑائے رہتے تھے۔ دارالانشاء اور محکمۂ دیوانی میں اگر پربھوؤں کی منشی گری اور محرری کے قلم کی سرسراہٹیں سنائی دیتی تھیں تو قلمدانِ وزارت کے مالک بھی کئی براہمن رہ چکے تھے (گولکنڈہ اور بیجاپور کو فی الحال دور

---

۱ : بھارت۔ روس (انگریزی) افاناسی نکیتن کا بیان صـ ۲۲ ـ ۱۹

ہی رہنے دیں) خود نظام شاہی خاندان براہمن تما بھٹ کی نسل سے تھا۔ اور اس کا جادو کبھی جادھو گھرانے کے سر پہ چڑھ کر بولتا رہا۔ اور کبھی بھونسلوں کے سیاسی حوصلوں کو بڑھاوا دیتا رہا۔ اُن تلواروں کا دھرم کونسا تھا جو یشونت راؤ، وشواس راؤ، بھوج بل نایک، دیونایک اور اسی قبیل کے دوسرے مرہٹہ سرداروں کے ہاتھوں میں رام رایا۔ وانی وجیانگر کے خلاف اُٹھ چکی تھیں؟ اُن ہزاروں ہندو فوجی عہدہ داروں اور مرہٹہ سرداروں کو جنھوں نے ملک عنبر حبشی کی معیت میں نظام الملکی مملکت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالا دیا تھا۔ نہ کبھی دیس نکالا ملا اور نہ سیاسی کانٹا سمجھ کر درباروں سے باہر نکالا گیا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں نظم ونسق کی باگیں تھیں ان میں زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ دیشمکھ، دیش پانڈے، دیش کلکرنی، مقدم، محالدار، چیر گلے، دیسائی، مہاجن، شیٹے مہاجن، کھوت، پٹیل، نایک اور (سرنایک) داڑی، مجمدار، اور دھرم ادھیکاری وغیرہ عموماً اکثریتی فرقہ کے لوگ[۱] ہوتے تھے اور آج بھی بیشتر ہندو گھرانوں کے یہ آبائی القاب باقی ہیں۔ عادلشاہی دور میں یہودی بھی انتظامی شعبوں میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ اکثر خواجہ کے خطاب سے نوازے جاتے تھے[۲]

---

[۱]: ایک طویل فہرست اس تاریخی حقیقت کے ثبوت کے طور پر مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں دیکھئے (الف) احمد نگر کی بادشاہت (انگریزی) صہ ۲۰۲، ۱۲۷ (ب) دکھن تر یک گئیز۔ جیوڈیشل سسٹم (انگریزی، بمبئی) دیکھئے محضر نمبر آتا ۱۶۱۔ (ت) راقم کی غیر مطبوعہ تصنیف (انگریزی فارسی) "دستاویزات فارسی برائے ماخذ تاریخ مرہٹ و مہاراشٹر" مختلف اسناد (ج) قرامین و اسناد سلاطین دکن۔ دیکھئے اسناد عہد عادل شاہیہ و قطب شاہیہ اور (ح) منتخب وقائع دکن ــــ (حیدرآباد ۱۹۵۳ء)

[۲]: "پرتگالیوں کے سلاطین بیجاپور سے تعلقات"۔ اے۔ جی سی سیکویرا (مجلہ دانشگاہ بمبئی ۱۹۳۲ء) صہ ۲۹ - ۵۲۸

ترکِ وطن کا ایک اہم سبب اقتصادی ضرور ہو سکتا ہے مگر مذہب یا دھرم کے بارے میں تاریخ کے خدوخال مسخ کرنا تاریخ کے علم اور اس کی جدلیات سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے اور کسی بھی مورخ کا اس قسم کا اہتمام اس کے تاریخی شعور کے فقدان کا ثبوت دیتا ہے۔ قومی سالمیت کا نظریہ گو [برطانوی سامراجیت کی محکومی کے ردِعمل کے طور پر] پیدا ہوا ہے مگر ہندوستانی قومیت کا بے پناہ اظہار اس دور کی ادبیات میں اور تعمیرات سے ملتا ہے۔

دسواں باب

بھانت بھانت کی بولیاں

کوکن میں آباد ہونے والی قوموں کو سنسکرت کے بعد جس زبان کو منہ لگانا پڑا وہ درمیانی ہند آریائی دور کی مہاراشٹری پراکرت تھی جس کی ادبی خصوصیات کا ذکر عہد پراکرت کے قاعدہ نویسوں نے خاص طور سے کیا ہے۔ اسی سے جدید ہند آریائی دور کی زبان مرہٹی نے نشو و نما پائی ہے۔ مہاراشٹری جنوبی پراکرت تھی جس کے بولنے والے دکن اور مہاراشٹر (مع کوکن) میں برسوں دراویدی زبانیں بولنے والے چالوکیہ اور راشٹرکوٹ گھرانوں، ان کے مہامنڈلیشور: گوا کے کدمب کل۔ اور شری استھانک (دکھانہ) کے سلاہاروں کے سائے میں رہ چکے تھے۔ اسی لئے دراویدی زبانوں (خصوصاً کنڑی) کی لسانی آوازیں [کوکن] کے پربتوں اور ان کی قبیلوں قدیم قلعوں اور زمردیں پہاڑوں سے نکلنے والی روپہلی ندیوں اور پرانی بستیوں کے ناموں میں گونج رہی ہیں:

الف :- کونڈہ : پربت جیسے کونڈانہ، کونڈولی، کونڈگن (پربتوں کا دیس)، بھی کیا عجب کہ کوکن کی دراویدی شکل ہو۔

گیری : "کرشن گیری" کا پہرا (دکھنی ساتواہنوں نے کرشن گیری بنادیا تھا)

میڈ : "۔ میڈوں میں موجود ہے (ملے بھی پربت کے لئے استعمال ہوتا تھا)

نیر : "پہاڑی ڈھلوان حصہ۔ تھانہ (ضلع) کے دو مقاموں کے ساتھ ملحق ہے۔ جیسے نیر (نیرل) اور کوکنیر (ماہم) دھاتوں میں نیر نام کی بستی آج بھی آباد ہے۔ نیرلو: سایہ یا ٹیلوں سے گھرا ہوا۔ جیسے نیرل ہے

رائی : سمندری چٹان۔ درختوں کا جھنڈ۔ رائیریری اور اشیری کے محل وقوع سے ثابت ہے۔

سٹے : جھکا ہوا مغرب۔ سیہادری (مغربی گھاٹ) کا جھکاؤ اسی دراویدی "سٹے" کی طرف نظر آتا ہے۔

(ب) ہلہ : ندی۔ جوہالوں اور کالوں میں بہہ رہی ہے۔

ایری : پانی۔ کھنڈیری (کلبنی سے قریب ایک ٹاپو) کھنڈ: گھاٹی یا چوٹی اور کنڈ: نیچے۔ کھنڈیری کی وجہ تسمیہ ہو سکتی ہے۔

نرمَ : "نرمل (سوپارہ) کے مقدس نام سے صاف عیاں ہے۔

واتو : کھاڑی یا گھاٹ کا کنارا، واتیورسے۔ دیترنا کے کنارے آباد

گاؤں اور داُترے اور داتورُو کھاڑی کے کنارے بسے ہوئے ہیں.

کول : کھاڑی۔ کوولی (بھیمڑی کا دیہات) (کَل: پتھر کو کہتے ہیں)

(پ) پاڑہ اور اُولی: دیہات (کنڑی زبان میں۔ ہلی۔ جدید لفظ) کوکن میں کئی گاؤں انہیں سے آباد ہیں مثلاً: گھرسی پاڑہ:

اَولی سے کاریلی، کاندھیولی اور بوریولی وغیرہ

اُرُو : قصبہ: اُرُسے، منور [منورُد] ہے وَر

ناڈو۔ : گاؤں۔ نڈگی۔ نڈھال اور ناڈوڈ

(ت)۔ متفرقات:

اُپّو : نمک۔ اُپالت

ہالُو : دودھ۔ اُولی کے ساتھ مل کر ہالونا اور ہالیولی بنا تا ہے۔

تپّہ : گھی۔ توپ گاؤں۔

مرَہ : درخت۔ مروَل۔ جو یقیناً پہلے "مَرہ اُولی" ہوگا۔ اسی طرح مرَدہ ہے

سالَ : ہرن۔ مان گاؤں

ہرے : پرانا۔ ہرے گاؤں

بڈ : بایاں۔ بڈون (دہانم)

کَرَو اور کاترو: ہوا۔ کرجت اور کاتربج (کاترج) میں موجود ہے۔

آلہ : بھرا ہوا۔ جیسے جوتیوں (کھنڈ) سے بھرا ہوا کھنڈالا اور اَرن (قلعوں) سے بھرا ہوا ارنالہ (نالہ سوپارہ کے قریب) ہے، وڈالہ (وڈ برگد سے بھرا ہوا)

ڈلنڈا : چھاؤنی۔ جیسے ڈانڈا۔ راجپوری اور ریوڈانڈا ہیں۔ (چیول کے نواح میں آباد ریوڈانڈا ممکن ہے پراچین چمپاوتی کے کسی یگ میں فوجی چھاؤنی رہ چکا ہو اس کی عسکری اہمیت کا اندازہ سب سے پہلے پرتگیزوں کو سولہویں صدی میں ہوا تھا)

چکّہ : چھوٹا جنگل: کیچڑ۔ جوجِکلی۔ تاراپور کو اپنے دلدل میں پھنسائے ہوئے ہے۔

کیل : نیچے جیسے کیلوتے۔ ماہم اور کیلملی

کُدا : بجھم۔ قلابہ کے مغرب میں غاروں کی ایک بستی۔ کدال بسانت واڑی میں ایسی ہی قدیم آبادی۔

ویلو : بانس۔ جیسے ویولی یا بیلولی اور ویلکوس ہیں۔ اُلہاس کے کنارے سالشتی میں ویلولہ (وِلا) قرونِ وسطیٰ سے بانزہ (بانس) کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدود العالم سے جو دسویں صدی کی اور زبان فارسی کی قدیم ترین جغرافیہ پر تصنیف ہے علم ہوتا ہے یہ یقیناً پہلے ویلوالہ (بانسوں سے بھرا ہوا) ہوگا۔

وائی : مُنہ۔ دہانہ۔ سالشتی میں قدیم بودھی کیندر۔ کانہیری کے گھیرے میں پہلی جھیل۔ وہار کے نام سے اس کی مذہبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور قریب کی دوسری جھیل جو کانہیری کے دہانے پر واقع ہے اسی مناسبت سے تواَئی پکاری جاتی ہے۔ وائی: بیٹھن اور تنگہ کے قدیم راستے پر (مہابلیشور کے نیچے اور) سہیادری کے

دہانے پہ) ایک پرانی بستی کا نام ہے۔ بہمنی عہد میں یہاں راجواڑی تھی۔ ان کے علاوہ چند دراویدی الفاظ بستیوں کے نام پڑ گئے ہیں مثلاً: مَنے: گھر (واڑہ تعلقہ) اور تَنّے: قلعہ (ماہم میں)۔

(ش) کرناٹکی طریقۂ زراعت کی جڑیں مَدہ (پیمائش) سے لے کر ذھبیپ (غیر پیمائش شدہ اراضی)؛ کاس (قطعہ اراضی) اور شیلوتر (نمکسار کی زمیں) تک پھیلی ہوئی تھیں۔ نمک کے طاس کے لئے مرہٹی میں رائج آگر۔ دراصل دراویدی۔ "آگرو" کی ملاحت لئے ہوئے ہے۔

(ج) سون (دراویدی سوتہ) کولیوں کی ایک ذات ہے جس کے خدوخال پہ دراویدی نسل کی پرچھائیاں پڑی ہیں۔ کولی بھی کنڑی زبان کے "کُلّہ" یعنی کاشتکار) کا کل پُرزہ ہے۔ کھاڑی کے کنارے اور پہاڑوں کی ترائی میں رہنے والی اس قوم کا رشتہ بعض "کول" (کھاڑی) سے جوڑتے ہیں اور بعض فارسی کے "کوہی" میں اس کی وجہ تسمیہ ڈھونڈھتے ہیں۔

کولی بولی:

سالسٹی کی ہندو سون کولی (اور عیسائی کولی جاتیوں میں سیکڑوں

---

(۱): ان تمام عمرانی ولسانی تفصیلات کے لئے دیکھئے ۔ ۔ ۔ کی تصنیف

برس سے جو کوکنی کولی بولی، رائج ہے وہ آریائی زبانوں کے لسانی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ مگر اس بولی کی صوتی خصوصیات اور لب ولہجہ پر درا ویدی نسل کے عمرانی اثرات غالب ہیں۔ تصریفی تصرفات، غرابتِ الفاظ اور تلفظات ولہجہ میں یہ مسلم کوکنی بولی، سے مماثلت رکھتی ہے (مسلم کوکنی بولی کے ارتقاء میں کولی قوم کا نسلی اختلاط بھی مؤثر ثابت ہوا ہے) مگر ٹکسالی مرہٹی سے اپنی خصوصیات کے سبب مختلف ہو جاتی ہے گویہ سراسر اپنی بہن مسلم کوکنی کی طرح مرہٹی ہی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ سترہویں صدی تک یہ بولی اتنی مکمل اور عام ہو چکی تھی کہ ایک عیسائی راہب فرانسسکو واٹز داگیمارا کونے ۱۶۵۹ء میں کولیوں میں اشاعتِ نصرانیت کی خاطر یسوع مسیح کی سوانح عمری یا "پُران"[1] اسی بولی میں لکھی تھی۔ اس بولی کی لسانی، صوتی اور تصریفی خصوصیات حسب ذیل ہیں[2]۔

(۱) تلفظات: مسلم کوکنی بولی[2]، کی طرح کولی بولی میں بھی کوز آوازوں والے حروف ڈ، ڈھ، ڑ، وغیرہ "ر" کی طرح ادا کئے جاتے ہیں (مسلم کوکنی بولی میں بھی "ر" کا صوتی اثر غالب رہتا ہے۔ ل۔ بھی۔ ڑ۔ ہی کی آواز دیتا ہے۔

مثالیں (۱): گھورا، جھار (درخت) سُر کا ٹکما (کپڑے کا ٹکڑا) وغیرہ

(۲) صفات ماضیتی: اُورا (ओरा) ؛ جوراز (जोरा) کیورا (केवरा) وغیرہ

---

[1]۔ اس کتاب کی طباعتِ ثانی کا سال ۱۸۷۶ء ہے اس میں یسوع مسیح کے معجزات کا بھی بیان ہے۔

[2]: دیکھئے اسی کتاب میں "کوکنی بولی" کی خصوصیات۔ ص ۱۱۳۔ ۱۲۸

(۳) مصادر : پڑنے (परणें = گرنا) ۔ سورنے (सोरणें = چھوڑنا)

رڑنے (रडणें = رونا) ۔ جارنے (जारणें = جلنا)

(۴) "ش" کی نفسی آواز "س" کی سادگی اختیار کرلیتی ہے : ساستر (شاستر) سنبہٖ (بجائے شنبہٖ کے) ، سُنکروار (شکروار)

ب) صوتیات :

(۱) نفسی آوازوں کا بیجا استعمال : آٹھا (آٹا) ۔ تھونڈ (تونڈ = منہ) ۔ تھو (تو = وہ) ، ڈھلک (वळक شناسائی) ، ھُمید (اُمید) ھیاد (یاد) ، हाञे (आहे = ہے) ، हान (आहेत = ہیں) ۔ हैशी (अशी = ایسے)

(۲) اس کے برعکس بعض نفسی آوازوں کے تلفظ میں (قدیم دکھنی ، ہریانی یا پنجابی) کی پیروی کی جاتی ہے :

ان میں سے "ھائے ھوز" اکثر حذف کردی جاتی ہے ۔ مثالیں : आम्ही (بجائے आमी = ہم) ، तुम्ही (तुमी = تم) ، होता (ओता = وہ تھا)

(۳) "ن" کا بیجا استعمال : کنتھا (کتھا) ۔ پُنجا (پوجا) ۔ نِنْ جنے (निजणें = سونا) ۔ نِنْ گھنے (निघणें = شروع کرنا) ۔ اُنگرنے (उगणें = اٹھنا) ۔ موچُن (विचून = بغیر) ۔ مانجے (माझे = میرا) ۔ آمنچے (= ہمارا) تمانچے (तुमचे = تمہارا) ۔

(۴) چتپاون براہمنوں کی گھریلو بولی (چتپاؤنی کوکنی) کے برخلاف جس میں (ہریانی زبان کی طرح) "غنہ" (اُنوسُوَر) کا صوتی اثر غالب رہتا ہے کوکی بولی میں طویل "ن" کی آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

(ب) تصریفات:

(۱) دو حروفِ صحیح میں سے اکثر ایک کو ساکن (جبکہ وہ متحرک ہے) یا اس کے برعکس (جبکہ اُسے ساکن پڑھا جاتا ہے) کر دیتے ہیں اور کبھی تلفظ یکسر بدل دیتے ہیں: تَنگرُوار کو سُنکروار۔ پَڑجا کو پَڑجا۔ مُورکھ کو مُورکھ، کِرپا کو کرپا۔ لگن کو لگن، پَرمیشور کو پرمیسر اور شَبد کو سَبد تلفظ کرتے ہیں۔

(۲) اسماء (بے جنس کی جمع حالت فاعلی میں) (دکھنی اردو کی طرح) "آں" کے اضافے سے بنتی ہے۔ مثلاً۔ پھولاں۔

(۳) افعال۔ صیغۂ ماضی میں ला اور ले کے اضافوں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ساحلی بولی (لاری) یا گجراتی زبان کا اثر ہوگا: جاؤلنشی ۱ जाऊनशी گیا ہوا)۔ الیشورسُن جگ کیلے۔ (ईश्वरसून जग केले خدا نے دُنیا بنائی

(۴) ظرف مکانی کے استعمال میں مرہٹی کی न گرا دیتے ہیں مثلاً بجانے पराल کے صرف घरां کہتے ہیں۔

(۵) زمانۂ حال میں واحد متکلم اور واحد غائب (بلا استثنائے تذکیر و تانیث) کے بعض افعال "ت" پر ختم ہوتے ہیں مثلاً:

करतो (میں کرتا ہوں۔ وہ کرتا ہے۔ وہ کرتی ہے) اور جمع کے لئے "تات" مستعمل ہے: करतात (تم کرتے ہو، ہم یا وہ کرتے ہیں) واحد مخاطب کے لئے: करतोस (تو کرتا ہے)

(۷) صیغۂ ماضی میں حالتِ ظرفی کے ला، ली اور ले کے ساتھ کبھی کبھار ایک زائد "त" بڑھا دیتے ہیں مثلاً केलेत اور पाहिलेत کی بجائے केले کہتے ہیں۔ اسی طرح گجراتی "वा" کبھی حاصل مصدر میں جوڑ دیتے ہیں۔ مثالیں:

जावाना = جانا، देखावना دیکھنا: करवाना = کرنا

(ت) غرابت الفاظ:

بیشتر الفاظ جو ٹکسالی مرہٹی سے خارج ہیں کولی بولی میں بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے غریب اور غیر مانوس الفاظ یا تو چِتپاوَنی بولی میں رائج ہیں یا پھر اُتری کوکن کی گجراتی آمیز مراہٹی کے زیر اثر داخل ہوئے ہیں۔ کان (کیا۔ کِتاں۔ چِتپاوَنی) کیں (چِتپاوَنی میں بھی کہاں کے معنی ہیں)۔ نیچےؔ (دوسرا گجراتی) فارسی زبان سے بھی کئی الفاظ کولی بولی میں داخل ہو گئے ہیں، اُمید، یاد، حضور (صدر۔ حاضری) وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ براہِ راست آئے ہیں۔ کیونکہ دراوِیدی زبانوں سے بھی قبل کوکن میں فارسی نے اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔

۱؎ گزیٹیر س: تھانہ ج۱۳۔ ح۔ صد ۴۹ (فٹ نوٹ)۔ رتناگیری۔ ج۱۔ صد ۱۱۲۔ ۱۱۱ (فٹ نوٹ)

زبانوں کی راگ مالا

سلا ھار کوکن کے اُتری بھاگ میں مرہٹی کے پریوگ نے صرف "ہسراپ" اور دان پتر کے شاسن لیکھوں تک اپنی سیما سنبھالے رکھا اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کیونکہ مرہٹی بھاشا کی بڑھوتری ہونے تک لار دیس میں مسعودی (۹۱۶ء) کے بیان کے مطابق ساحلی بولی "لاری" کا چلن تھا۔

تیرھویں صدی میں جب دکھشن دیس کے دلیوگیری راجدھانی میں یادو راج کا ڈیرا لگا تو مرہٹی پر جوانی چڑھ گئی اور مہاراشٹر سنسکرتی کو نوجیون ملا۔ مگر اسی یگ کی آخری ہچکیاں تمام ہوتے تک یادو راج کی سانس بھی اکھڑنے لگی۔ خلج (افغانستان) کے ایک جیالے راجکمار علاء الدین نے سارے دکن کو ترکی گھوڑوں تلے روند ڈالا۔ مرہٹی بھاشا اور ساہتیہ کو اُتری کوکن میں کچھ سمے کے لئے سانس لینے کا موقع مل گیا تھا کیونکہ یہاں پہلے ہی سے یادو مہامنڈلیشوروں نے کرناٹک اور وسئی کے کیندروں میں قدم جمالئے تھے۔ مہی کا وتی میں بمب دلیو نے کچھ برسوں تک مہاوراج کا بھرم بنھائے رکھا ـــــ مگر امیران صدی کے اصیل گھوڑے شفقوں کے حدود سے نکل کر دور تک زمین کا سینہ شق کرنے لگ گئے تھے۔ بگیر بکش کی للکاروں اور تکبیر اور منونیس، کی آوازوں نے مرہٹی کو سہما دیا۔ اور جب بہمنی حکومت کا آوازہ دکن میں پھیلا تو فارسی زبان کی تان اور اونچی ہو گئی ـــــ مگر اس کی نغمگی سے کوکن کے باسیوں کے کان صدیوں پہلے آشنا ہو چکے تھے۔

قدیم گوکن میں اجنبی زبانوں کی "راگ مالا" میں جس زبان نے سب سے پہلے اپنی استھائی چھیڑی وہ پارسیکاؤں کی مذہبی زبان اَوِشتائی تھی۔ یہ قواعد صرف ونحو واصول "تلفظ" میں سنسکرت سے بیحد مماثلت رکھتی تھی۔ عہدِ قبل از مسیح سے ہند دیس سے رابطہ رکھنے والے اَریہٗ دیس کے پارسیکاؤں کو اسی لئے یہاں کی مروجہ پراکرتوں کو سمجھنے میں اتنی دشواری نہ ہوتی ہوگی۔ میلادِ مسیح کے عہد میں جب پارسیکاؤں کے شک پہلوی شتراپوں نے کوکن [اور کاٹھیاواڑ میں] جاگیرداری نظامِ حکومت کی نیو ڈالی تو پہلوی زبان کی لے تیز ہوگئی مگر سنسکرت شتراپ حکومت کی دفتری زبان کی حیثیت سے برقرار رہی جیسا کہ مہاشتراپ رُدرداما کے (۱۵۰ء) کے گرناری شاسن لیکھ سے پتہ لگتا ہے۔

پارسیٔ باستانی: یا پہلوی ہی (غالباً) اُن نسطوری عیسائیوں کی بھی زبان ہوگی جو سوپارہ اور کلیان میں عرصۂ دراز سے آباد ہو چکے تھے۔ آٹھویں صدی (۷۱۶ءتا ۷۷۵ء) کے مہاجر زرتشتی۔ جن کی کئی پیڑھیوں (۷۴۱-۷۳۰ء سے لیکر) گجرات اور کوکن میں گذر چکی تھیں۔ اسی گلبانگ پہلوی میں اپنے پُرکھوں کی اُجڑی بہاروں کی داستانیں سناتے ہوں گے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایران میں عربی کے اختلاط سے "بگڑی" زبان نے جنم لیا لیکن ہندوستان کے نو آبادکار پارسی اپنے آبائی وطن کی اس نئی ارتقاء پذیر زبان کے دائرۂ تسلط سے اتنے باہر اور تہذیبی ولسانی مراکز سے اتنے دور آپڑے تھے کہ معاصرانہ تہذیبی رجحانات اور لسانی میلانات

۱: وزن شعر فارسی۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری۔ (ایران ۱۳۶۵ء) ص ۴۰-۳۹

سے کما حقہ طور پر واقف نہ ہو پاتے ہوں گے۔ مگر بیت قریب سے دور کی آواز سن ضرور لیتے ہوں گے۔ جب ان کے ہم وطن ملاح اور تاجر شیمور میں اپنی زبان میں گفت وشنید کرتے ہوں گے۔ پہلوی سے پارسیوں کو مذہب کے ناطے جذباتی لگاؤ تھا۔ جس کی پرچھائیاں ان کی ثقافت کے ہر پہلو پر پڑ رہی تھیں۔ ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اسی میں دسویں صدی کے اوائل تک لکھتے پڑھتے تھے۔ جیساکہ کانہری کے غار نمبر ۶۶ کے پہلوی کتبہ سے علم ہوتا ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ساحلی بولی لاری کی تان بھی اونچی ہو چکی تھی۔ اس میں فارسی الفاظ کا رچاؤ بڑی حد تک موجود ہے۔ اور جب چودھویں صدی کے آغاز سے دکن [اور کوکن] میں فارسی کا طوطی بولنے لگا۔ تو بھلا پارسی اپنے آبائی وطن کی زبان کیوں نہ سیکھتے ؟ جبکہ اسے سرکاری حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور دکن میں فارسی ادب کی تاریخ کا آغاز ہو چکا تھا۔ سیاسی امور کی انجام دہی کے لئے پرتگیزوں اور یہودیوں نے بھی فارسی کی تحصیل ضروری سمجھی پرتگیزوں کو عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں سے سیاسی تعلقات اور سفارتی مراسلات کے سبب ترجمان رکھنے پڑتے تھے[۱]۔ چند فارسی کتبوں اور دستاویزات سے قطع نظر۔ کوکن خطے کا اولین سرمایۂ ادب [مگر جس کا معتد بہ حصہ عربی میں ہے] ایک عالمگیر شہرت کے حامل۔ جیّد عالم کا رہین منت ہے جیسے عالم اسلام مخدوم فقیہ علی مھائمیؒ

---

۱ : اے۔ جے۔ ایل سیکویرا " پرتگیزوں کے سلاطین بیجاپور سے سیاسی تعلقات " بمبئی یونیورسٹی جنرل۔ (۱۹۳۲ء)، ص ۲۹ - ۵۲۶

شیخ علی المہائمی کے نام سے جانتا ہے اور جو اسی خطے کے قدیم نوائطی خاندان سے تھے۔

محمد شاہ بہمنی اوّل (۷۵۹ھ - ۷۴۸ھ / ۱۳۵۸ - ۱۳۴۷ء) کے عہد کا کلیان جہاں نوائطی تاجر اور جہاز ران عرصۂ قدیم سے آباد تھے۔ اس خوشحال نوائطی بستی میں مولانا شیخ احمد بن ابراہیم بن اسماعیل پرویرے کے گھر شب عاشورہ ۷۷۶ھ میں ایک چاند اترا جس کو علی کہہ کر پکارا گیا۔ مشائخین میں شمار تھا اسی لئے شیخ کہہ کر خطاب کیا گیا۔ پروَرھے یا بقول مولانا عبدالحق محدث دہلوی مصنف اخبار الاخبار - پیرو خاندانی لقب تھا۔ مخدوم - کنیت کی وجہ تسمیہ تفصیل طلب ہے کہ کس طرح رات بھر والدہ کے مانگنے پہ پانی کا پیالہ یا تپائی لئے کھڑے رہے آواز نہ دی کہ آنکھ لگ گئی تھی جنبش نہ کی کہ مبادا آنکھ کھل جائے اور پانی طلب کریں - عرف عام میں فقیہ مشہور ہیں اسی لئے کہ فقہ میں دسترس رکھتے تھے۔ نو سال کی عمر ہوئی کہ شفقت کا سایہ اٹھ گیا۔ مولانا شیخ احمد کے زیر تربیت کمسنی ہی میں تجوید قرآن، فقہ وحدیث و دیگر منقولات و معقولات میں درس مکمل کر لئے تھے۔ والد جو کلیان کی خاک سے اُٹھے تھے اور وہیں[1] پیوند

---

(۱): کلیان بمبئی کے قریب ایک قدیم قبرستان میں مولانا شیخ احمد کی پختہ درگاہ ہے جو ربیع الاول ۱۲۸۱ھ میں تعمیر ہوئی کسی مقامی شاعر راشد کے اردو میں کہے ہوئے دو قطعات تاریخ وفات اندر اور باہر دو مرمری تختیوں میں درج ہیں۔
اندر کا قطعہ اس طرح ہے:

جناب شیخ احمد واصل حق ☆ جہاں سے جب ہوئے جنت کو رخصت
لسان غیب راشد نے بتایا ☆ مکین الخلد ان کا سال رخصت
۷۷۵ھ

خاک ہو گئے تو والدہ فاطمہ جو ملک التجار ناخدا حسین لیکولے کی صاحبزادی تھیں۔ نورِ نظر کو لے کر اپنے میکے۔ مہائم میں مقیم ہو گئیں جہاں کلیان (سوپارہ اور تھیور) کی طرح عرب و عجمی اور مخلوط النسل مسلمانوں کی کافی تعداد آباد تھی۔ اور جو اس وقت احمد شاہ گجراتی کی سلطنت کا اہم بندر تھا۔ خدمتِ مادر۔ ولایت کا باعث بنی یا خدمتِ خلق اللہ۔ مگر یہ صحیح ہے کہ خوارق عادات یا کرامات سے کہیں زیادہ شیخ علی المہائمی کے علمی محاسن اور اخلاقی مناقب اتنے اعلیٰ تھے جنہوں نے ان کا درجہ ولایت تک پہنچا دیا۔ سلوک و طریقت میں طریقۂ "اویسی اور مسلکاً وجودی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ علی المہائمی نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کی تقلید و تشریح میں کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ تذکرہ نویس آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ بتاتے ہیں مگر صرف مندرجہ ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) تفسیرِ رحمانی تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان: یہ مشہور زمانہ تصنیف تفسیر مہائمی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کا علمی مرتبہ اتنا افضل ہے کہ شہنشاہ بابر کے معاصر عبدالقدوس گنگوہی نے اس کی تتبع میں جو تفسیر لکھی ہے وہ تفسیرِ مہائمی کے طفیل شہرت رکھتی ہے۔ اس میں کلامِ پاک کی آیاتِ کریمہ کا باہم دگر مربوط ہونا بڑی قابلیت سے بیان کیا گیا ہے[۱]۔ مولانا عبدالحق محدث نے اس کی "صفت ایجاز و تدقیق" کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ "تفسیر را القرآن امتزاج دادہ است" گو یہ تفسیر عالمی شہرت کی حامل ہے مگر حضرت مجدد الف ثانی (جو نکہ وحدت الوجود نظریے کے

۱: چشمۂ کوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۳۲۰-۲۱

کٹر مخالف تھے اسی لئے اپنی 'نقشبندیہ انتہا پسندی' سے کام لیتے ہوئے]
اس کے مطالعہ کو "بی ضررہائی خفیہ بلکہ جلیہ نیست" کہتے ہیں[۱]۔
(۲) تفسیر و تشریح الٓمٓ: رسالہ دربیانِ وجوہِ اعراب الٓمٓ تا متقین۔
(۳) خصوص النعم[۲]: شیخ اکبر کی مشہور زمانہ تصنیف فصوص الحکم کی دو جلدوں پر مشتمل شرح ہے بقول صاحب اخبار الاخیار: "... کہ دران در تطبیق ظاہر و باطن کوشید"[۳]۔
(۴) زوارق: یہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف عوارف المعارف کی شرح ہے۔
(۵) نصوص: شیخ صدرالدین قونوی کی تصوف پر ایک کتاب کی شرح۔
(۶) شرح الضوء الازھر
(۷) استجلاء البصر فی الرد علی استقصاء النظر: ابن مطہر حلی شیعی کی۔ استقصاء النظر کی رد میں ہے۔
(۸) نور الاظہر فی کشف القضاء والقدر۔
(۹) انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام: اسرار شریعت پر معرکۃ الآراء تصنیف ہے اسے اسرار الفقہ بھی کہتے ہیں۔
(۱۰) رسالۃ الوجود فی شرح اسماء المعبود

۱: چشمۂ کوثر۔ شیخ محمد اکرام ۱/۲-۳۲۰
۲: متاخرین میں شاہ ولی اللہ محدث کی حجۃ اللہ البالغہ اسی موضوع پر ہے۔
۳: اخبار الاخیار۔ رسالۂ ضمیر الانسان

(۱۱) جادلۃ التوحید: مولانا عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ "بغایت موجزو منقح" ہے

(۱۲) اجلۃ التائید فی شرح رسالۃ التوحید: غالباً اسی کتاب کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال موضوع اتنا مختلف نہیں۔

(۱۳) اراءۃ الدقایق بشرح مرأۃ الحقایق: یہ رسالہ جام جہاں نما کی شرح اور اس کا ترجمہ ہے۔

(۱۴) ترجمہ و شرح لمعات عراقی

(۱۵) اصحائف النصیحۃ۔

(۱۶) مرأۃ الحقایق: فتاوی۔ یا فتاوی مخدومی[1]۔ آپ سے منسوب ہے۔

مخدوم فقیہ صاحب کا ذکر مختلف قدیم تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ مولانا عبدالحق محدث[2]

---

[1]: تاریخ الاولیاء۔ ج ۲ ص ۴۷

[2]: آپ کا تذکرہ مندرجہ ذیل کتابوں میں ملتا ہے۔ آئین اکبری (ابوالفضل) نفحۃ العرب (مولانا باقر آگاہ) حبل متین (شیخ عبدالوہاب متقی شاہ دل قادری) رسائل سید وجیہ الدین علوی۔ علمای ہند (مولانا رحمٰن علی) سبحۃ المرجان (غلام علی آزاد بلگرامی). رسالۂ ضمیر الانسان (سید ابراہیم قادری حسینی۔ کلیان۔ مخطوطہ لائبریری بمبئی یونیورسٹی) تاریخ الاولیاء (عبدالفتاح گلشن آبادی) بمبئی کے مختلف اہل قلم نے جو تذکرے لکھے ہیں وہ خوارق عادات و کرامات کی مثالوں سے پُر ہیں۔ جو چنداں وقیع نہیں (۱) آفتاب کوکن (۲) یادگار مخدومی (علی عمر گوگاری) (۳) تذکرۂ مولانا فقیہ علی مخدوم مہائمی۔ بازاری شاعروں اور تک بندوں کی قوالیوں کی سستی کتابیں۔ "مہائم کا میلہ" اور کرامت مخدوم مہائمی بھی بازاروں میں بکتی ہیں۔ مولوی ابو محمد عبدالعزیز نے "فقہ مخدومی" کے عنوان سے ایک شرح لکھی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد کی انگریزی تحقیق "عربی ادبیات ہندوستان" میں بھی سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔

آپ کا شمار "علمای صوفیۂ موحدۂ" میں کرتے ہیں۔ روحانی مرتبت اور علمی و دینی فضیلت کے سبب آپ کو "قطب الاقطاب عالم معانی" "مولانا قطب ربانی" وغیرہ خطابات سے نوازا گیا ہے۔ تاریخ وصال ہے: ۸/ جمادی الآخر ۸۳۵ھ ۱۴۳۱ء "جنات الفردوس" اور "کشف المختوم"[1] سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ گنج شہیداں سے قریب دفن ہوئے اور غالباً اسی مسجد سے متصل مدفن بنا جس سے ملحق موجودہ درگاہ ہے۔ مزار کے جنوب میں آپ کی والدہ کی قبر ہے، جو خود صاحبۂ مقامات عالیہ تھیں[2]۔

علی المہائمی کے شیوخ الطریقہ، اساتذہ اور تلامذہ کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ تاریخ الاولیاء میں ایک تلمیذ محمد سعید کوکنی الرتناگیری کا نام ملتا ہے۔

محمد بن ابوبکر بن عمر المخدومی الدمامینی — گو کوکن کے نہ تھے، مگر مہائم کے دوران قیام (رمضان المبارک ۸۲۵ھ مطابق جولائی ۱۴۲۲ء تا ذی الحجہ ۸۲۵ھ مطابق ستمبر ۱۴۲۲ء) میں عربی صرف ونحو پر ایک معرکۃ الآراء کتاب تصنیف کر کے اس سرزمین سے وابستگی پیدا کر لی تھی۔ "مخدومی" کا لقب مخدوم فقیہ صاحب سے ارادت علمی اور نسبت روحانی کا سبب ہے۔

شیخ ابوالحسن ابن قاضی عبدالعزیز بن قاضی تاج محمد نے جو عادل شاہی دور میں بندر چیول کے قاضی تھے، "محمد نامہ" کے عنوان سے سکندر

---

[1]: کشف المختوم۔ محمد یوسف کھٹکھٹے کے زور فکر کا نتیجہ ہے

[2]: رسالہ ضمیر الانسان

عادل شاہ کے حالات لکھے ہیں۔ جسے زبیری نے اپنی بساطین السلاطین میں طبقۂ عادل شاہیہ کے تحت شامل کیا ہے۔ دکن میں پہلی فارسی کتاب جو کسی پارسی نے لکھی وہ قصۂ سنجان ہے جس کا مصنف بہمن ابن کیقباد ابن ہرمز سنجانی تھا جو نوساری کا موبد تھا۔ اس کی سن تصنیف ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء ہے اور زردشتیوں کی ہجرت کی دکھ بھری داستان ہے۔ دکن کی خاک میں جا اس عہد کے کتنے انشا گو فن ہو گئے جو لاکھ گل میں نمایاں ہیرے تھے بہا ہو گئے۔ اور جن کے نام و کام سے آج خود ان کے ناز پروردہ بہار و اقف بھی نہیں ہیں۔

فارسی اور مرہٹی کا ملاپ:

فارسی ہمارا نشتر میں ساڑھے تین سو برس تک لوگوں کی زبانوں میں مصری گھولتی رہی اور کانوں میں شہد ٹپکاتی رہی۔ یہ مسلم حکمران طبقہ اہل اقتدار اہل قلم اور نوادر و شرفاء اور علم و ادب کی زبان تھی۔ اس کی دفتری حیثیت نے اس کا دائرۂ عمل دکن کے مالی و ملکی نظم و نسق سے لے کر دلی سرکار تک پھیلا دیا تھا۔ دربار میں اسے بار یابی حاصل تھی اور امیرانِ صدہ کے چھوٹے چھوٹے دفتروں تک رسائی حاصل تھی۔ چونکہ فاتح قوم کی غالب زبان تھی اسی لئے دکن کی مقامی زبانیں اس سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھیں۔ مرہٹی جو خود اپنے پراچین کینڈر۔ دیوگری میں اس سے سب سے پہلے دو چار ہوئی تھی۔ اس سے آنکھیں لڑا بیٹھیں۔ مرہٹی کے لسانی سرحدوں تک ہمیشہ فارسی [اور دکھنی اردو] کا چرچا رہا۔ بہمنی حکومت کی تاسیس کے بعد جب فارسی کے ساتھ ساتھ مرہٹی بھاشا کا دھارا بہنے لگا تو انیسویں صدی کے درمیانی منزل تک ان دونوں کا سنجوگ اٹوٹ رہا۔ اس سنگم کے پس منظر میں دراصل دو قوموں کا سماجی اور معاشرتی ملاپ تھا۔ مسلم مدنیت نے گو کہ دکن کی معاشرت پر فوقیت حاصل کر لی تھی مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات

یکتا اور وطن پرستی کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ ایک طرف قومی سالمیت کا اٹوٹ تصور اُبھر رہا تھا اور دوسری طرف جذباتی ہم آہنگی کا چشمۂ شیریں ذہنوں کے خیابانوں اور دلوں کی کھیتیوں کو سیراب کرنے لگا تھا۔ کاروبارِ سلطنت، سماجی اجتماعی زندگی اور معاملات دنیوی نے قومی و مذہبی امتیازات، تکلف اور تعصب کے پردے اٹھا دیئے تھے اور اسی طرح تکلم کو بھی ہم زبانی عطا کر دی تھی یہی وجہ تھی کہ مرہٹوں کی مرہٹی ترکوں کی فارسی بولنے لگی تھی ـــــ !!!

(۱) مرہٹی بھاشا کی سیما میں سب سے پہلے فارسی کے متفرق الفاظ مسخ شدہ ہیئت لے کر لنگڑاتے ہوئے داخل ہونے۔ سب سے قدیم ترین نمونہ ناگاؤں (ضلع قلابہ) کے مندر کھمبیشورا کا کتبہ ہے جس میں تین مسلمانوں ـــــ (خوجی - تاجرا اور مدالہام) کے نام ملتے ہیں۔ شک ۱۲۸۹ء کے ساتھ ہجری کا ۷۶۹ھ بھی درج ہے۔ دو[۲] فارسی الفاظ بھی کا فرون کی بستی میں نظر آتے ہیں۔

(۲) فارسی چونکہ دار الانشاء اور دیوانی کی زبان تھی اسی لئے سرکاری مراسلات درباری احکام اور دیوانی اسناد کی۔ (الف)

دفتری اصطلاحیں اور رسمی عبارتیں اتنی عام فہم ہو چکی تھیں کہ مرہٹی بولنے والے سرکاری ملازمین (جو ملازمت کی خاطر فارسی میں تھوڑی بہت شد بد حاصل کر لیتے ہوں گے) اور وہ لوگ بھی جو فارسی سے قطعی نابلد تھے۔ عام بول چال میں بلا تکلف انھیں استعمال کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ عربی و فارسی

۱: مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر ـــــ مولوی عبدالحق (اورنگ ـــــ آباد دکن ۱۹۳۳ء) ص ۵ - ۴

کے یہ الفاظ آج بھی مرہٹی میں اس طرح رائج ہیں جس طرح سیکڑوں برس پہلے یہ مستعمل تھے : محضر خط، خریطہ، بیع نامہ (اور اسی قبیل کے دیگر نامجات)۔ برحکم، فقیر، مذکور۔ کل باب کل قانون۔ الواب، مقاسہ، تقاوی، متصدی، حق رعیت نسبت، رسوم و حقوق۔ انعام وطن اور سینکڑوں دیگر اصطلاحات۔

(ب) فارسی کے آئین مکتوب نگاری نے مرہٹی کو ابلاغ و اظہار سے اور آداب مراسلت نے القاب اور دیگر ارکان سے روشناس کرایا۔

(پ) مرہٹی مکاتیب و اسناد میں اندراج تاریخ کا طریقہ تو بالکل مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا یعنی کہ عربی ہندسوں کو ان کے عربی تلفظات میں لیکن مرہٹی حروف میں لکھنے کا رواج مرہٹہ حکومت کے عہد زوال تک قائم رہا حالانکہ بہمنی سلطنت کے سقوط کے بعد دکن کی مسلم حکومتوں کی دیوانی میں اسلامی مہینوں کے ساتھ صرف ہندسے درج کرنے کا نیا طریقہ رائج ہوگیا تھا مگر مرہٹی میں اربع۔ تسعین و ثمان مائۃ۔ جیسے اعداد آج بھی موڑی پتروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ صدرہ، شہور اور سن لکھنا تو روزمرہ کے حساب کتاب میں شامل تھا۔

(ت) عہد پیشوائی تک دیوانی، درباری، عدالتی اور مالی و ملکی عہدہ داروں کے فارسی اسماء مرہٹی میں سرفراز رہے۔ اور یہی اعلام اور خاندانوں کے القاب بن گئے۔

۱: دیگر مثالوں کے لئے دیکھئے (۱) مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر (۲) ادبیات فارسی کی مختصر تاریخ۔ دیورے صفحہ ۶۲-۳۵۴ (۳) راجوڑے " مرہٹہ تاریخ کے مصادر۔ ج (دیباچہ) (۴) پٹوردھن۔ فارسی مرہٹی کوشہ (دیباچہ) اور (۵) ڈھل ترمبک گنے۔ محضر (مرہٹی)

مثلاً: واکنیس (واقعہ نویس)۔ پارسنیس (فارسی نویس) پھڈنس (فرد نویس) ٹپرنس، اسر نویس) کارکھانس (کارخانہ نویس)۔ چٹنس (چیٹ نویس) مجمرلنس (حضورنویس) موجمدار (مجموعہ دار یا موازنہ دار) پوتدار (فوطہ دار) وغیرہ۔ محالدار، حوالدار، قاضی، مقدم، خوط (کھوت) جاگیردار۔ وطندار۔ کے علاوہ مالی وملکی عہدہ داروں کو جن کے نام مقامی زبانوں میں تھے۔ بہ طریق جمع فارسی مثلاً: دیشمکھان۔ کلکرنیان وغیرہ لکھتے تھے۔

(۳) فارسی خطابات بھی مرہٹی بھاشا اور مرہٹہ درباروں میں باریابی حاصل کرنے لگ گئے تھے۔

(۴) دھرم شاستر۔ ذات پات اور ریت رسم کو چھوڑ کر عربی و فارسی الفاظ کی کھپت لین دین اور بازاروں میں ہونے لگی تھی۔

(۵) مسلم صنعتوں (فن کاغذسازی، اسلحہ سازی، فن حرب) اور ایجادات کے سبب فارسی و عربی مصطلحات مرہٹی بھاشا کے کل پرزے بن گئے۔

(۶) گو مرہٹی میں گیت لکھنے والے بھگت، سنت اور سادھوکویوں نے مرہٹی کی پوترتا کی مٹی پلید نہ ہونے دی مگر گاؤں گاؤں گھوم کر مانگنے والے ہندو بھکاری اور مسلمان فقیر اپنے مرہٹی گیتوں اور صداؤں کی دلکشی کا دان فارسی لفظوں سے حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح صوفیائے کرام کے رشد و ہدایات اور تبلیغات نے دکھنی اردو کے راستے بہت سارے فارسی و عربی الفاظ کو مرہٹی کے بھگتی مارگ پر لا ڈال دیا تھا۔

(۷) مرہٹی بولنے والے نومسلم عربی و فارسی کے القاب کو اپنے لئے دین کا ایک

اور فریضہ تسلیم کرتے تھے جبکہ انہیں مسلم معاشرے کی عام سطح تک پہنچنے کے لئے دینی بھائیوں سے ہم زبانی کی ضرورت بھی تھی۔

(۸) مقامی مسلمانوں اور نووارد آفاقیوں نے جب ہندو عورتوں سے شادی بیاہ کر لیا تو ان کی زبانیں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ فارسی زبان کا نفوذ گہرا تھا۔

(۹) عام بول چال میں فارسی الفاظ کا چلن اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ ان کے آگے سنسکرت اور پراکرت مترادفات بھی نہ ٹھیر سکتے تھے۔

(۱۰) مسلم مدنیت و معاشرت نے جب مرہٹواڑی کی سماجی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرنا شروع کر دیا تو ذہنی افق پر نئے خیالوں کی شفق پھوٹنے لگی اور فکر و نظر کی سرحدیں فارسی ادبیات، صرف و نحو اور روایات و اسالیب بیان سے ٹکرانے لگیں:

(الف) فارسی جاننے والے مرہٹی عالموں کی تقریر و تحریر کا پیراہن گو مرہٹی تھا لیکن پیرایۂ بیان، جملوں کی نشست اور الفاظ کی ترتیب و ترکیب سے فارسی کی تراش اور اس کا طرز نمایاں تھا۔ (ب) محاورات و مصطلحات اور تراکیب بعینہ مرہٹی تحریروں میں استعمال ہونے لگے۔ (پ) بعد میں محاوروں کا ترجمہ مرہٹی میں ہونے لگا (ت) مرہٹی "ویاکرن" بھی فارسی تصریفات کی بیساکھیاں لے کر چلنے لگی۔ اور عبارتیں آدھا تیتر آدھا بٹیر بن گئیں مثلاً: "طلب کر دن حضور آنثرلے ہر دو[۱]" (ج) فارسی طرز تحریر اور اسلامی روایت کی تقلید میں مقاموں کے ساتھ صفات کا استعمال بھی مرہٹی اسلوب

---

[۱] دیکھئے: ڈھل قرمبک گنے۔ محضر (مرہٹی)

[۲] ڈھل ترمبک گنے۔ محضر (مرہٹی)

کا وصف بن گیا: بندرِ معمورۂ ممبئی ۔ بندرِ میمون مصطفےٰ آباد عرف چیول خجستہ بنیاد (اورنگ آباد) وغیرہ ۔

(۱۱) فارسی خطِ دیوانی (جسے عہدِ جہانگیر میں شکستہ کا نام دیا گیا) دفتری کاروبار اور مراسلت کے لئے نہایت تیز رفتار اور سہل طرزِ تحریر تھا ۔ دیوگری راجہ راؤ کے منتری ہیمادری پنت نے موڑی طریقۂ تحریر کو اسی کی تقلید میں رائج کیا ۔

(۱۲) مُہروں کے استعمال پر قدامت کی مُہر لگ چکی ہے ۔ مسلمان مہر سازوں (حکاکوں) نے اس کی تزئین و تراش میں بھی اپنے ذوقِ خطاطی کا ثبوت دیا ہے مرہٹواڑی راجاؤں اور سرداروں نے مسلمان حکمرانوں اور اُمراء کی مہور کی تقلید میں جو عبارتیں کندہ کروائی تھیں وہ اگرچہ مرہٹی یا سنسکرت حروف میں لکھی جاتی تھیں مگر فارسی کا ترجمہ ہوتی تھیں ۔

(۱۳) مرہٹی "بکھر" یا تذکرے جو زیادہ تر کائستھوں کے لکھے ہوئے ہیں ۔ فارسی زبان کی شوکتِ بیان سے طاقتِ گویائی حاصل کرتے تھے ۔

(۱۴) انیسویں صدی میں جب (لوکامنیہ تلک نے اور اس کے پہلو انہوں نے ہندوسنسکرتی اور مرہٹی زبان کی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں کیں تو سماجی تعلیمی انقلابات کی جلو میں جدید علمی رجحانات بھی پیدا ہوئے ۔ فارسی کے عروسِ سخن سے مرہٹی گیت پہلے ہی سے متاثر تھا ۔ اب اُس نے اپنے "اَلَنکار" کو فارسی کے تشبیہوں اور استعاروں کے گہنوں پاتوں سے سجانا شروع کر دیا ۔ مرہٹی میں غزل اور رباعی کا آغاز اسی عہد سے

---

۱۸ :۔ دیکھئے : پیشوا دفتر (پونہ) کی موڑی دستاویزات (اصل)

سے ہوا۔ فارسی شاعری کی رنگینیوں نے مرہٹی کبت پر جو رنگ چڑھائے ہیں وہ پروفیسر پٹوردھن کی "گیتا نجلی" اور عمر خیام چیہ ربائیا" مادھو جولین کے بھاؤ گیتوں نیشونت دتا اور گریش کی "گزلوں (غزلوں) سے جھلک اٹھتے ہیں۔

(۵) مسلم ثقافت اور فارسی زبان کے غالب اثرات کا مستھوں کے فکری و علمی مشاغل و مظاہر میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ فارسی زبان خصوصاً شمالی ہندوستان کے کائستھوں کی ناز پروردہ تھی۔ خارجی میل جول میں اپنائیت کا احساس اور داخلی و معنوی یکسانیت کا اظہار اسی زبان میں۔ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ہندو مسلمان دونوں کے دل عروسِ ادب کے لئے ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ اور دونوں کے فکری دھارے ایک ہی گنگا اور دجلہ سے نکلتے تھے۔ کوکن کے پربھوؤں کی بولی گجراتی یا لاڈی تھی مگر مہاراشٹر میں اپنی قدیم سکونت کے سبب انہوں نے یہاں کی مقامی زبان پر بھی قدرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی مرہٹی اسی وجہ سے گجراتی آمیز بن گئی ہی نہیں بلکہ ہر دور میں غالب زبانوں سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاٹلنے پربھوؤں کی مرہٹی اور کوکنشت مرہٹی میں تلفظ، لہجہ اور الفاظ کے فرق نمایاں ہیں۔ یہ لوگ ارادہ کو ورادہ۔ دنا یک کو انا یک اور ایشیور شور کو ولشیو لیشور بولتے ہیں۔ عربی و فارسی نے ان کے پیروں میں موزہ پہنا دیا' ہاتھوں میں رومال اور پیالہ تھما دیا۔ لُبس، پیک دان، حمام، اور فانوس سے مانوس کر دیا۔ [اور انگریزی اقتدار نے پگار دے دیا جو آج بھی تنخواہ کے معنی میں بمبئی اور مضافات میں مستعمل ہے]

---

(۱) تھانہ گزیٹیر ص ۸۸ - ۹۱

ان کے علاوہ ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جو مرہٹی کے مزاج میں رچ گئے ہیں۔

ردِّ عمل: یہ لسانیاتی ردِ عمل یک طرفہ نہ تھا۔

فارسی کا بھی ایک ایسے دیس اور اس کے سماج سے واسطہ پڑا تھا جن کے تہذیبی و تمدنی تقاضوں کو اُسے بہر طور پورا کرنا تھا۔ چاہے اُس کے لئے اُسے اپنی جھولی خالی کرنی پڑتی یا پھر مقامی زبانوں کے آگے پھیلانی پڑتی۔ بعض حالتوں میں یوں بھی ہوا کہ جب اُس نے ہاتھ پھیلایا اُس کی زبان نگر گئی۔ چنانچہ زرعی نظم و نسق میں جب قدیم دستورون اور طریقوں کو بحال رکھنے کا سوال پیدا ہوا تو فارسی زبان کو تمام مروجہ اسماءِ القابِ حکام اصطلاحاتِ ابواب و رسوم (ٹیکس) اور مقامی مصطلحات کو جن کا تعلق مرہٹی یا ڈراویدی زبانوں سے تھا۔ آخر وقت تک گلے سے لگائے رکھنا پڑا۔ عادل شاہی دَور میں فرامین اور اسناد کا فارسی متن یا دیوناگری لپی میں لکھا جاتا تھا یا آخر میں ۔ مرہٹی (اور تلنگی) عبارتیں درج تحریر کردی جاتی تھیں۔ عادل شاہ کا فرمان ہمیون [ہمایون] "حکام دیوانی کو اس طرح خطاب کرتا ہے:

(الف) ... بجانب حوالداران و ٹھانہ داران دسر سمتان دعاملان و دیسائیان یا: ناڈگیران [۱] ... و دیس کلکرنیان ...

(ب): ابوابِ ممنوعہ کے دروازے کھلے تو بہت نئے الفاظ فارسی میں داخل ہونے لگے۔

۱: تفصیلات کے لئے دیکھئے: فرامینِ سلاطین۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی ص ۱۵۴۔ ۱۳۵۔ اور واقعات مملکات بیجاپور از بشیر الدین احمد دہلوی ج ۳۔ ص ۴۰۶ - ۳۹۱

ٹانک ٹیپی و کھونکی ۔ ہمہ الواب پان و ناگر نستان بھیکی (چٹکی بھر آٹا) کھل بھرنی ۔ بجاوہ کلال و گنتی سنگ ۔ گرام دیوتی ۔ سیری دہیری دہول و کوری و کوکل و کاردنی ۔ ۔ ۔ جوڑہ پاپوش ۔ بیٹی و بیگار[1] ۔

(پ) پھر دوالدہ بلوتہ اور دیگر پیشہ ور داخل ہوئے : تیلی و بتولی و جابپ و جولائی (جولاہ ۔ لفظ عربی) و دھنگران بنیلان اور جاٹیاں ۔ کومٹیاں (کمائی) وغیرہ جمع ہونے لگے ۔

(ت) زمین کی پیمائش بھی فارسی کی وسعت کا اندازہ کرنے لگی : چاور، کرڑو، بیگھ لاونی، کہندنی وغیرہ ۔

(ث) وقت کے ہاتھوں جب فارسی نے دکھنی لباس اور مہاراشٹری پیراہن پہن لیا تو اُس کے استعمال اور علم میں وہ ساری چیزیں آگئیں جن سے ان کا دن رات کا واسطہ تھا، چھڑی، ٹوکرہ، کوٹھری، کوٹھ، جوڑہ پٹیان ۔ گھڑی، پٹہ، بیٹہ، باولی، کھان ڈاک، تلوہ، لکھوتہ، دو کاوڑا انبہ ۔ چوتھائی ۔ کچہری ۔ چوک ۔ چکلہ، ڈورابو ۔ پیپ[2] (مذکور) ۔

جب یہ معمولی پڑھے لکھے محرروں اور وقائع نویسوں کے ہتھے چڑھی تو انہوں نے اس کی ساری لطافت کی مٹی پلید کر دی : ہزار لوٹ کر دند ۔ بیوپاری کر وند[1] ۔ جیسے مرکب افعال فعال بن گئے ۔

---

[1] دیکھیے فرامین و اسناد سلاطین دکن (حا پجا) بیگار منگوانا (انگوری زبان کا لفظ) ہے ۔ یہی بگڑ کر بیگاری بن گیا ہے ۔

[2] دیکھیے وقائع دکن اور منتخب کاغذات عہد شاہجہانی

لسانی دھارے:

یادو حکمرانوں کی ماتر بھومی۔ اودھ کی سرزمین تھی۔ جہاں لسانی اعتبار سے برج بھاشا اس کے کسی روپ کا بول بالا تھا۔ دکھشن دیس، شمالی ہندستان کی لسانی سرحدوں سے کچھ اتنا دور تو نہیں تھا کہ جب اوّلین صوفی مبلغین دیوگیری آئے ہوں گے تو یادو راج کے باسی ان کی بولیاں سمجھتے نہ ہوں گے؟ "دکھنی ہندوی" کی داغ بیل اسی یگ میں پڑی۔ مگر اسلامی تہذیب کے غالب اثرات کے تحت اس کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کی رسم پڑ گئی۔ دکھنی ہندوی کے ابتدائی ترین ادب پارے اسی لپی میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ عام طور سے صوفیوں کے مذہبی رسالوں پر مشتمل ہے[1]۔

خلجیوں کے بعد ترکوں کی ترک تازیاں شروع ہوئیں تو اس دھرتی نے ان کے پیر پکڑ لئے۔ ترک قبیلوں کے قافلوں نے پڑاؤ ڈال دیئے۔ ان کی قیادت میں لشکر آیا تو اس نے "اوردو" کی چھاؤنی ڈال دی اور جس کے "اردو بازاروں" میں شمالی کے دوکانداروں اور کرخنداروں نے لین دین کا بازار گرم کر دیا۔ ان نوواردوں میں دلی کی گلیوں اور نواحی علاقوں کے گوجروں، جاٹوں اور راجپوتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ شمالی ہند کی ہند آریائی بولیاں ساتھ لائے تھے۔ ترکوں کی مادری زبان ترکی تھی۔ مگر ہندوستان میں ساٹھ برس کے قیام نے ترکی بھلا دی

۱: علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ج۔ ۱ (شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۶۲ء) ص ۳۲-۱۳۱، ۱۳۳، ص ۱۳۶

) . ایران کی برتر تہذیب نے توران میں ترکوں کی ترکی پہلے ہی تمام کر دی
ا ور فارسی کی حلاوت نے زبان کی تلخیاں بھلا دی تھیں ۔ جب ہندوستان
، تو یہاں بھی فارسی کا بول بالا تھا ۔ خسرو جیسے ترک اللہ ع
ــــــ زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم ــ کا اعتراف کرنے
، گئے تھے ۔ جب دکن میں ڈیرے جمائے تو یہاں بھی فارسی بولی آئی تا ۔
لی ڈھونڈھے پائی تا ۔ سننے میں آیا ، ڈراویڈی زبانیں (تلگو ، تامل ، کنڑی ، ملیالم)
یکھنے کا یارا نہ تھا ۔ مرہٹی ان کے ہونٹوں کے کوٹھوں پر بمشکل ہی سے چڑھ سکتی تھی ۔
ائے اُس بولی کے اختیار کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا جو عوام سے رابطہ کا ذریعہ
ہوئی تھی اور یہ ــ شمالی کی ہند آریائی بولی تھی جو ان کی آمد سے پہلے ہی شمالی
صوفیوں کے لئے دکن میں ذریعۂ اظہار بن چکی تھی ۔ یہ دکھنی اردو کا مول روپ
دیم دکھنی تھی ۔ جسے دکن کے تلنگی اور کنڑی علاقوں کے باسی "ترک ماٹ" (ترکوں
بولی) کہتے تھے !

دکھنی اردو :

ــــــ اور اپنے عہد سے بہت پہلے غلط زمانے میں پیدا ہونے والے
دین تغلق کے اشارے پر جب دلی کی سلطنت اٹھ کر دکن کی دہلیز پر آگئی
شمالی ہند کی گنگا جمنی تہذیب کی لہریں دکھنی سنسکرتی کے کرشنا اور کاویری

ا :۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ۔ ج ص ۳۲ ۔ ۳۱ ۔ ص ۱۳۶ ۔ ص ۱۴۰

دریاؤں سے گلے ملنے لگ گئیں۔ لسانی اثرات کے دھارے دراویدی زبانوں کے علاقوں کو سیراب کرنے لگ گئے۔ نظم ونسق کی سہولت کے پیش نظر فارسی ہی سرکاری اور درباری زبان رہی مگر ترکی عہدیداروں اور شمالی کے نوواردوں کی سماجی اور تجارتی زندگیوں کے تانے بانے۔ اردو یا مول اردو کے "گیسوئے منت پذیر شانہ" سے لپٹے ہوئے تھے۔ دکن کے ڈراوڑوں اور مہاراشٹری بولنے والوں کے لئے بھی یہی زبان رابطہ کا ذریعہ بن چکی تھی۔

مرہٹی اور گجراتی کے بعض لسانی اثرات اور چند دراویدی اسماء کو چھوڑ کر دکھنی [اردو] کے تمام غریب الفاظ اور قواعدی خصوصیات دہلی کی کھڑی بولی اور ہریانی کی دین ہیں۔ بعض ماہرین لسانیات دکھنی پر پنجابی کی پرچھائیاں دیکھتے ہیں۔ مرہٹواڑی کے پہلے ہندی کوی اور بھگت نامدیو (۱۲۷۰-۱۳۵۰ء) کی ہندی کویتاؤں میں برج بھاشا کی مٹھاس گھلی ہوئی ہے۔ اور کھڑی بولی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ بہمنی دور کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے جس زبان نے ترکوں کے "اردو" گہوارے میں آنکھیں کھولی تھیں اور اردو بازاروں میں بولنا سیکھا تھا۔ اس نے صوفیوں کے خانقاہوں میں قلم چلانا بھی سیکھ لیا تھا۔

بہمنی دور میں صوفیائے کرام کے اعجاز مسیحائی نے اردو کو طاقت گویائی عطا کی اور ان کے ید بیضاء نے اس کی تحریروں کو جلا بخشی۔ سب سے پہلے حضرت گیسو دراز (۱۳۲۱-۱۴۲۲ء) نے گیسوئے اردو کو اپنے ہاتھوں سے سنوارا اور انہیں کے مبارک

(۱): علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص۴۱، ص۴۲۔ پنجاب میں اردو پروفیسر محمود شیرانی۔ اور دیکھئے تاریخ ادب اردو۔ محمد صادق (انگریزی) آکسفورڈ ۱۹۶۴ء۔ ص۴۳

ہاتھوں سے اردو ادب میں مستقل تصنیف و تالیف کی بنیاد رکھی گئی۔ اسکا دور کے بہمنی معاشرے کا جو نقشہ فرشتہ نے کھینچا ہے اُس میں عمرانی خطوط کے ساتھ لسانی لکیریں بھی نظر آتی ہیں۔ طبقہ واری تقسیم اس طرح تھی۔[1]

(۱) **دکھنی**: یہ لوگ اُن ترک خاندانوں کی اولاد سے تھے جن کی ہجرت کے ڈانڈے علاؤ الدین خلجی کے دھاوے، ملک کافور کے یلغاروں اور ترکوں کی ترک تازیوں سے ملے ہوئے تھے اور جو تغلقوں کے دور میں دکن میں آکر بس گئے تھے۔ بہمنی دور کے اوائل تک ان کی دو تین پشتیں یہاں گذر چکی تھیں (ظاہر ہے ان دکھنی ترک خاندانوں میں مقامی نومسلم گھرانے بھی بیاہ کے بندھنوں کے ساتھ خلط ملط ہو چکے ہونگے) یہ لوگ دکھنی کہلانے لگے تھے۔ اور ان کی زبان دکھنی کہلاتی تھی۔[2]

(۲) **حبشی**: حبش کے حبشی (جن میں افریقہ کے کافر غلاموں کی بڑی تعداد شامل تھی) حبشی زبان یا عربی بولتے تھے (مقامی طور سے یہ سیدی کہلاتے تھے جو بدوی قبائلی نسل اور مصری اور سودانی اصل سے تعلق رکھتے تھے)

(۳) **غریب یا آفاقی**: بہمنی مملکت کی 'بساط ہوائے گل' کے تازہ واردان جو ترکستان۔ افغانستان (تورانی) اور ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ گو اس اجنبی دیس میں غریب یا پردیسی کہلاتے تھے مگر دولت و ثروت ان کے گھروں کی کنیزیں بن چکی تھیں، فارسی ان کے گھروں کی لونڈی تھی۔

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۵۷، ص ۹۲۔۱۹۶

[2]: ایضاً۔

احمد شاہ بہمنی کے عہد میں دیسی اور پردیسی کا ٹکراؤ اور شیعہ سُنّی کا الجھاؤ علاحدگی پسندی اور انتشار پیدا کر رہے تھے۔ ترکؔ، عربؔ، مغلؔ (غالباً تاتاری) اور ایرانی ایک طرف صف آرا تھے تو ان کے بمقابل حبشی اور دکھنی تھے جو آفاقیوں کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے، عدم اعتمادی، حسد اور قومی عصبیت نے دکھنی گروہ کو پردیسیوں کی غریب زبان سے اجتناب کرنا سکھا دیا تھا ــــ (سوائے بحالت مجبوری یا برائے آداب درباری اور کاروبار دفتری) لہٰذا دکھنی میں بول چال سیاسی چال بھی تھی اور خفیہ گفت وشنید کا چلن بھی تھا۔ پھر خود بہمنی حکمراں اپنی ہندو رعایا کا دل جیتنے کے لیے دکھنی کی من موہنی بھاشا کو بڑھاوا دینے کی کوششیں کرتے تھے۔ یہ خود کنڑی اور تلنگی زبانوں میں گونگے نہ تھے۔

عادل شاہی دَور ــ کی پہلی صدی میں آفاقیوں کے غلبے کے سبب ایرانی اثرات اور شیعی محرکات نے ہندوستانی ثقافت کی ترقی کا منہ پھیر دیا تھا اور دکھنی بولی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ حالانکہ ابراہیم عادل شاہ (اول ۱۵۳۴ تا ۱۵۵۷ء) نے تسنّن کی تجدید کی، فوج اور دربار کی ملازمتوں سے آفاقیوں کی تخفیف کی اور ہندوی [دکھنی]۱ کو ترویج دینے کی غرض سے اسے دفتری زبان کا درجہ دیا مگر یہ سب تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ جب اس کے جانشین نے بساط پلٹ دی۔ مگر اس دَور کی دوسری صدی ہندوستانی تہذیب اور مسلم ثقافت کے لئے بارآور ثابت ہوئی۔

---

۱ : محمد صادق ص۴۳-۴۴

جب دونوں کی مشترکہ قدروں کی۔ جن کی آبیاری بہمنی عہد سے ہو رہی تھی۔ ایک نئے دکھنی کلچر میں نمودار ہو گئی۔

کچھ سیاسی مصلحت کا تقاضہ تھا اور کسی حد تک سمجھوتہ بازی تھی۔ جس کے سبب ایرانی اثرات رکاوٹ نہیں بننے پائے۔ بلکہ قند پارسی نے طوطیان ہند کو شکر شکن بنا دیا۔ اور جب اس کے حسن و جمال کا پرتو دکھنی زبان اور ادب پر پڑا تو اس کا حسن بھی زہد شکن بن گیا۔ اور اب اس "نو بہار تازہ" کی آنکھوں کی سرمئی تحریر یں اور چہرے کے غازے سے پچھلے جیسا الھڑ پن نہیں جھلکتا تھا۔ بلکہ اس کے عشوۂ ناز اور غمزۂ اسلوب میں پختگی آ گئی تھی۔ اور اس کے اصناف سخن کے سارے خطوط نمایاں اور تیکھے بن گئے تھے۔ اسے چونکہ سلاطین وقت کی سرپرستی حاصل تھی اسی لئے دوران کے منہ لگ گئی۔ اور جب ملوک و سلاطین کے منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ تو کلام الملوک۔ ملوک الکلام بن گیا۔ محمد قلی قطب شاہ جیسے دکھنی کلچر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے دکنی میں ایک کتاب نورس یادگار چھوڑی ہے۔ جو اس کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ "نورس" پر درباری شاعر ظہوری نے اپنا مشہور دیباچہ تحریر کیا ہے۔ جو فارسی ادبیات میں "انشاء غنائیہ" کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نظام شاہی :- دولت آباد اور خلد آباد میں جیسے صالحین اور مشائخین کے تقدم ہمت لزوم کے سبب "روضہ" کہتے تھے صوفیوں کی خانقاہوں میں اردو پروان چڑھ چکی تھی۔ بہمنیوں کے زوال کے بعد چونکہ نظام الملکی مملکت کا حصہ بن گئے تھے۔ اسی لئے ان علاقوں

کا جہاں اردو کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی انضمام اردو کی ترقی و اشاعت میں کافی اثر انداز ہوا ہوگا کیونکہ اردو زبان کی ترقی کا دور احمد نگر کے سیاسی زوال کا دور تھا۔ احمد نگر میں دکھنی اور پردیسی اختلافات اور سیاسی زبوں حالی کے باوجود دکنی کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پڑی تھی۔ دکنی عوام تو خیر سے اپنی اسی مادری زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن برہان ماثر کے ایک واقعے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض اوقات آفاقی اور غیر ملکی بھی اسی زبان میں گفت و شنید کرتے تھے۔ بہادر شاہ گجراتی اور احمد نظام شاہی کی "صاحب سلامت" (ریختہ) اردو میں ہوتی تھی۔ دکھنی زبان کے شعرائے متقدمین اور اولین مصنفین کی فہرستوں میں شمالی اور دکنی خطوں کے سیکڑوں نام نظر آتے ہیں۔ مگر ایسا کوئی نظر نہیں آیا۔ جس کا تعلق کوکن کے اس دور سے رہا ہو یا پھر اسی کی خاک سے اس کا خمیر اٹھا ہو، جبکہ یہ علاقہ بھی، عادل خانی اور نظام الملکی مملکتوں میں منقسم ہونے کے سبب قدیم دکھنی سے متاثر ضرور ہوا ہوگا۔ جیسا کہ مسلم کوکنی بولی کے کنیڈے سے پتہ چلتا ہے جس میں فارسی و عربی کے علاوہ شمالی کی کھڑی بولی اور ریختائی (یا بالفاظ دیگر، دکھنی) کی ہلکی سی چھاپ نظر آتی ہے۔

ے: برہان ماثر ص ۱۸۳

گیارہواں باب

نوآبادیاتی نظام کی بنیاد کوکن میں

ایشیاء کی اشیاء اور مصنوعات بحیرۂ احمر یا خلیج فارس کے ذریعے مغربی ممالک میں پہنچائی جاتی تھیں۔ ترکی اور مصر دونوں راستوں پر محصول وصول کرنے کے لئے ہاتھ پھیلائے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ اسلامی ریاستیں تھیں جنہیں صلیبی جنگوں میں شکست کھائے ہوئے نصرانی اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ بیرونی تجارت پران کی اجارہ داری اور اقتصادی خوشحالی متعصب اور مسلم دشمن پرتگیزوں کو خون کے آنسو رلاتی تھی لہٰذا اُنہوں نے مسلمانوں کا خون بہانے کے لئے تلواریں سونت لیں اور سُولی پر چڑھانے کے لئے صلیب بلند کرلی۔ اب اُنہیں ایک ایسے محور کی تلاش تھی۔ جہاں سے نصرانیت کی تبلیغ گردش کرسکے اور ایک ایسے محاذ کی جستجو تھی جوان کے

ؑ ہند کی معاشی حالت ص ۱۳۱

قومی مفاد اور تجارتی اجارہ داری کی مدافعت کرکے خشکی پر سلطنت قائم کرنے کی بجائے
اُنہوں نے سمندروں پر حکمرانی کرنے کی ٹھانی تاکہ معصوم مسلمانوں کا خون بہے تو سمندروں میں
بہہ جائے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کا خون انہیں سستا دکھائی دیا — !!!

سولہویں صدی کی پو پھوٹ رہی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی اُفق کو مسلم
حکومتیں تابناک بنا رہی تھیں۔ مگر یہ بکھرا ہوا نظام شمسی تھا جو ابھی تک اپنے محور
کی تلاش میں تھا۔ بہت ساری قوتیں جب ایک ساتھ اُبھریں تو تصادم ناگزیر بن
گیا۔ سیارے آپس میں ٹکرانے لگے تو تباہیاں آنے لگیں۔ اقتدار کی جنگ
شروع ہوئی تو اس کی قربان گاہ پر انسان بھینٹ چڑھایا جانے لگا۔ ملوکیت
استبدادیت میں ڈھلنے لگی تو معاشرہ کے ذہین افراد کے دماغوں پر چھریاں
چلنے لگیں۔ خود اُنہوں نے ذہنوں میں پناہ لے لی اور عوام کو مٹھوں اور خانقاہوں
میں پناہیں دیں۔ بھگتی تحریک اور تصوّف دراصل ملوکیت کے خلاف دانشور
طبقے کا خاموش احتجاج تھا۔ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں جہاں چیتنیہ
کبیر داس اور گرو نانک جیسے بھگتوں نے اپنا مقام بنایا ہے۔ وہاں نچلے طبقے
کے دستکار: رائے داس (چمار) سین (نائی) دادو (بنا) اور دوسرے
دھارمک اور سماجی سدھارکوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ جس خون آشام
شام کا ذکر ہو رہا ہے وہ اسی پندرھویں اور سولہویں صدی کے دوراہے پر سر پہ
کھڑی تھی۔ ہندوستان کا جمہور طبقہ بھگتی مارگ پر چل پڑا تھا۔ پھر شمالی ہند
میں کوکن کی تشویشناک خبروں نے یاسیت اور کرب کے اندھیروں کو اور
بھی گہرا کر دیا۔ کوکن کے کنارے مظلوموں کے خون میں ڈوبے جا رہے تھے۔

بحرِ ظلمات سے اٹھتا ہوا سیاہ طوفان اب مغربی ساحل پر اپنی تباہیاں پھیلا رہا تھا۔
امیر البحر ماجد کی رہنمائی میں پرتگیزی امیر البحر داسکوڈے گاما "مسالے اور مسیحیوں"
کی کھوج میں کالیکٹ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو چکا تھا۔

صلیب کی پھانسی:

صلیب کے بہروپیے سوداگر، ہندو مسلم عوام کی وطن دوستی اور حریت پسندی
کی آزمائش دار و رسن سے کر رہے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اندلس
میں اسلامی سطوت کو کھنڈر بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو بھی
مصلوب کر کے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا جائے۔ وہ عرب سوداگروں اور نوائطی
تاجروں کے سخت دشمن تھے۔ یہی لوگ بحری تجارت میں فرنگیوں کے حریف تھے
اور انہیں کے ہاتھوں میں ساحلی تجارت اور حکومت کی باگیں تھیں۔ اور اس بیرونی
تجارت کے ڈانڈے مصر و عرب سے ملے ہوئے تھے۔ پرتگیز: تجارت، دولت
اور نصرانیت کو اپنے آدرش کی "تثلیث" بنا کر ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کی نیو رکھنا
چاہتے تھے۔ تجارت میں دراصل حصولِ زر اور سرمائے کی چاہ تھی اور وہ حرص و
طمع کا چمکتا چہرہ بینواؤں کو دکھا کر عیسائیت کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔
ان کے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں ننگی تلوار تھی۔ یسوع مسیح کی سفید
بھیڑیں۔ ہندوستانیوں کے لئے بھیڑیئے بن رہی تھیں۔ پرتگیزی مبلغین
میں چند بے لوث ولی بھی تھے۔ جو مسیحائیت کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور زخمائے
دل کی مسیحائی بھی۔

پرتگیزی استیلاء اور استحصال کے پھیلتے بڑھتے گرداب نے سب سے پہلے کالیکٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تجارتی تنازعات حکمتِ عملی کی شروعات بن گئیں۔ پرتگیزی استبدادیت کا بھنور بڑھتا بڑھتا مصر و ترکی کے مملوک سلطان کے تجارتی بیڑوں کو بھی محیط کر رہا تھا۔ بحری تجارت کے سب سے بڑے اجارہ دار یہی عرب مسلمان تھے۔ اس حریفانی میں پرتگیز۔ خدائی فوجدار بن بیٹھے۔

گجرات کا محمود شاہ بیگڑا ادھار کھائے بیٹھا تھا کیونکہ سنہ ۱۵۰۷ء میں پرتگیزوں نے تھانہ کے ہندو رائے کو شہ دے کر شاہِ گجرات کے خلاف سرکشی پر آمادہ کر لیا تھا مگر ممبئی اور وسئی پر مظفر شاہی دھاک[1] بیٹھ جانے سے تھانہ کا راجہ بھی چپکا بیٹھا رہا۔ پرتگیزوں کی سیاسی شرارت سے چڑ کر شاہ گجرات نے کالیکٹ کے زمورن راجہ اور سلطانِ مصر سے معاہدہ کر لیا ہمصری جنگی بیڑے کے لئے وسئی سے کوکن کے جنگلوں کے شہتیر مکۂ [معظمہ] بھیجے جانے لگے اور جب بیڑا تیار ہو گیا تو والیٔ مصر قنصور الغوری[2] نے اسی سال حسین کردی حاکم جدہ کو امیر البحر

۱: فرشتہ (ترجمہ برگس) ج ۴ ص ۷۵-۷۴

۲: مہاراشٹر پردیش گزیٹیر (رتناگری) میں یوں تو اسلامی ناموں کے صحیح تلفظ سے بیحد غفلت برتی گئی ہے۔ مگر بعض تاریخی اسماء کے اندراج میں بھی فاضل مرتبوں سے تسامح ہوا ہے، جبکہ سابق برطانوی گزیٹیرس کے مصنفوں نے صحتِ زبان کا جو اعلیٰ ثبوت دیا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے۔ مثال کے طور پر "قنصور الغوری" کو "منصور غوری" (Mansoor Ghory) (دیکھئے صفحہ ۱۲۹) لکھ کر اسے خلیفۂ مصر کا امیر البحر بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ تمام مصادر متفق ہیں کہ یہ امیر حسین کردی ایک ایرانی تھا۔ دے کنہا ص ۱۳۱-۱۳۰ اور گزیٹیر ضلع تھانہ۔ ج ۱۳۔ ح ۲۔ ص ۴۴۸

بنا کر فرنگیوں کے خلاف بھیجا۔ گجراتی حکومت کا امیر البحر ملک ایاز جو دیو میں متعین تھا، اپنے جنگی بیڑے کو لے کر نظام شاہی سلطنت کی واحد بندرگاہ چیول پہنچا دابھول کا بحریہ بھی آن ملا، نظام الملک جو ایک معاہدے کی رو سے پرتگیزوں کا دوست تھا۔ چپ سادھے بیٹھا رہا۔ حالانکہ ابھی ابھی پرتگیز غارت گر چیول کی بندرگاہ میں نوائطی تاجروں کے جہازوں سے گھوڑے اور مالِ غنیمت لوٹ کر گووا لوٹے تھے۔ جہاں انجدیو کے جزیرے میں گووا کا پہلا وائسرائے ڈوم فرانسس ڈالمیڈا مورچہ سنبھال چکا تھا۔ بائیس جنگی جہازوں کے بیڑے اور پندرہ سو تربیت یافتہ بحری فوجیوں کی طاقت پر اسے گھمنڈ تھا اور سب سے زیادہ ناز اپنے نوجوان جانباز بیٹے ڈوم لارنیکو ڈالمیڈا پر تھا جو کننے نور اور چیول کی مہموں سے فتحیاب ہو کر آچکا تھا۔ اور اب اس کا جنگی بیڑا چیول کے دہانے پر کھڑا اور اس کے سپاہی بندرگاہ میں مورچہ سنبھالے اتحادی بیڑوں کے منتظر تھے۔

چیول کا تجارتی موسم آچکا تھا اور اندرونِ ملک سے بیوپاری اپنا تجارتی اسباب باربردار بیلوں پر لاد کر لا رہے تھے۔ کہ بندرگاہ کی طرف سے جنگ کی خبریں آنے لگیں۔ چیول میں یہ ہندوستان کی پہلی صلیبی جنگ تھی۔ پانی میں آگ لگ چکی تھی۔ تین دن دھوئیں کے بادلوں نے جاڑے کے کہر آلود سورج کو اور دھندلا دیا اور دو رات۔ سربلند مستولوں، ساگوانی تختوں، ناریل کے بٹے ہوئے بل کھائے ہوئے رسّوں اور اطلسی بادبانوں کے جلنے کی وجہ سے دور دور تک چراغاں ہوتا رہا مگر مسلمانوں

اور دشمنوں کے گھروں کے ہزاروں چراغ بجھ گئے، فرشتہ کا اندازہ ہے کہ چار
سو ترکوں نے جام شہادت نوش کیا اور چار ہزار فرنگی فی النار جہنم ہوئے"۔ ان میں
لارینسکو بھی تھا جو جرات اور شجاعت کی اعلیٰ مثال قائم کرکے اس جنگ میں گرا۔"
مگر پرتگیزی استعماریت کی بنیاد کھڑی کرتا گیا۔ وہ اپنے ملک کا مایۂ ناز فرزند
شمار[1] ہونے لگا، پرتگیزی رزمیہ ناموں کا وہ رستم بن گیا۔ پرتگیزوں کی یہ پہلی شکست تھی اور
ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی اور غالباً آخری شاندار فتح۔

اس فتح نے ہنگامی طور پر سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑا دی اس لئے
کہ یہ نوآبادیاتی نظام کی اس سرزمین پر پہلی شکست تھی۔ ہر زبان پر امیر حسین کا نام
تھا اور ملک ایاز کی تعریف تھی، جنہوں نے فرنگیوں کے دیو پیکر جہازوں کو نذر
آتش کر دیا تھا۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ مگر ڈوم فرانسس
ڈالمیڈا کا بوڑھا دل اپنے بیٹے کی جواں مرگی سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ وہ کئی
دنوں تک اس کا سوگ مناتا رہا۔ مگر بوڑھے فرانسس کا سوگوار دل اپنے بیٹے کی موت
تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ گو افواہوں میں اس کا اقرار تھا۔ دل نے نہ مانا
تو ایک یوگی کو کھمبایت[2] بھیجا جہاں پرتگیزی قیدی رکھے گئے تھے۔ اس واسطے
کہ شاید اس کا بیٹا ان کے ساتھ زنداں میں ابھی تک زندہ ہو مگر اس کا پتہ کسی
کو نہ تھا، کف آلود لہروں نے اس کی لاش کو نہ جانے کس ٹھکانے لگا دیا تھا۔

۱: دے کہا۔ ص ۲۹ اور ص ۸۳-۸۲ (فٹ نوٹ بھی دیکھئے)

۲: ایضاً۔

بوڑھے فرانسیس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک چکی تھی جس کے شعلوں میں سارا مغربی ساحل جلنے لگا۔ سب سے پہلے دابھول پر فرنگیوں کا قہر ٹوٹا۔

دابھول : وا شِشٹی (یا انجنویلی) ندی کے کنارے پہاڑی کے دامن میں آباد اطالوی سیاح ورتھیمہ کو اپنے دیس کے ایسے ہی کسی شہر کی یاد دلاتا تھا جس کے اردگرد مغربی طرز کی حصار بندی تھی جس سے چھ میل دور بہتے ہوئے سمندر کی لہریں کھاڑی کے پانی سے مل کر بھرتی کے وقت سر ٹکراتی رہتی تھیں مصطفےٰ آباد یا خضر آباد اب (ممبئی، چیاتم اور تھانہ) کی طرح "نوائطی سوداگروں کا شہر تھا" یہاں کھپریلوں کی پوشش والی شاندار حویلیاں قدیم عالیشان مسجدیں اور ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہیں تھیں۔ گھاٹ سے لے کر ندی کے کنارے دور تک خوبصورت پختہ مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں کے قلعہ میں چھ ہزار محافظ فوج رہتی تھی جس میں پانچسو ترکوں کا دستہ تھا۔

۱۵۰۸ء کی زندگی کے دو دن رہ گئے تھے، دیو اور کھمبایت کے بنئے بیوپاری اپنے چار بادبانوں والے بٹیلوں اور کاٹھیاواڑی "کوتھیا" کشتیوں میں بیٹھے پائی پائی کا حساب کر رہے تھے، مکہ، عدن، اور ہرمز کے ایرانی اور عرب سوداگر اپنے تجارتی دباؤں اور دھنگیوں سے تانبا، پارہ، چاندی

۱؎: ورتھیمہ کا بیان (Badger's Varthema ص۱۱۵) گزیٹیر ضلع رتناگیری ج۲ ص۳۲۸ (فٹ نوٹ بھی دیکھئے)

اور شنگرف کے خروار اُتار رہے تھے اور گھوڑوں کو ہنکا کر گھاٹ اُتارنے لیجا رہے تھے۔ ملیباری اپنے بگلہ اور بوتیل بار بردار کشتیوں میں سوتی کپڑوں کے گٹھے اور گیہوں اور سبزیوں کے بورے اور ٹوکریاں رکھ رہے تھے۔ ندی کے کنارے کنارے ڈھلوان پہاڑی کی ترائی میں دُور تک زندگی پھیلی ہوئی تھی، بوجھ اٹھانے والے حبشی غلاموں کے شور و شغب میں گرگھوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں ڈوب رہی تھیں۔ شوقین نوائطی امراء اپنے سجے ہوئے نفیس بجروں میں "کشتی رانی" کے مزے لوٹ رہے تھے جس شوق کی خاطر بہمنی بادشاہ دابھول آیا کرتے تھے۔ گھاٹ کے قریب مسجد کی شمالی دیوار سے ملحق حجروں میں مسلمان مسافر اور درویش حیوّل کی فتح پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اعظم خاں پیر کی درگاہ میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ کہ فرنگیوں کی آمد کا شور مچ گیا۔ ان کی متوحش آنکھوں نے "کرسٹانوں" کے اینس جنگی جہازوں کے بیڑے کو گھاٹ کی طرف رینگتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بیرہ سو انگریزی اور چار سو ملیباری سپاہیوں نے شہر پناہ کو تین طرف سے گھیر لیا۔ اور شہر کے تینوں بڑے دروازوں کے آگے ڈٹ کر مورچہ سنبھال لیا۔ محصورین کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کیا مگر گولے اتنے اونچے جا رہے تھے کہ پانی میں آگ لگ رہی تھی۔ محاصرین فصیل کے نیچے پہنچ کر لاشوں کے پشتوں سے ایک دوسرا احصار بنا چکے تھے۔ محافظ فوجی اب خود محفوظ

۱: گزیٹیر ضلع رتناگیری ص ۳۳۲۔ باربوسا کا بیان (سٹینلی) ص ۷۲

۲: تاریخ فرشتہ (ترجمہ) ج ۲ ص ۵۴۳

نہ تھے۔ سروں کی فصلیں کٹ کر فصیلیں بن گئیں۔ بربریت ننگی ہو کر ناچنے لگی مسلمان عورتوں اور بچوں کو مسجدوں میں بھی پناہ نہ ملی۔ انتقام کے زہر میں بجھی ہوئی تلواریں نو انٹلوں کے خون سے پیاس بجھا رہی تھیں اور جب لاشوں کے کھلیان بھر گئے تو آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر جل کر خاکستر بن گیا۔ پرتگیزی درندگی اور بہیمیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ برسوں تک بد دعا دیتے وقت یہی کہا کرتے تھے کہ "خدا کرے فرنگیوں کا قہر تم پر بھی ایسا ہی ٹوٹے جیسا کہ دابھول پر نازل ہوا تھا"[1]

عادل خانی صوبے دار (مصطفیٰ خاں) نے دابھول کے جھلسے ہوئے ویرانے اور کھنڈر سے دور دریاؤں اور گھاٹوں کے قدیم اور مقدس شہر سنگمیشور کو اپنا صدر مقام بنا لیا اور جب باربوسا سیاح ۱۵۱۴ء میں الکنڈہ اور دُورنہ ندیوں کے سنگم پر آباد "سنگونگر" آیا تو یہ مملکت عادل شاہی کے دوسرے شہر عادل آباد یا پانڈہ (ولایت) کی طرح ترقی پر تھا۔ (یہاں دکن اور ملیبار سے تجارت ہوتی تھی اور دیو، عدن اور ہرمز کی کشتیاں ٹھہرتی تھیں)۔ سنگمیشور میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم ہو چکا تھا [کیونکہ نواحی جنگل کے بہترین شہتیر "شیشم" قسم کے جہاز بنانے کے لئے نہایت موزوں تھے][2] اس سے قریب جے گڑھ ابھی تک قزاقوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ لیکن سنگمیشور اور پانڈہ کی تجارتی ترقی سے دابھول

---

[1]: دے کنہا ص ۳۲؛ تاریخ فرشتہ (ترجمہ) ج ۲۔ ص ۵۰۰

[2]: گزیٹیر ضلع رتناگیری۔ ج ۱۔ ص ۳۷۲

کی رونق پر کبھی اوس نہ پڑی بلکہ ہمیشہ نکھرتی ہی رہی۔ اور آگرچہ اجڑ اجڑ کر بستا رہا۔ گو اگلے پچاس برسوں (۱۵۵۰ء) تک یہ پرتگیزی غارتگری کا نشانہ بنا رہا مگر ہر دفع کبھی تو قطبی ' ہندو اور بنیا بیوپاریوں نے اس کی تجارت کو ترقی دی اور کبھی ایران سے تجارت کی تجدید ہوئی تو دنیا بھر کے لوگوں کا ہجوم اکٹھا رہنے لگا۔ گو اس کی آبادی ۱۵۴۷ء میں صرف چار ہزار نفوس[۱] پر مشتمل تھی۔

بوڑھا فرانسس، جس کا دل رحم و مروت کے جذبات سے خالی ہو چکا تھا اور جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی سلگ اٹھا تھا۔ اپنے سب سے بڑے دشمن گجراتی بادشاہ کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا تھا۔ دابھول کی بربادی کے ایک ہفتہ بعد فرانسس کا بیڑا بمبئی کی کھاڑی بندورہ (باندرہ) میں سامان رسد لوٹنے کے لئے داخل ہوا۔ بیس مسلمانوں پر مشتمل ایک گجراتی پڑاؤ کو لوٹ کر بھی خاطر خواہ سامانِ خورد و نوش حاصل نہ ہو سکا۔ چند مسلمانوں کو مہائم کے ہندو حاکم کے پاس بھیجا اور ان کے پیچھے چند پرتگیزوں کو روانہ کیا جنہوں نے قلعہ کے پاس سے چوبیس بھیڑوں کو اٹھا کر گھاٹ کی طرف ہنکا دیا۔ (معلوم ہوتا ہے کہ مہائم۔ باندرہ میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہمیشہ سے پائے جاتے تھے) مہائم کا آئے (ممبئی کی پہاڑیوں [وڈالا - یا سیوہ دسیو] کی طرف بھاگ گیا اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ کیونکہ دابھول کے جلنے کی آنچ جزائرِ بمبئی تک پہونچ چکی تھی۔

---

[۱] : گزیٹر۔ ضلع رتناگیری ص ۳۲۹

تیزوں کی چھریاں تیز تھیں۔ جیالم ہی میں شقاوت کے مذبح خانے میں
یں کاٹی گئیں۔ اور جزیرے کے کالے انسانوں "کو ذبح کر دیا گیا گھگوڑ
جر نے بارہ بورے چاول اور بارہ بکریاں فرنگی بھیڑیوں کو بھیج کر جان
پائی۔ پرتگیزی بیڑا دلو کی طرح تنکم سیر ہو کر دیو کی سیر کے لئے چل پڑا ۔
ستے میں بسئی پڑتا تھا جو ان کی یورش سے اس وقت محفوظ رہا (ابھی اس
پرتگیزی تسلط ہونے کے لئے سترہ سال باقی تھے) اس خوبصورت بستی
پرتگالیوں کے دشمن نوائتی بڑی تعداد میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے
تھے سپاری ناریل اور جنگلی کھجوروں کے پیڑوں کے گہرے سبز جھنڈوں میں
چھپی ہوئی اس کی بندرگاہ میں دیس بدیس کی کشتیاں آکر ٹھہرتی تھیں۔ ملیباری
قلے اور بوتیں یہاں گرم مسالے کی تجارت کے لئے آتے تھے جس کی یہاں
ری مانگ تھی [۲] بسئی گجرات کی مظفر شاہی کے زیر اقتدار تھا۔

فروری ۱۵۰۹ء: فرانسس دیو پہنچ چکا تھا ایک معاہدے نے
ملک ایاز کو حکومت پرتگال کی ایازی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب
نظام الملک سے مؤاخذہ کرنا باقی تھا جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے
سازش کو پرورش پاتے ہوئے دیکھ کر بھی مسلمانوں کے جنگی بحریہ کو چنول
سے باہر نکالا نہیں تھا۔ اس کی یادداشت میں اسے بھی شاہ پرتگال کا باجگذار
بننا پڑا۔ [ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا] ایک دوسرا عہد نامہ مرتب

[۱]: گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۲ ص ۲۵-۲۷
[۲]: دوارت باربوسا کا بیان۔ دے کنہا۔ ص ۱۳۳

ہوا جس کی قرارداد میں بندر چیول اور تجارتی جہازوں کی حفاظت شامل تھی۔ پانچ سال کے بعد گوآ کے وائسرائے کا ایک تجارتی نمائندہ چیول میں (جسے اب پرتگیز "چاؤل" کہنے لگے تھے (Feitor) متعین کر دیا گیا جس کے ذمہ گوا میں اور جنگی بیڑوں کو سامان رسد پہونچانا ہوتا تھا۔ ۱۵۱۶ء میں گوا کے نئے وائسرائے لوپو سوارس نے برہان نظام شاہ کی کمیتی کا فائدہ اٹھا کر ایک تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اور اس طرح نوآبادیاتی نظام کا پہلا بنیادی پتھر کوکن کی سرزمین میں گاڑ دیا گیا۔ پرتگیزوں کو بندرگاہ میں مداخلت کا پورا اختیار مل گیا اور بندر کے کنارے فرنگی نوآبادکاروں کی پہلی "نوآبادیاتی بستی" بس گئی۔ گو چاؤل شہر اور مضافات میں نظام شاہی برقرار رہی (کم از کم ۱۶۲۵ء تک) اور مسلم چیول پر شیخ کی عملداری کا دائرہ آہستہ آہستہ سمٹنے لگا۔ نئے آقا۔ پرتگیزوں کی دوستی کی پائیداری شیخ چیول کی وضعداری بن گئی تھی۔ بندرگاہ چاؤل کی ناخدائی ملتے ہی پرتگیزوں نے تجارت کے پیچوں کو سنبھال لیا کیونکہ یہ اس وقت کسی بین الاقوامی بندرگاہ سے کمتر نہ تھی۔ اور اسی بندرگاہ سے پرتگیزی استعماریت کے تجارتی، سیاسی اور مذہبی مفادات کے ڈانڈے ملے ہوئے تھے۔ اب پرتگیزوں کے جہاز بلا روک ٹوک ممبئی کی کھاڑیوں تک آجا سکتے تھے۔ گو چاؤل کا شمار (مغربی سیاحوں کے معیار کے مطابق) بڑے شہروں میں نہ ہوتا تھا لیکن اس وقت اس کی منڈی اور بندرگاہ نظام الملکی مملکت

ہیں سب سے عظیم تصور کی جاتی تھی۔ تجارت کا دارومدار موسم پہ تھا۔ یہاں خلیج فارس اور عرب ممالک کے تاجر اپنے دھاؤ جہازوں میں گھوڑے اور کھجور لاتے تھے اور اس کے عوض (سونے کے پھل (ناریل) لے جاتے تھے۔ ملیباری تاجر اپنے شبیرا اور بگلہ جہازوں میں ناریل، سپاری، مسالے، دوائیات تباشیر اور کرنڈ گجراتی بیوپاریوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لئے لاتے تھے۔ یہاں سے وہ گیہوں، سبزیاں، باجرہ، چاول، تل، تل کا تیل گوڑ اور کنارہ لے جاتے تھے۔ اور یہی جہاز گجرات کا سفر کرتے تو کپڑوں کے تھان چیول سے لے جاتے تھے کیونکہ [دکن] کے نفیس ململ ----
اور مقامی سوتی کپڑوں کے ملبوسات کی تجارت بھی انہیں سے دامنگیر تھی۔ مقامی کرگھوں پر بنے ہوئے کپڑے کو بیرانی کہتے تھے۔ گجراتی بیوپاری انہیں کپڑوں کو دیو کے راستے عرب و ایران لے جاتے تھے۔ پرتگیز اپنے دیو کی تجارتی کوٹھی سے (جسے البوقرق نے ۱۵۱۲ء میں قائم کر لی تھی) مکہ معظم سے لائے گئے شنگرف، تانبا اور پارہ۔ سونے کے بھاؤ بیچنے کے لئے چیول لاتے تھے۔ تانبا کی مانگ بہت زیادہ تھی کیونکہ اندرون ملک میں برتن باسن بنانے اور سکے ڈھالنے کے لئے اس کی بے حد ضرورت پڑتی تھی۔ ان معدنیات کے مبادلے میں ہندوستان کا سونا اور مسالہ سمٹ کر پرتگال جا رہا تھا اور جہاں خوشحال زندگی کا سنہری دور شروع ہو چکا تھا۔

---

(۱): دے کنہا ص ۳۳ ۔ باربوسا کا سفرنامہ کا ترجمہ ہنری اسٹینلی (لندن ۱۸۶۶ء) ص ۶۷-۶۹

ہندوستانی صلیبی جنگ :

چاؤل کی بندرگاہ پر پرتگیزوں کا تسلط ہوتے ہی انہوں نے دستِ تطاول بڑھانا شروع کر دیا۔ ان کے بادبانی "گیلی" چھوٹے "کیراویل" اور دو مستولی "برگن ٹائن" تھانہ، تمبیم (تھانہ بمبئی۔ جہائم) کی کھاڑیوں تک دھاوے مارنے لگے۔ مقامی تاجروں کے جہانگری اور بڑاؤ اور نوالطی تاجروں ملاحوں اور ماہی گیروں کے جھوٹوں اور دو بادبانی کشتیوں کو لوٹنا پرتگیز لیڈروں کا شیوہ بن گیا۔ دیو سے لے کر اپنے پرانے مقبوضہ ہرمز تک تاخت و تاراج کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ دابھول پر پرتگیزی قہر کا آئے دن ٹوٹنا ایسا ہی ہو گیا تھا۔ جیسے مظلوم مسلمان بیواؤں اور یتیموں کی سوگوار آنکھوں سے آنسوؤں کا ٹوٹنا۔ کبھی مہائم کے قلعہ دار شیخ جی کے سامنے بحیرۂ عرب سے آنے والے عرب دُہاؤ پر دھاوا مارا اور قلعہ پر بمباری کی تو کبھی ماہی کے چھ جلپوؤں اور مستولوں والے سوال (مچھوے) کو جنول سے مار بھگایا۔[۱]

۱۵۲۱ء میں والیٔ احمد نگر برہان نظام شاہ اور بہادر شاہ گجراتی کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ شاہ گجرات کی ملکی توسیع پسندی سارے دکن کو محیط کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ خود دیکھ رہا تھا کہ اجنبی سوداگر تجارت کے بہانے اب سیاست کے بیوپاری بنے بیٹھے تھے اور نظام الملک

---

۱ : بمبئی کا عروج - ایضاً۔

اپنی مملکت کے ایک اہم شہر چاؤل میں انہیں تو آبادی قائم کرنے کی اجازت دے کر یہ سوچ بیٹھا تھا کہ ہوئے ہم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو، لیکن یہ آسمان کی نہیں زمین کی بات تھی جو ان کے پیروں تلے سے سرک کر بنگال دیس کی طرف کھسک رہی تھی۔ ادر بیجا پور کا نیا بادشاہ اسمٰعیل عادل شاہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے اجنبی قدموں کے سارے نقوش عادشاہی سرزمین سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ ۱۵۲۲ء میں دابھول دوبارہ راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا اور عادل شاہ کے سینے میں انتقام کی چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ اور پھر ایک دن شعلوں نے چاؤل کو لپیٹ میں لے لیا۔ اب تو نظام الملک آگ بگولا بن گیا۔ اس نے اپنے سفیر لطیف خان کو گورنر ڈی گو لوپے داسیکویرا کی خدمت میں ایک قلعہ کی تعمیر کا منصوبہ پیش کرنے کے لئے بھیجا۔ صیاد تو تاک میں بیٹھا تھا پھر موقع بھی اچھا تھا کیونکہ شیخ خیول کی موت کے بعد موروثی عہدہ کے لئے دو بھائیوں شیخ احمد اور شیخ محمد میں چپقلش چل رہی تھی۔ خیول کی مسلمان بستی کے نیچے دو میل کے فاصلے پر رلیوڈنڈا میں کھاڑی کے شمالی ساحل پر جو عسکری اہمیت رکھتا تھا قلعہ کی تعمیر کی بنیاد رکھی جانے لگی۔ نئے معاہدے کی رُو سے پرتگیزوں نے نظام الملک کو گھوڑے فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا تاکہ وہ اپنی گھڑسوار فوج سے پرتگیزوں کی بہادر شاہ کے خلاف مدد کر سکے۔[۱] (دنیا ہے تو دُکھ ہے۔

---

[۱] : دے کنہا ۔ ص ۳۵

گھوڑے ہیں تو بدھو ہیں۔ ہندوستان میں کہاوت مشہور تھی) دکن ہمیشہ سے گھوڑوں کا محتاج رہا ہے۔ یہاں تک کہ خود اسماعیل شاہ دابھول کے حادثے سے دو سال قبل دشمنی اور غیرت کو پیروں تلے کچل کر پرتگیز وائسرائے سے گھوڑوں کی فراہمی کی بات چیت کر چکا تھا)

قلعہ بننا شروع ہوا تو ملک ایاز کی غیرت غزنوی کو غیظ آیا۔ اور پچاس کے قریب لڑاکو غرابوں کو لے کر چاؤل کے دہانے پر آ کر شیر کی طرح غرانے لگا۔ قلعہ کی تعمیر میں رکاوٹ پڑنے لگی گو حفاظتی بحری دستے کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر تعمیر میں کھنڈت نہ پڑی اور ملک ایاز تو تین ہفتوں سے زیادہ گھیرا نہ ڈال سکا اور اس کا دیرینہ ساتھی حاکم جیول شیخ محمد دل مسوس کر رہ گیا۔ کیونکہ تین سال کے اندر قلعہ بلند ہو کر مسلمانوں کے سینوں پر مونگ دلنے لگا۔ ادھر آغا محمد نے جو کھمبایت کے بحریہ کا امیر البحر تھا شیخ محمد کی شہ پا کر چاؤل کا محاصرہ کر لیا۔ دوبدو جنگ چھڑ گئی۔ دل جلے مسلمانوں نے اپنے ترکش کے سارے تیر خالی کر دیئے۔ پھر بھی مجبور ہو کر محاصرہ سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ کیونکہ دشمنوں کے ہاتھ اور زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ جب اسلحہ جات باہر سے دستیاب ہونے لگے۔ ہندوستان میں اب فرنگیوں اور مسلمانوں کے درمیان "صلیبی" جنگ چھڑ گئی تھی اور چاؤل سے لے کر دیو تک کئی سمندری محاذ کھل گئے تھے۔

۱: ایضاً۔ نیر نے کونکن ص ۴۶-۵۴

بمبئی کی کھاڑیوں کا پانی خون سے سرخ رہنے لگا تھا۔ اور نیلے آسمانوں پر جلتے ہوئے جہازوں اور کشتیوں کے شعلوں سے دن رات شفق چھو لینے لگ گئی تھی۔ بسی، اور باندرہ ماہم کی کھاڑیاں گجراتیوں کے اہم مورچے بن گئے جنوبی کی تجارت اکھڑ چکی تھی۔ اور شہر کی رونق پر خوف کی پت جھڑ چھا چکی تھی۔ لیکن بسئی کی بستی پر بہار آرہی تھی۔

فریب فرنگ:

سفید فام فرنگیوں کے آگے پیچھے ایک سیاہ فام رام اور سلام بھی نظر آنے لگے تھے، پرتگیزی استبداد اور اجنبی ابھرتی ہوئی قوت کا دبدبہ آہستہ آہستہ بغاوت کے جذبات کو دبا رہا تھا اور نفرت کو گھٹا رہا تھا۔ جبکہ ہندوستانی دیکھ رہے تھے کہ فرنگیوں کے پاس بہتر اسلحہ جات ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کی برتری محسوس کرنے لگے تھے۔ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے مفاد پرستوں کے ذہنوں میں حرص دولت اور ہوس جاہ آہستہ آہستہ گھر بنانے لگی تھی۔ ان "فرنگی زدہ" اور "حرص گزیدہ" لوگوں میں زیادہ تر خود پرتگیزوں کے حبشی غلام تھے جو بندگی سے مجبور تھے، ملیباری اور کرناٹکی تھے، جو وجیانگر کے کھیسے پٹے "ھنوں" کے سامنے پرتگالی "پرڈاؤ" اور "دوکات" سکوں کے سنہری اور روپہلی چہروں کے فریب کھا چکے تھے۔ انہیں ملاحوں کی دو جبیوؤں والی کشتیاں، نونی، کنوڑا اور پڑاؤ اب پرتگیزی بحریہ کا حصہ بن گئی تھیں، جیسا کہ گورنر سمپایو اور سلویرا کے چالیس جہازوں اور

کشتیوں کے بیڑے اور فوجی دستے سے اندازہ ہوتا ہے۔

حریت پسند ہندوستانی اپنے بھائیوں کی اس نئی تبدیلی سے بیگانہ نہ تھے اور پرتگیزوں کا سب سے بڑا دشمن ملک ایاز بھی بے نیاز نہ تھا۔ اور اب تو خود اس کا جواں سال اور جوانمرد بیٹا کمال ملک ایک حبری عرب علی شاہ کے ساتھ دیو کے بحریہ کی کمان کر رہا تھا جو اسی سے اوپر چھوٹی چھوٹی [بارکا] چھپیوں اور دو مستولوں والے "بارقوں" پر مشتمل تھا۔ جیئول نظام الملک کا تھا۔ اور جیئول کی تجارت پرتگیزوں کی تھی۔ اور دونوں "کھمایت کے سلطان" کے دشمن تھے۔ دشمن کو زک پہنچا تو سمپایو اور سلویرا کی سرگردگی میں چالیس جہازوں کے بیڑے نے حرکت کرنا شروع کر دیا۔

گجراتی بحریہ ایک چھوٹے سے جزیرے [غالباً واشی] سے [جو تراپیے کے سامنے ہے] لنگر اٹھا کر تھانہ کھاڑی کے دہانے ٹھہر گیا [یہاں سے آگے الباس ندی میں پرتگیزوں کا ایک مختصر سا قلعہ سانتا کروز کے نام سے بن چکا تھا] کشتیاں کنارے لگا دی گئیں۔ اور دو بارقے پہرہ داری کے لئے گشت لگانے لگے۔ مگر رات کے اندھیرے میں پرتگیزی جاسوس نے علی شاہ کو بیس ہسپانوی قسم کی کشتیوں کی معیت میں ناگوٹھنہ کی طرف روانہ ہوتے نہیں دیکھا ــ ناگوٹھنہ پر گجراتی قبضہ تھا۔

سمندری ہواؤں کے نرم جھونکوں کی تھپکیاں کھا کر گہری نیند سونے والے گجراتی فوجیوں نے چوری کا کھٹکا بھی محسوس نہ کیا جبکہ دشمنوں نے

ستائیس چھوٹی چھوٹی کشتیوں (فُستہ) کو مچھلیوں کی طرح پھنسالیا۔ اور راتوں رات اپنے۔ بحریے کی ایک ٹکڑی کو باندرہ کھاڑی کے دہانے پر متعین کر دیا تاکہ گجراتی بیڑا اگر تھانہ اورن کھاڑی کے ذریعے کولابہ کا کاواکاٹ کر بھی بسئی کی طرف نکلنا چاہے تو باندرہ مہائم کے قریب کھاڑی اور سمندر کے سنگم پر ان کو جا لیا جائے۔

—— اندھیری رات میں ایک "تلوار نما ستارہ"[1] نمودار ہو کر مسلمانوں پر اُن کے عقیدے کے مطابق نحوست پھیلا رہا تھا اور جنگ کے عین موقعہ پر اس کا نکلنا بدشگونی کی علامت تھی اور شکست جو یقینی تھی وہ حقیقت بن کر سامنے آگئی اور سامنے فرار کی آخری راہ سیمو [سائن یہ جدی گاؤں] کی وہ کھاڑی تھی جو دھاراوی جزیرے سے گزر کر مہائم قلعہ تک جاتی تھی (اور جو ایک صدی قبل اسی گجراتی بحریہ کی وہ گذرگاہ رہ چکی تھی جس کے ذریعہ خلف حسن بصری کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا[2] جب دہانے پر بحریہ پہنچا تو پرتگیزی توپوں کے دہانے کھل گئے، آگ برسنے لگی اور قلعہ میں بھی پناہ نہ ملی، علی شاہ صرف سات بارقوں کو بچا کر بسئی کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ قیدی، اسلحہ جات اور توپ خانے پرتگیزوں کے ہاتھ لگے، ستر سے اوپر مالِ غنیمت میں آئی ہوئی کشتیوں میں چند نفیس بجرے بھی تھے جن کی ساگوانی تختیوں پر آیاتِ کریمہ کی طغرا کاری کی گئی تھی[2]۔ اس حملہ سے مہائم پر فرنگیوں کا تسلط ہو گیا اور ششٹی کے دیہاتوں میں

---

[1] دے کنھا ص ۳۹، تفصیل کے لیئے دیکھئے۔ ایضاً ص ۴۰ و ص ۳۸؛ تھانہ گزیٹیر ج ۱۳: ح ۲: ص ۴۵۰-۴۴۹

[2] گزیٹیر شہر بمبئی۔ ج ۲: ص ۲۷

ان کا دبدبہ بیٹھ گیا، تھانہ کے تھانیدار نے سالانہ دو ہزار پرڈاؤ (تخمیناً ساڑھے سات سو روپے) خراج دینے کا وعدہ کر کے شاہِ پرتگال کی بندگی قبول کر لی۔

بائیس پڑاؤ لے کر سلویرا مہائم اور "ممبائم" کے ہرے بھرے "حیات بخش برزیر دش" میں پڑاؤ ڈالے موسم برسات کی آمد تک پڑا رہا۔ یہاں گوشت اور چاول کی افراط تھی۔ املی، املتاس، جامن، بھنڈی اور کتھل کے گھنیرے سایوں میں، ناگ پھنی کی باڑوں کے نیچے اور کروندے اور مُچھی کے جھنکاڑوں میں پرندے جانور اور دیگر شکار بکثرت دستیاب ہوتے تھے۔" سمندر کی نم آلود ہواؤں کی حریری سرسراہٹ خواب آور تھی اور پُر سکون فضا کیف انگیز اور طمانیت بخش تھی۔" جانوروں کے شکار سے پیٹ بھر جاتا تو انتقام اور بربریت کی شکم پُری کے لیئے انسانوں کا شکار شروع کر دیا جاتا۔ کبھی ناگوٹھنہ کی ٹھانی تو آنبہ ندی کے کنارے چھ گاؤں جو گجراتی مقبوضہ تھے، الاؤ بن کر جل اُٹھتے اور خاکستر بن کر رہ جاتے۔ بسئی پر دائمی قبضہ کا خیال دامن گیر تھا مگر اُس کی تخریب میں اس خواب کی تعبیر ڈھونڈھ رہے تھے۔ نئے تعمیر ہوتے ہوئے قلعہ کو نقصان پہنچایا اور علی شاہ اور اس کے ساڑھے تین ہزار سپاہیوں کو سلویرا کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ انتقام کی آگ سرد پڑنے لگتی تو سورت، رانڈیر، دمن اور اگاشی کو آگ لگا کر تاپنے لگتے۔

وسئی، بسئی، بسین: ریوڈانڈا کے قلعہ کی تعمیر کے بعد پرتگیز اب ڈئیو میں بھی اپنے استعماری منصوبوں کو اینٹ اور پتھر سے مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ مگر ابھی (۳۱-۱۵۳۰ء) تک تعمیر کا یہ منصوبہ کاغذی پیراہن سے

---

۱ گزیٹیر شہر بمبئی ص ۲۸؛ گزیٹیئر تھانہ۔ ج ۱۳۔ ح ۲؛ ص ۴۵۰

سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مگر اس تصویری پردے سے ان کی توسیع پسندی اور شر انگیزی کی نیتیں ننگی ہو کر نکلیں۔ نُنو دا کُنھا۔ گوآ کے وائسرائے کا سارا دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا کہ اس کا دھیان بٹ گیا جب اُس نے سُنا کہ ملک ایاز کا بیٹا ملک طوقن، بستئی کی قلعہ بندی کر رہا ہے اور اس طرح ارد گرد کے علاقوں پر گجراتی تسلّط اور زیادہ مستحکم ہو جانے کا خدشہ تھا جب کہ انھیں علاقوں کے گھنے ساگوانی جنگلوں سے بہترین قسم کے شہتیر جہاز سازی کے لیئے حاصل کیئے جاتے تھے اور پرتگیزوں کی عسکری طاقت کا انحصار گھوڑوں سے زیادہ جہازوں پر تھا کیونکہ بحری طاقت ہندستانیوں کیلئے نئی عسکری اہمیت کی حامل تھی اور جس طاقت کا خود ہندستان میں فقدان تھا۔

ملک طوقن، بستئی کی بستی کو وسعت دینے کے لیئے آباد کاری اور آبادانی کے لیئے سہولتیں فراہم کر رہا تھا، رفاہِ عام کی غرض سے عالیشان عمارتیں تعمیر کی جا رہی تھیں، اور تجارت کو فروغ دینے کے لیئے ارد گرد کے باشندوں کو بستئی میں بسایا جا رہا تھا۔ اور اب تو شہر کے ارد گرد فصیلیں ایستادہ تھیں جن کے پُشتوں کے آگے خندقیں کُھدی ہوئی تھیں جو پانی سے لبریز رہتی تھیں۔ قلعہ میں پندرہ ہزار فوجی متعین تھے۔

نُنو دا کُنھا نے بھی اپنی عسکری طاقت کی نُمائش کے لیئے "بمبایم" بندر کے کنارے تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک بحری فوج اکٹھا کر لی! "کے وَل" جزیرے میں تاڑوں کے جُھنڈوں سے گِھرے ہوئے دھوبی تالاب کے کنارے [اسپلینیڈ] میدان میں فوجوں کی موجودات کا جائزہ لیا گیا تو مقامی باشندوں، بھنڈاریوں، بنگولیوں اور نوائطوں نے خوف و حیرت کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ دیکھا کہ صرف پرتگیزی سپاہی تین ہزار چھ سو، اور ایک ہزار چار سو ساٹھ ملاح تھے تو خود ان کے

بھائیوں کی تعداد دو ہزار ملیباریوں اور کرناٹکیوں، پانچ ہزار جہازرانوں اور تین ہزار بندوقچیوں پر مشتمل تھی۔ آٹھ ہزار غلام تھے، جن میں بدیسیوں کے علاوہ خود ہندستانی بھی شامل تھے۔ بمبئی کی کھاڑیوں میں چار سو بادبانی کشتیوں کا عظیم الشان قافلہ لنگر ڈالے کھڑے تھا۔[1]

پھر خوفزدہ ملک طوقن نے بسئی قلعہ کی اونچی فصیل کے کنگوروں سے جھانک کر دیکھا تو دور سمندر میں کالے غرابوں کے سفید بادبان پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دمن کی طرف قافلہ رواں دواں تھا اور جس پر پرتگیزوں نے اپنا پرچم لہرا دیا، مگر دیو مغلوب نہ ہوسکا اور نہ تو دے کُنھا کے تعمیرِ قلعہ کا دیرینہ خواب پورا ہوا۔ وہ تو گھر لوٹ آیا مگر انتونیو سلدھا، ساٹھ غرابوں کے ساتھ غارتگری کے لیئے رہ گیا، جس نے ۱۵۳۱ء کے مارچ اور اپریل کے دو مہینوں میں موھو وہ، گھوگا اور سورت کی صورتیں مسخ کردیں اور بلسار، تاراپور، کلوہ مہائم اور اگاشی کو تاراج کرکے ویرانہ بنا دیا۔[2] گوا مالِ غنیمت کا گودام بن گیا، جہاں چار ہزار قیدیوں کو کلیساؤں اور خانقاہوں کی تعمیر میں جوت دیا گیا۔

فتح و معاہدۂ بسین: بسئی کی قلعہ بندی دے کُنھا کے دل کا بوجھ بن گئی اور اس مسلم بستی کی پھولتی بہار اس کی آنکھوں کا کانٹا بن گئی۔ ۱۵۳۲ء کو شروع ہوئے بیس دن گزرے تھے۔ عیسائیوں کا متبرک دن تھا اور اسی دن بسئی کے عظیم الشان قلعہ کی شاندار فتح پرتگالی تاریخ

---

[1] گزیٹیر شہر بمبئی ص ۲۹-۲۸

[2] دانکھا۔ ص ۱۳۴ (اور دیکھیے) DANVERS, "PORTUGUESE IN INDIA." (HAKLUYT SOCIETY) P. 416.

میں یادگار بن گئی۔ ڈیڑھ سو جنگی جہازوں کا بیڑا قلعہ کا محاصرہ کیئے ہوئے تھا۔
معاہدے کی بات چیت ناکام ہوئی تو پرتگیزوں نے جارحانہ کارروائیاں شروع
کر دیں۔ ایک دستے نے قلعہ کے شمال میں مورچہ سنبھال لیا۔ کچھ بہادر فرنگی
بندروں کی طرح پھسل کر کھائیاں پار کر کے فصیل کے دمدموں پر چڑھ گئے
اور دیوار پر سے رینگ کر کنگوروں کے تنگ محرابوں کے ذریعہ بُرج میں پہنچ
گئے اور مورچہ سنبھال لیا۔ ملک طوقن کے سپاہیوں نے جب اہلِ فرنگ کی
یورش اور یلغار کا یہ رنگ دیکھا تو اُن کے رنگ فق ہو گئے اور وہ جنگ کرنا
بھول گئے۔ جب اُن میں بوکھلاہٹ پھیلی تو دشمن سارے قلعہ میں پھیل گئے
اور مسلمان باشندوں میں خوف وہراس پھیل گیا' عالیشان حویلیاں خالی ہونے
لگیں' اور منڈی میں لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا' اسلحہ جات کے گوداموں پر
دشمنوں کا قبضہ ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا جزیرہ پرتگیزوں کے قدموں
کے نیچے لرزنے لگا۔

پرتگیزی استعماریت کی یہ فتح اتنی شاندار تھی کہ برسوں پرتگالی شعراء
کا موضوعِ سخن بنی رہی[1]۔ بہادر شاہ گجراتی جو پہلے ہی دمن پر فرنگی تسلط اور
اپنے ساحلی شہروں کی تباہیوں پر آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ اب اشک شوئی کے لیۓ
نظام الملک کے دامن سے بھی محروم ہو چکا تھا' جسے صرف ایک برس قبل اُس نے
شاہ کے خطاب سے نوازا تھا اور سبز چتر شاہی اور آفتاب گیر عطا کیا تھا۔ مغل

---

[1] دسے کُنہا؛ ص ۱۳۰-۱۳۴

شہنشاہ ہمایوں بہادر شاہ کو غاصب سمجھتا تھا اور اب ایک طرف اُس پر مغلوں کا عتاب نازل ہو رہا تھا اور دوسری طرف سے قہرِ فرنگی ٹوٹ رہا تھا۔ سفارتوں کے تبادلے ہوئے اور آخرکار بہادر شاہ کو سرِ تسلیم خم کر کے معاہدۂ بسین پر اپنی مُہر ثبت کرنا پڑی۔ اور بسین اور متعلقہ علاقے کی ساری آمدنی جو برّی اور بحری ذریعوں سے حاصل ہوتی تھی، شاہِ پرتگال کے نام دائمی طور پر میراث کر دی گئی۔ اور پھر جہاز کے ترمچی نے ترم بجا کر شہریوں کو مطّلع کر دیا کہ اُن کی قسمت پر مُہر لگ گئی ہے۔ تملیک نامہ تھانیداروں کو دکھایا گیا جنھوں نے "چھاپہ" دیکھ کر سر جھکا لیا اور شاہِ پرتگال سے وفادار رہنے کا حلف اُٹھایا۔ رسمِ حلف کے بعد ہر ایک تھانیدار نے پرتگیزی تجارتی نمائندے کو خوشبودار "سبزہ" کی ایک ایک ٹہنی پیش کی۔ تملیک نامہ کو طلائی صندوقچہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس معاہدے کی رُو سے بسین اور اُس کے نواحی علاقوں پر پرتگیزوں کا عمل دخل ہو گیا، بحیرۂ احمر سے تجارت پر چُنگی لی جانے لگی اور ہر گجراتی جہاز کے لیے بسین سے شاہِ پرتگال کا پروانۂ راہداری حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ گجراتی بندرگاہ [دیو] کا بحریہ غیر مسلّح کر دیا گیا اور ترکی مسلمانوں کو مظفر شاہی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا۔ مہائم، بمبئی اور باندرہ سے شاہِ پرتگال کے نام پر "چندہ" لیا جانے لگا اور تھانہ کا تھانیدار دوبارہ باجگذار بن گیا۔

اِدھر مغل بھی فرنگیوں کی بحری طاقت اور تجارتی ترقی سے مرعوب ہو چکے تھے اور دوستی کا ہاتھ معاہدے کے کاغذ کے ساتھ بڑھا رہے تھے مگر نُنو دے کُنھا کے دماغ میں دیو کے قلعہ کا منصوبہ اور اُس پر قبضے کا سودا سمایا ہوا تھا، جبکہ خود

لے جرنل بمبئی (برانچ) رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ ج: ۱۰ - ص ۳۲۳

"ORIGIN OF BOMBAY" PP. 88, 89.

شاہِ پرتگال نے وائسرائے کو ایک ایسی بندرگاہ پر قابض ہونے کا حکم دیا تھا جو ہندوستان سے عرب و ایران کی تجارت کے لیئے گزرگاہ کا کام دے اور جس کی حیثیت مرکزی اور بین الاقوامی ہو۔ اور جب بہادر شاہ گجراتی نے ایک نئے معاہدے کی رُو سے پرتگالیوں کو دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دے دی تو دے کُنھا کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پُوری ہوگئی اور گذشتہ سال (۱۵۳۴ء) کے معاہدۂ بسین کی مزید توثیق کردی گئی، جس کی رُو سے بسین اور اردگرد کے علاقوں پر پرتگیزی تسلط نئے سرے سے مُستحکم و مُسلّم کر دیا گیا۔ بہادر شاہ جب تک جیتا رہا بسین اور دیو کے معاہدوں پر پشیمان رہا اور اپنی ہی دورنگی حکمتِ عملی کے سبب فرنگیوں کی نیرنگیوں سے دھوکے کھاتا رہا۔ جب ۱۵۳۵ء میں مغل، بہادر شاہ کی مملکت پر چھاپے مارتے مارتے دمن اور بسین پر بھی ہلّہ بولنے لگے تو پرتگیزیوں کو اپنے دفاع کے فقدان کا احساس ہوا۔ بسین کے بانی اور معمار "نُنو دے کُنھا" کے حکم سے، انتونیو گلوائونے، جس نے مغلوں کو شکست دی تھی، نئے قلعہ کا سنگِ بُنیاد رکھا۔ بسین کا جزیرہ پرتگیزی شمالی صُوبے کا عظیم الشان شہر اور صدر مقام بن گیا۔

برہان نظام شاہ تالکوکن کے ساحلی علاقے پر سے گجراتی تسلط کی دھوپ ڈھلتی ہوئی دیکھ کر ۱۵۴۰ء میں سانکشی اور کرنالا کے قلعوں پر قابض ہوگیا۔ قلعدار اول کی درخواست پر بسین کے کپتان نے مداخلت کی اور دونوں طرف کے سپاہی مہینوں بھوک، گرمی، تھکن اور زخموں سے چُور ہوکر "چند پتھروں کے ڈھیر کے لیئے اپنی قبریں کھودتے رہے"۔ مگر جب پرتگیزی گورنر کو احساس ہوا کہ دونوں قلعے تجارتی یا عسکری نقطۂ نظر سے اُن کے لیئے چنداں اہمیت نہ رکھتے تھے تو اُس نے ان کھنڈروں کو نظام الملک کو بخش دیا اور اس کے عوض میں سالانہ پانچہزار طلائی پرڈاؤ وصول کرنے لگا۔

اِس سودا بازی میں شاطر پرتگیز بازی لے گئے اور ساتھ ہی نظام الملک کی دوستی بھی خرید لی جس کا سلسلہ اگلے سترہ برسوں تک اُستوار رہا۔[1]

پرتگیزی استعماریت کی جڑیں جب پھیلنے لگیں تو وجیانگر راج بھی اُس کا سایہ ڈھونڈھنے لگا۔ ۱۵۴۷ء میں ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے گوآ کی پرتگیزی حکومت نے عادل شاہی تشدّد کے خلاف وجیانگر کے دفاع کی ساری ذمہ داری اپنے سَر لے لی۔ اس نئی حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہوئے پرتگیزی لُٹیروں نے مُوذی بندروں کی طرح عادل خانی مملکت کے سارے بندروں میں لُوٹ مار مچانا شروع کر دیا۔ شِری وردھن اور دابھول پر مشقِ ستم ہوتی رہی اور عادل آباد (پانڈہ) بندر کی رونق وجیانگر راج کے انکولہ اور ھنوور بندرگاہوں میں منتقل ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ملابار اور دکن کی ساری تجارت بھی۔ ادھر "چور سے کہے چوری کر اور شاہ سے کہے جاگتا رہے" کے مصداق نظام شاہ سے بھی ایک دفاعی معاہدہ عمل میں آیا جس کی رُو سے پرتگیزوں نے چیوَل کی بندرگاہ سے بحری قزاقوں کو پاک کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا [جب کہ وہ خود قزاقی میں کسی سے کم نہ تھے] نظام الملک نے پرتگیزی علاقوں کے لیئے سامانِ رَسد اور جہاز سازی کے لیئے [کوکن] کے جنگلوں سے شہتیر دینے کا وعدہ کر لیا۔ والئ احمد نگر تو "دونوں جہان دے کے انھیں خوش کر دیا" اور "وہ خود ہی ذبح بھی کر رہے تھے اور خود ہی اُلٹا ثواب بھی لُوٹ رہے تھے"۔ اور اگلے سال انھوں نے بانکوٹ اور دابھول کو جی بھر کر لُوٹا۔ اور اپنی بربریت اور درندگی کا بدترین مظاہرہ کیا ـــــ اور اسی سال دابھول کو دوبارہ آباد کرنے اور تجارت کو نئے

---

[1] دے کُنھا ص۱۳۷، ص۴۳-۴۲۔ نیرنے کوکن ص۴۳
[2] نیرنے کوکن ص۴۷

سرے سے فروغ دینے کے لیئے عادل شاہیوں کو سبز باغ دکھانا شروع کر دیا۔

ساونت واڑی:

جنوبی کوکن میں عادل شاہی سلطنت کے ستون اب سرنگوں ہوتے جارہے تھے ـــــ سولھویں صدی پچاس سال کے پیٹھے میں تھی اور عادل شاہی حکومت جوان، مگر ۱۵۵۴ء میں کدال کے دیسائی مانگ ساونت کی بغاوت اور خودمختاری سے اس کی ساکھ جنوبی رتناگیری میں ختم ہوگئی۔ واڑی سے چھ میل کے فاصلے پر ہودوڑہ کی دیہاتی بستی اس نئی راجواڑی کی چھوٹی سی راجدھانی بن گئی۔ مانگ نے اتنا نام پیدا کیا اور اپنی رعیت کے لیئے اتنے کام کیئے کہ مرنے کے بعد وہ اوتار بن گیا۔ ہودوڑہ میں اس کا مٹھ آج بھی موجود ہے[1]۔ ادھر اچرا (مالون سے قریب) عادل شاہی فوج کو پرتگیزوں نے زبردست شکست دیکر اس کا جنازہ اٹھادیا۔ نظام الملکی حکمرانوں سے چھیڑ چلی جارہی تھی اور گجرات شاہی سے مسلسل جھڑپیں ہورہی تھیں۔

ڈوبتا ساحل:

شمالی تالکوکن میں فرنگیوں نے ۱۵۵۶ء میں اشیری جیسے مضبوط قلعے کو اسیر کرلیا تو گجرات تک بری راستہ ان کے قدموں تلے بچھ گیا۔ وتیرنا کے زرخیز دامن میں آباد منور پر مسلط ہوکر انھوں نے اپنا دبدبہ اس قدیم دوآبہ پر قائم کر دیا جو کسی عہد میں آریاؤں کا پہلا مسکن تھا۔ گو اس قسم کی سیاسی ڈکیتیوں نے ان قزاقوں کو "بادشاہ"

---

[1] نیرنے کوکن صـ ۱۴۳

بنا دیا تھا مگر مستقل سرکاری آمدنی کے ذرائع پھر بھی محدود و مسدود ہی رہے۔
ہوس نے سازش کے جال بُنے اور پرتگیزوں نے نئی چال چلی تاکہ نئے شکار حسین نظام شاہ کو پھانس لیا جائے۔ چیول اور ریوڈنڈا کے سامنے ایک کوہستانی درّے کے درمیان کُنڈلکا دریا کی ایک آبنائے، کورلے عسکری اور تجارتی نقطۂ نظر سے بےحد اہمیت رکھتی تھی۔ اس پر تسلط ہو جانے سے پرتگیز، چاؤل شہر اس کی بندرگاہ اور تجارت اور پھر محصولات پر قابض ہو سکتے تھے۔ جب کورلے میں ایک نئے قلعہ کی تعمیر کا منصوبہ فرنگی سفیر نے نظام الملک کے سامنے پیش کیا تو اسے خود اپنی مملکت کے نقشے میں کوکن کا سارا علاقہ ڈوبتا نظر آنے لگا اور اپنا سرکاری خزانہ خالی دکھائی دینے لگا۔ وہ چونکا۔ اُس نے خود اپنی مملوکہ زمین پر قلعہ بنانے کا مُستحکم ارادہ کیا، مگر دھمکیوں سے اُس کا منصوبہ ڈھیر ہو گیا۔ گو ایک معاہدے نے پرتگیزوں کو اس ارادے سے باز رکھا[۱] کورلے فرنگیوں کے استحصال سے محفوظ رہ گیا — اور — ۳۵ سال بعد نظام الملک نے قلعہ بھی تعمیر کرا لیا۔ مگر یہ سارے ہوائی قلعے ثابت ہوئے کیونکہ پرتگیزی اقتدار کا سیلاب اس کی مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرتا جا رہا تھا۔ اس باڑھ میں دمن سے لے کر دتیرنا تک، کا زرخیز علاقہ (سن۱۵۶۰ء) میں بہہ گیا۔ چنگیز خاں ایک گجراتی امیر نے فرنگیوں کے فوجی احسانات کا بدلہ لاکھوں بیگھے زمین بخش کر ادا کر دیا۔ اس طرح خود اپنے بادشاہِ گجرات سے غداری کر بیٹھا اور وطن فروشی کے نرخ کو ارزاں کر دیا۔
لیکن اس علاقے کے حاکم نے جب حکم حاکم ماننے سے انکار کر دیا تو پرتگیزوں نے

۱؎ فرشتہ (ترجمہ برگس) ج: ۳؛ ص: ۲۲۸، ۲۳۹

"مرگِ مفاجات" کا حکم دے کر فوراً ہی پارینر اور دمن کے قلعوں کو دبوچ لیا۔ اور بلسار کے ٹاپو کو گھوڑوں کے ٹاپوؤں تلے روند ڈالا۔ اس طرح لسبن کے شمالی صوبے کی دفاع کے لیئے دمن کا قلعہ مضبوط محاذ بن گیا ___ اور [۷۱-۱۵۷۰ء] تک پرتگیز نظام الملکی مملکت اور گجراتی سلطنت کے زرخیز علاقوں پر قابض ہو چکے تھے اور جوھار کی کولی راجواڑی میں سیہادری کی مشرقی ترائی تک پہنچ چکے تھے۔[۱]

"مشورے ہو رہے ہیں آپس میں"!

پرتگیزوں کی شرانگیزیاں رنگ لانے لگیں۔ مظلوموں کے خون کے چھینٹوں سے ظلم کی شام گہری ہوتی جا رہی تھی ___ دُور آگرہ میں اکبر بادشاہ بھی آگاہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا خون جب سے ارزاں ہونے لگا، پرتگیزی مصنوعات اور تجارتی اشیأ گراں ہونے لگیں اور مسلم حکومتوں کا وقار سستا ہو گیا ہے جب آپس میں لڑتے لڑتے تھک گئے تو وجیا نگر راج سے اُلجھ گئے اور تالی کوٹ کی مشہور جنگ تاریخ کا سُرخ عنوان بن گئی۔ وجیا نگر کا نگر اُجڑ گیا مگر خود مسلم ریاستوں کی بُنیادیں اجنبی قدموں کے بارِ گراں سے لرزنے لگ گئی تھیں اور کوکن کے سارے ساحلی علاقے سے بحرِ اوقیانوس کی طوفانی لہریں ٹکریں لینے لگی تھیں۔

پانچ سال کی بیحد محتاط اور خفیہ گفت و شنید کے بعد ۱۵۷۰ء میں احمد نگر بیجاپور اور کالی کٹ کی حکومتوں نے بدیسی راج کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ دُور افتادہ سماترا کی حکومت نے بھی اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحرِ ظُلمات

---

[۱] واٹسن کا "گجرات"، ص: ۵۶ ؛ [۲] نیرنے۔ کونکن، ص: ۴۵

کا طوفانی گھیرا کتنا وسیع اور ملک گیر بنتا جا رہا تھا۔ یہ اتحاد کسی جذبۂ حرّیت یا وطن دوستی کا مظہر نہ تھا بلکہ ذاتی مفاد کا تحفّظ، غصب شدہ علاقوں کی بازیافت اور البتہ فرنگی استحصال کی استیصال کے بعد ملک ستانی کی جانب متحدہ اقدام تھا۔ اسی لیئے اس اتحاد میں باہمی اعتماد کا فقدان تھا اور اس پر تشکیک کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے عمل کرنے سے پہلے ہی اپنے حصّے بخرے کا حساب مکمل کر لیا تھا اور اپنے ملک کے حصّے کی مقبوضات پر اپنا نشان ڈال دیا تھا۔ مگر دشمن پر نشانہ لگانے میں کوئی پہل نہیں کر رہا تھا۔ ایک عادل شاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ نہ جانے کب سے شیشۂ مئے کی طرح بھرا بیٹھا تھا، ذراسی چھیڑ خانی سے اُبل پڑا اور گووا کا محاصرہ کر لیا[1]۔ مرتضیٰ نظام شاہ (اوّل) نے چاؤل، بسّین اور دمن کی تسخیر کے لیئے اپنے سپہ سالار فرہاد خان کو چھبیس جنگی ہاتھیوں، آٹھ ہزار گھڑ سواروں اور بیس ہزار بہادر سپاہیوں کے ساتھ چاؤل بھیجا اور خود ایک لشکرِ جرّار اکٹھا کرنے لگا[2]۔

چوَل کے شمال میں محاذ کھول کر فرہاد خان نے بسّین سے سامانِ رسد کی فراہمی کا راستہ مسدود کر دیا اور کارنجہ (اورن) کی گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ زمورن کے کالیکٹ بحریہ نے دریا کے دہانے کو گھیر لیا۔ یہ بحریہ بائیس[3] جنگی پڑاؤ پر مشتمل تھا، ان میں پندرہ سو ملیباری توڑے دار بندوق سے مسلح تھے۔ ریوڈنڈا کا قلعہ دفاعی حیثیت سے ناکافی تھا اور پرتگیزی بستی کے اردگرد ایک مختصر سی دیوار مسلّم سدِ سکندری کے سامنے ریت کی دیوار سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بارہ تیرہ سال

---

[1] فرشتہ (ترجمہ) ج: ۳؛ ص: ۵۲۲
[2] دے کنھا؛ ص: ۴۸
[3] ایضاً؛ ص: ۴۸

قبل کی تعمیر کی ہوئی خوبصورت سفید رنگ کی وِلّاؤں کو خالی کرا دیا گیا اور سَرما کے پھولوں سے لدے ہوئے چمنستانوں کو اُجاڑ کر ان کے اِرد گرد اینٹیں چن دی گئیں۔ فرانسِسکن کی خانقاہ میں کچھ پرتگیزی دِفاع کے لیئے تیار ہو بیٹھے اور ڈومی نی کنس کے گرجا کے اِرد گرد کی حویلیوں کو مُستحکم کر کے فرنگیوں نے دفاعی محاذ بنا لیئے۔

——— پھر شاہی لشکر کی آمد کا شور اُٹھا۔ چاؤل کی تاجرانہ زندگی میں تہلکہ مچ گیا اور فرنگیوں میں بوکھلاہٹ پھیل گئی جب انھوں نے پچیس ہزار خراسانی گھوڑوں کے ٹاپوؤں اور ڈھائی سو [میسوری] ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی دِلدوز آوازیں سُنیں۔ صرف ہَراول دستہ تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ مورچہ بندی، سُرنگ کھودنے اور بارُود بچھانے کی غرض سے چار ہزار ترک، ایرانی، حبشی اور یورپی معماروں، کاریگروں اور مستاروں کا ایک علاحدہ دستہ تھا۔ چالیس نام چین توپ خانے، آتش افشانی کے لیئے میر آتش کے حُکم کے منتظر تھے۔ اسّی ہزار پیدل سپاہیوں کی فوج تھی۔[1]

ویران گرجا گھروں اور بھگوڑے پرتگیزوں کی خالی وِلّاؤں پر قبضہ کر کے توپ خانے نصب کر دیئے گئے اور مٹّی کے کچّے حصاروں سے معمولی قلعہ بندی کا کام شروع کر دیا گیا۔ پہاڑی کے دامن سے چھاؤنی پھیل کر شہر کے دوسرے کنارے تک اَن گنت خیموں کے سفید پھولوں سے بھر گئی اور یہ چمن زار، ہنگامِ کارزار سے لالہ زار بن گیا، کیونکہ جب گولہ باری شروع ہوئی تو سیکڑوں پھول روزانہ زندگی کی ڈالی سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ کبھی فرانسِسکن کی خانقاہ پر مسلمانوں کا قبضہ

---

[1] رادھے شیام۔ "احمد نگر کی بادشاہت"، ص: ۳۲۵، ۳۳۹

ہوگیا تو یہیں سیپیوں سے مزین کنواری مریم کے "گرد ٹو" کے نیچے آدم کے بیٹوں کی گردنوں پر رات کے اندھیرے میں چھریاں چل گئیں اور کسی منحوس دن "ہولی کراس" کے مقدس سائے تلے مسلمانوں کو مصلوب کر دیا گیا۔ کبھی یسوع مسیح کی بھیڑوں کی لاشوں سے راستے پٹ گئے تو کبھی شاطر پرتگیزوں نے ان مکانوں کو مع مسلمان مکینوں کے بارود سے اڑا دیا جو محاذ بن گئے تھے، یہی پھر ان کے مدفن بن گئے [تقریباً چار سو سال بعد گوا کے وطن پرستوں کے پرخچے اڑانے کے لیے پرتگیز فاشستوں نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا] گوا سے سامانِ رسد اور کمک کی فراہمی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور پرتگیزوں کے حوصلے بڑھتے رہے اور پرتگیز مورخین کے دعوے بلند ہوتے رہے جو اپنے گنے چنے شہیدوں کا شمار کر سکتے تھے مگر مسلمانوں کی لاشوں کے انبار ان کے حساب و کتاب میں نہیں سما سکتے تھے۔ بلکہ کارنجہ کے مٹھی بھر فرنگی محصورین نظام الملکی محاصرین پر بھاری دکھائی دیتے رہے اور پانچ ہزار نظام الملکی فوجیوں کا آوارہ دستہ سالشٹی میں اشیری اور دمن تک مٹھی بھر پرتگیزوں کی بہادری کے مقابلے میں ناکارہ ثابت ہوا ــــــ [نظام الملک دمن، بسین اور چیول پر قبضہ جمانے کی آس لگائے بیٹھا تھا] خود پرتگیزوں نے نظام الملکی مملکت کے کلیان اور اس کے مضافات بھیمڑی میں آگ اور خون کا دریا بہا دیا[1]

۱۵۷۱ء کا موسم گرما شروع ہو گیا مگر جنگ کی گرما گرمی اپنے عروج پر رہی۔ گوا، دیو، دمن اور بسین سے اسلحہ جات، سامانِ رسد اور فوجی کمک چاؤل کے محصورین کے حوصلوں کو بڑھاتی رہی اور جب جون کا گرم چمکتا سورج نو

---

[1] رادھے شیام۔ "احمد نگر کی بادشاہت"، ص: ۳۴۵، ۳۳۹

آیا تو دونوں فوجوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مسلسل گولہ باری سے سر اُڑتے رہے اور محاذ سر ہوتے رہے، مگر مسلمان ڈومی فی کنش کے کلیسا اور نواحی حویلیوں پر قابض ہو کر بھی فتح کا سہرا اپنے سر نہ باندھ سکے، کیونکہ فرہاد خان اور اخلاص خان جیسے امراء کا فوجی کردار مشتبہ رہا، پرتگالی شراب کا سر میں نشہ چڑھ چکا تھا۔ رشوت نے مٹھی گرم کر دی تھی۔ جمشید خان کو یک گونہ بیخودی دن رات چاہیئے تھی اور دوسرے آپس میں اُلجھے ہوئے تھے۔ سات مہینوں تلک آگ کی چتا جلتی رہی، قتل کی تلوار چلتی رہی اور خون کی ندی بہتی رہی۔ دونوں طرف سے ہزاروں جانیں جنگ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ فرنگی جاندار ثابت ہوئے اور مسلمان بیجان۔ پھر اُن کی سفید فاختہ زیتون کی ڈالی چونچ میں ڈال کر اُڑی اور صلح کا سفید پرچم لہرانے لگا۔ شادیانے بجنے لگے اور کلیساؤں میں ارغنون کے نغمے بلند ہو گئے اور کیتھولک راہب یُوحنا کی انجیل سے وہ مشہور آیت پڑھنے لگے جس میں یسوع مسیح نے تلقین کی ہے کہ کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو ——— پرتگالی شراب جس کے چند جرعوں کے لیئے دکھنی اُمرا نے اپنے وطن اور حکومت سے غدّاری کر کے اپنے ہزاروں بھائیوں کا خُون بہنے دیا تھا، خُوب لنڈھائی گئی۔

اس طرف سے فارغ ہوتے ہی پرتگیز لٹیرے عادلشاہی حکومت سے انتقام لینے کے لیئے دابھول، کھارے پاٹن اور عادل آباد میں آگیا بیتال بن گئے۔ یہ کھارے پاٹن وہی تھا جہاں سے ابھی خود ان کا مشہور ولی فرانسس زیویر، دعوتِ صُلح و آشتی دے کر گیا تھا۔ پرتگیز نوآبادیاتی نظام کی جڑیں دمن سے لے کر ھنوور تک پیوست ہو چکی تھیں، لیکن ساتھ ہی گھن لگنا بھی شروع ہو چکا تھا۔

کیونکہ جب ۱۵۸۰ء میں پرتگال کا انضمام ہسپانیہ میں ہوا تو حکمران اندلس سے نئے نظریوں نے سیاسی تصورات اور تجارتی تعلقات میں تبدیلیاں پیدا کرکے روحانیت کی سوداگری اور تبلیغی سودا بازی کا بازار گرم کر دیا۔ یسوعی راہبوں، پادریوں اور مبلغوں کے مقدس عباؤں کے نیچے پوشیدہ روحانی تشدد اور جبریہ تبدیلیٔ مذہب کے حربوں نے ہزاروں مقامی باشندوں کو پرکھوں کے دین دھرم کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ غریب "کرسٹانوں" کے نذرانے، فدالگو (پرتگیز امراء) کے عطیے اور حکومت کی انعامی زمینوں نے مقدس باپوں کے گلے میں کنواری مریم اور یسوعِ مسیح کی شبیہوں کو اور ہاتھوں میں تسبیحوں کے دانوں کو چاندی کا بنا دیا تھا اور یہ ایک نئے جاگیرداری سماج کے عظیم ستون بن کر جزائر بمبئی میں بہت بڑے اقطاعدار بن چکے تھے[1] ـــــــ ادھر سیاسی جبر نے دستِ تطاول بڑھا کر زائرین کعبہ کے جہازوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک "حسینی جہاز" جزیرۂ واشنستی (اورن) کے پاس شہید ہو گیا ـــــــ اکبر بادشاہ نے عبداللہ خان ازبک والیٔ توران کو اپنے ایک خط میں ابوالفضل کے قلم سے "شوریدہ بختان فرنگ" کی شورہ انگیزی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے[2]۔ مگر پھر بھی پرتگیزوں کی شر انگیزیوں کو نظر انداز کر بیٹھا تھا کیونکہ وہ خود ایک پرتگالی حسینہ ملکۂ دوناجولیانہ کے حسن فتنہ انگیز اور جمالِ فرنگ کی نیرنگیوں کا شکار رہ چکا تھا۔ فاطم خان، صوبیدار ناکوکن نے بہت کچھ سر مارا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ برہان نظام شاہ (دوم) سرپھرا بادشاہ تھا۔ کورلے میں قلعہ کی تعمیر کا سودا پرکھوں کے زمانے سے سر میں سمایا تھا۔ لہٰذا ۱۵۹۴ء میں یہ سربلند ہوا تو فرنگیوں کے سر پر بھی خون سوار ہو گیا اور مضافات کی مسلم بستیوں پر شبخون مار کے ہزاروں دکھنیوں[3]

---

[1] دے کنھا؛ ص ۷۰

[2] انشای ابوالفضل (نولکشور)، ص: ۲۳

[3] برہان مآثر (۱۹۲۳ء) ص: ۲۹۱؛ فرشتہ؛ ج: ۲؛ ص: ۱۵۴

کا خون بہانا شروع کر دیا ـــــــ پھر ایک دوسری جنگ کی خونچکاں داستان نے جنم لیا۔ فرہاد خان اور دیگر نظام الملکی خوانین نے قلعہ میں مورچہ سنبھال لیا۔ ریوڈانڈا کے تمام راستوں کو مسدود کر دیا گیا تو پرتگیزوں کی تعداد محدود رہ گئی۔ محصورین مجبور ہو گئے تو صلح جوئی پر آمادہ ہو گئے[1]۔ برہان نظام شاہ کی باچھیں کھل گئیں اور اس کی جنسی بھوک بڑھ گئی جب اس نے فرنگی امردوں اور ہسپانوی گلبدنوں کے ایمان شکن حسن کو دیکھا اور ہوس سینے میں چھپ چھپ کر تصویریں بنانے لگی۔ جنگ میں مدد دینے والے امرا کی بیگمات کی بھی ناموس خطرے میں تھی۔ شجاعت خان کی بیوی حرم میں داخل کر دی گئی تو غیرت نے اُسے اپنے سینے میں خنجر مارنے پر مجبور کر دیا[2]۔ فرہاد خان اور دیگر اُمراء کا سکونِ قلب، کورلے قلعہ کی طرح چھن گیا، کیونکہ پرتگیز محصورین کو سامانِ رسد کے ساتھ فوجی کمک بھی مل چکی تھی۔ فرہاد خان اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ قیدِ فرنگ سے نجات کا بہانہ تھا یا جانِ شیریں بچانے کی ترکیب تھی، جس نے اسے تبدیلیٔ مذہب پر اکسایا، وہ عیسائی بن کر مرا۔ اس کی بیٹی نئے مذہب کے روحانی وطن پرتگال پہنچا دی گئی اور ماں نے تاوان دے کر رہائی حاصل کی[3]۔

سولھویں صدی کی زندگی کے گنے چُنے چھ سال باقی رہ گئے تھے۔ برہان نظام شاہ مر چکا تھا۔ درباری سازشیں زندہ ہو گئی تھیں اور خانہ جنگی کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ شیعہ اور مہدوی تحریکیں رُوحانی فضا کو مسموم بنا رہی تھیں ـــــــ مغل احمد نگر کی دہلیز تک پہنچ چکے تھے لیکن ملک عنبر دیوار بن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

---

[1] فرشتہ (ترجمہ) ج: ۳ ; ص: ۲۸۵
[2] فرشتہ (ترجمہ برگس) ج: ۳ ; ص: ۲۸۵ ۔ منتخب اللباب ج: ۳ ; ص: ۲۴۰-۲۳۹
[3] دے کنھا ، ص: ۶۲

اِدھر کلیسا کے پادریوں نے مذہبی احتساب کی صلیب پر مقامی باشندوں کو مصلوب کرنا شروع کر دیا تھا اور سیاسی استبداد نے رعیت اور تاجروں کو معاشی استحصال کا نشانہ بنا لیا تھا۔ چیؤل اور اس کے مضافات سے مظلوم بھاگ کر ریوڈنڈا اور دابھول میں پناہ لینے لگے۔ ملک عنبر تو مغلوں سے اُلجھا ہوا تھا۔ چیؤل کے تھانیدار عبدالکریم نے ولندیزیوں کی مدد سے پرتگیزی جہازوں کو لُوٹ کھسوٹ کر انتقام لے لیا۔ لیکن انتقام اور عناد کا یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ کبھی مسلم چیؤل کی بستی میں شیطنت ناچنے لگ جاتی اور کرتنجہ کے کرائے پر حاصل کیئے گئے مسلمان موت کے ہاتھوں بک جاتے اور کبھی نظام شاہی بستے سالسٹی، بسین اور اگاشی کو روندڈالتے ــــ آخر کار ۱۶۱۵ء میں پرتگیز، عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا[۱]۔ ولندیزی اور نوآباد کاروں کو نظام شاہی مملکت میں بود و باش اختیار کرنے کا حق نہیں دیا گیا لیکن ملک عنبر دریدہ ان کی دوستی کا دم بھرتا رہا ــــ کیونکہ ولندیزی جنھوں نے ۱۵۹۵ء میں قدم رکھا پرتگیزوں کے حریف بن چکے تھے۔ ان کے اور انگریزوں کے جہاز دابھول، چیؤل اور بسین تک پرتگیزی دستورات راہداری کی پرواہ کیئے بغیر بلا روک ٹوک جاتے تھے جبکہ ۱۶۲۴ء تک پرتگیزی پروانۂ راہداری کے بنا کوئی جہاز ایران اور ترکی کے راستے یورپ نہ جاسکتا تھا۔ ونیگرلہ میں ولندیزیوں نے قدم جما لیئے تھے اور قلعہ بھی قائم کر لیا تھا (۱۶۴۱ء) اور انگریز ۱۶۳۸ء میں راجہ پور میں تجارتی کوٹھی قائم کر کے بحری تجارت کی دوڑ میں پرتگیزوں سے آگے بڑھ چکے تھے ــــ [۱۶۶۰ - ۷۰ء میں جب سیواجی نے راجہ پور کو لُوٹا تو تجارتی کوٹھی اُکھڑ گئی] اور اب

---

[۱] رادھے شیام۔ ص: ۳۵۶ - ۳۵۰

پرتگیزی اقتدار کی ساکھ بھی اُکھڑ چکی تھی۔

فتح و شکست کے اسباب:

گووا اور چول کی جنگوں میں پرتگیزی فتح کے اسباب در اصل ان کے وہ قومی
اوصاف تھے جن کے مالک کبھی خود ان کے وہ حریف مسلمان عرب تھے جنھوں نے اندلس
پر قبضہ کر لیا تھا اور ہندوستانی مسلمانوں میں انھیں اوصاف کا فقدان تھا۔ پرتگیز، جذبۂ
قوم پرستی سے سرشار تھے اور شہنشاہیت کے پرستار جس کا وقار وہ بہر طور قائم رکھنا
چاہتے تھے کیونکہ اسی وقار سے ان کے قومی مفادات وابستہ تھے اور ان کا دار و مدار
ایک اجنبی دیار میں خود ان کی بقا اور تحفظ پر تھا۔ یہی جذبہ تھا جس نے (٦۴٥١ء)
میں چاول میں مقیم لوگوں نیز اور لسبن کی دولتمند خواتین کو اُکسایا اور انھوں نے
اپنے جسموں کے سارے گہنے پاتے اُتار کر گووا کے واسطے کر بھیج دیا" تاکہ دکن کی
مُہم جاری رکھی جاسکے اور ان کے قومی وقار کو گہن نہ لگنے پائے۔ یہاں کی آب و ہوا
میں رہتے ہوئے وہ حکمران طبقے کی تمام راحتوں اور فاتح قوم کی آسائشوں کے دلدادہ
ہو چکے تھے اور گرم ملک کے نیلے آسمانوں کے نیچے مہیا تمام سہولتوں اور نعمتوں کے گرویدہ
بن چکے تھے۔ حبشی غلاموں کے پرے، ولاؤں کی قطاریں، کھیتوں کے وسیع قطعات
اور سونے کے ڈھیر، سب کچھ ان کی ملکیت میں تھا۔ فرنگیوں کا جذبۂ قوم پرستی ہمارے
نقطۂ نظر سے چنداں وقیع اور قابلِ احترام نہ ہو مگر اپنی بقا، تحفظ، مفاد اور نئے
جاگیرداری نظام کے استحکام کے لیے وہ جو بھی جدوجہد کرتے رہے وہ غیر فطری نہ تھا۔ یہ مسلّم
ہے کہ انھوں نے مسلم تسلط کو کچلنے کیلئے، اپنے سیاسی مقاصد کی برآری کیلئے اور اشاعتِ عیسائیت کی خاطر،
ہمیشہ شقاوت کی تلوار، فریب کے جال اور مذہبی عصبیت کی کیلوں بھری جان لیوا صلیب سے کام لیا ▲

بارہواں باب

مُغل سامراجیہ اور مرہٹہ سوراجیہ

تاریخ سولہویں اور سترہویں صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت نے ایک نیا موڑ لے لیا تھا۔ یہ مغل شہنشاہیت کا سنہری دَور تھا۔ ثقافت نئے اقدار اور روایات کا پُرشکوہ جلوس لئے تکلفات کے حریم ناز میں دربار سجا رہی تھی۔ اقتصادی استحکام، مادی ترقیوں اور سماجی بلندیوں نے ہندوستانی معاشرے کو تمدنی اور تہذیبی برکتوں اور نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ ذہن و فکر کی شاہراہیں علم و دانش کے چراغوں سے منوّر ہو رہی تھیں۔

مغل — نووارد اور اجنبی تھے مگر جلد ہی معاشرے کے تمدنی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال کر ہندوستانی بن گئے۔ ثقافتی قدروں کے اشتراک و اختلاط سے ایک نیا تہذیبی ڈھانچہ تیار ہوا۔ یہ لوگ تیموری شاہزادوں کے عہد کے وسطی ایشیا کی مہذب و متمدن زندگی کے اعلیٰ نمائندے تھے اور حکمران طبقے کے بے حد ذہین اور باشعور افراد تھے جو زندگی کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی جستجو میں زرافشاں اور آمو دریا پار کر کے گنگا اور جمنا کی گود میں چلے آئے اور پھر اسی کے تہذیبی گہوارے میں ایک گنگا جمنی معاشرت کی نشو و نما ہونے لگی جس کا خمیر ہندوستانی تھا مگر جس کے رنگ اور رُوپ پر سمرقند و بخارا کے تہذیبی جمال کی پرچھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ "ہندوستانی مغل" جہانگیری بھی کرتے رہے اور جہانداری بھی، اور ایک نئی ذہنی، فکری اور تہذیبی دنیا تخلیق کر کے عوام کے دلوں پر حکمرانی

بھی کرتے رہے۔ ان میں اکبر اور دارا شکوہ جیسے "صُلحِ کل" کے پیامبر، انسانیت کے ارفع اور آفاقی قدروں کے قدرداں اور مذہبی رواداری کے علمبردار پیدا ہوئے۔ اکبر کی روشن خیالی سے اکتساب نُور کرنے والے: فیضی، ابوالفضل، بیربل، خانخاناں اور ابوالفتح گیلانی جیسے تابندہ ستاروں نے قرونِ وسطیٰ کی فکری فضا اور ذہنی ماحول کو تابناک بنا دیا تھا۔ دورِ مغلیہ میں متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے تصوّرات حقیقت کے حسین سانچوں میں ڈھل چکے تھے۔ جذباتی ہم آہنگی فارسی شاعری اور ہندی کویتاؤں میں گُونج رہی تھی۔ یہ کبھی تان سین کے سُروں میں رچ گئی، کبھی دسونت اور لباون کی چتر کاری اور درباری مصوّروں کے "میناتور" شاہکاروں میں بول اُٹھی۔ جمالیاتی ذوق نے انگڑائی لی تو "مائلِ پروازِ حُسن" نے مرمریں سِلوں میں اپنا مرکز ڈھونڈ لیا۔ فنِ معماری میں تڑپ پیدا ہوئی تو محلوں، مسجدوں، قلعوں اور مقبروں میں اسے ابدی سکون ملا۔ مدنیت کے بیکراں تصوّرات کو فتحپور سیکری جیسے کئی نئے شہروں میں پناہیں ملیں۔ حُسنِ خود بیں میں جلوہ نمائی کا جذبہ اُبھرا تو فنونِ لطیفہ کی حسین تخلیقات میں جلوہ گر ہوا ــــ اور یہ تمام لطافتیں، نزاکتیں اور رعنائیاں جب ایک مرکز پر جمع ہو کر سنگِ مرمر میں ڈھل گئیں تو تاج محل جیسے لافانی شاہکار کی تخلیق ہوئی، جو ہر زمانے اور تہذیب کے انسان کا ورثہ ہے، کیونکہ یہ سماجی محنت اور انسانی محبّت کا بے نظیر مظہر ہے۔ یہ صرف ایک شاہنشاہ کی عظیم شخصیت، داخلی جذبات اور حوصلہ مندیوں کا مظہر ہی نہیں، بلکہ ہر انسان کے قلبی احساسات اور نازک ادراک کی دھڑکن ہے، اِس لئے کہ "یہ اُن تمام لوگوں کی آرزو پُوری کرتا ہے، جن کے دلوں میں محبّت ہے۔"[1]

تاج محل بنانے والے مغل تاجدار اپنے سے فروتر تاجوروں کے سروں سے تاج

---

[1] پروفیسر محمد مجیب۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنِ تعمیر۔ معارف (اعظم گڈھ، ستمبر ۱۹۶۳ء)

بھی اتار لیتے تھے۔ یہ مغل شہنشاہیت کا استعماری روپ تھا۔

پراگندہ روزی۔ پراگندہ دل

۱۶۳۳-۳۶ء کا زمانہ نہایت پرآشوب تھا کھیتوں میں اکال پڑا تھا اور تباہی کا بازار گرم تھا۔ تونگر بھی [illegible] جواہرات کے وزن کے برابر ایک سیر جوار یا جو کا حصول نہ کر سکتے تھے اناج کے دانے گوہر نایاب بن چکے تھے۔ دکن کی مسلم سلطنتیں مغل[1] سامراجیہ کے سامنے سہم کر سسکتی جا رہی تھیں۔ قطب شاہی عروج [illegible] خوبصورت [illegible] آلام میں پھنس چکی تھی۔ عادل شاہی کو انحطاط پذیر تو [illegible] دیمک چاٹ رہے تھے اور انگریزی استحصال و استبداد نے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا بنا دیا تھا۔ نظام شاہی حکومت کا نظام چراغ سحری تھا۔ ملک عنبر کی [illegible] ذہنی [illegible] نے [illegible] کو [illegible] [illegible] گیا [illegible] اس کی شمع حیات بجھ گئی تو نظام شاہی مملکت میں اندھیر پھیل گیا [illegible] سے زیادہ اٹھا کر مغلوں نے برہان نظام شاہ کے قتل کے بعد، فروری ۱۶۳۳ء دولت آباد کے نئے پایہ تخت پر قبضہ جما لیا۔ مردہ نظام شاہی کا جو ساکم جہاں تھا وہاں کا خود مختار حکمران بن گیا۔ سیدی سابا اور سیف خان نے کوکن آپس میں بانٹ لیا۔ سیدی عنبر ڈانڈا راجپوری پر راج کرنے لگا۔ شاہ جی بھونسلے ایک مرہٹہ سردار نے مرتضیٰ نظام شاہ کو کٹھ پتلی بنا دیا اور خود سیاسی بازیگر بن گیا۔ پونہ سے بالاگھاٹ اور جنیر سے سنگمنیر اور ناسک تک اس کی مہم بازیاں کئی ملکی[2] بازیاں جیت چکی تھیں۔ جب سیف خان اور

---

[1] Source Book of Maratha History از ایچ۔ جی۔ رولنسن (بمبئی ۱۹۲۹ء) ج: ا صفہ ا

[2] فرامین و اسنادِ سلاطینِ دکن۔ دیکھئے فرامینِ عادل شاہیہ۔

ن سایا کوکن سے کوچ کر گئے تو کلیان، بھیونڈی میں بھی شاہ جی کی جتھے کارستانی
ے لگی۔ بھیونڈی کا ماہولی قلعہ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کے لیے حصار بن گیا جہاں ۱۶۳۲ء
ے کر ۱۶۳۶ء تک کئی مرتبہ اُس کی اہلیہ جیجا بائی نے ننھے سیواجی کو لے کر پناہ لی تھی۔
ب اُس پر بغاوت کی فردِ جرم عائد کی گئی تو شاہ جی کو بھی یہیں پناہ ملی۔ مگر جب رندولہ
ن عادل شاہی فوج کے ساتھ اور مغل سو بیدار خان زمان نے اپنا لشکر لے کر ماہولی کو محصور
یا تو فرار کی راہ بھی نہ ملی۔ شاہی مجرم کو ۲۸۱۵ فٹ کی بلندی سے نیچے اتر کر جھکنا پڑا۔
م خدمات کے صلے میں نئی جاگیروں کا طلب گار بنا اور معافی کا خواستگار ہوا اور عادل
ہی حکومت کی وفاداری کا دم بھرنے لگا۔

۱۶۳۶ء کے معاہدے کی رو سے شاہ جہاں نے کلیان سے ناگوٹھنہ تک کا
ق سابق مالکوکن نظام الملکی، بیجاپور کے ماتحت کر دیا اور یہیں سے سرکار مالکوکن کے
بدار مقرر ہو کر صدر مقام کلیان میں مقیم رہنے لگے۔ جنوبی کوکن کا علاقہ عادل شاہی حکومت
جیرہ کے سیدیوں کے سپرد کر دیا، تاکہ تجارت کی حفاظت ہو سکے اور عازمینِ حج کی پاسبانی۔
نظامت وزارت بن گئی (اور جب ۷۰ - ۱۶۶۹ء میں مغلوں نے رائے گڑھ، انجن ویل
ت سندھو درگ فتح کر کے سیدی وزیر کو بخش دیا تو اِس عنایت کے عوض اُس نے سورت
مغل بیڑے کی امیر البحری کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ یہ رابطہ ۱۷۵۹ء تک قائم رہا)
ن کا مقبوضہ علاقہ مغل سلطنت کا صوبہ بنا تو شہزادہ اورنگ زیب بہادر نائب السلطنت
مرر ہو کر آیا۔

بادشاہ نامہ (ایلیٹ) ج: ۷، ص: ۵۶۔ گرانٹ ڈف ص: ۵۱ (فٹ نوٹ)

، مرہٹہ تاریخ کے مصادر (مذکورہ بالا) ص: ۲۸۔ بادشاہ نامہ ص: ۶۰

اس وقت جب مغل شہنشاہیت خود اپنے ہم مذہب دکھنی ریاستوں کے تہذیبی گہواروں کے گرد تلواروں کے گھیرے ڈال رہی تھی، پونہ کے کوہستانی گہوارے میں مرہٹوں کا احساسِ قومیت اور جذبۂ حرّیت شاہ جی بھونسلے کے بیٹے سیوا جی کے روپ میں پرورش پا رہا تھا۔

سیوا جی کا شہرِ آرزو

عادل شاہی حکومت سترہویں صدی کے نصف النہار تک پہنچ کر چھ منزلیں طے کر چکی تھی کہ اس کے باجگذار بادشاہ کی زندگی کا تاج موت کے آہنی ہاتھ نے اُتار لیا۔ اُمرائے بیجاپور محمد عادل شاہ کی موت کے سوگ میں اور مغلوں سے شکست کھانے کے غم میں ماتم کناں تھے۔ اس ماتم میں شریک ہونے کی غرض سے نظام الملکی تالکوکن کا فوجدار ملا احمد نایت بھی کلیان سے رخصت ہو چکا تھا۔ کلیان، بھیونڈی کی قدیم بستیاں اُسے جاگیر میں ملی تھیں۔[1]

شاہجہاں کی علالت کی تشویشناک خبریں ذہنوں میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" کو قریب لا رہی تھیں۔ ابھی صفِ ماتم بچھنے بھی نہ پائی تھی کہ سلطنت کے دعویداروں کی فوجیں صف آرا ہونے لگیں۔ دکن کا صوبیدار شاہزادہ اورنگ زیب آگرہ کی جانب کوچ کرنے کے لئے پا بہ رکاب بیٹھا تھا کیونکہ سیاسی تیور بتلا رہے تھے کہ امن و امان کا مزاج بگڑنے والا ہے اور خانہ جنگی کی آگ بھڑکنے والی ہے۔ ادھر شاہ جی کا حوصلہ مند اور اولوالعزم بیٹا عادل شاہیوں کی پُشت پناہی پاکر دکن کے قلعوں پر قبضہ کر کے

---

[1] عالمگیر نامہ ص: ۵۷۶

مغل قوتوں کی شہ رگ کاٹ رہا تھا۔ پُونہ اور سُوپہ کے موروثی جاگیروں کے چند بیگھہ مٹی سے وہ مطمئن نہ تھا۔ اُس کے تنگنائے عزم کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے تھی۔ اُس کے جوان دل میں اُمنگوں کا جوالا مُکھی غنیموں کو پھونک دینے کے لئے بے چین تھا۔ اُس کی پسماندہ قوم کی تہیدستی، توانگروں کے ہاتھوں سے سب کچھ چھین لینے کے لئے اُسے مجبور کر رہی تھی۔ جنگجو باپ کے جنگی کارنامے اُس کے تصوّر میں جہانگیری اور جہانداری کے نقشے مرتب کر رہے تھے ——

اور اب جب کہ دولت آباد سے لے کر بُرہان پور تک سیاسی سنّاٹا چھایا ہوا تھا اور مغل شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں دُور —— شمالی ہند کے اُڑتے ہوئے گرد و غبار میں ڈوبتی جا رہی تھیں، تو سیواجی کے مُلک گیری کے خوابوں کے خطوط واضح تر ہونے لگے۔ گرمیوں کی سنسان دوپہر کی طرح خواب آگیں اور بے حد اُکتا دینے والی سیاسی فضا اُسے جھنجھوڑنے لگی۔ سامنے کوکن کا زرخیز خطّہ تھا اور کلیان، بھیونڈی کی خوش حال بستیاں تھیں، جہاں کے طلسمی دفینوں کی داستانیں اس کے حوصلوں اور وَلولوں کو شہ دے رہی تھیں[1] کہ: چلے آؤ " اگر "شاہ" بننا چاہتے ہو تو ہمیں مات دے جاؤ"۔ کیونکہ نہ تو شہر پناہ ہی موجود تھا [اور نہ اس وقت تک شہر پناہ جو معدوم ہو چکی ہے، تعمیر ہوئی تھی] مقامی [کولی] راجاؤں کی شر انگیزیوں سے شورشیں برپا تھیں اور کچھ راجاؤں نے بُلاوے[2] بھی بھیجے تو سیواجی کا بھی دل بڑھا اور اُس نے کلیان بھیونڈی کی طرف تین سو گھڑ سواروں، بارگیروں اور ماؤلی سپاہیوں کے دستے کے ساتھ قدم بڑھا دیا —— !!

صدیوں برس کا طویل سفر طے کر کے رواں دواں وقت کی ایک ہزار چھ سو ستّاونویں

---

[1] ٹریے ورنیے: سفرنامۂ ہندِ مغول (انگریزی ترجمہ)، ج ۲، ص ۲۲۳، ص: ۱۶۱—۱۶۰۔

[2] تاریخ سیواجی۔ ورق ۱۳ (الف)، بحوالہ سرکار "سیواجی" ص: ۵۱۔ ڈینس کنکیڈ "عظیم باغی" کے مورخ اور دیگر تاریخ نویسوں نے کوکن (کلیان) پر حملہ کو ۱۶۴۸ء کا واقعہ قرار دیا ہے۔ دیکھئے "عظیم باغی" نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی (۱۹۶۸)، ص: ۵۵—۵۴

منزل پر کلیان کا تھکا ماندہ اور اُداس شہر لاوارث بچے کی طرح سہما ہوا بہتی ہوئی ندی کے کنارے
کھڑا تھا۔ دکن کے سیاسی جمود کی طرح سارے پر اکتوبر کا سرمائی کُہرا چھایا ہوا تھا جس کی
کہلائی بیلنوں سے قدیم مسجدوں کے کالے اور سفید مینار سے اور گنبد سرمئی چادروں میں ٹھٹھرے
ہوئے نظر آرہے تھے۔ شنالا تالاب کے "مُطہّر" پانی میں کالی مسجد کو اپنا عکس دیکھتے ہوئے صرف
چودہ سال گذرے تھے۔ آخری برسات کے پانی سے بھری ہوئی ندی میں دُور دُور
تک نوائطی تاجروں اور کولی ماہی گیروں کی بادبانی کشتیاں اور ڈونگیاں ڈول رہی تھیں۔
بندر کے سنگین گھاٹ پر ہندی ملاح، ٹانڈیل اور حبشی غلام اسباب تجارت کی باربرداری
میں مشغول تھے۔ ان میں اودن اور جزائر بمبئی کے نمک سازوں کا نمک تھا جس کی تجارت
سے "میٹھ کر" خاندان میں خوشحالی کی ملاحت پھیلی ہوئی تھی۔ ماہولی کے نواحی جنگلوں کی
عمارتی لکڑیاں تھیں جس کے بیوپار نے نوائطی تاجروں کو اقتصادی استقامت بخش دی
تھی۔ پرتگیزی تھانہ کے کاٹھیاواڑہ اور "ریوڈی" کھتوں میں بُنے گئے "ارمیسیا" مہین
ریشمی کپڑوں کے تھان تھے اور تار ریشکوں کے گچھے اور بادلے کی رنگ برنگی انٹیاں تھیں۔
آدھے دن کے راستے پر واقع کلیان کی تجارتی منڈی، اسلام آباد کے ساتی اور کنتھری بنکروں
کے بُنے ہوئے گاڑھے کے گٹھے تھے اور ان سب سے زیادہ نمایاں دکن کے نفیس اور
پُرتکلف پارچہ جات تھے ۔ ———— کھاڑی کے کنارے قبرستانوں
سے پرے، اندرونی حصے میں نوائطی تاجروں اور قدیم گھرانوں کی گھنی آبادی تھی۔ اس
سے پرے نوانگر ـــ قدیم ہندو بستی میں کوکن اور گجرات کے براہمنوں کی واڑیاں تھیں۔
کاکستھ پربھوؤں کے بلند مکانات تھے۔ وانیوں کی دکانیں تھیں ـــ خوجے بھی دکانداری

کرتے تھے۔ پارسیوں کے آتشکدے میں سنجان اور نارگل کے معبدوں سے لائی گئی آگ روشن تھی۔ اُن کے میخانوں کی فضا بھی "دو آتشہ" ہو رہی تھی۔ ویران مقبروں میں شہر کے اوباش، نکھٹو اور بے روزگار دن بھر کُتوں کی طرح اینڈتے رہتے تھے اور بیکار مشغلوں میں وقت ضائع کرکے بلا مقصد کی زندگیاں گذار رہے تھے۔ ــــ الہاس کے کنارے ٹیلے پر ایک گڑھی تھی [جو ۱۵۷۰ء تک فوجی چوکی کا کام دیتی تھی] اسی درگاڑی قلعہ کے احاطے میں عیدگاہ اور مختصر سی عبادت گاہ تھی[2]۔ فوجی دستے کے سپاہی جو بحری راستے کی پاسبانی کرتے تھے تاکہ کوئی پرتگیزی بیڑا البسین، تھانہ کے ذریعے اچانک حملہ نہ کر دے ــــ اس حملے سے بے خبر رہے جو پیچھے کی طرف سے شہر پر ہو رہا تھا۔ حملہ آور بھی مختلف تھے اور حملے کی نوعیت بھی دُوسری تھی۔ "ہر ہر مہادیو" کے نعروں سے دلوں کی دھڑکنیں تشویش اور خوف کی طرح بڑھ گئیں۔ کوکنی مسلمانوں کے بلغور خانوں سے دھان کُوٹنے کی دھمک بھی گھوڑوں کی ٹاپوں میں ڈوب گئی۔ شہر کی بارہ قدیم مسجدوں سے اذانوں کی بلند ہوتی ہوئی آوازیں بھی شور و شر اور چیخ و پکار میں گُم ہو گئیں ــــ کھاڑی کے کنارے آدھار واڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کے ڈوبے ملاحوں کی سنگین قبریں تھیں۔ ایک کالے تراشیدہ کتبے پر لنگر کے نقش کے نیچے عربی میں یہ قطعہ کھُدا ہوا تھا[3]۔

بتابینك احداث وهن سكوت ــــ وسكانها تحت التراب خفوتا

ايا جامع الدنيا ليغير بلاغة ــــ لمن تجمع الدنيا وانت تموتا

"ــــ اور بغیر غم کا بوجھ اُٹھائے، دھوکے اور ریا سے [دنیا کا جاہ و مال] جمع

---

[1] ڈاکٹر جان فرائر۔ ج: ۲۔ ص: ۸۔۳۰۱ [2] تھانہ گزیٹر۔ ج: ۱۴۔ ص: ۱۱۸ ذفٹ نوٹ بھی دیکھیے
[3] عبارت جگہ جگہ سے معدوم ہونے کے سبب صاف پڑھی نہیں جا سکتی۔

کرنے والوں کا اندوختہ " جب لُٹ گیا تو لُٹے گھروں میں خوف و وحشت کے سبب قبرستانوں جیسا گہرا سناٹا چھا گیا ۔ مگر زندگی کے یہ حادثات یادوں کی قبروں میں فراموشی کی منوں مٹی تلے دب کر بھی کبھی کبھار سرگوشیاں کر اُٹھتے " ۔ ایسی ہی سہمی ہوئی سرگوشیاں فرانسیسی سیاح ٹرمے ورنیئے نے بھی سُنی ہوں گی، جب وہ " بوندگی سے جو سلطنتِ بیجاپور کا ایک چھوٹا سا شہر تھا " گذرا ہوگا کہ کس طرح سیواجی نے مقامی براہمنوں کی نشاندہی پر شہر کو جا بجا کُھدوا ڈالا تھا۔ دفینوں سے اتنا زر و جواہر اُس کے ہاتھ آیا کہ اُس نے اپنی عسکری طاقت تیس ہزار سپاہیوں تک بڑھالی[1]" مغربی سیّاح نے ملا احمد[2] عرب فوجدار نالکوکن کی بہو کی بہادری کا چرچا بھی ضرور سُنا ہوگا، جس نے اپنے خُسر کی غیر حاضری میں غنیموں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ آخر عورت ذات تھی، دست و بازو کو نظر لگ ہی گئی۔ اسیر کر کے جب اُسے سیواجی کے سامنے حاضر کیا گیا تو اُس نے "صُوبیدار نجی سُن" کو ایک بہادر سپاہی کی نظر سے دیکھا اور نہایت عزّت و حُرمت کے ساتھ بدرقہ (محافظ دستہ) کی نگرانی میں واپس بھیجدیا[3]۔ اسے تو کوئی گزند نہیں پہنچی مگر مغل جاہ و جلال اور بیجاپوری

---

[1] سفرنامۂ ہند، ج ۲، ص ۲۲۳، ۱۶۱-۱۶۰

[2] مولانا (یا مُلاّ) احمد ایک عربی النسل (نائطی) تھا جو عادلشاہی حکومت کی جانب سے کلیان بھیونڈی کا فوجدار بنکر آیا تھا۔ مُلاّ کا خاندان اپنی سماجی مرتبت اور علمی منزلت کے سبب قوم نوائط میں مشہور تھا۔ اِس گھرانے کے افراد "کلاں تر" اور "کوکنی" القاب بھی استعمال کرتے تھے [تاریخ النوائط ص ۲۲۴]۔ مآثرالامراء میں مغل امراء کے تذکروں میں مُلاّ احمد کا ذکر بھی ملتا ہے جس سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مُلاّ احمد کا مغل حکومت سے بھی تعلق تھا۔ چنانچہ اسکے علم و دانش اور فضل و کمال کا شہرہ سُنکر جہاں علی عادلشاہ والیٔ بیجاپور نے دارالمہام سلطنت کا رُتبہ عنایت کیا تھا وہاں عالمگیر نے بھی کمالِ اعزاز کے ساتھ اپنی بارگاہ میں طلب کیا تھا اور رفتہ رفتہ شش ہزار ذات و سوار کا منصب بھی عطا کیا تھا اور سعد اللہ خاں کے خطاب سے بھی سرفراز کیا لیکن طلبِ شہنشاہی پر آمادہ سفر تھا کہ بازنارہ اجل سے طلبی آگئی۔ مُلاّ احمد کا صاحبزادہ محمد اسد نابتہ اکرام خان کے خطاب و منصب سے سرفراز ہوکر مغل سلطنت سے سلسلۂ مُلازمت منسلک رہا۔ (مآثرالامراء ص ۲۲-۴۲۱)، نوٹ ۳ آگے دیکھئے

نتدار کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا، کیونکہ سقوطِ احمد نگر کے بعد ان علاقوں سے عادل شاہی علاقہ
لینے لگے تھے تاکہ امن وامان برقرار رکھا جا سکے۔ کلیان کی عظمتِ پارینہ کے خدوخال اور بھی
ری طرح مسخ ہو گئے۔ وہ اپنے قدیم نام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا اور کچھ عرصے تک یہ زیرِ نگین
یا مُنوّر نگین] بنا رہا۔[1]

سیاسی استقلال کے لئے مالی استحصال اور مُلکی استیلا، بقا کی ضمانت نہیں دیتے۔
قتصادی استقامت کی بُنیاد زرعی معیشت پر تھی اور سیواجی اِس نکتے سے ناواقف نہ تھا
مگر اس کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اُسے زر، زمین اور قلعوں کی ضرورت تھی۔ اس کی
رفعتِ آگہی نے اسے سب سے پہلے بلند قلعوں کو سرنگوں کرنے کے لئے اکسایا جن کی تسخیر
ن کی تقدیر پلٹ سکتی تھی۔ سیواجی، ماہولی کی عسکری اہمیت سے واقف تھا جو بھیونڈی
کے نواح میں کئی تجارتی شاہراہوں کا شہ رگ بنا ہوا تھا۔

ماہولی سے جہتار تک

تہ نواور بانسہ کے دوآبے سے نکلی ہوئی پگڈنڈیوں کی رگیں اِن تجارتی شاہراہوں
سے پیوست تھیں اور انہیں کے مرکزِ اتصال پر بھیمڑی کی صنعتی بستی کا دل دھڑک رہا تھا
وڑ تھوالہ، واستدری اور سونولی کی غالب مسلم آبادیوں سے جس کا دل ملا ہوا تھا۔ اسی
ندرگاہ سے پچھی گانو (مچگاؤں) کی اتراؤں سے پرتگیزی راہبوں کے لگائے ہوئے بدیسی

بقیہ نوٹ نمبر۳ صفحہ ۳۷۷: اس تاریخی واقعہ کو جس پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھا دیا گیا ہے، اگر جذبۂ قومی اور
حساسِ حرّیت کے ساتھ پیش کیا جائے تو یقیناً یہ قومی اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کی ترقی کے لئے ممد
ابت ہو سکتا ہے۔ تاریخ سیواجی، ورق: ۱۴-۱۳؛ عظیم یافعی۔ ص ۵۵
[1] منتخب کا غذاتِ اورنگ زیب عالمگیر (حیدرآباد دکن)۔ نومبر ۱۶۶۱ء نمبر ۱۰۷-۱۱ اور ۲۹ بڑے آر۔

قلمی آموں [الفانسو وغیرہ] کی ڈالیاں اور "انبہ بادشاہ پسند"۔ برہانپور کے میوہ ہای ڈاک" کے ذریعہ شاہجہاں کے شاہی دسترخوان کو رسیلا بناتی تھیں[1] اور اسی چوراہے سے سُورت کے طلسمی خزانوں کے قافلۂ داستان گذر کر سیواجی کے منصوبوں میں اپنی منزلیں بنا رہے تھے۔ وہ ٹھوالہ ہوتا ہوا ماہولی آیا جس کا سنگین قلعہ اس کے ارادوں کی طرح مضبوط اور عزائم کی طرح بلند تھا۔ سیواجی کو ماہولی سے جذباتی لگاؤ ضرور رہا ہوگا کیونکہ یہ اس کے بچپن کا گہوارہ رہ چکا تھا اور اب بھی ۸۱ جنوری ۱۶۵۸ء ۲۰ کتیس سالہ جوان سیواجی کے لئے اپنی باہیں کھولے ہوئے تھا۔ اور دُور جہاڑ تاکوکن کی وسعتیں اُس کے استقبال کے لئے فرشِ راہ بن چکی تھیں۔ اباجی سونے دیونی مقبوضات کا صوبیدار مقرر ہوا۔ دیوستھانوں کے دھرمارتھ اور براہمنوں کے مدد معاش۔ انعامات جو مسلم حکومتوں کے عہد میں منسوخ کر دیئے گئے تھے، اُن کی تجدید کی گئی۔ اسی طرح پُرانے زرعی طریقۂ کار کو رواج دیا گیا۔

جب سیواجی کے سامنے کوکن کے قلعوں سے ڈھیر لگ گئے تو نئے مغل شہنشاہ عالمگیر کی فکروں میں اور بھیڑ لگ گئی۔ جے سنگھ کو بھیجا تاکہ وہ سیواجی کی سرکوبی کرے۔ لیکن وہ سیواجی کی دل جُوئی کی خاطر صلح جوئی پر آمادہ نظر آیا۔ بیجاپوری میر لشکر افضل خاں جنگجوئی کا قائل تھا۔ لہٰذا وائی پر قبضہ کرنے کے بعد خط بھیجا جس میں سیواجی پر اُن علاقوں کو غصب کرنے کا الزام لگایا جو سقوطِ احمد نگر کے بعد ازرُوئے معاہدہ مغلوں سے برائے تحفظِ امن وامان عادل شاہی کی تحویل میں آچکے تھے۔ مزید یہ فردِ جرم عائد کر دی گئی کہ سیواجی نے مُسلم عبادت گاہوں کو مسمار کیا اور کلیان۔ بھیونڈی کے

---

[1] بمبئی گزیٹیر۔ ص: ۱۱۴، رقعاتِ عالمگیر نمبر ۵۲۔ [2] گرانٹ ڈف، مرہٹوں کی تاریخ ص ۱۱۹، ۱۱۸

صالح مسلمانوں کی دینی زندگی میں رکاوٹیں ڈال دی تھیں۔" افضل خان نے سیوا جی کے راج دوت کرشنا جی بھاسکر کے ذریعے پیغام بھیجا اور اپنے اور شاہ جی بھونسلے (مہاراج) کے دیرینہ مراسم اور برادرانہ تعلقات کا حوالہ دیتے ہوئے اونچ نیچ سمجھائی اور ملاقات کی دعوت دی۔ مقبوضہ قلعوں کی بحالی کا یقین دلاتے ہوئے والئ بیجا پور سے مالکوکن اور دیگر جاگیروں کی بخشش کا وعدہ بھی کیا۔"[1]

سیواجی بساطِ سیاست کی چالوں کو سمجھنے لگ گیا تھا۔ گو مقابلے کی ٹھان لی تھی مگر اتنی عسکری طاقت نہ تھی کہ بیجاپوری لشکر سے ٹکر لے سکتا۔ یہ امرِ محال تلوار اور ڈھال سے زیادہ سیاسی چال کا متقاضی تھا۔ افضل خان سے ملنے کی ٹھانی مگر اپنے دل میں ٹھانی اور تھی۔ خان بھائی اپنے آپ پر اتنا اعتماد کر بیٹھا تھا کہ غیر کو آزمانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ گو دیوانہ نہ تھا مگر ظاہری دوستی کا فریب کھا گیا۔ جب "آستیں میں دشنۂ پنہاں" کا عقدہ کھلا تو اس کی زندگی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا ——
مگر سیواجی کے سامنے پنہالہ قلعے کا دروازہ کھل چکا تھا اور اس کی یورش و یلغار کے لئے عادل شاہی مملکت میں گوآ کے نواح تک اور کرشنا کے کنارے تک راستہ وسیع ہو چکا تھا مگر سیواجی کے تسلط کا تلاطم ابھی سیدیوں کے جنجیرہ اور ڈانڈا۔ راجپوری اور پرتگیزوں کے بسین اور تھانہ کے ساحلوں سے دور تھا۔ بیکراں سمندر کی کف آلود لہریں اس کا منہ چڑانے لگیں تو وہ سیاسی شعور کی گہرائیوں میں اترا —— اور اسے بحری طاقت کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

سیواجی کا بحریہ

یہ بحری طاقتوں کے عروج کا دور تھا۔ دور پار سمندروں کے اجنبی لوگ بحری بیڑوں

---

[1] مرہٹہ تاریخ کے مصادر (انگریزی)، رالنسن، بحوالہ شیوابھارت، باب: ۱۸، ص: ۶۹-۶۸

کے بل بوتے پر ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر اپنا کس بل دکھلا رہے تھے۔ پرتگیزی اقتدار
کی باڑھ ڈیڑھ سو سال کے بعد اب اُتر چلی تھی اور اب صرف بسئین کے شمالی صوبے اور
گوا تک اُن کے تسلط کی باڑھ بندھی ہوئی تھی۔ ولندیزی "فنگرلہ" (وینگرلے) میں ۱۶۳۸ء
میں ایک تجارتی نو آبادی قائم کر چکے تھے۔ انگریزوں کی استعماری قوتیں (۱۶۴۹ء میں) راجہ پور
کے مرکز پر جمع ہو کر گردش کے لئے پر تول رہی تھیں ـــــ مگر گیارہ سال بعد سیواجی نے راجہ پور
کو لوٹ کر اس کے پر کتر دیئے۔ انگریزی تجارتی کوٹھی منہدم اور ساقط ہو گئی۔ ایک نئی فرنگی
قوت، فرانسیسیوں سے مرہٹوں کی دوستی کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔ سیواجی سیاسی بصیرت
کا مالک تھا اور اپنے دور کے نئے اقدار کا ادراک اور شعور رکھتا تھا۔ اُس کے تصورات
ین نئے منصوبوں کے بادبان کھُل گئے۔ کلیان۔ بھیونڈی پر قبضہ کرنے کے بعد جب سب
سے پہلے اُس نے الہاس ندی کی روپہلی چال دیکھی اور اس کے پیچ در پیچ آبی جال میں جب
اس کی دُور بین نظریں پھنس گئیں تو اس کا سفینۂ تخیل بحیرۂ عرب کی موجوں پر بہتا ہوا
جبشان جنجیرہ کے رومان پرور جزیرے تک پہنچ گیا۔ جیوّل کا چمکیلا ساحل اور داابھول کا
بندر اس کے تصور میں نت نئے منظر پیش کر رہے تھے۔[1] اُس کی نظریں لوٹ کر پھر الہاس
اور کاموری کھاڑی کے سنگم پر ٹھہر گئیں ـــــ اور پھر وہ مقام بھی تصور میں اُبھر آیا جہاں
الہاس اور بسئین کی کھاڑیاں بیکراں سمندر میں کسی صوفی کے فنا فی اللہ کی طرح وصل
کے لئے بے قرار نظر آتی ہیں۔ کاموری کھاڑی سے پرے بھیونڈی اور بسئین کی سرحد پر
کانبے، کرناڑ، گوہ اور پائے میں پرتگیزی قلعوں سے سیواجی کی نظریں ٹکرانے لگیں اور
جہاں مرہٹہ سردار مورو ترمبک پنگلے اور نیتاجی پالکر کے تاخت و تاراج سے تحفظ کے لئے

---

[1] خط، ایسٹ انڈیا کمپنی مورخہ ۱۶ راگست ۱۶۵۹ء اور گوا کے وائسرائے کا خط شاہِ پرتگال کے نام ۱۶ راگست ۱۶۵۹ء

پرتگیزوں نے فوجی چوکیاں قائم کر لی تھیں۔ سیواجی نے ماہولی کی بلندی سے جب تنگر اور کاسن پہاڑوں کے زمرّدیں نشیب و فراز کو دیکھا اور ان کی ترائی میں (قلعۂ استیری تک جو بسین کے پرتگیزی شمالی صوبے کا ایک پرگنہ تھا اور اب جس پر مرہٹوں کا قبضہ ہو چکا تھا) پھیلے ہوئے گھنے جنگلوں کی طرف نظر اُٹھائی تو جنگی بیڑے کی تعمیر کا جو خواب وہ دیکھ رہا تھا، اُس کی تعبیر اُسے مل گئی۔ ان جنگلوں سے اَین اور ساگوان کے لکڑے جو جہاز سازی کے لئے کارآمد تھے، کھار پاڑ کے قدیم راستے سے باربردار بیلوں کے قافلوں کے ذریعے بھیونڈی تک لائے جا سکتے تھے۔ کاریگروں کی کمی نہ تھی۔ مقامی مسلمان نجّاروں کو کام اور دام سے مطلب تھا [قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی عوام کے محنت کش طبقے کو اِس قصّے سے کبھی مطلب نہیں رہا کہ "گاؤ آمد و خر رفت"] عیسائی مستری، کولی ترکھان اور پانچ کلشی ستار سیواجی کے منصوبۂ جہاز سازی کے لئے بڑی تعداد میں مل سکتے تھے۔ جہاز سازی ان کا آبائی پیشہ تھا۔ بھیونڈی کے قریب کا نیے کے دستکاروں کے فنِ نجّاری کی تعریف اطالوی سیّاح نکولائی منوچی بھی کرتا ہے[1]۔ (یہ جے سنگھ کے توپ خانے کا میرِ آتش تھا اور اسی نے جوہار اور رام نگر کے کولی راجاؤں کو رام کیا تھا) جہاز سازی کے کارخانے کے لئے بھیونڈی اور کلیان سے زیادہ مناسب مقاموں کا تصوّر سیواجی کر نہیں سکتا تھا، کیونکہ یہاں اُلہاس کی کھاڑی میں اور کاموری اور الہاس کے سنگم پر مرہٹہ بحریہ کی چھاؤنی بھی قائم کی جا سکتی تھی۔

اور پھر درباری بھاٹ نے سیواجی مہاراج کی مہما میں کبت لکھا:

---

[1] مغل ہند کی ایک جھلک (انگریزی استوریا دو موگور کا مختص) (لندن ۱۹۱۳ء) ص ۱۳۴

ہ نے ساگر پر کاٹھی دھری"[1] ۔۔۔ اور سمندر کی مچلتی لہروں پر کاٹھ کے بنے ہوئے
ہ رواں" نے چال دکھانا اور مغربی ساحل کی بندرگاہوں کو اسیر کرنے کے لئے جال
نا شروع کردیا۔ پانچ سے دس لاکھ روپوں کے اخراجات سے بنے ہوئے چار سو
وں کا بیڑا دریا سارنگ اور میاں نایک بھنڈاری کی سرکردگی میں سر اُٹھا کر رینگنے لگا۔
ہری قافلے میں مختلف قسم اور حجم کے جہاز تھے، شبر، بگر، ڈمبر، ٹرانڈے، تیر وکی،
پال، پھوسے، گلبت اور غراب وغیرہ۔ مرہٹی بحریہ کے رنگروٹوں میں مقری اور
ت خان جیسے مسلمان ملاحوں کی موجودگی سے مرہٹہ راج کے سیاسی مزاج کا اندازہ
ہے۔ مذہب کا تیور نظر نہیں آتا۔ ان میں ملیباری [اور شاید موپلا] ملاح بھی
ل تھے، جن کی قزاقیوں کے قصّے وقت کے دھاروں پر بہتے ہوئے سیواجی کے
ں تک پہنچ چکے ہوں گے کہ کس طرح ۱۵۷۰ء میں انہوں نے پرتگیزی تھانہ کو تاراج
ے کیتھڈرل کے عظیم گھنٹے کو عیسائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے اُتار لیا تھا اور اس
یسوعی مُبلّغین سے اُن کے مذہبی احتساب کا انتقام لے لیا تھا۔ ان ناخداؤں میں
ہ جاتی کے انگریہ بھی تھے اور نچلی جاتی کے سنگھر، وگھیرا اور کولی بھی شامل تھے۔ یہ
ے بحری جنگوں کے آزمودہ کار تھے اور ملاحی اُن کا آبائی پیشہ تھا۔

بھیونڈی اور بسین کی سرحد پر تعمیر کئے گئے چھوٹے چھوٹے قلعوں کی مخروطی
ں سے جب پرتگیز محافظوں نے مرہٹہ جہازوں کے مستولوں کو سربلند دیکھا اور جزیرہ ممبئی
خری سرحدی گاؤں سیمو تہہ [تسائن] میں ٹیلے پر بنے ہوئے چھوٹے سے قلعے کی فوجی چوکی سے
ہیروں کی طرح چمکتے ہوئے نمکزاروں سے پرے کھاڑیوں کے روپہلے پس منظر میں جب پرتگیز

---

[1] النبین ۔ مرہٹہ تاریخ کے مصادر

فرینداروں (جاگیرداروں) اور توجیوں نے سفید بادبانوں کو پُروائی جھکڑوں سے سینہ زوری کرتے ہوئے دیکھا ـــــ تو اُنہیں اپنے اِردگرد ایک پھیلتے بڑھتے گرداب کا شدید احساس ہوا جس میں اُن کے ناپاک اِرادوں کا بیڑا غرق ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ گوؔا کے وائسرائے نے اپنے آقا شاہِ پرتگال کی خدمت میں فوراً ایک عریضہ بھیجا:

" ایک مرہٹہ سردار کا بیٹا جو مغل شہنشاہ کا باغی ہے، لسبئین [سے قریب بھیونڈی] اور چیول کے علاقوں کا مالک بن بیٹھا ہے، وہ بے حد طاقت ور ہے اور اُس کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ہمیں بھی چوکنا کر دیا ہے اور ہمیں اب زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کیونکہ اُس نے اپنے چند جنگی جہاز بھیونڈی، کلیانا اور پنویل کی بندرگاہوں میں تیار کرالئے ہیں ..." [1]

خوابوں کا جزیرہ

پرتگیزوں نے بھاری خراج دینے کا وعدہ کرکے اپنی فکروں کے بوجھ کو ہلکا کر لیا اور اپنی بچی کھچی مقبوضات کو مرہٹوں کے مزید تاخت و تاراج سے بچا لیا ـــــ لیکن اب ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہی تھی کہ اپنے ڈھلتے تمدن و اقتدار کے سورج کو ڈوبنے سے بچا سکیں۔ بومبیہیم (بون بیہہ) کے جزائر میں ایک سو بارہ برس پرانے جاگیرداری سماجی نظام کی جڑیں اب سوکھ چلی تھیں اور ان کی سقافیوں کی طرح پھیلے ہوئے اِقطاعوں (فرزندوں) میں واقع پرتگیز فرینداروں کی شاندار سنگین ولاؤں کی بنیادیں

---

[1] گوؔا کے وائسرائے کا عریضہ، مورخہ ۱۶ راگست ۱۶۵۹ء۔

اُکھڑ چلی تھیں۔ ممبا دیوی اور کولی مچھیروں کے گاؤں مجگاؤں کے مرغزاروں کی آغوش میں "لارڈ آف دی مینر" کے گلشن سراؤں میں حبشی غلاموں، کولی کہاروں، مالی اور بھنڈاری خدمت گاروں کے ہجوم میں تعیش کوش زندگی کا طمطراق پھیکا پڑتا جا رہا تھا اور اُن کی گھنی باڑیوں (ہورتا)، دلکش گلستانوں اور اثمار سے لدے اور اشجار سے بھرے بوستانوں کی "ہندوستانی بہار" پر کہرآلود انگلستان کی نئی کہربائی طاقت کے نمود سے اوس پڑنے لگی تھی، کیونکہ ابھی ابھی (۲۳ جون ۱۶۶۱ء) چارلس دوم تاجدار انگلستان کو شاہ پرتگال کی شہزادی کیتھرائن سے شادی میں ممبایم کا جزیرہ جہیز میں مل چکا تھا۔ سات جزیروں کے "بنات النعش" جھرمٹ میں اس "عروس البلاد" کو جو کسی کے سہاگ کی نشانی تھی، پرتگیزوں نے کئی فزندیوں میں تکا بوٹی کر کے (۱۵۳۴ء سے) اپنے ہم وطنوں میں بانٹ دیا تھا۔ ممبایم کے جزیرے کی جاگیردار خاتون (۱۶۶۱ء میں) دونا اگنیزدا میراندا تھی جس کا خطاب "سینہورا دا الہا" تھا اور جہاں ایک "رشک عدن" باغ میں اس کی خوبصورت ڈیوڑھی "قنطہ" کئی دیگر حویلیوں کے درمیان واقع تھی۔ آنیر کھاڑی کے کنارے ڈونگری (مانک جی نوروز جی ڈونگر) کی تلہٹی میں کولی مچھیروں اور بھنڈاریوں سے آباد جزیرہ مجگاؤں میں ڈلیسوزا خاندان کے بزرگوں کی یادگار "حویلی" تھی اور جہاں ڈلیسوزا فزندار کے دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اُس کے ملازم، آگری (کیتی)، کولی، مالی، بھنڈاری اور دوغلے پرتگیز (توپاسے) محنت کے پسینے سے دھان کی فصلوں اور پام درختوں کی مختلف نسلوں کی آبیاری کرتے تھے۔ مہی کاوتی (ماہم) کے راجہ بھیم دیو کے ہمراہی "پرَدو" (پربھو)، ان اقطاع داروں کے گماشتے اور مالیہ گذار تھے۔ جزائر بمبئی کے سب سے بڑے اقطاع علاوہ متمول پادری تھے، جو مذہبی اداروں اور

کلیساؤں کے اوقاف کی صورت میں مہائم، ورلی (وورلی)، واڈر، سائن (سیمو ہ، سیوہ)، سیتوری، بائی کلہ اور پریل میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بنے بیٹھے تھے، اسی طرح قصبۂ مہائم اور اس کا مندوم (جنگی گھر)، وریلہ (وڈالہ)، ترومبہ (ٹرامبے) اور جیمبور کے "الدے ایس" [دیہات] اور "برسے تور" [گاؤں] ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغازِ اقتدار تک پرتگیز فزینداروں کو دوامی پٹے پر معمولی رقم کے عوض اٹھا دیئے گئے تھے. صرف دالکیشور کے مندوم کا کرایہ دار ایک ہندو پوساجی تھا۔[1]

یہ دراصل فوجی جاگیریں تھیں جو [معاصر مغل حکومت کے مروجہ نظامِ منصبداری کی تقلید میں] فوجی خدمات سے مشروط تھیں۔ ہر فزیندار کا فرض تھا کہ نوآبادیاتی نظام کی بنیادوں کو استوار رکھنے اور ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے جنگی تدابیر پر عمل پیرا رہے۔ حقِ ملکیت اور لگانداری کے عوض جو رقم حکومت پرتگال کو ادا کی جاتی تھی، اُسے "فورس" کہتے تھے۔ [فورس روڈ آج بھی اپنے نام کا حق جتلا رہا ہے] "ٹیر یرا" دکمیت، اور مچھواؤں کی یافت، سیندھی اور تاڑ سے کشید کی ہوئی شراب اور تیل اور گھی پر عائد محصول اور دیگر املاک و جائداد کی آمدنی کا واحد اجارہ دار اقطاعدار ہوا کرتا تھا[2] ـــــ اور جب سالسٹ کی روبہلی کھاڑیوں اور نقرئی نمک زاروں کی مرطوب فضاؤں کی حدیں پار کر کے مرہٹہ قوم پرستوں اور حریت پسندوں کے نعروں کی گونجیں سیمو ہ سے لے کر ماہی گیروں کے جزیرے الگمانی تک آباد دس ہزار انسانوں کو سنائی دینے لگیں ـــــ اور ان دوسرے دس ہزار نوعیسائیوں کے کانوں سے بھی ٹکرانے لگیں جو تھانہ، لسبین، مند پیشور اور دیگر نواحی بستیوں کے مقام

---

[1] بمبئی کا عروج، ص: ۷۲-۶۹ [2] ایضاً، ص: ۹۵-۹۶

باشندے تھے اور جنہیں فرانسسکن اور جیسوئیت پادریوں نے مذہبی احتساب[1] کی عدالت میں کھینچکر "جبریہ تبدیلیٔ مذہب" کی سزائیں دی تھیں ـــــ تو اُن کے بجھے دلوں میں بھی نئی اُمیدوں کے چراغ جھلملانے لگے اور اب یہی نوگرفتہ مہاتم کے قدیم ترین کلیسا "سینٹ مائیکل" اور بندورہ (باندرہ) کے "سینٹ اینڈریو" گرجا میں یوم السبت کے موقعوں پر ارغنوں کے آہنگ اور مقدس باپ کے خطبوں میں کپکپی اور مایوسی کی تھرتھراہٹ محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ سیموہ، پریل اور مہاتم میں متمول راہبوں کی پُر تکلف خانقاہوں اور مہاتم کے میدان [اسپیلینڈ] میں واقع قدیم فرانسسکن چرچ سے لے کر ـــــ سالسٹی میں پوئیسر کے "سینٹ سے سی لیا" کلیسا، بوریولی اور باندرہ کی تبلیغی درس گاہوں اور بُدھ گپھاؤں کے کھنڈرات پر تعمیر کئے گئے کلیسائی اداروں کی بُنیادیں لرزتی نظر آنے لگیں ـــــ ان میں سے کتنے ہی مندروں اور مسجدوں کو مسمار کرکے بنائے گئے تھے[2]

"سی اِم" یا سیموہ کے نمک سار اور مجگاؤں اور ڈونگری کے درمیان بہنے والی اُبتر کھاڑی کے طاسوں میں پانی سے "ہیرے کی کنیاں" بنانے والے آگریوں نے جب سُناکہ اُن کے دل کی جراحتوں کا مداوا کرنے والا ایک نیا مسیحا خود اُن کے دھرم اور راشٹر میں پیدا ہوا ہے تو اُنہیں یقین ہوگیاکہ اب ان کی کچلی ہوئی حمیت اور مجروح غیرت کے زخموں پر نمک چھڑکنے والے اغیار ان کی دھرتی پر زندہ نہیں بچیں گے۔ مہاتم، مزگاؤں، کیوّل [کولی واڑ] اور پریل کے "رومش جیل" کے اردگرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں دال اور چاول اُگانے والے آگری دکینی، جن

---

[1] بمبئی کا عروج، ص: ۵۷ [2] ایضاً، ص: ۶۹-۷۶ (فٹ نوٹ بھی دیکھئے) تھانہ گزیٹیر ۱۸۸۲ء ج ۱۳ ص ۲۰۰-۱۹۹

کے چہرے دھوپ سے جھلسے ہوئے اور بھوک سے سُتے ہوئے رہتے تھے، اپنے دلوں میں خوش آئند توقعات کی تخم ریزی کرنے لگ گئے تھے کہ شاید اب وہ دن دوبارہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں گے جب سونے کی بالیاں کاٹنے والی درانتیاں تلواریں بن کر سروں کی فصلیں کاٹ ڈالتی تھیں[1]۔ سات جزیروں کے گرد نقرئی ہالے بنانے والی کھاڑیوں کی گہرائیوں اور لہریں مارتے ہوئے سمندر کے پاتال سے چاندی جیسی تڑپتی ہوئی مچھلیاں پکڑ کر انہیں بسین کے نوائطی تاجروں کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول[2] بیچ ڈالنے والے کولی ماہی گیروں کے دلوں سے اب خوفِ دار و گیر دامنگیر نہیں رہتا تھا۔ جب سے انہوں نے دیکھا تھا کہ قریب سے گذرنے والی الہاس جل پری خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی کیونکہ اب اس کے سینۂ آب پر مرہٹہ بحریہ رواں دواں رہنے لگا تھا۔ بسین اور بندورہ سے بھاگ کر نا ئیگام، ڈونگری اور مہائم میں بس جانے والے شینوی اور پالشیکر براہمنوں کی باچھیں کھل گئیں اور ان کے دھیان میں ہندو سنسکرتی کے پراچین اتہاس کی کتاب کھل گئی اور وہ ہندو قومی تہذیب کے آواگون کا سپنا دیکھنے لگے۔ ان کے تصور کے صنم خانے میں سلابا، ون کے یادگار والکیشور مندر اور مہالکشمی کے مسمار گو پرم ابھرنے لگے اور ان کے بتکدۂ خیال میں بھولی بسری یادوں کی طرح دیوی دیوتاؤں کی پرچھائیاں ابھرنے لگیں جن کی مورتیوں کو خوف کے ہاتھوں نے ریگ زاروں میں کہیں چھپا دیا تھا[3]۔ وہ اب خوش تھے کہ خود ان کے فرقے کے افراد پنچ کاشی، پربھو اور کولیوں کے علاوہ

---

[1] بمبئی کا عروج ص: ۷۹، ۱۰۱۔ ڈاکٹر جون فریئر۔ ج ۱، ص: ۱۷۴۔ [2] ایضاً ص: ۱۷۲ مسی گومک" (مجگاؤں) خاص طور سے بڑ مچھلی کیلئے مشہور تھا۔ دیکھئے جون فریئر: ۱ صفحہ ۱۷۲ [3] ایضاً ص ۹۸، ص ۱۳۳، ص ۱

تجلی جاتی کے لوگ جوز بردستی کرسٹان بنا دیئے جاتے تھے۔ اب دوبارہ ان کے پیروکار بن کر ان کی اجاڑ اور معاشی اعتبار[1] سے بیکار زندگی کو عقیدت کے چراغوں سے منور کر دینگے دیوڈونگر [ملیبار ہل] میں آم، جامن، کٹھل اور پام کے گہرے سائے میں "سری گنڈی" کے پارس پتھر کے پجاریوں کی تعداد بڑھنے لگی اور سودنی کلم [بائیکلہ] کے جنگجو بھنڈاری اور کولی اپنی قومی روایت کے مطابق گلے سے چاقو لٹکائے "چٹانوں کے دیوتا" کھنڈا دیو [گھوڑپ دیو] کے معمولی مندر میں چھٹی کے دنوں میں اور تہواروں پر باقاعدگی[2] سے جا کر پرارتھنا کرنے لگے تاکہ ان کے من مندر میں شانتی اور شردھا (پاکیزگی)، کا اجالا پھیل جائے ــــ لیکن جتنا ذہنی کے ساکنان چمن میں کچھ ایسے بھی تھے گوشے میں قفس کے جنہیں آرام بہت تھا"۔ جیسے پرتگیزی حکومت اور زمینداروں کے عمال ۔ پربھو اور شینوی [جیسے رام چندر شینوی تھا] اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی مہاجرت میں حصول دولت کا سیدھا راستہ دیکھ کر یہاں بود و باش اختیار کرتے آرہے تھے۔ ان میں کھمبایت اور بھڑوچ کے پارسی تاجر تھے [جیسے عمارتوں کے ٹھیکیدار خورشید جی پوچاجی (۱۶۶۴ء) اور فورٹ میں پہلی اگیاری کے بانی (۱۶۷۱ء) ــــ مودی ہیرجی واچہ تھے[3]] دوراب جی نانا بھائی پرتگیزوں کا تجارتی نمائندہ تھا۔ اس کے برعکس قصبۂ مہائم اور جزیرۂ مہائم میں مخدوم علی مہائمی کے سوا دو سو سال سے کچھ برس اوپر پرانے مزار کی نواح میں آباد نوائطیوں کا ردِ عمل کیا ہوتا ہوگا، جب وہ سترہویں صدی کے ہر سنگِ میل پر مغل شہنشاہیت کے عظیم باغی شیواجی کے

---

[1] بمبئی کا عروج، ص: ۸۴، تھانہ گزیٹیر، ایضاً۔ ص: ۶۳، ۲۰۰۔ [2] ایضاً۔ ص: ۹۴۔

[3] ایضاً۔ ص: ۹۹، ص: ۱۱۹ ــ ۱۱۸

سیاسی عروج اور کوکن میں اس کی فتوحات کا رُخ دیکھتے ہوں گے کہ کس طرح اس

عظیم باغی

نے جنوری ۱۶۶۴ء میں کلیان۔ اسلام آباد کی چھاؤنی میں [۱۶۶۰ء سے] پڑاؤ ڈالے ایک مغل دستے کی نظروں میں دھول جھونک کر ماہولی کے راستے سے گذر کر "بندر مبارک سورت" کو لوٹا جو زائرینِ کعبہ کے لیے "بابُ المکہ" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور ہندوستان کا سب سے عظیم اور دولت مند تجارتی مرکز تھا۔ ستائیس سال بعد "عادل شاہی کونکن" کے فوجدار عبدالرزاق خان لاری کا مہمان مشہور مورخ ہاشم علی خافی خان شیواجی کی راجدھانی "راہیری" [رائے گڈھ] میں قلعے سے متصل ایک حویلی میں بیٹھا ہوا اپنی تاریخ منتخب اللباب میں لکھتا ہے کہ ـــــ "مرہٹوں نے بے شمار مالِ غنیمت جمع کر کے اپنے گھوڑوں کو کشمیری اور احمد آبادی مال سے لاد دیا تھا اور زر و جواہر سے اپنے دامن بھر لیے تھے۔"[1] پھر جزائر بمبئی کے نواطیوں نے سُنا کہ برسوں کی پُراسرار خاموشی کے بعد [۱۶۷۰ء میں] شیواجی راجہ نے مغل حکومت سے دوبارہ سرتابی اور سرکشی اختیار کر لی ہے۔ وہ آندھی بن کر اُٹھا۔ بگولے کی طرح کوکن اور دکن کے اُن سارے علاقوں پر چھا گیا جو عہد نامۂ پورندھر (۱۶۶۵ء) کی رُو سے مغل حکومت کو لوٹا دیئے گئے تھے۔ پرگنۂ کارنجہ (اورن) بھی مرہٹہ سوراجیہ کا حصہ بن گیا۔[2] مغل تھانیدار اور فوجدار مدافعت میں سر کٹاتے رہے مگر سپہادری کی

---

[1] منتخب اللباب، ج۲، ص: ۲ - ۲۴۰۔ ایلیٹ (انگریزی ترجمہ)، ج۷، ص: ۵۲۳-۲۱۱

[2] نسخۂ دلکشا۔ از بھیم سین برہان پوری The Journal of a Bondela — officer — (انگریزی ترجمہ) ج۲؛ ص: ۱۲۲-۳

چوٹیوں پر سربلند قلعے سرہوتے گئے۔ کونڈانہ اور پورندھر کی تسخیر نے شیواجی راجہ کے منصوبوں کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا۔ مگر ماہولی جیسے مضبوط قلعے کے محاصرے میں جہاں اسکے مغل قلعہ دار منوہر داس گوڑ کی راجپوتی آن کا امتحان لیا گیا، وہیں اسلام آباد (بھیمڑی) کے تھانیدار اوزبک خان دا(ود) منوہر داس کے مستعفی ہو جانے کے بعد، نیئے قلعہ دار ماہولی علی وردی بیگ جیسے جواں مردوں کو موت کے گھاٹ اتار بھی دیا گیا تھا۔۔۔ اور پھر مغربی گھاٹ کے سلسلے سے شیواجی کی شاندار فتوحات کا ٹوٹ سلسلہ بندھ گیا مگر اس کے ساتھ ہی کلیان، اسلام آباد میں مغل افواج اور مرہٹہ آوارہ گرد دستوں نے تباہی اور غارتگری کا ایسا سلسلہ باندھا جو برسوں تک نہیں ٹوٹا۔

جزائر بمبئی کے کوائلی دل ہی دل میں خوش ضرور ہوئے ہوں گے جب انہوں نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح مرہٹہ طاقت کے نمود سے پرتگیز خوف و ہراس کے پاتال میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ یہی مسلم کش فرنگی تھے جنہوں نے ان کے ہزاروں ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کا خون سمندر میں بہا دیا تھا اور ان کے مذہبی استبداد کے سبب تھانہ کے مسلمان بنکروں کو اپنے بزرگوں کے دین سے رشتہ توڑ کر عیسائیت سے تانا بانا جوڑنا پڑا تھا۔ یہی حاسد فرنگی تھے جنہوں نے کوائلیوں کے آباء و اجداد کے ہاتھوں سے بحری تجارت کے پتوار چھین لیئے تھے اور ان کی اقتصادی خوش حالی کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔[2] ▲

---

[1] نسخۂ دلکشا۔ از بھیم سین

[2] تھانہ گزیٹیر د ۱، ج ۱۳؛ ص ۶۳، ص ۲۰۰

تیرھواں باب

کوکن میں
دولتِ انگلیسیہ کی پہلی صبح

یوں بھی اب جزائر بمبئی میں پرتگیزی نوآبادیاتی نظام کی رات سر پر کھڑی تھی اور دولتِ انگلیسیہ کا وہ شاندار سورج طلوع ہو رہا تھا جو صدیوں تک غروب ہونے نہیں پایا۔ اور پھر اس عروس البلاد کے شاندار مستقبل کی پو پھوٹی جب ۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہیز کے اس جزیرے کو چارلس دوم سے پٹے پر لے لیا۔ معاشی حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے جس کے نتیجے میں اقتصادی خوشحالی کا دور شروع ہوا اور دور دور سے لوگ تلاشِ معاش میں آنے لگے اور جزائر بمبئی کے تیس لاکھ درختوں کے مرطوب سایوں میں سمٹنے لگے۔ ڈاکٹر جان فرئیر نے ۱۶۷۵ء میں یہاں کے غیر صحتمند اور "انگریز کُش" آب و ہوا میں ساٹھ ہزار انسانوں کو آباد پایا[1] تھانہ اور چیول سے اپنی قدیم سکونت کا رشتہ توڑ کر سوتی اور ریشمی کپڑوں کے بُنکر بسنے آ گئے (۱۶۶۸ء)، اطراف کے ساحلی جزائر اور قصبات سے معمار کاریگر اور سڑک کوٹنے والے مزدور مراعات و معاش کے وعدے پا کر وارد ہونے لگے۔

---

[1] "بمبئی کا عروج" ص: ۹۰

۱۶۷۱ء میں سورت کے مہاجن مہاجرین کر آئے جن کے بعد دیو سے نیا پارکھ کا جوہری گھرانہ "پارس" کی تلاش میں آیا۔ آرمنی خوجہ تاجروں نے ترکِ وطن کر کے ممبایم قلعہ کی چہار دیواری کے اندر اپنی دُکانیں جمالیں، لیکن جلد بڑھا بھی دیں۔ دھن دولت کی داستانیں سُن کر پانچ نفیروں کی ایک ٹولی کو بھی بمبئی آنے کی دُھن سمائی۔ یہ پانچ 'خاکسارانِ جہاں' گھڑ سوار تھے۔ مُمبایم جزیرے میں ایک ممتاز دلوی گھرانہ (۱۶۵۰ء) سے بُود و باش اختیار کر چکا تھا[۱] [مُسلم] خاؤں کے ناخداؤں نے فورٹ کے باھر گوروں کی بستی سے پرے شمال میں ناخُدا محلے کی نیو ڈال دی تھی اور انگریزی بحریہ کے چپّو سنبھال لیئے تھے۔ قلعہ کی بلندی پر لہراتا ہوا یُونین جیک دُور سمندر سے، سِدیوں، مرہٹوں اور مغلوں کو نظر آنے لگا[۲]

جب 'شری گنڈی' کے پَوِتر پتھر کو عقیدت سے چھُونے والے ہاتھوں نے محنت کی پُوجا شروع کی تو ان ہاتھوں میں پارس پتھر کی خاصیت پیدا ہو گئی اور ممبایم جزیرہ سونا اُگلنے لگا۔ مگر جو بہہ کر انگلستان جانے لگا اور انگریز تاجروں کی کوٹھیوں میں ہُن برسنے لگا۔ ہندوستان کی دولت اور پیداوار کو سمیٹنے کے لیئے بمبئی کی بندرگاہوں نے اپنے دامن پھیلانے شروع کر دیئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بمبئی کے گورنر نے جہاز کے کارخانوں کی تعمیر اور بندرگاہوں کی توسیع کی طرف توجہات مرکوز کر دیں۔ سورت کے ایک سیٹھ جیوجی مودی کو جہاز سازی کا ٹھیکہ دیدیا گیا تھا[۳]

۱۔ "بمبئی کا عروج" ص: ۱۱۸ - ۱۱۶ - ۱۳۰ - ۱۳۵ - ۱۳۸

۲۔ "بمبئی ملکۂ این کے عہد میں" (انگریزی۔ لندن ۱۹۳۳ء) ص: ۲۰، ۲۷ اور ایسٹ انڈیا اور ایران کا نیا تذکرہ۔ جان۔ فریئر۔ ج: ۱، ص: ۱۵۴

۳۔ بمبئی گزیٹر (شہر اور جزیرہ) ج: ۱، ص: ۳۳

مجبُور حاکم

اب جب کہ ماہم، دھاراوی، سیموہ اور وڈالہ سے لے کر کولابہ تک تمام جزائر انگریزوں کے دستِ تسلّط میں تھے وہ پھر بھی اپنی تہی دستی اور کوتاہی داماں کے شاکی تھے چونکہ روزمرہ زندگی کی ضروریات کے علاوہ دوسرے لوازمات زندگی کے لیئے وہ قریب کے مرہٹہ مقبوضہ علاقوں کے مرہونِ منت تھے، مثلاً ایندھن، عمارتی لکڑیاں، اشیائے خورد نوش اور ریوڑ وغیرہ۔ اور اب جب کہ کوکن کا سارا ساحلی علاقہ سوائے پرتگیز اور سدیوں کے مقبوضات کے شیواجی کے سائے میں تھا ان اشیاء کی درآمد پر قدغن ہو سکتی تھی، لیکن مرہٹہ سوراجیہ نمک اور مغربی ممالک کی مصنوعات کے لیئے خود بمبئی کا دست نگر تھا۔ راجہ رام اپنے بیٹے کے لگن منڈپ کو چراغاں کرنے کے لیئے شیواجی نے دو ہزار موم بتیوں کے لیئے بمبئی سے درخواست کی تھی[1]۔ لیکن مرہٹہ سوراجیہ اور انگریزی نوآبادی کے درمیان پرتگیزی منڈووم۔ چُنگی وصول کرنے کے لیئے ہاتھ پھیلائے رہتی تھی۔ کیونکہ جب سالشٹی اور کلیان۔ بھیونڈی کے علاقائی جنگلوں سے عمارتی لکڑی اور تعمیر کے دیگر سامان مجگاؤں کی بندرگاہ میں برآمد کیئے جاتے تھے تو پُرتگیز مزاحم و معترض ہوتے تھے اور ان کی مجبُوریوں سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے چنگی کے تناسب میں ۳۳ فیصد کا اضافہ کر دیا تھا[2] گو کہ سورت کونسل نے بمبئی کے گورنر کو ان علاقوں کے جنگلوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے کی ہدایات دی تھیں لیکن وہ مجبُور تھا جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے ہمفرے کُک کے اس

---

[1] پیشوا دفتر۔ شیواجی۔ از: سرکار۔ ص: ۳۶۰
[2] بمبئی گزیٹر۔ ایضاً۔ ص: ۶۰

عریضے سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے شاہ انگلستان چارلس دوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بھیونڈی۔کلیان کی جغرافیائی اہمیت جتاتے ہوئے اُس نے لکھا تھا: "یہ دکن کے دروازے ہیں جہاں سے کارومنڈل اور گولکنڈہ کی تجارتی اشیاء اور مصنوعات بمبئی میں برآمد کی جاسکتی ہیں۔ اور ان علاقوں کے جنگلوں سے عمارتی لکڑیاں بھی بآسانی فراہم کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ کلیان اور بھیونڈی جزیرۂ ممبایم کی طرح شاہِ پرتگال سے جہیز میں مل جاتے ــــ اگر حکومت پرتگال سے خصوصی پروانۂ راہداری بھی حاصل ہوجائے تو ممبایم کے حال بردار جہاز بغیر کسی مزاحمت کے ندیوں اور کھاڑیوں سے گذر سکتے ہیں[1]۔۔۔"

مختلف رکاوٹوں کے باوجود انگریزی بحریہ بہرحال مرہٹہ اور سدی بیڑوں کے مقابل بادبانوں کا سینہ تان کر کھڑا ہوگیا اور آمادۂ جنگ ہوگیا۔ مگر دانایانِ فرنگ جنگ سے قبل حکمتِ عملی چلانے کا ڈھنگ سیکھ چکے تھے۔ وہ اپنے دونوں سیاسی حریفوں سے نباہنا بھی چاہتے تھے اور وقت پڑے پر اُن کا مقابلہ کرنا بھی جانتے تھے۔ لیکن سدیوں کی قزاقیوں سے ان کا قافیہ تنگ ہوچکا تھا۔ کبھی (۷۳ــ۱۶۷۲ء میں) مغل امیرالبحر سدی سنبھل الملقب بہ یاقوت خاں کی شعلہ خوئی مجگاؤں کے مکانوں کو جھلسا دیتی اور سیموہ کے مکینوں کو بے سروسامان بنادیتی اور کبھی (۱۶۷۸ء میں) اس کے حریف سدی قاسم کے پٹھان سپاہی مجگاؤں کی مارکیٹ کو مقتل بنادیتے۔ سدیوں کے جہاز برسات میں مہبّ جنوب کے طوفانی جھکولوں کے سبب مجگاؤں کی بندرگاہ میں لنگرانداز رہتے تھے[2] اور جب ستمبر۔اکتوبر میں سمندر کی طغیانی اور موسمی ہواؤں کے جھکڑوں میں کمی آجاتی تو ان کے انتقام کی طوفانی لہریں مرہٹہ علاقے کے گاؤں اور کھیتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہادیتی تھیں۔ مرہٹہ دستے غارت گری کے اِس سیلِ رواں

---

[1] بمبئی گزیٹر، ج: ۱؛ ص: ۳۴ـ۳۳ ص: ۶۰۔ [2] بمبئی کا عروج، ص: ۳۲، ص: ۳۲ــ۱۳۰ـ جوان

کو روکنے کے لئے سدِّ راہ بن جاتے مگر سدی اپنے ڈانڈا۔ راجپوری کے بحری محاذ میں ہرگز نہ سے محفوظ رہتے۔ انگریزوں نے گو مرہٹوں کی جانب بھی غیر جانبدارانہ رویّہ روا رکھا تھا۔ لیکن کبھی شیواجی کے بحریے کا سواگت کرتے تو کبھی کلیان۔ بھیونڈی کے کارخانوں میں تیار ہوئے اس کے [چھ] جہازوں کو پکڑ لیتے[1]۔ مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان واحد قابلِ ذکر جزیرہ کھنڈیری کا بحری معرکہ ہے جو ۱۸ اکتوبر ۱۶۷۹ء[2] میں پیش آیا اور جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اس کا بدلہ مرہٹوں نے ممبایم جزیرہ سے لینا چاہا۔ اگر شمالی صوبہ سین کے پرتگیزی گورنر نے کلیان اور بھیونڈی کے چار ہزار سپاہیوں کو تھانہ کے راستے گذرنے کی اجازت دے دی ہوتی تو ممبایم پر چڑھائی کا منصوبہ پورا ہو جاتا۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنے مقبوضہ پنویل بندر سے گذر کر جزیرہ ترومبہ کے سامنے سے سات رشیبرے کر [غالباً شبخون] مارنے کی کوشش کی[3] ـــــــ اور جزیرۂ ممبایم کی ایک کہرآلود صبح میں کانوں کے دروازوں پر افواہیں دستک دینے لگیں کہ گذشتہ شب آدھے چاند کی ملگجی اور پھیکی چاندنی میں شیواجی مع ایک مختصر مسلح دستے کے ساحل پر اُتر کر ڈونگری قلعے میں چپ چھپاتے داخل ہوا تھا اور بڑی چالاکی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا[4]۔"

---

[1] سورت فیکٹری ریکارڈز ج ۲، ص ۱۰۴-۱۰۶۔ ورق ۲۴۔ ۲۰۔ خط مؤرخہ ۲ دسمبر ۱۶۷۳ء۔

[2] کھنڈیری کی شکست کے بعد شیواجی نے انڈیری قلعے کی مرمت اور استحکام کیلئے کلیان اور چیؤل کی آمدنی میں سے ایک لاکھ ہن دیا تھا (۱۶۷۹ء)۔ اس سے قبل ۳-۱۶۷۲ء میں راجشری چھترپتی صاحب نے حکم دیا تھا کہ دسکے وطن (خالصہ) اور صوبوں کے محالوں سے جنگی اخراجات کیلئے ایک خاص رقم اکٹھی کی جائے۔ کوکن کے محال یہ تھے : کرال (۲۰ ہزار ہن)، کولون (۲۰ ہزار)۔ دابھول (۱۵ ہزار)، راجہ پور (۲۰ ہزار)، کلیان (۵ ہزار ہن)۔ راجواڑے۔ مرہٹوں کی تاریخ کے ماخذ مرہٹی) ج ۸، ص ۱۷-۱۶۔

[3] "بمبئی کے اردگرد"۔ آمیس دگلس (بمبئی۔ ۱۸۸۶ء) ص ۷۰-۶۹۔

[4] شیواجی نے اتاجی دتو کو کوکن اضلاع کا سوبیدار بنا کر سدیوں اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ (۱۶۷۷ء)۔ سورت کونسل نے بھی بمبئی کے حکام کو ہدایات بھیجی تھیں کہ اگر شیواجی شرارت پر آمادہ رہے تو چیؤل کلیان اور دیگر بندروں میں اس کے جہاز چھین لئے جائیں۔ (سورت فیکٹری ریکارڈز ایضاً)

آم، کٹھل، جامن اور املی کی باڑیوں اور کیلے اور ناریل کے جوڑتاؤں سے گھری ہوئی کولی اور بھنڈاری بستیوں میں ہیجان پھیل گیا۔

کالیکا دیوی (کالیا دیوی) اور گرگام کے پہاڑی گاؤں میں تاڑ اور ناریل کے سوکھے پتوں کی چھتوں سے لوگ باہر آکر سرگوشیاں کرنے لگے۔ آبادی سے باہر چراگاہوں سے پرے زرد ریگ سے اٹے ہوئے اسی راستے پر تاڑوں اور ناریلوں کے جھنڈ میں آباد کوکواڑ کے مخلوط النسل (تویاڑ) پرتگیزوں نے اپنے کھپریل کی نیچی چھتوں والے پختہ مکانوں کی صدفی شیشے والی کھڑکیوں کو گرا کر اپنے خوف وہراس پر پردہ ڈال دیا[۱]۔ اور اُن کی نظروں کے سامنے پلھو کی پہاڑی سے قریب "مینڈھم پوائنٹ" کا عیسائی قبرستان گھومنے لگا۔ سارے جزیرہ کو وحشت کی لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ممبایم کی سب سے خوبصورت کوٹھی 'قنطہ' کے اردگرد پھیلے ہوئے مرغزاروں اور گلزاروں کی بہاروں پر یاس کی اوس پڑ گئی۔ "اُس کے رشکِ عدن گلستان کی نرم رَو گلگشت پر [کبھی نکہت بیز ہواؤں کی پالکیاں چلتی تھیں] اب وہاں پیتل کے چار توپ دم لے رہے تھے ... برگ پوش اور گل پیرہن کنجوں میں کبھی سکون اور سناٹے سانس لیتے تھے اب وہیں سے محافظ دستوں کے ہتھیاروں کی آوازیں آتی تھیں۔ نسیم بہار کی ترنم ریز سرسراہٹیں جو کبھی درختوں کے ہجوم برگ وبار سے ہم آہنگ ہوکر کلیسائی سرود خانوں کی لَے میں نغمے بکھیرتی تھیں اب دُہلِ جنگ کی صدائے بازگشت سے دہل جایا کرتی تھیں[۲]..."

جزائر سالشٹی کو چھوڑ کر قلابہ اور ناناگھاٹ تک کوکن کے "ساکنانِ دیر وحرم"

۱۔ جون فریئر۔ ج: ۱، ص: ۱۷۲ (مکانوں کی بناوٹ کی تفصیل)

۲۔ ڈاکٹر جون فریئر "ایسٹ انڈیا اور ایران کا نیا تذکرہ" (انگریزی۔ ج ۱، ص: ۱۹۵۔
" بمبئی کا عروج۔ ص: ۸۳، ۹۲-۹۳-۹۲۔

کی بستیاں ایک طرف سدیوں اور مرہٹوں کی آتش زنی اور لوٹ مار کے سبب جھلسی ہوئی ویرانیاں بن گئی تھیں اور دوسری طرف مرہٹہ آوارہ گرد دستوں کی غارتگری، پرتگیزوں کی استبدادیت اور مغلوں کی ترکتازیوں سے ان کی زندگیاں کھیتوں اور کھلیانوں کی طرح ویران ہو گئی تھیں۔ انتقام کی آگ کھڑی فصلوں کی چتائیں سلگا دیتی اور مکانوں کا الاؤ بنا کر اپنا ہاتھ تاپتی تھی۔ موت و زیست کی اس معرکہ آرائی میں نجانے کتنے ہی معصوم انسان تاریک راہوں میں مارے گئے اور اس اگیا بیتال نے نجانے کتنے گھروں کے چشم و چراغ کو گل کر دیا تھا۔ جہنم زار کوکن کی سب سے ویران تاراجگاہیں کلیان اور بھیونڈی کی بستیاں اور ان کی نواحی عملداریاں تھیں۔ یہاں چند مہینوں کے دوران میں (جنوری تا اپریل ۱۶۷۰ء) مرہٹہ دستوں نے پچاسوں بستیوں کا سہاگ لوٹ لیا تھا اور کبھی (فروری ۱۶۷۵ء) مغل سپہ سالار بہادر خان اس طرف سے گذرتا تو جی بھر کر آگ اور خون کی ہولی کھیل لیتا۔ انتقام کے شعلے کلیان کے [مسلمان] نوجوں کی دکانوں اور ہندو نبیوں کے مکانوں میں امتیاز نہیں کرتے تھے[1]۔ آلام کی اس گرد میں شکستوں کا شمار کرنے والے ہزاروں ہی ہوں گے لیکن تاریخ کے اس بے حد ہنگامہ خیز دور میں وقت کی پُر ہجوم رہگذر پر ایک تیز بیں انگریز سیاح کبھی بومبایم کے بندر سے بیس چپوؤں والا بارجہ لے کر باندورہ اور کانورن دکانیہری) کی طرف سیر و شکار کے لئے جاتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی جنیتر کی جانب خدم و حشم کی جلو میں جاتا نظر آتا ہے اور جس کے مشاہدے اور جائزے اس دور کی زندگی کے دونوں رخوں کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں[2]۔

---

[1] سیواجی سرکار (انگریزی) ص: ۲۲۲۔

[2] ڈاکٹر جون فریئر، ج ۱، از ص: ۳۰۷ تا ۳۱۶ اور ص ۳۵۲۔ ۳۴۵۔ اور دیکھئے ص ۱۷۵ تا ۱۹۷۔

اُجلا رُخ ، جزائرِ سالسٹی ـ تھانہ

اپریل ۱۶۷۴ء کی ایک گرم مرطوب دوپہر میں ڈاکٹر جون فریئر کا بارہ چپوؤں والا بجرا، بادبان کھولے تاناؤ [تھانہ] کی طرف روانہ ہوا کشتی ران کے علاوہ اس میں بمبئی گورنر کے دو ملازم ـ چار مسلمان (خان) چپراسی[1] ـ ایک انگریزی داں برہمن ترجمان ـ ڈاکٹر فریئر کا ذاتی خدمت گار ایک پرتگالی ـ پالکی کے آٹھ قلی [کہار] ـ ایک درجن فراش کاٹ کباڑ اٹھانے کے لئے ـ ایک سائیس اور ایک گھوڑا تھے ـ رات کے پچھلے پہر پرتگیزی تھانہ کی خلیجی بندرگاہ میں ان کا بجرا لنگر انداز ہوا ـ فرنگی عملداری کے اس صنعتی قصبے سے پرے سیہادری کی سرمئی چوٹیوں پر شیواجی کے دیو پیکر قلعے تاروں کی چھاؤں میں دھندلے خوابوں کی طرح دکھائی پڑتے تھے ـــ اور ڈاکٹر فریئر کے تصوّر کے 'فانوسِ خیالی' میں تھانہ کے ماضی کی پرچھائیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگیں ... !!!

دو سو برس پہلے یہ محمود بیگڑا[2] کی گجراتی سلطنت کی آخری اقلیم کا صدر مقام تھا ـ اس شہر کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ باربوسا سیاح نے اسے 'تانہ مَیمبو' لکھ کر اس کے نام میں ممبئی اور مہایم کو بھی مدغم کر دیا تھا ـ گو داابھول اور چیول کی تجارتی رونق کے آگے بندر گاہوں کے بادشاہوں کی اس قدیم بندرگاہ کی بحری تجارت ماند پڑ گئی تھی مگر اس کی مسلم بستی میں بڑی رونق رہتی تھی ـ یہاں نوائطیوں کی بنائی ہوئی عربی طرزِ تعمیر کی شاہکار مسجدیں تھیں ـ بہجت انگیز بوستانوں میں بہاروں نے چھاؤنیاں ڈال دی تھیں ـ لیکن

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر ـ ج ۱ ـ ص : ۳۱۲ ـ

[2] فرشتہ (ترجمہ برگس) ـ ج : ۴ ، ص ، ۶۲ ، ج : ۲ ، ص ، ۲۹۵ ـ

بحری تجارتی راستوں پر قزاقوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور تھانہ کی قدیم صنعت پارچہ بافی کے تانے بانے ٹوٹ چکے تھے۔ جب دسمبر ۱۵۳۳ء کے معاہدے کی رُو سے اس "قصبہ" کی انتظامی باگ ڈور پرتگالیوں کے ہاتھوں میں آئی تو چرخے کی مال اور چرخیاں دوبارہ گردش کرنے لگیں۔ اور زردوزی کے نو سو کارچوب اور ململ کے، بارہ سو کرگھوں کے تار و پود سلجھ گئے جو فرنگیوں اور گجراتیوں کی لوٹ کھسوٹ کے سبب بافندوں کے بھاگ جانے سے بند پڑے تھے[1]

سولہویں صدی کا تانا بانا ٹوٹتے سمے تک اُونی، سُوتی اور ریشمی پارچہ جات اور رنگین ملبوسات کی تجارت بدیسی منڈیوں میں اپنا رنگ جما چکی تھی اور مقامی مہین ریشمی کپڑے "ارمیسیا" کی مانگ تھانہ کے چاول کی طرح پرتگال میں بہت زیادہ ہو چلی تھی[2] کپڑے کی یہ خاص قسم کا تھاروواڑہ کے نو عیسائی تنکر [تو پاڑ] تیار کرتے تھے جب کہ راباوڑی [محلہ] میں مقیم نوائطی نورپاؤں [قابِّا واتح اور مقری قبیلوں[3]] نے کارچوبی، زرتار پٹکے اور رُوپہلی تاروں کی کامدانی میں [اپنے آباؤ اجداد کی طرح] بے حد مُدرتیں پیدا کر لی تھیں۔ ململ کی بافندگی اور زردوزی اس علاقے میں کچھ کم قدیم صنعت نہ تھی، جیسا کہ ۱۴۲۹-۳۲ء کی جنگوں میں سلطانِ گجرات کی فوجوں کے ہاتھ آئے مال غنیمت میں اس قسم کے پارچہ جات کی موجودگی سے ثبوت ملتا ہے[4]

عرب ممالک کے ڈہاؤ اور پرتگال کے مال بردار جہازوں کو تھانہ کے ریشمی

---

[1] تھانہ گزیٹیر، حصہ "قابلِ دید مقامات"۔ دیکھئے تھانہ کا بیان۔ ص: ۵۸-۳۵۷۔

[2] نیرسنے، کونکن۔ ص: ۳۲۔

[3] رنگین چوکڑیہ تہمد، جو بھیونڈی اور تھانہ میں بُنا جاتا تھا، عرصۂ دراز تک مقری کے نام سے مشہور رہا ہے۔ واتح بافندوں اور یوپی کے بُنکروں (مومن و انصار) کے طریقہ ہائے بافندگی کی تفصیلات کے لئے دیکھئے تھانہ گزیٹیر۔ ج: ۱۳، ح: ۱

[4] فرشتہ (انگریزی ترجمہ: برگس) ج: ۴، ص: ۳۰-۲۸۔ بیلی: گجرات (انگریزی) ص: ۱۱۸-۱۱۶۔

اور سُوتی کپڑوں کے تھانوں سے لدا پھندا دیکھ کر ڈاکٹر جون فریئر کا تصوّر ماضی کی بھُول بھلیّوں سے نکل کر "حال" کی سیدھی ڈگر پر نکل آیا اور اسے ضرور تعجب ہوا ہوگا جب اس نے سُنا ہوگا کہ ان کپڑوں کی تجارت بدیسی منڈیوں میں مُسلسل چالیس برس سے اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے تھی[1]۔

سرمئی صبح کی کھلائی ہوئی روشنی میں فرنگی سیّاح نے دیکھا کہ چار میل تک پھیلے ہوئے اس "پرتگالی قصبہ" کے سات کلیساؤں کی مخروطی برجیاں نیزے کی طرح دُھندلکوں کا سینہ چیرنے کے لئے لپکی ہوئی تھیں [اسے پرتگیزی پادریوں کے مذہبی احتساب کی ہولناکیاں یاد آگئی ہوں گی] ـــــ پھر ساٹھ مسجدوں اور مندروں سے اذان و ناقوس کی ملی جُلی آوازیں کانوں میں پڑیں [تو اُس نے شاید سوچا ہوگا کہ گرجا کا نغمہ عشائے ربانی (MASS) بھی ان سے ہم آہنگ ہو جاتا تو ان کی لَے او زیر ہو جاتی]۔ ہندو مسلم اتحاد کی اس متوازی طاقت کی آبرو برقرار رکھے ہوئے یہاں ساٹھ سنگین حوض بھی تھے۔ بعض حوضوں پر لسبین کے طرز تعمیر کا پرتو پڑا ہوا تھا اور بعض [لسبین کے کانوں کے] تراشیدہ سِلوں سے اور کچھ ایک ایک اینٹ جھوڑ کر تعمیر کئے گئے تھے[2]۔ یہاں ایک کلیسائی درس گاہ بھی تھی۔

پرتگیزی ریندیرو (عامل) کے پروانۂ راہداری حاصل ہو جانے کے بعد جب فریئر کا بجرا لہروں کی ترنگ پر جھومتا ہوا تھانہ بندر سے ایک میل آگے بڑھا

---

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ ج ۴، ص: ۴۶۸ - ۴۷۰۔ تھانہ کے علاوہ پرتگیزی مملکت کے کلوہ۔ جہانم بندر سے بھی پارچہ جات دساور بھیجے جاتے تھے۔ دمن کے صوبہ میں سنجان، دھانو اور تاراپور بھی تجارتی منڈیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایضاً۔ تھانہ کو قصبہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس میں آٹھ پکھاڑیاں (تعلقے) شامل تھے۔ [2] تھانہ کے قدیم گرجوں میں فرانسسکن پادریوں کا بنایا ہوا ۱۵۴۰ء کا سینٹ جون باپٹسٹ چرچ بھی تھا۔ ڈاکٹر جون فریئر ج ۱، ص: ۱۸۸۔ تھانہ گزیٹیر ج، قابل دید مقامات۔

تو اس نے دیکھا کر بائیں جانب لبسین کی کھاڑی پُرسکون تنہائیوں[1] کے دھارے پر چُپ چاپ بہہ رہی تھی، اپنے ازلی ساحل کی سمت جس کے ڈھلوانی کنارے پھلوں کے پیڑوں سے پٹے پڑے تھے۔ دونوں جانب فدالگو [امیروں] کی کھپریلی کی چھتوں اور گوبر سے لیپے فرش والی حسین و دلکش کوٹھیاں اور دیہی رہائش گاہیں یا "اُلدیہہ"[2] کھڑی تھیں۔ طویل و کشادہ مگر نیم تاریک دیوانخانوں والی اِن سنگین وِلاؤں کے سامنے چوبی پورٹیکو کے پاکھے پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور چوبی ستونوں کے گلے میں چنبیلی کی حسین بچکیلی ڈالیاں اپنی نازک باہیں ڈال کر جھومتی رہتی تھیں۔ صدفی[3] شیشوں کے چوکور خانوں والے دریچوں سے جنگلی پھولوں کی ہلکی ہلکی لپٹیں آتی رہتی تھیں اور سمندری ہوائیں سبزہ زاروں کی ہری دُوب اور چراگاہوں کی لانبی گھاسوں کی بھیتی بھینی سگندھ اپنے حریری دامن میں بٹورے بڑی بیگانگی سے سارے میں بکھیرتی پھرتی تھیں اور جب فانوسوں کی کافوری شمعیں اور روغنی قندیلیں گُل کر دی جاتیں تو رات کی رانی کی دلنواز نکہتوں میں بسی ہوئی خنک چاندنی دبے قدموں تاریک شبستانوں میں داخل ہو جاتی ــــ [وہ چاندنی جس کے شیدائی قرونِ وسطیٰ کے مشرقی شاعر اور عاشق بدنام حد تک رہ چکے ہیں] کہر آلود انگلستان کے سرما گزیدہ انگریز کے لئے گرم ممالک کے نیلے اور بے حد چمکتے آسمان

---

[1] فریزر۔ کلیان جانے کے لئے غالباً تروَمبہ کے بندر سے اس کھاڑی سے گذرا ہوگا جو ساٹن اور سالشٹی کے درمیان سے گذر کر باندرہ اور ماہم (دھاراوی) کے پاس سمندر سے مل جاتی تھی۔ آج بھرن نے اُسے کرلا بنا دیا ہے جو مرہٹی زبان میں بذات خود یہی معنی رکھتا ہے۔ یعنی پاٹی ہوئی زمین۔ دیکھئے "بمبئی ملکہ این کے عہد میں"۔ (لندن ۱۹۳۳ء) ص: ۶۹۔

[2] اس عربی لفظ کو پرتگیزوں نے aldeas بنا دیا ہے۔ یہ اُندلس کی مسلم تہذیب کی یادگار ہے۔

[3] پرتگیزی عہد تک بمبئی میں سیپیوں کو چمکا کر لگایا جاتا تھا۔ انگریزوں نے شیشوں والی کھڑکیوں کو رواج دیا۔ دیکھئے: بمبئی کے ایدر گرد (انگریزی) امیس دوگلس (بمبئی ۱۸۸۶ء) ص: ۱۰۱۔ (فٹ نوٹ) فریزر ص

کی چاندنی کا لطف اٹھانا ایک انوکھا تجربہ ہوتا تھا اور اسے بومبے یم کے کسٹم ہاؤس کے بام پر فروزاں چاند کی روشنی میں ساٹھ ستّر سال پُرانے شیکسپیر پڑھنے میں وہی مزا آتا تھا جو لطف سالسٹی کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیلنے میں آتا تھا، یا بانکوٹ کے گرم چشموں میں نہانے میں[1]

کانورن

پھر چاندنی کے بلوری خول میں ملفوف سنّاٹا یکایک چھناکے سے ٹوٹ جاتا، جب کانہیری کی ہری بھری وادیوں میں واقع جھلملاتی جھیلوں کے کچھاروں سے شیر کے دہاڑنے کی آوازیں سُنائی دینے لگتیں اور مگاتنہ [ماگاتھن] تک پانچ میل پھیلے ہوئے جنگل میں پرندوں اور چرندوں میں شور مچ جاتا۔ ارنا بھینسوں کی ڈکاریں، سیاروں کی چیخیں اور آموں کی ڈالیوں پر پھدکتے ہوئے اور بڑ دادا کی جٹاؤں سے جھولتے ہوئے لنگوروں کی کلکاریاں سارے میں گڈمڈ ہو جاتیں اور ماگاتھن کے کلیساؤں کے بوستانوں میں ناچتے ہوئے رنگین موروں کے کھرج سُر میں نکلتے ہوئے جھنگار ـــ دُور ـــ دُور تک سُنائی دینے لگتے۔ مزروعہ کھیتوں میں کسی بھنڈاری یا کیتی شبگرد کی چوکنی آہٹیں یا کوئی فاختہ امن و آشتی کا پیغام لے کر دیوانہ وار چاند کی اور اُڑ جاتی اور کوئی ٹوپیہ دار چھتوں میں بسیرا لئے کبوتروں کے سرمئی غول میں غٹرغوں کا غوغا برپا ہو جاتا اور جب کانہیری کی چٹانوں میں تراشیدہ تالابوں کے کچھاروں سے نکل کر چیتلوں کی ڈار چوکڑیاں[2] بھرنے

---

[1] بمبئی کے اِرد گِرد (انگریزی) ایمیس ڈگلس (بمبئی ۱۸۸۶ء) ص ۱۹-۱۸۔

[2] ڈاکٹر جون فریئر جو سالسٹی کے جنگل میں شیر کا شکار کھیل چکا تھا، ان رَم جانوروں کا ذکر کرتا ہے۔

لگتی تو تھانہ کی کھاڑی [الہاس] کے لب جوئبار" "موجۂ سبزۂ نوخیز" کی آغوش میں کسی انگریز سوداگر کے مرمریں فرش اور شیشے جڑے ہوئے طویل وکشادہ فرانسیسی طرز کے دریچوں والے بنگلے میں بیٹھے تاش کھیلتے ہوئے اور ہسپانوی سفید شراب کے جرعے اور جامِ عرق آشام لنڈھاتے ہوئے سیاحوں کا نشہ ہرن ہو جاتا کیونکہ انہیں یقین ہو جاتا کہ بمبئی کا گورنر بہادر اپنی شکاری ٹولی کے ساتھ سالسٹ کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیلنے آ گیا ہے[1] اور سالسٹ کی قدرتی شادابیوں سے سرشار مرغزاروں میں فدالگو [ایبرولیا] اور شرفائے پرتگال کی پرتکلف الدیہہ اور نیم خود مختار جاگیرداروں کے پرشکوہ کاشانوں کے شانوں پر مدماتی رات کی زلفیں اور پریشان ہو جاتیں !!

اور ماگاتھن کے دیہی چرچ کا پرتگالی راہب اپنی پرتکلف خانقاہ کے بیحد آرام دہ مہمان خانے میں ہسپانوی شراب اور کلیسا کے مملوکہ اودتوں کے پھلوں[2] سے انگریز سیاحوں کی خاطر مدارات کے لئے کے لئے اپنے کافر غلاموں کو ہدایت دیتے وقت سوچتا ہوگا کہ "ان انگریزوں کا مہذب معاشرہ رقص و سرود کی گردش میں روحانی اقدار کے محور سے دُور جا پڑا ہے اور ان کی زندگیاں جام و مینا میں اس درجہ ڈوب چکی ہیں کہ ان کے دلوں سے ایمان و آگہی کا سارا عطر نکل چکا ہے [اور کچھ دیر کے لئے جب خود اس کے ہم قوم فدالگو اور دوسرے طبقے کی تعیش کوش زندگی کا نظارہ فراموشی کے

---

[1] بمبئی کے اردگرد ۔ ص ۱۸ ، ہسپانوی سفید شراب کو SACK کہتے تھے اور عرق arrack ہے جو تاڑ، چاول یا شکر سے کشید کیا جاتا تھا اسی لئے اسے عرق Punch بھی کہتے تھے ۔ ایضاً۔

[2] بمبئی کے اردگرد ۔ ص ۱۹-۱۸ ۔ ص ۲۶۹ ۔

[3] ڈاکٹر جون فریئر ۔ ج ۱ ، ص ۱۸۵ ۔ ماگاتھن ، بوریولی سے آدھ میل مشرق میں آباد تھا ۔ یہاں بُدھ گپھائیں تھیں اور دیہی چرچوں کا شمار نہ تھا ۔

گرد و غبار سے اٹ جاتا] تو بمبئی کے انگریزوں کی ثروت و سطوت کا قافلہ امیرانہ
ٹھاٹھ باٹھ اور رئیسانہ طمطراق کے ساتھ اس کے گذرگاہِ خیال سے گذرنے لگتا[1] اہلِ
اقتدار انگریزوں کے خواب آگیں دن سلمنی لگی ہوئی پالکیوں میں کہاروں کے شانوں پر
گذرتے تھے۔ ان کی رنگین شامیں گرگام پکھاڑی میں مالابار کے پیڑوں کے سایہ دار
خیابانوں سے لے کر "بوڑھی عورت کے جزیرے" پیانرو ساحل تک۔ ہوا خوری،
پاشہ سواری میں گذرتی تھیں[2] اور یہ انگریز راتیں کبھی جھاڑ فانوس سے مزین و
منور کاشانوں میں بیئر کے بھدے بلوری پیمانوں میں گھل جاتیں اور کبھی مزربن جیسم اور
مونالزا کی معصوم مسکراہٹ والی بلونڈ الیزا جیسی کسی حسینہ کے مژگاؤں میں، واقع
"وپیل دی ویرے" کے حریری شبستان میں پناہیں ڈھونڈتیں[3]۔ یا پھر کسی تقریب یا
تہوار پر اپالو اسٹریٹ میں فورٹ کے حکمرانوں کے رہائشی ایوان میں رقص و شراب کے ہنگاموں
میں بسر ہو جاتی تھیں[4]۔ [اور پھر تھوڑی دیر کے لیے یہ انگریزی راہب کی نظروں میں شمالی
صوبہ نشین کے دربار کی شان و شوکت ماند پڑ جاتی اور بمبئی گورنر کے درباری جاہ و جلال
سے اس کا ایوانِ تخیل جگمگا اٹھتا] جس کی جلو میں ہر دم اس کا طبیب، نائمس، خانگی
پادری، خواجۂ دارالضرب، ترجمان اور خدمتگاروں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ نقیب
ترم بجا کر اس کی پیشوائی کرتا۔ خواب گاہ کی چوکھٹ پر چوبدار اور ایوان کی ڈیوڑھی پر
محافظ دستے کورنش بجالاتے اور سلامی دیتے تھے۔ گورنر کی ضیافتوں [یا بڑا
کھانا] میں ساز و آہنگ فضاؤں میں ہلکی چاشنی گھولتے رہتے۔ بھنڈاری اور

---

[1] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۱۹-۱۸، ص: ۱۳۵، ص: ۲۰۲-۱۸۱۔
[2] بمبئی ملکۂ این کے عہد میں۔ ص: ۴۲-۴۱، [3] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۲۰۲-۱۸۱۔ [4] ایضاً

مُسلمان [خان] چوبداروں کا ہراول دستہ یونین فلیگ لہراتا ہوا اور دیگر ماہی مراتب[9] خدم وحشم اس کے شاندار جلوس کو چار چاند لگا دیتے اور ملابار ہل کی زمردیں وادی فرنگی ماہ پاروں سے کاہکشاں کی طرح دمکنے لگتی۔ جہاں درختوں کے طویل سائے میں گورنر[1] بہادر کا خیمہ لگ جاتا اور کوہساروں میں گلناری اور انگوری رنگ کے سوٹوں اور کلابتونی دامن والی "شام" کی پوشاکوں کی رنگین دھنک پھیل جاتی اور لمبے چوڑے ایرانی نما لچیے پر چمکیلے تسموں والے ہیرے کے جڑاؤ جوتے پھسلنے لگتے اور مُرصع گرگابیاں[2] تھرکنے لگتیں رقص وسرود کی محفل گرم ہوجاتی تو زندگی کی ساری کلفتیں (جو وطن سے دُوری کے[3] سبب پیدا ہوجاتی ہوں گی) نشاط وانبساط کی پھواروں سے دُھل جاتیں نشہ ونغمہ سے فضا مخمور اور کیف آگیں بن جاتی۔ پھر زندگی کی مقصدیت بے معنی ہو کر نظروں کے سامنے ننگی کھڑی ہوجاتی اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی لامتناہیوں کے باوجود سارا ماحول اتنا کھوکھلا محسوس[4] ہوتے لگتا کہ انگریزوں کو شکاری کتوں کی طرح والکیشور کے جھاڑ جھنکاڑوں میں خرگوشوں کا پیچھا کرنے میں وہ لطف[5] آنے لگتا جو شاید سائن قلعے کی بلندی سے دُور تھل گھاٹ کے دُھندلے پس منظر میں سالسٹی کے چمکیلے نمک زاروں یا دھاراوی سے لے کر ورلی کے ہوادار جزیرے تک جُوئباروں کے تفریحی نظاروں[8] میں بھی نہیں ملتا اور پھر یہی عفو پرور، رقیق القلب[6] اور دردمند انگریز قوم" قومی افتخار اور نسلی برتری کے شدید احساس کے تحت ان ہندوؤں کا تمسخر اڑانے لگتی تھی جو" یونی گی

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج: ۱، ص: ۱۷۸، ص: ۱۳۵۔ بمبئی ملکۂ ایّن کے عہد میں۔ ص: ۴۲۔

[2] بمبئی ملکۂ این کے عہد میں۔ ایضاً۔ بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۲۰۲۔ ۱۸۱۔

[3] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۲۰۲۔ ۲۰۱۔ ص: ۱۸۔ [4] ایضاً ص: ۱۹۔ ۱۸۔ بمبئی ملکۂ این کے عہد میں ص: ۴۲۔ ۴۱۔ [5] بمبئی ملکۂ این کے عہد میں۔ ص: ۶۹ اور دیکھئے دیباچہ۔ [6] بمبئی کے اردگرد ص: ۵۶۔

پرستش کے لیے براہمنوں کی بستی والکیشور کے "سایہ فگن مقدس کنج عزلت" میں، جسے قدرت نے اپنی ساری لطافتوں، رعنائی خیال اور نغمگی کی شاعری سے نوازا تھا، جایا کرتے تھے[1]۔ یہی انگریز کبھی فن کی قدردانی میں اتنا آگے بڑھ جاتے کہ ایلیفنٹا، ایلورا، اجنتا، کارلی اور بھاجہ کی گپھاؤں میں صناعی کے نادر نمونوں اور صنم تراشی کے شاہ کاروں کی جستجو کرتے پھرتے [اور پر تجسس راہب کا مہمان ڈاکٹر فریئر اگر چار برس بعد ۱۸۷۰ء میں دوبارہ کانورن گیا ہوتا تو ان تینوں انگریزوں کا پتہ لگا لیتا جنھوں نے] کانیہری گپھا میں مہاتما بودھ کے عظیم الجثہ مجسمے کے چرنوں میں اپنے نام کھود کر شردھانجلی ارپن کی ہے[2]۔ کبھی اپنے تہذیبی ورثے پر اتنا ناز کر بیٹھتے کہ بودھی رہبانیت غاروں کی طرح کھوکھلی نظر آنے لگتی۔ "بھکشوؤں کو انگریز قنوطی سمجھتے تھے جو نکھٹو، آوارہ گرد، لیکن قوی العزم دریوزہ گر تھے اور جن کا تہذیبی سرمایہ چند تاریک غاروں کے سوا اور کچھ نہیں اور وہ بھی شاید دوسروں کے کارنامے ہیں کیونکہ یہ بودھ بھکشو بحری عجائب خانے کے اس خلوت پسند کیکڑے کی طرح تھے جو دوسرے کے خول کو خالی پاکر اس کے اندر گھس جاتا ہے[3]۔"

لیکن ڈاکٹر جون فریئر کوئی ایسا متعصب اور مغرور انگریز نہیں تھا۔ وہ تخیل پرست ضرور تھا، اسی لئے جب اس نے شام کے ملگجے اندھیرے میں کانورن کی گپھاؤں کو سرمئی غبار میں ڈوبا ہوا دیکھا تو اس کے تصور کے سامنے سیکڑوں برس کا گرد و غبار چھٹ گیا اور اس نے کانیہری کی وادی میں شہد کے چھتے جیسی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں کو دیکھا جہاں سے سانجھ کی بھکشا لے کر کیسری رنگ کے لبادوں میں

---

[1] بمبئی کے ارد گرد۔ ص ۱۸ (فٹ نوٹ) اور ص ۷۰-۶۹۔ [2] ایضاً ص ۴۱۔ [3] ایضاً ص ۳۵

ملبوس بھکشو جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں لوبان کے دھوئیں کی دھند کو چیرتے تراشیدہ زینوں سے اپنی معبودگاہوں کی اور جا رہے تھے جن کے چپٹائی داخلوں پر اسوک کے سوکھے پتوں اور چنبیلی کے پھولوں کے ہار (توارن) لگے ہوئے تھے۔ گھٹا ٹوپ اندھیارے میں دور سے جلتی ہوئی مشعلیں یوں دکھائی دیتیں جیسے ــــ دھرتی کی گود سے ہزاروں تارے اس تجلی سے ہمکنار ہونے کے لئے رواں دواں تھے جس سے قرون وسطیٰ کا سارا روحانی ماحول منور تھا اور عام انسان کا وجود فروزاں ــــ!!

سالشٹی کے سرسبز و شاداب نظارے جب فریئر کے دل و دماغ کو طراوت و تازگی بخشنے لگے تو اس کی یادوں کی گرفت میں وہ شاداب لمحات آگئے جو اس نے یہاں کے مرغزاروں، جوئباروں اور کانوری کے کوہساروں میں چند مہینے قبل گذارے تھے۔ یہاں کی زرخیز دھرتی میں قدرتی جھرنوں سے سیال چاندی ابلتی تھی جو چٹانوں سے گر کر موتی کی لڑیاں بن جاتی اور کسی غیر آباد ٹاپو کے اردگرد جھنکارتی ہوئی نقرئی پائل۔ یہاں کی لہلہاتی ہوئی کھیتیوں میں گوبھی، کرم کلہ اور مولی کے علاوہ اتنی تر و تازہ سبزیاں اور ترکاریاں اگائی جاتی تھیں کہ ان کی درآمد سے گویا کی سبزی منڈی میں تازگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں کے پھلوں کی لذت اس کے کام و دہن میں رس ٹپکانے لگی اور "کرشی"[1] میں اُگے ہوئے بے نظیر شہدی تربوزوں کی مٹھاس منھ میں گھلنے لگی۔ فریئر کو یہاں کی پیازوں کی لذت یاد آگئی جو اس کے نزدیک اس کے وطن کے سیبوں کی طرح میٹھی اور مزے[2] دار تھی۔ یہاں کے علف زاروں میں کانس، دوب، نائیزہ اور کچھار گھاس اُگتی تھی جن میں گھارالپوری (ایلیفنٹا)

---

[1] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۴۳۔
[2] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج ۱، ص: ۱۸۹۔ بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۲۴۱۔ کرشی سے غالباً کاشی بنا ہے وہ کھیت جہاں ککڑیاں اور پھوٹ وغیرہ اگائے جاتے ہیں۔

اور دیلودیہ (دیچرس آئی لینڈ) کی طرح سانپ لہرایا کرتے تھے [1]

باندورہ ۔ ماہم

فریئر کو سالشی ٹی میں پرتگالی امرا و شرفا کی دیہی رہائش گاہیں الدیہہ، اور ماگاٹھن کے دیہی گرجے بے حد پسند آئے تھے جو وہ ترومبے سے دیکھتا آرہا تھا۔ ترومبے جہاں فلسفیوں اور عزلت گزینوں کی آماجگاہ اور ابیراؤں کی بستی تھی ــــ اور تھانہ، منتے [2]، باندورہ اور لبستین تک اونچے نیچے سبزہ زاروں میں جیسوئٹ اور فرانسسکن سلسلوں کے کلیسا جوزمردیں قباؤں میں پیلے صوفیوں کی صورت محوِ خیال ایستادہ تھے، بجرے میں بیٹھے ہوئے فریئر کو بے حد پیارے لگے اور اس کے گذرگاہِ خیال میں موجۂ گل سے چراغاں ہوگیا تو اس نے باندورہ کو آبِ جو کے کنارے جگمگاتے دیکھا ــــ جہاں وہ بائیس جیبوں والا بارجہ نے کر چند ماہ پہلے گیا تھا۔ بندر کے قریب باندورہ کے متمول مالکان۔ جیسوئٹ پادریوں کی قدیم کلیسائی درس گاہ تھی جس میں سولہویں صدی کے اخیر تک چیول ــــ سے نوعیسائی پنجابی تربیت کے لئے آیا کرتے تھے [3]۔ سامنے ایک کھلے میدان میں ایک بڑی چوبی صلیب کے سائے میں کچھ کالے کرسٹان، سمندر میں بجتی ہوئی جلترنگ کی سہانی [4] دُھن پر سرودِ شام' کا کلیسائی نغمہ الاپ رہے تھے۔ کھپریل کی چھتوں والے پیلے مکانات محکوم تو پاڑوں کے زرد چہروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور سینٹ اینڈریو

---

[1] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۱۷۱، ص: ۲۴۴۔ [2] منتے [فریئر لے اِن] تھانہ سے قریب ایک گاؤں جہاں قدیم پرتگیزی گرجا تھا اور ایک گڑھی تھی جس میں محافظ دستے رہتے تھے۔

[3] بمبئی کا عروج۔ ص: ۷۷ (فٹ نوٹ)

[4] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج: ۱، ص: ۸۵-۱۸۴۔ اس کھلے میدان میں آج باندرہ کا سلاٹر ہاؤس واقع ہے۔

کا پرانا پرچم شام کے سُرمگیں اندھیرے میں مظلوم حبشی غلاموں کی طرح ڈوبتا جا رہا تھا۔ پہاڑی ڈھلوان پر سمندر کی جانب آب رسانی کے لئے بنایا ہوا پوچھے اگوڈا نظر آ رہا تھا جس کے قریب چونتیس سال پرانی فوجی چوکی ریلاک۔ ہاؤس، چوکنی کھڑی تھی۔ اونچائی پر ولایتی کھپریل کی پوشش والی ٹوپیوں تک جاتے والا لال بجری کا راستہ کنڈلی مارے ہوئے سانپ کی صورت منظر آ رہا تھا جہاں سے سامنے تھانہ کی زمردیں بستی پرتگیزی بانہ زرہ کی حریف بنی نظر آ رہی تھی، جو کھاڑی اور سمندر کی لہراتی ہوئی روپہلی لہروں کے پس منظر میں سبزہ خط اور کاکل مشکیں کی تفسیر پیش کر رہی تھی۔ انگریزوں کا خوبصورت جنگی گھر سفید بادبانوں کی اوٹ سے نظر آ رہا تھا اور فوجی چوکی باندورہ کے پرتگیزی بلاک ہاؤس کے منہ مقابل سینہ تانے کھڑی تھی[1]۔ تاڑ اور ناریل کے گھرے سبز پتے مور چھل بنے ہوئے مخدوم فقیہہ علی مہائمی کی درگاہ کے زیر تعمیر گنبد کی نگہبانی کر رہے تھے۔ اس درگاہ کی ٹھیک اسی وقت توسیع اور مرمت بھی ہو رہی تھی۔ (۱۰۸۵ ہجری)[2]

گھوڑبندر اور بسین

جب ڈاکٹر جون فرائیر کا بجرا تھانہ سے تین میل پرے سالسٹ کی سب سے پُرشکوہ اور حسین حویلی کے سامنے سے گذر رہا تھا جسے وہ پہلے بھی بسین کے دوران سفر میں دیکھ چکا تھا۔ جون ڈی میلو کی یہ الدیہہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھی جہاں سے ایک زینہ دار عمارت دیدہ گل کی طرح لہراتی آدھ میل تک خیابانوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی پانی کے کنارے تک چلی گئی تھی جس کی گلہٹی میں ایک ٹاپو پر پرتگیزی فدالگو کا شاندار

---

[1] ڈاکٹر جون فرائیر۔ ج ۱، ص ۱۸۵-۱۸۴۔ [2] دیکھئے اس کتاب کا آخری باب۔ مہائم کا بیان۔

ضیافت خانہ تھا جس میں اترنے کے لئے سنگین سیڑھیاں تھیں۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک خوش فضا وادی میں گرے بونڈل (گھوڑ بندر) کا ستھرا اور عظیم قصبہ آموں کے پیڑوں کے سائے میں صدیوں سے سستا رہا تھا۔ یہاں شمالی صوبے کے ایک بے حد متمول اور معزز ترین فدالگو۔ ہسپانوی خطاب یافتہ ڈون۔ مارٹن الفانسو کی رفیع الشان حویلی بدیسی اقتدار کی یادگار بنی کھڑی تھی۔ سینٹ جون کا چرچ کے چمنستان میں شام کا بسیرا کرنے والی چڑیوں کی چہچہاہٹیں گونج رہی تھیں۔ بڑ والا کی جٹاؤں کی کمندوں میں اسیر خوبصورت گڑھی سامنے تھی ——— اور جب رات کی کالی زلفیں سارے ماحول کے شانوں پر پریشان ہونے لگتیں تو محافظ دستے چلاتے ہوئے گیدڑوں اور شیر کشتیوں کے جنگجو چلاتے ہوئے مرہٹوں کو آبادیوں سے دور ——— رکھنے کے لئے چربی کی مشعلیں جلا کر خود بھیڑیوں کی طرح چلانے لگتے۔ یہ گرجا اور قلعہ ہندوستانی فن معماری کے اعلیٰ نمونے تھے۔ گھوڑ بندر کی کھاڑی میں ایک مصنوعی تنگنائے تھی، روایت جس کی تعمیر مقدونیہ کے سکندر اعظم سے منسوب کرتی ہے[1]۔ تنگنائے کے سامنے کھلا ہوا بحری راستہ تھا جو سمندر کی لامتناہیوں میں گم ہوتا نظر آرہا تھا۔ تا حد نظر ہسپانیاں چاندی کی پازیبوں سے گمنام ٹاپوؤں کی سنسان فضائیں گونج رہی تھیں اور سامنے سنگم پر بسین کا زرخیز جزیرہ کوکن کے زر و جواہر کو خزانوں میں چھپائے گہرے سبز غلاف میں ملبوس زوال آمادہ پرتگالی اقتدار کا مدفن نظر آرہا تھا۔

بسین: جہاں چار عظیم الشان دروازوں والا سنگ سرخ کا شاندار

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج ۱، ص ۱۹۰ - ۱۸۹۔

قلعہ تھا [جس پر دو سال بعد شیواجی ناکام چڑھائی کرنے والا تھا اور پینسٹھ برس
بعد "دسئی چی مُہم" میں مارے گئے مرہٹہ سُورماؤں کے سوگ میں ودھواؤں کی نو لاکھ
دھانی بانگوں کے ٹوٹنے کی جھنکاریں سُننی جس کی تاریخ کے مقدر میں تھی][۱] —

یہاں بیالیس توپ خانے آگ برسانے کے لئے مُنہ کھولے رہتے تھے —
سنگ سرخ کے پُرشکوہ ریاستی ایوان میں پرتگیزی شمالی صوبہ کے جنرل کا دربار لگتا
تھا جس کے حضور میں فدالگو دست بستہ ایستادہ رہتے[۲] تھے۔ [جنرل اپنے سُرخ
ایوان سے ناریل کے پیڑوں کو سرگوشیاں کرتے سُنتا ہوگا تو وہ تصوّر میں اپنے آپ کو
اُندلس کے قصر الحمرا میں پاتا ہوگا جہاں سیکڑوں برس گذرے اُموی خلیفہ الحکم نے
دُور دُور سے یہی درخت منگوا کر لگوائے تھے] ۔ یہاں فدالگو امیروں کی کشادہ دریچوں
والی پُرتکلف حویلیاں تھیں جن کی سُرخ دیواروں پر سبز بانکڑی اور عشق پیچاں بیلیں
سازش کے جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ان حویلیوں کے مسقّف بالاخانوں پر عیش
کوش امرا سیم بر اور سیم بدن حسیناؤں اور کنیزوں کے جھرمٹوں میں چاندنی راتوں
کا لطف اٹھاتے تھے[۳] — بیل ایل یا پورٹ پیتے[۴] پیتے وہ ذری سی دیر کے لئے
ہوش میں آجاتے جب بام کے پتّوں کی مخملیں سرسراہٹوں کے ساتھ پیانو اور گٹار پر کوئی
ہسپانوی نغمہ ہسپانوی گلابوں کی نکہت بار فضاؤں میں مچلنے اور مہکنے لگتا ۔ یا کوئی

---

[۱] دیکھئے "वसईची मोहीम" یلکٹ، یشونت نرسینہ کیڑکر (پونہ)۔ وہ بیت یہ ہے:
पडयांत उडाले लोक । करिती किती शोक
पडुनि संग्रामी । नव लाख बांगडी फुटली वसई मुक्कामी ॥
[۲] ڈاکٹر جون قریشی۔ ایضاً۔ ص ۹۲-۱۹۱۔ [۳] ہند کی معاشی حالت۔ ص ۲۰۱-۲۰۰۔
[۴] بمبئی کے اردگرد۔ ص: ۲۹۳۔

اندلسی مہاجر مطرب پرتگالی کے اعلیٰ دماغ اور دانشور شاعر کیموئینس کی وہ مشہور تاریخی نظم جو فتح لسبن کے بارے میں ہے، سُنانے لگتا جس میں " کا نیہری غاروں کے کھوکھلے تقدس[1] کی تضحیک کی گئی ہے اور بھکشوؤں کو نکھٹو اور بھکاری کہا گیا ہے اور اب جو پُرتگیزی مطلقوں کے ایندھن کے لئے لکڑ ہاروں کی طرح لکڑیاں کاٹنے لگ گئے ہیں اور اُن کی زندگیاں اور تمنائیں اور فرزندوں میں رُوں رُوں کرتے ہوئے رہٹوں کی طرح رینگ رہی ہیں" قدالگو امیروں کے نشیمن خیال میں اِل موروُدی چیُول" کے میتارۂ مدافعت پر کاسی کا بنا ہوا عقاب اپنے پر پھڑپھڑاتے لگتا جب کیموئنس ہی کا ایک اور مشہور نغمہ نشاط انگیز فضاؤں میں تیرنے لگتا جس میں اُس نے" ان دیکھے چلے [چیُول] کے بلند برجوں کی رفعتوں کے گیت گائے ہیں اور اس سرزمین کے تقدس کی ستائش کی ہے۔"[2]

جہاں الفانسو دا البوقرق عدن جاتے وقت (۱۵۱۴ء میں) لنگر انداز ہوا تھا اور دس برس بعد واسکو داگاما نے گوا آتے دورانِ سفر میں طوفانی بارش سے پناہ لی تھی اور اس کے بیس برس بعد اس کی دھرتی نے سینٹ فرانسس زیویئر کی قدم بوسی کی تھی۔ جب وہ لسبن کی زیارت کے لئے جا رہا تھا۔[3]

عیسائیوں کی گوری بستی سے الگ اور نسلی عصبیت سے دور، منقافات لئے ہوئے سوکھی ہتھیلیوں کے نوالے سوداگر جب کبھی عربی اور ہسپانوی دھنوں کو سنتے ہوں گے تو ماضی کے سوگ میں سر دھنتے ہوں گے اور اندلس کی ساری تہذیب اُن کے

---

[1] بمبئی کے ارد گرد۔ ص، ۴۳-۴۲۔

[2] بمبئی کے ارد گرد۔ ص، ۳۵-۲۳۴۔ اور دیکھئے برمنی زبان میں "چیُول"۔ مصنفہ، گریتی فون مستر و الیتر۔ زبرلن ۱۹۶۴ء)

[3] ایضاً۔

گلے سے لگ کر رونے لگتی ہوگی۔ لیکن عظمتِ ماضی کے یہ نوحہ گر اپنی شاندار تہذیب کی عظیم ثقافتی روایات اور جاندار علمی اقدار پر کچھ دیر کے لئے فخر کر لیتے ہوں گے[1] جب وہ یہ سنتے ہوں گے کہ لبتین کی جیسوئٹ اکادمی میں جس میں تاریخ، اخلاقیات اور تفاسیر کے درس دئیے جاتے تھے[2] فلسفہ اشراقی اور طب کے بیان میں بھولے بھٹکے کبھی کبھار قرطبہ کے "اویروس" (ابنِ رشد) اور بلخ کے "اوی سنا" (ابی سینا) کے نام بھی لے لئے جاتے ہیں۔

دھان اور اناج کی کھیتیوں اور کھاڑیوں میں کام کرنے والے مسلمان جب کبھی عرب دھاؤ کے بادبانوں کا تنا ہوا سینہ دیکھتے ہوں گے تو ان پر امید و بیم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہوگی یہ سوچ کر کہ شاید مسقطی عرب اپنے بھائیوں کا بدلہ لینے پھر آ گئے ہیں جن پر مسقط میں پرتگالیوں نے بے حد ظلم ڈھائے تھے (اور فرنیئر کے لبتین جانے سے چند ماہ قبل، چھ سو مسقطی قزاق لبتین پر ٹوٹ پڑے تھے۔ دیہاتوں کو بھسم کر ڈالا تھا اور فصیل سے باہر واقع کلیساؤں کو لوٹ کر راہبوں کو ذبح کر ڈالا تھا۔ فدالگو اور ان کے اہل و عیال کو غلام بنا کر لے گئے اور شہر کے ایک معتدبہ حصے کو تباہ و برباد کر کے ویرانہ بنا دیا تھا[3]۔ مگر فرنیئر کی یادوں کے کھنڈر میں لبتین کے جھلسے ہوئے ویرانے گم ہو گئے جب دور سے صبح کے دھندلکوں میں کلیان کے مظلوم و منحوس معبد کی جھلسی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ریکھائیں نظر آنے لگیں۔ شیواجی کے سوراجیہ کی سیما شروع ہو چکی تھی اور رات بھر کے سفر کے بعد موافق ہواؤں نے اس کے بجرے کو الہاس کھاڑی کے کنارے لگا دیا تھا۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے[4]۔

---

[1] ڈاکٹر جون فرینیئر۔ ج: ۱، ص ۱۹۲۔ [2] ایضاً۔ ص ۱۹۲۔ [3] ایضاً۔ ص: ۳۰۸۔ [4] ایضاً۔ ص ۳۰۹

گھناؤنا رُخ

کلیان — "عظمتِ پارینہ کے اس شاندار کھنڈر کو دیکھ کر ڈاکٹر جون فرئیر نے اس کے ماضی کے ٹوٹے ہوئے آئینوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ یہ قدیم بستی جس کی شکستہ ثقافتی قدریں چونا اور ریت، مٹی اور پتھر کے ملبوں تلے سسک رہی تھیں۔ "جس کی تباہی پر دکن کے مسلمانوں کو ہر طرح سے ماتم کرنے کا حق تھا کیونکہ یہ کبھی ایک عظیم الشان تجارتی مرکز اور ہر طرح کی تکلفات سے مزین و ممتاز شہر تھا۔ اگر پُرشوکت تعمیرات کے باقی ماندہ تبرکات لائقِ اعتنا قرار دیے جا سکتے ہیں، تو یہ آثار الصنادید اس حالت میں بھی اپنے جلالِ رفتہ کے دعوے کو قابلِ اعتبار بنا سکتے ہیں۔[1] گو مغلوں کی آتشِ غضب سے اس کے حُسن و جمال کا غازہ اُتر گیا تھا۔ پر انگریزوں کے کالے کرتوتوں کے سبب اُس کے جاہ و جلال کی آنکھوں کا کاجل پھیکا پڑ گیا تھا اور مرہٹوں کی چیرہ دستی نے اس کی رعنائیوں کو لوٹ لیا تھا۔[2]" اب اس کے چہرے پر گذشتہ عظمت و حشمت کی جھرّیاں رہ گئی تھیں۔ آلام کی گرد سے اَٹی ہوئی اس ویران بستی میں اُس وقت بھی[3] استرکاری کئے ہوئے چوکور پتھروں کی کئی منزلہ عمارتیں سوگوار کھڑی تھیں، جن کے رنگ و روغن کی دھنک لوٹ چکی تھی اور دیواروں پر نقش و نگار کی بیلیں مُرجھا گئی تھیں۔ شِشتالا تالاب کے مغرب میں اکیس سال پُرانی کالی مسجد ماتمِ ماضی میں سیہ پوش مرثیہ خواں تھی۔ اسی تالاب کے راستے پر — انڈاونگے، روزآلے اور آدھار تالابوں کے کنارے شہر کی قدیم مسجدیں

لہ ڈاکٹر جون فرئیر، ج: ۱، ص ۳۰۹، ۳۰۸۔ ٢ه ایضاً۔ ٣ه ایضاً۔

کے موذن کانوں میں انگلیاں ڈال کر گم شدہ تجلیوں اور تابانیوں کو بانگ دے کر پکارا کرتے تھے[1]۔ ان تالابوں سے مسجدوں میں پانی فراہم کیا جاتا تھا[2]۔ مسجدوں کے زیر سایہ پرشکوہ مقبرے غم و یاس سے کفنائے پڑے تھے۔ گو اب ان پر حزن و ملال کی شدید کیفیت طاری تھی لیکن ان کی بچی کچھی شان و شوکت سے ان کے بانیوں اور مدفون مکینوں کی زندگی کی "آخری طمع" ہویدا تھی[3]۔ کہ مرنے کے بعد بھی ہم مرنے والوں میں نمایاں رہیں"۔ شیواجی ایک ہندو ہونے کے ناطے ان مقبروں کو مسمار کرنے کا ہر سیاسی جواز رکھتا تھا لیکن ایسا نہ کرتے ہوئے اس نے ان روضوں کے خانگی استعمال سے متولیوں کو باز رکھا اور خاص طور سے ان مقبروں کو جو شہر کے وسط میں واقع تھے' بانیانِ درگاہ کے خواہشوں کے علی الرغم غلے کی کوٹھیوں میں تبدیل کر دینے کا حکم دے دیا تھا[4]"۔

" ان مدفنوں سے ملحقہ خانقاہوں میں کبھی وظیفہ یاب ملا سر پر سفید عمامے کا گنبد رکھے عُود و گل کی تیز خوشبوؤں میں ڈوبے مُردہ ارواح' کی مغفرت کے لئے بڑے رقت انگیز لہجے میں دُعائے استغفار مانگا کرتے تھے، کیونکہ ان کی دُعائیں عام طور سے مقبول و مستجاب سمجھی جاتی تھیں[5]" یہ جلیل القدر درگاہیں گرمیوں میں [اپنے مرمریں فرش، موٹی دیواروں، بلند سقف اور سنگین ساخت کے سبب] تابستان گاہوں [ییلاق] کا کام دیتی تھیں جن میں شہر کے بے روزگار اور نکھٹو دن بھر بے کار مشغلوں میں اپنا وقتِ عزیز ضائع کرتے رہتے۔ ان میں وہ بھی رہتے ہونگے جو مغلوں اور مرہٹوں کی دراز دستیوں کے سبب" دست نگر اور دریوزہ گر بن گئے تھے۔

---

[1] تھانہ گزیٹیر۔ ج: قابلِ دید مقامات' کلیان کا ذکر' دیکھئے۔ ڈاکٹر فریئر۔ ص: ۳۵۱۔
[2] ڈاکٹر فریئر۔ ص: ۳۰۹۔ [3] ایضاً۔ ص: ۳۰۹۔ [4] ایضاً۔ ص: ۳۰۹۔ [5] ایضاً۔ ص: ۳۰۹۔

اور تیرِ تجویزوں کی رُوبا ہی نے جن کے "گھروں کو لوٹ کر سگ خانہ بنا دیا تھا"[1] اُجاڑ تکیہ گاہوں میں سر چھپانے والے یہ مظلوم و مجبور انسان (تصوف کے انفعالی اقدار سے دھوکا کھا کر تسلیم و رضا پر تکیہ کرتے تھے اور توکل کی بیساکھیاں لے کر) زندگی کی ڈگر پر چل رہے تھے اور جب کبھی کھاڑی کے کنارے آدھار واڑی قبرستان کے کھنڈروں سے گذرتے ہوں گے تو قبروں کے سنگیں کتبوں کو پڑھ کر عبرت حاصل کر لیتے ہوں گے جن میں دنیا کی بے ثباتی اور کم مائیگی کا رونا رویا گیا ہے کہ "ہمارا مال و اسباب جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اور ہماری باتیں جو تم سن رہے ہو، ان میں سے ہر ایک موت کی طرف رواں ہے"[2]۔

ٹٹوالہ سے مربارٹ تک

اپریل کی جھلستی ہوئی دوپہر میں ڈاکٹر فریئر کا کارواں پتھریلی سڑکوں اور بے آب و گیاہ پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ٹٹوالہ پہنچا "یہ گام (گاؤں) کلیان سے تین کروہ (۲½ ۷ میل کے، فاصلے پر آم کی گھنی باڑیوں سے گھرا ہوا ایک گہری ندی کے کنارے، جو اس وقت پایاب تھی، گہری سوچ میں تنہا کھڑا تھا۔ کلیان کے ویران مقدر کا منحوس سایہ مغربی گھاٹ کے سلسلوں تک پھیلا ہوا تھا اور ٹٹوالہ بھی انتقام کے شعلوں سے راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا جس میں سے اس وقت بھی دھواں اُٹھ رہا تھا۔ سوائے ایک چوبی مسجد کے چلچلاتی ہوئی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے اور کوئی عمارت یہاں باقی نہیں بچی تھی"[3]۔

---

[1] ڈاکٹر فریئر۔ ص: ۳۰۹۔

[2] مالنا وحدیثی حیث تری ؛ کلٌ الیٰ منہ یعسقل [الخ]

[3] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج: ۱، ص: ۳۱۰۔

"مغل فوجوں نے سارے راستے بھر آتش زنی اور رہزنی کے سفاک نشانات چھوڑے تھے" "سسکتی بلکتی بستیوں میں بھوک پل رہی تھی اور کھیتیوں کھلیانوں میں دھول اُڑ رہی تھی" "مغل، ریوڑوں، عورتوں اور بچوں کو ہنکالے گئے تھے۔ جانور طعام بن گئے، اور انسان غلام"[1]

"چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا تو اس کی نیلگوں روشنی میں میلوں تک پھیلے ہوئے چھلیے جنگل، پُراسرار بیابان اور گھنے پودوں اور گھنیری جھاڑیوں کے بن" "دیوؤں اور بھوتوں کے مسکن معلوم ہونے لگتے"[2] "مرہاڑ کا نادار اور قلاش علاقہ آچکا تھا" یہاں کے باشندوں کا ایک دوسرے پر سے اعتبار اُٹھ چکا تھا اسی لئے اُن کا کسی مشترک دیوتا پر ایمان نہ تھا۔ ہر مشترک کی گھاس پھوس کی جھونپڑی میں تیل سے چکٹ ایک متعفن مورتی بڑی گمبھیر اُداسی کے ساتھ چپ چاپ لاتعلق کھڑی رہتی جو اپنے پجاری کو چور، ڈاکو، شیر اور دیگر درندوں سے، جن کی یہاں کمی نہ تھی، محفوظ رکھنے کی روحانی ضمانت دیتی تھی۔ یہ ادیباسی اتنے توہم پرست تھے کہ اگر خرگوش راستہ کاٹ دے یا بائیں ہاتھ پر کوئی کوا دکھائی پڑ جائے تو یہ ہر کام میں نحوست کا سایہ دیکھنے لگ جاتے اور سارا دن بے کار گھر میں پڑے رہتے چاہے گھر میں فاقہ رہتا۔[3]

بیل پر سوار ڈاکٹر جون فرئیر دکن کی اور آگے بڑھتا گیا۔ اکا دکا چھلسے ہوئے دیہات داغہائے جگر کی طرح کبھی کبھار چاندنی میں کھل اُٹھتے جن کے آس پاس دُور دُور تک پھیلی ہوئی کوکھ جلی کھیتیاں بنجر اور ویران پڑی تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ یہ لائق زراعت نہ تھیں، دراصل مغلوں نے کھڑی فصلوں کو جلا ڈالا تھا اور جو محفوظ

---

[1] ڈاکٹر جون فرئیر: ج:۱، ص: ۳۱۰۔ [2] ایضاً۔ ص: ۳۴۵۔ [3] ایضاً۔ ص: ۳۱۱۔

رہ گئی تھیں اُن پر شیواجی کے سپاہیوں کی درانتیاں چل رہی تھیں اور کاشت کار ظلم کی چکی میں پستا جا رہا تھا۔ خانہ بدوش ڈھنگر اور چرواہوں کے ریوڑوں کی مینگنیاں، گوبر اور پوال کے جلے کھاد کی بجائے ان کھیتیوں میں گرانبار ستم کے سُوپ نے جلی فصلوں کی راکھ بکھیر دی تھی۔ ان کشت زاروں اور علف زاروں میں سوائے خودرو نرسلوں کے اور کچھ نہ اُگتا تھا اور یہ چارہ بھی کسی دن مغل سواروں کے بھوکے گھوڑوں کے کام آنے والا تھا۔[1]

ڈاکٹر فریئر نے دکن کے دورانِ سفر میں (اور واپسی کے وقت بھی) سیاسی استبداد کے بڑے ہولناک تماشے دیکھے تھے۔ کوکن کی پس ماندہ قبائلی سماجی زندگی کے ترحم انگیز نظارے اور سنگین حقائق جب اس کے سامنے چٹانوں کی طرح کھڑے ہو جاتے تو وہ نظریں پھیر کر اپنے آپ کو قدرت کے دلفریب مناظر میں محسوس کر لیتا اور تصور کے اُڑن کھٹولے پر اُڑتا ہوا کنیا کماری تک پہنچ جاتا، جہاں تک [اس کے علم کے مطابق] سیہادری کی کالی زُلفوں کے سلسلے پہنچتے تھے۔[2] عمودی چٹانوں کی قطاریں اُسے "ٹوٹی ہوئی پسلیاں" نظر آتی تھیں [فریئر آخر ڈاکٹر تھا] اور کبھی قرونِ وسطیٰ کے صوفی کی نظروں سے دیکھتا تو اُسے "یہ چٹانیں سنگین سیڑھیاں نظر آتی تھیں جن کے ذریعے بارگاہِ خدا تک پہنچا جا سکتا تھا۔"[3] کبھی وہ دامنِ کوہسار میں بہنے والی چھل چھل کرتی ہوئی شیتل جل کی نرمل ندی سے "پہاڑی وعظ" سننے میں مگن ہو جاتا اور اسے کسی ایرانی شاعر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہوگا [جو اُس نے ایران کی سیاحت کے دوران کبھی سُنا ہوگا]۔

بنشیں بر سرِ جوی و گذرِ عمر ببین !   کین اشارت زجہانِ گذران ما را باد !

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر۔ ج ۱، ص: ۲۱۱-۲۱۰۔ [2] ایضاً۔ ص: ۳۱۲۔ [3] ایضاً۔ ص: ۳۱۲۔

دھیر (دھئی)

"ایک کوہستانی سلسلے سے محصور میدانی علاقے میں شیواجی کا مسلح دیہات دھیر (دھئی) خوف وہراس سے سمٹا ہوا تھا۔ لوگوں پر ایسی وحشت طاری تھی کہ اپنی عورتوں کو نہتا پانی بھرنے کے لیے اس تالاب تک جانے نہیں دیتے تھے جو وادی میں ایک برج کے نیچے تراشیدہ سنگِ سیاہ سے تعمیر کیا گیا تھا۔ سراسیمہ سپاہی پگڑیاں باندھے اور بالوں کی لٹوں کو کانوں سے باہر نکالے مضحکہ خیز طریقے سے ہتھیار باندھے رہتے تھے۔ یہاں شیواجی کے منتخب گھوڑوں کے اصطبل میں [ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر] چارے اور بھُس کا ہمیشہ انتظام رہتا تھا۔ آم اور املی کے تناور درختوں کی اوٹ سے کہیں کوئی ویران مسجد سہمی نظروں سے ان مسمار مقبروں کی سمت دیکھتی رہتی تھی جن کے مکینوں نے اُسے تا دمِ مرگ آباد رکھا تھا اور جو اب خود نفیس تراشیدہ سلوں کے ڈھیر میں بے ننگ و نام دبے پڑے تھے۔ ایک خوبصورت روضہ [غلط طور سے] ملک احمد بحری[1] سے منسوب تھا۔ دھیر کا حوالدار بمبئی [بھیمری] کے حوالدار کے ماتحت تھا اسی لئے فرییئر کو کلیان کے حوالدار کے نافذ کردہ پروانۂ راہداری پر مقامی حوالدار کی مُہر لگوانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کی دوستی کا حوالہ دے کر بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اسبابِ سفر کی تلاشی دینی پڑی اور ایک تحفہ بھی دھیر کے حوالدار کو بطورِ رشوت پیش کرنا پڑا جس کے طفیل اُس نے فریئر کو

---

[1] ملک احمد بحری احمد نگر میں دفن ہے۔

پان کا بیڑہ دے کر سُرخرو بنا دیا اور گھاٹ عُبور کرنے کی پروانگی دے دی۔

برَوی، ٹھیک ایک ماہ بعد ۲۲ مئی کو فریئر دکن سے ناناگھاٹ کے قدیم راستے سے لوٹا اور پھر ایک مرتبہ اور شیواجی کے دیوپیکر قلعے اس کی نظروں کو اسیر کرنے لگ گئے[1] اور مقبروں اور مسجدوں کے حسین کھنڈر اس کے دھیان کی نگری کو آباد کرنے لگے اور اسے [کلیان سے قریب] برَوی کی چار سا گوانی ستونوں اور سفید دیوارو والی صاف ستھری مسجدیں اتنی دلکش نظر آئیں کہ اس کے قدم خود بخود اس طرف اُٹھ گئے جہاں ایک ایسی ہی نفیس عبادت گاہ آباد دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے قبلہ رُو محراب پر آیاتِ کریمہ کے کشیدہ طُغرے تھے۔ تختہ بندی کی ہوئی چھت میں ایک جگہ سات قدمچوں والے منبر کے عین اُوپر چوکور خانہ چھوڑ دیا گیا تھا[2] [تاکہ یہ چھت کے چوبِ مالہ کے لئے داخلے کا کام دے سکے]۔ سقف سے آویزاں بلّوری قندیلوں میں کافوری شمعیں روشن کی جاتی تھیں یا تیل اور فتیلے کے چراغ ٹمٹماتے رہتے تھے۔ مسجد کے زیریں حصّے میں محرابی چھت دار دالان سے گُذر کر ایک گہرا حوض ملتا تھا جس میں اُترنے کے لئے سنگین زینہ تھا۔ مسجد کا امام بھگوئے ہوئے سُوتی چیتھڑوں کو پیٹ پیٹ کر کاغذ بنا رہا تھا۔ انہیں کاٹ کر مسجد کی سنگین دیوار پر دُھوپ میں سُکھانے کے لئے چپکا دیتا پھر اُتار کر صیقل کرتا اور جِلا دے کر لکھنے کے قابل کاغذ بنا لیتا۔[3]

" ناناگھاٹ کی تلہٹی میں واقع ولیشا کھرے سے لے کر مرباڑ اور برَوی تک کھیتیاں کُنبی کاشت کاروں کی اُجاڑ زندگیوں کی مانند ویران پڑی تھیں۔ یہ لوگ نہ تو اُنہیں جوت سکتے تھے اور نہ فصلیں کاٹ سکتے تھے، کیونکہ ان کے غلّوں کو حکومت

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر۔ ص: ۱۲-۳۱۳۔ [2] ایضاً۔ ص: ۳۴۵۔ [3] ایضاً۔ ص: ۵۲-۳۴۷۔

سے ۔ ا ندے اُٹھا لے جاتے اور گتّوں کو جنگل کے درندے۔ اسی لئے یہ اپنا اناج سُنسان جگہوں اور کھووں میں لیجا کر چھپا دیتے تھے۔ اورنگ زیب کے لشکریوں کا خوف ان پر اس درجہ چھایا رہتا تھا کہ اجنبی صُورتیں دیکھ کر یہ جنگلوں کی جانب بھاگ کھڑے ہوتے تھے" اور بعض دفعہ تو "دیہات[1] کے دیہات ان کے کھیت اور پیٹ کی طرح خالی دکھائی دینے لگتے"۔ اس سراسیمہ مخلوق کی سہمی ہوئی نگاہوں میں زندہ رہنے کی حسرتیں دم توڑ رہی تھیں"۔ رات بھر الاؤ مغلوں اور مرہٹوں کے دلوں کے آتش انتقام کی مانند سُلگتا رہتا تھا اور جب ساگوُن کے گھنے جنگلوں سے شیر کے دہاڑنے کی آوازیں سُنائی دینے لگتیں تو دہشت سے سناٹے کا دل بھی دھڑکنے لگتا۔ بھالو، کوہ میں چھپے بلبلانے لگتے اور سیار چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر[2] اُٹھا لیتے تھے"۔

بارش کے پہلے چھینٹے پڑنے کے آثار نظر آرہے تھے۔ فریئر نے مئی کے گہرے نیلے آسمان کی طرف نظریں اُٹھائیں تو اُس نے دیکھا کہ "اودی اُودی گھٹائیں سیہا دری کی کالی زلفوں سے چھیڑ خانیاں کر رہی تھیں اور جیسے دیکھ کر سارا ماحول شرم و حیا سے پانی پانی ہوتا نظر آرہا تھا۔ مینڈکوں کی ٹرّاہٹ سے [جنگلی[3] بطخوں کی طرح بڑے بچے اُس نے بمبئی کے کنوؤں میں دیکھے ہوں گے] فضاؤں پر ارتعاش طاری تھا اور آغوش کشادہ وادی کے ماتھے پر ان گنت جگنوؤں[4] کی افشاں چُنی ہوئی تھی"۔ اُس نے جب گرم ملک کی برسات سے پہلے کا یہ تابناک منظر دیکھا ہوگا تو اُسے بڑا عجیب لگا ہوگا۔ اُس کے پاس چونکہ کسی مشرقی شاعر کا رُومانی تصوّر نہیں تھا اسی لئے وہ ان

---

[1] ڈاکٹر فریئر۔ ج: ۱، ص: ۴۸-۳۴۵۔ [2] ایضاً۔ ص: ۳۴۷۔

[3] ایضاً۔ ص: ۴۹-۳۴۷۔ اور بمبئی ملکہ این کے عہد میں۔ ص: ۲۲۔ [4] ڈاکٹر فریئر۔ ایضاً۔

فرقداں شمعوں کو افشاں یا کہکشاں سے نہ تو تشبیہہ دے سکا اور نہ استعارے سے
کام لے کرا نہیں وہ آنسو کہہ سکا جو مظلوموں اور دُکھیوں کی بلکتی آنکھوں سے بارش
کے قطروں کی طرح ٹپکتے رہتے تھے۔ فریزر کا بجرا تھانہ خلیج سے بندر بمبئی کی طرف
ڈولتا ہوا جا رہا تھا، خلیج جو دو رُویہ کناروں کو مغل اُمرا اور مرہٹہ سرداروں کی
زندگیوں کے تضادات کی مانند کاٹتی چلی گئی تھی۔ راستے بھر وہ اپنے مشاہدات
کی ورق گردانی کرتا رہا اور یادوں کے سُوکھے پھُولوں کو اپنے خطوں میں وطن بھیجتا
رہا ـــ اور اُسے "جنگل تور کی وہ خاصیت یاد آگئی جو صُبح سفید اور رات[1] سُرخ نظر
آتا ہے"۔ یہی فرق اُس نے دونوں قوموں کی زندگیوں میں دیکھا تھا ـــ دُور ـــ
دُور تک جھُلسے ہوئے جنگل اُداس کھڑے تھے جیسے ایک نہیں ہزاروں مجنوں مر چکے تھے۔

---

[1] ڈاکٹر فریزر۔ ج:۱، ص: ۴۹-۳۴۷۔

چودھواں باب

مشاہیرِ کوکن

ڈاکٹر جون فریئر کے مشاہدات کی روشنی میں مغلوں کا جُرم زیادہ سنگین نظر آتا ہے جو اپنی آتشِ انتقام سے دیہاتوں کو جہنم زار بنا دیتے اور پکی ہوئی فصلوں کو بھون ڈالتے تھے۔ اس طرح وہ مرہٹہ سوراجیہ کی زرعی معیشت کی جڑوں کو کھوکھلی کر دینا چاہتے تھے۔ مغلئی پڑتی تو اناج کے ذخیروں اور چوکر چاروں کے انباروں میں بھی چنگاریاں سلگ اُٹھتیں۔ اِس طرح [کسی حد تک] سامانِ رسد کی فراہمی میں رُکاوٹ پڑ جاتی اور آخوروں کی باگ ڈور ڈھیلی پڑ جاتی تو عسکری قوت پر ضرب پڑ جاتی۔ غارتگری اور لُوٹ کھسوٹ میں مرہٹے کچھ کم مجرم نہیں تھے۔ لیکن ان کے معاشی استحصال کا مقصد دراصل حصولِ زر اور ذخیرہ اندوزی تھا۔

پھر مسلسل جنگوں کے باعث مغل سپاہی تھک چکے تھے اور جب کہ کئی مہینوں کی تنخواہیں بقایا میں تھیں تو بھلا ان کرائے کے جانبازوں میں نبرد آزمائی کا کون سا جذبہ باقی رہ جاتا۔ اس کے برعکس "شیواجی کی فوج معمولی نمائیشی اور آخور کی بھرتی نہ تھی بلکہ معقول تنخواہ یاب باقاعدہ سواروں کا لشکر تھا[1]....؟

---

[1] واقعاتِ مملکتِ بیجاپور۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی ص: ۳۵۳-۵۴

گو یہ بزدمن تھے مگر تلوار کے دھنی تھی اور احساسِ قومیت اور جذبۂ حرّیت سے سرشار تھے۔ اس لیئے ہمیشہ کامرانیوں سے ہمکنار رہتے تھے۔ مغل منصبدار برسوں سے ایک طرح کی جلا وطن زندگی بسر کرتے کرتے تنگ آچکے تھے۔ مگر بجائے 'بجنگ آمد' کے مرہٹوں سے سازباز رکھتے تھے[1]۔ مغل امراء شیواجی سے مسلسل شکستوں کے سبب شکستہ دل ہوکر دلبروں سے دِل بہلانے کا سامان پیدا کر چکے تھے اور شمشیر و سِناں پھینک کر شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں کے نرم آنچلوں کے پرچم تلے عشوہ و غمزہ و اَدا کا مقابلہ کرنے بیٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے سَروں پر متمدّر کی چھت سے موت کی تلوار لٹکتی ہوئی دیکھ رہے تھے اس لیئے چندروزہ عیش کو آبدار اَسلحوں اور بجد چمکتے ہوئے ہتھیاروں سے، جنھیں وہ اِس ڈر سے نہیں چھُوتے تھے کہ مبادا ان کی آب وتاب ماند نہ پڑجائے[2]۔ ذبح کرنے کی بجائے خود حریم ناز کی قُربان گاہوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ منصبداروں اور فوجی عہدہ داروں کے عسکری تصوّرات بدل چکے تھے اور سپاہیوں کے فوجی اخلاق حد درجہ پست ہو چکے تھے۔ رشوت خوری کا سب سے بڑا مرتکب دکن کا سب سے بڑا عہدہ دار، بہادرخان صوبیدار تھا۔ جھنجلاکر دِل جَلے جیسے لعن طعن کرتے تھے اور کبھی شیواجی پر لعنت و ملامت کی نشتر زنی کر کے اپنے جَلے دِل کے پھپھولے پھوڑ لیتے تھے: مگر یہ سارے امیر و منصبدار یہ تسلیم کرچکے تھے کہ "شیواجی ناقابلِ شکست سپاہی تھا"[3]۔ مُسلم مورخین اور دارالانشا

---

[1] ڈاکٹر جون فرئیر۔ ج ۱، ص: ۴۴۔ ۳۱۵ اور دیکھیئے "عظیم باغی" ص: ۲۰۶ و ۲۰۴

[2] ایضاً

[3] ایضاً

کے نشی، شیواجی کو "شیوائے مقہور" لکھ کر اور "کافر" کہہ کر تھوڑی دیر کے لیئے اپنا ایمان تازہ کر لیتے تھے ـــــــ اس لیئے کہ وہ ان کے نزدیک شہنشاہِ ہند کا باغی اور عادل شاہی مملکت کا غاصب تھا۔

شیواجی:

شیواجی کی بغاوت یکسر سیاسی نوعیت کی نہ تھی جب کہ یہ جذبۂ قومیت سے سرشار، مسلم اقتدار کی زوال آمادہ قدروں کے خلاف ایک مسلح تحریک تھی۔ عادل شاہی حکومت کے ضعف نے شیواجی کو توانائی عطا کی۔ جوانی کی اُمنگوں نے اسے پہلے مُہم باز بنایا، بعد میں بدامنی اور انتشار نے فوجی تنظیم کا موقع دیا۔ اورنگ زیب کی سیاسی غلطیوں نے کامیابی کا سیدھا راستہ دکھلایا۔ اس کے علوِ ہمت اور استقلال نے اسے ایک مرہٹہ سلطنت کا بانی مُبانی بنا دیا۔[2]

عالمگیر کی مذہبی عصبیت کا ردِّ عمل شیواجی کی نیم مذہبی جذبے سے مملو ارادت کی شکل میں یا خوش حال خان خٹک کی قومی تحریک کی صورت میں ظاہر ہونا ایک جدلیاتی عمل تھا۔ اس کے نتیجے میں ہندو قوم پرستی اور ہندو قومی تہذیب کا احیائً لازمی امر تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شیواجی نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیئے مذہب کو آلۂ کار نہیں بنایا جبکہ عالمگیر یہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ یہ بھی غلط نہیں کہ

---

[1] منتخب وقائع دکن (فارسی متن) ص: ۵۳، ۵۴، ۱۶۱۔ خافی خان۔ بحوالہ لین پول اورنگ زیب (انگریزی) ص: ۱۶۷

[2] لین پول "اورنگ زیب" (انگریزی)، ص: ۶۸۔۱۶۷، "الفنسٹن: ہسٹری آف انڈیا" (۱۸۶۶) ص: ۶۴۲

"شیواجی نے اورنگ زیب (جس سے وہ سخت نفرت کرتا تھا) کے تعصب کی مہیب شکلیں پیش کر کے تمام مرہٹوں کے دلوں میں تازہ رُوح پھونک دی تھی اور ایسی قلب ماہیت کر دی کہ لوگوں کے دل مرہٹوں کے نام سے لرز اُٹھتے تھے"[1]۔ وہ اپنی پس ماندہ قوم کو مسلمانوں کی پیشوائی میں اور زیادہ دنوں تک دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اسے ملک گیری اور جہانداری کے راستوں پر آگے بڑھانے کا خواہشمند تھا، اسی لئے اُس نے اپنے لوگوں میں جاگرتی پھیلائی، سیاسی شعور پیدا کیا اور نئی ہندو قومیت کا احساس اُجاگر کیا۔

" اگرچہ لوگ اُسے لٹیرا، قزاق اور چالباز سمجھتے ہیں لیکن اُس کے کارنامے کچھ اور کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بستیوں کو لُوٹ لینا اور جلا دینا ایک معمولی بات تھی۔ پھر شیواجی ہی کی خصوصیت کیا تھی، وہ زمانے کی روش پر چلتا تھا۔ رہا فریب اور دھوکا، تو معرکۂ جنگ میں اس سے کون بچا ہے۔ اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ مشہور ہے اور مہذب پیرائے میں اسی [چھل بٹے بازی][2] کو ڈپلومیسی کہتے ہیں"۔ اس کے علاوہ شیواجی میں اور بھی عیوب تھے"۔ اُس نے کاروانوں کو لُوٹا اور عوام کو ستایا۔ مگر کبھی کسی مذموم فعل کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنی مملکت کے عوام کے ناموس کی پاسداری کی"[3]۔ مُسلمان مورخین لکھتے ہیں" وہ قرآنِ مجید کا بڑا پاس ادب اور مساجد کا احترام ہمیشہ مدِنظر رکھتا تھا۔ اس کا سلوک عورتوں اور بچوں کی

---

[1] واقعاتِ مملکاتِ بیجاپور، ص: ۲۸۸، ص ۲۸۰ (فٹ نوٹ)

[2] ایضاً، ص: ۲۸۹۔ ص: ۵۴ - ۳۵۳

[3] خافی خان۔ دیکھئے تذکرہ شیواجی اور لین پول، ص: ۹۸، الفنسٹن، ص: ۶۴۷۔ اور واقعاتِ مملکاتِ بیجاپور۔ ص: ۸۸ - ۲۸۷۔

صنفِ صنعت سے ہمیشہ قابلِ تعریف رہا ہے[1]۔" اس کے بحریہ اور قلعوں کے "احشام و عملہ و فعلہ" میں مسلمان بھی ملازم رکھے جاتے تھے[2]۔ اِن حقائق سے اس کی مذہبی رواداری کی روایتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس کی عالی ظرفی کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے۔

جس طرح شیواجی کے ناگہانی حملوں، فوری یلغاروں اور آئندہ اقدام کے بارے میں کوئی یقین سے کہہ نہیں سکتا تھا اسی طرح اس کی موت کی خبریں بھی بے یقینی کی موت مرتی رہیں اور زندہ ہو کر دہشت پھیلاتی رہیں۔ بمبئی کی انگریزی کونسل نے لکھا کہ "شیواجی اتنی مرتبہ مر چکا ہے کہ کچھ لوگ اسے اب غیر فانی سمجھنے لگے ہیں[3]" اور یہ سچ ہے کہ وہ آج بھی مرا نہیں، حالانکہ مورخوں نے کئی مرتبہ اُسے اپنے قلم کی تلوار سے مارا ہے۔ ہمت و شجاعت کا یہ دیوتا آج بھی زندہ ہے اپنی قوم کے دلوں کے ٹکڑوں اور ذہنوں کے صنم کدوں میں۔ اور اپنے دیش کے آدرش کی علامت بن کر وہ آج بھی جاوداں اور تابناک نظر آرہا ہے۔!!

مرہٹواڑی کے ہندو راجاؤں، مہامنڈلیشوروں اور پالیگاروں کو فنِ معماری سے جو شوق رہا اس کی تکمیل قلعوں کی تعمیر میں ہوئی اور اُن کے ذوقِ فن کی نمود اور تشکیل مندروں کے رُوپ میں ہوئی۔ یہاں کے متعدد قلعوں کی تعمیر میں راجہ بھوج کے نام کی نیو پڑی ہوئی ہے اور ہیماد پنتی پتھروں سے بنائے گئے بُت کدوں میں یادو راج کے وِدیا وان منتری ہیمادری پنت کی یادوں کا تراشا ہوا بُت ملتا ہے اسی

---

[1] خافی خان۔ دیکھئے تذکرۂ شیواجی اور لین پول۔ ص: ۱۴۸۔ الفنسٹن، ص: ۶۴۷۔

[2] منتخب کاغذات اورنگ زیب۔ نمبر ۹۶۶ اور ۹۶۴۔

[3] عظیم باغی، ص: ۲۴۴۔ شیواجی غالباً یکم جون ۱۶۸۰ء میں مرا۔ مآثر عالمگیری اور تاریخ محمدی میں ۲۲ مئی ۱۶۸۰ء درج ہے۔

نے دفتری لپی موڈی ایجاد کرکے مرہٹی زبان کو ایک نیا موڑ دیا اور فنِ تعمیرات میں ایک نئے اُسلوب کی طرح ڈال کر کلاکاروں اور شیلپ کاروں کو نیا رجحان[1] بخشا۔ اِس فنی اُسلوب کا تعلق خاص طور سے تراشیدہ سِلوں کے کٹاؤ اور آرائش سے تھا، مگر ایسا لگتا ہے کہ بیشتر عمارتیں ہندوراج کے خاتمے سے پہلے ہی وقت کے استبداد اور جغرافیائی کارفرمائیوں کے سبب کھنڈروں میں تبدیل ہوگئیں لیکن انقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ۔ اُن کی تباہیوں میں سیاست و مذہب کا بھی ہاتھ تھا۔ مُسلم تسلط کے رُوبرو جب صنم کدے سجدہ ریز ہوگئے تو ان کی بنیادوں نے نئی عمارتوں کو سہارا دیا۔ منقش سنگین اور چوبی ستونوں نے عبادت گاہوں کا بوجھ سنبھال لیا اور تراشیدہ سِلوں نے اپنی کافرادائی اور ایمان شکن نقش و نگار کے سبب درگاہوں اور مرقدوں کے سینوں میں اپنا مقام بنا لیا۔ سنگ و خشت کی یہ پیوندکاری۔ پاکھوں اور کھمبوں کی یہ قلم کاری گو ایک طرح سے (موقع و محل کے پیشِ نظر ہنگامی حالات میں تعمیری ضروریات اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل کرتی دکھائی دیتی ہے، مگر بعض دفعہ "دھوکے میں نجات ہوگئی ہے" اور انجانے پن میں ہندو مسلم فنِ تعمیرات کے فنی اسالیب کے امتزاج و اختلاط کے لئے مواقع فراہم کرتی نظر آتی ہے اور ایسے بہت سارے مواقع سو سال پہلے تک مہسلا کی مسلم عبادت گاہیں، تلے کی پُساتی لیتی میں، تانکشی میں بدرالدین شاہ کی درگاہ اور تسونولی بھیمڑی کے شہر غریباں میں دیکھنے کے لئے مل جاتے تھے۔

لیکن ہندوراجاؤں میں فنی اسالیب کے اختلاط اور ہندو مسلم ثقافتی،

---

[1] ہندوستانی فنِ تعمیر (انگریزی)۔ پرسی براؤن (۱۹۴۲ء)

عسکری اور انتظامی روایات و اقدار کے امتزاج کی طرف جس نے عملی قدم اٹھایا، وہ شیواجی تھا جس کا سب سے بڑا تضاد خود اس کے دور میں اس کا حریف عالمگیر تھا۔ ہم اس کے بحریہ کے امیر البحر دولت خاں کا نام سن کر اس لئے چونکتے ہیں کہ مسلم مؤرخین اور ان کی تقلید میں مغربی تاریخ نویسوں نے اس کے کردار کے خدوخال کو عالمگیر کے آئینے کے روبرو مسخ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس کا خاص معمار بھی ایک مسلمان شیخ محمد[1] تھا جس نے اس کے حکم سے اوچیت گڈھ کا قلعہ بنایا اور اس کی تلہٹی میں واقع پنگل سائی گاؤں میں ایک مندر تعمیر کر کے اپنے راجہ کا من موہ لیا تھا۔ شیواجی کے مانگرولہ (مانگاؤں) کی گڑھی کے کاریگر اور تراشیدہ حوضوں کے شیلپ کار مسلمان ہی تھے۔ مشرق کے جبل الطارق[2] رائے گڈھ میں گنگا ساگر کے کنارے دو پانچ منزلہ مینارے اپنے بارہ پہلوؤں کی مینت کاری اور محرابی دریچوں کی کاریگری سے اس تاریخی سچائی کا بول بالا کرتے ہیں کہ شیواجی کو مسلم فنی اسالیب کو برتنے کا فن بھی آتا تھا اور ایسا کرنے میں اسے عار بھی نہیں تھا اور یہ کہ ان کے مسلم معمار بھی چھترپتی راجہ کے سائے میں پنپ رہے تھے اسی طرح نقار خانے [نگار خانے] کا طرز تعمیر ببانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ انہیں بھی مسلمان کاریگروں نے اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے[3]۔ جب شیواجی نے رائیری یا رنڈی کو (۱۶۶۲ء) میں اپنی راجدھانی بنانے کا منصوبہ بنایا تو کلیان کے صوبہ دار اباجی

---

[1] BOMBAY COURIER شمارہ ۱۲ر فروری ۱۸۱۵ء

[2] نیرنے۔ کونکن۔ ص، ۳۸۔ انڈین اینٹی کیوری، سوم، ص ۱۰۱۔

[3] قلابہ گزیٹیئر ص: ۶۳-۳۶۱

سونڈدیو کو تعمیرات کا طویل سلسلہ شروع کرنے کا حکم دیا اور جب دو سال بعد اُس کے راجہ بننے کے خواب کی تعبیر پُوری ہوگئی تو تین سو کے قریب عمارتیں[1] آنکھیں مَلتی ہوئی بیدار ہوگئیں۔ راجہ کا رنگ محل نازک اندام نرتکیوں کے گھنگھرؤں سے گُونجنے لگا جن کے کوٹھے اَنبھوڑہ کی سات کوٹھیوں سے پَرے مہادیو مندر کے پاس تعمیر کئے گئے تھے۔ راجہ کی کچہری (دربار) میں میلہ سا لگا رہتا تھا اور اشٹ پَردھان کے بھَون اور دفتروں میں، پیشوا، پنت آماتیہ (مجمدار)۔ پنت سچیو (سُرنِس)، منتری (وکنس۔ واقعہ نویس)۔ سامنت (دبیر، سیناپتی (سرنوبت) نیایادھیش اور پنڈت راؤ (نیاشاستری) کے قلموں کی سرسراہٹیں سُنائی دینے لگی تھیں۔ دارالضرب سے ضرب کی آوازیں سارے میں تقسیم ہونے لگی تھیں اور ایک میل تک پھیلے ہوئے بازار میں لوگ خرید وفروخت کے لئے جمع ہونے لگے تھے اور جب عملہ واحشام قلعہ کی رہائش گاہیں تعمیر ہوگئیں تو دو ہزار افراد ان میں بٹ گئے۔ لوگ خاطر جمع ہوکر رہنے لگے کیونکہ غلّے کی کوٹھریاں بھری ہوئی تھیں اور بارُود خانے پُر تھے۔ چٹانوں سے تراشیدہ یا تعمیر کئے گئے حوضوں اور تالابوں میں پانی کی کمی نہ تھی۔

عادلشاہیوں کا یہ اسلام گڑھ جسے انہوں نے ۱۶۳۶ء میں مغلوں سے بطور امانت[2] لیا تھا۔ گورائیگڑھ بن کر دوبارہ مُرتد ہوگیا تھا مگر اس کا قربستی میں مسلمانوں کی تہذیبی یادگاریں ہمیشہ محفوظ رہیں۔ مسجد توپخانہ، مدن شاہ اور عادل شاہ کے مزارات

---

[1] ڈاکٹر جون فریئر۔ ایضاً۔ ص: ۲۰۳ ۔ ۲۰۰۔

[2] جرویس، کونکن، ص: ۹۲۔

کو کسی قسم کی کبھی گزند نہیں پہنچی اور اسی طرح شیواجی کے تعمیر کردہ قلعے بیرواڑی میں کسی شیخ کی درگاہ ہو، چاہے اس کے مقبوضہ قلعوں؛ ساگر گڑھ اور گوسالگڑھ میں گمنام پیروں کے مقبرے ہوں، ان پر ہمیشہ احترام کا غلاف چڑھا رہا۔ سُر گڑھ قلعے میں یار پیر کی درگاہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ کھندیری ٹاپو میں جو بقول خافی خان، شیواجی کا مستحکم بحری محاذ تھا۔ داؤد پیر کے مزار پر مسلمان اور ہندو ملّاح حسبِ دستور نذرانے چڑھاتے تھے جس طرح وہ وِٹھّل کے مندر میں چڑھاوے چڑھاتے تھے، کیونکہ اُن کے عقیدوں کے مطابق ان دونوں کی سمندر پر حکمرانی تھی اور انہیں کی رُوحانی قوتوں سے اُن کی کشتیاں مہیبِ شمال کے جھکڑوں سے اُٹھتی ہوئی طوفانی موجوں سے محفوظ رہ سکتی تھیں ——— ورنہ ان کا بھی ان مسلمان "کشتی شکستگان" جیسا حال ہوتا جن کی قبریں بیپل کے پیڑوں، بیر کے جھنکاڑوں اور چمپا کے پودوں کے سایوں میں تسبیح کے ٹوٹے دانوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔

شیواجی کو ہمیشہ سے یلغار و یورش سے اُلفت تھی۔ کوہستانوں کے دروں اور قلعوں کی وادیوں میں گھوڑا دوڑانے کا مشغلہ دراصل "لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھا"۔ اسے قلعوں کی تسخیر سے جتنی محبت تھی، اتنی ہی لگن ان کی تعمیر اور مرمّت سے تھی۔ پرتاپگڑھ کا قلعہ بنایا تو مہاڑ سے دکن کے راستے کی حفاظت ہو گئی۔ (۱۶۵۶ء) رائے گڑھ سے قریب لنگانہ اور گوسالے کے پاس بیرواڑی کی بنیاد اسی نے ڈالی تھی۔ علی باغ کے سامنے قلعۂ قلابہ اس کے بحریہ کا بحری محاذ تھا۔ سورن درگ، وجیہ

ا۔ ایلیٹ۔ ج ۷، ص ۲۹۰، ص ۳۵۵۔

۲۔ گرانٹ ڈف۔ مرہٹوں کی تاریخ۔ ص ۶۴۔

درگ اور گنڈیری قلعوں کی مرمت کرائی اور اضافے کیے۔ قلعوں کی مرمت کے لیے اُس نے کوکن کے چند پرگنوں اور محالوں کی آمدنی میں سے مقررہ رقمیں مخصوص کر دی تھیں۔[1]

شیواجی کے مرنے کے بعد عالمگیر نے اطمینان کی سانس ضرور لی ہوگی جبکہ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دکن کی مسلم سلطنتوں کی سانس بھی اکھڑ چلی تھی مگر خود اُس کی خشک زندگی کی ٹیڑھی ٹہنی کو سیاسی اندیشوں کی امربیل نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کی توتوں پر بیت جھڑ چھا رہی تھی۔ خود اس کے خلاف اُس کے محل میں سازشیں جوان ہو رہی تھیں ــــ اور عالمگیر بُوڑھا ہوتا جا رہا تھا اور اب تو اُس کی راتوں کی نیند بھی اُڑ گئی تھی، جب سے یہ خبر اُڑی تھی کہ اُس کا چہیتا چھوٹا بیٹا اکبر، شیواجی کے بیٹے سنبھاجی کے ساتھ مل کر بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا اور جس کی تعبیر سنبھاجی اپنی مہمات میں ڈھونڈ رہا تھا جو کبھی سدّیوں کے خلاف راجپوری کے محاصرے تک محدود رہتی اور کبھی پرتگیزوں کی عداوت پر مبنی ہوتی جنھوں نے مغل بحریے کو الہاس ندی میں محاذ کھولنے کی اجازت دے دی تھی۔[2] مگر اِس حرکت نے مرہٹوں اور انگریزوں کے مابین مفاہمت کے دروازے کھول دیئے اور اب وہ بلا مزاحمت و محصول مرہٹہ اضلاع سے ایندھن اور تعمیرات کے سامان بمبئی میں درآمد کر سکتے تھے۔[3] اِدھر سنبھاجی نے اکبر کا دل بھی اپنی مٹھی میں لے لیا تھا اور اب صرف ــــ دلّی لینا باقی تھا۔ مگر دِلّی دُور تھی اور مغل فوجیں نزدیک آ چکی تھیں اور اکبر کی سرکشی کا انجام بھی نزدیک آ پہنچا

---

[1] سین۔ شیواجی کا عسکری انتظام۔ (انگریزی)

[2] مآثر عالمگیری۔ ص: ۲۲۷۔ دلکشا۔ ورق ۱۷۸۔

[3] منوچی۔ ج: ۲۔ ص: ۲۰۶۱۔

تھا اور جب اُسے ماحولی کی سنگین چٹانوں اور بھیمڑی کلیان کے مکینوں نے بھی پناہ
نہ دی تو باپ نے بڑی حسرت سے کہا: "وہ ازلی و ابدی مصائب میں گرفتار ہو چکا ہے
اور اسی طرح پہاڑوں اور ویرانوں میں آوارہ رُوح کی طرح بھٹکتا رہے گا"
لیکن ایک دن (۱۶۸۸ء) اِس مایوس و نامُراد شہزادے نے حسرتوں کا لنگر اُٹھا دیا
اور اپنے سفینۂ غمِ دل کو راجپوری کی بندرگاہ سے ــــ دُور ایران لے گیا، کبھی نہ
لَوٹنے کے لیے۔ اور اٹھارہ سال بعد اُس کے سفینۂ حیات کو موت کا کنارا مل گیا۔
اُس کا شہنشاہ باپ ہی بہتر جانتا تھا کہ آیا اُس کے سر سے ایک بوجھ اُتر گیا ــــ یا
بارہائے غم سے اُس کی بوڑھی کمر اور کمان بن گئی۔

مُغلوں کی یلغاروں اور سدّیوں کی یورشوں نے سنبھاجی کو سنبھالا لینے
نہ دیا۔ عادلشاہی سلطنت کا جنازہ اُٹھ چکا تھا اور اب مُغلوں نے گولکنڈہ بھی سَر کر لیا
تھا۔ مرہٹہ سوراجیہ کی سیما سمٹنے لگی تھی اور معاشی ابتری اور اقتصادی بدحالی نے سارے
معاشرے کو پراگندہ اور سراسیمہ بنا دیا تھا۔ زوال آمادہ قدروں میں اُبھرنے کی سکت بھی
نہیں رہی تھی ــــ اور تاریخ کی جبریت ایک بھرپور وار کرنے کے لیے وہ تلوار ڈھونڈ رہی
تھی جو بھیمڑی اور کلیان کے نواب سیّد عبدالقادر المقلب بہ

مُعتبر خان

کے ہاتھوں میں ننگی ہو چکی تھی۔ یہ کلیان کے ایک صُوفی منش نوائطی خاندان
سے تعلق رکھتا تھا اور سابق فوجدار تالکوکن مُلّا احمد عرب کا خواہر زادہ تھا۔ اولوالعزم
سپاہی تھا اور حوصلہ مند ملازم شاہی ــــ جو جعفر آباد عُرف چاندوڑ کی فوجداری
سے ترقی کر کے اپنی فتوحات اور فوجی خدمات کے باعث موروثی عہدے اور جاگیر کا

حقدار بنا۔ ۱۶۸۷ء میں جب وہ گلشن آباد (ناسک) کا تھانہ دار تھا تو اُس نے اپنے بل بوتے پر مقامی ادیباسیوں کی ایک فوج بنالی اور اُس کی مدد سے مرہٹوں کے مایۂ ناز قلعہ پٹّہ جسے شیواجی وشرم گڑھ کہتا تھا اور جہاں اُس نے کئی عالی شان عمارتیں بنوائی تھیں، تسخیر کرلیا۔ یہ کارنامہ شہنشاہ کی تالیفِ قلب کا باعث بنا اور اس کے منصب اور ماہی مراتب میں اضافے کا سبب ہوا۔ گو وہ اپنے صَرفِ خاص سے کئی ہزار روپے اِس مہم میں صرف کرچکا تھا جیسا کہ اُس کا منشی جیٹھ مل اپنی منشآت "کارنامہ جیٹھ مل" میں لکھتا ہے۔

معتبر خان کی فتوحات کی خبریں اب باقاعدگی سے شہنشاہ کے "سیاہہ حضور" میں درج ہونے لگی تھیں کہ کس طرح نواب نے کونگ یا کلنگ کے مستحکم قلعے کو زیر کرلیا تھا جو قلعۂ دولت آباد سے بھی بلند تر اور عمودی خط پر واقع تھا اور جب اُس نے ترمبک کے قلعہ دار کو بھاری رشوت دے کر اُس کے ضمیر کے دریچے کو بند کر کے قلعے کا دروازہ کھول لیا تو بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ترمبک قلعہ سنبھاجی کی عسکری طاقت کا مستحکم محاذ تھا۔

ماہولی بھی سیاسی و فوجی قوتوں کا محور تھا جس کے اِرد گرد شمالی تالکوکن کا سارا نظام گردش کرتا تھا۔ یہ طاقت کا وہ افسانوی جن تھا جس کی تسخیر سے کوکن کی فتح کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ اِسی کے ذریعے ملک احمد بحری احمد نگر کا بانی بنا۔ اِسی بلند قلعے نے کبھی شاہ جی، اُس کی بیوی جیجابائی اور ننھے شیواجی کو پناہ دی تھی اور عہدِ عالمگیری ہی میں سمرقند کا شیخ الاسلام عابد خان

لہ منتخب کاغذات اورنگ زیب، نمبر ۴۹۹۲، مؤرخہ ۱۰ ارجون ۱۶۸۸ء۔

(متوفی ۱۶۸۹ء) جو نظام الملک آصف جاہ بانیٔ سلطنت حیدرآباد کا پردادا تھا، ماہولی کا قلعہ دار رہ چکا تھا۔

بھنڈار گڑھ اور پلس گڑھ کی قدرتی فصیلوں کے پہلوؤں میں سمٹا ہوا ماہولی سہمی ہوئی نظروں سے اس نڈر نوجوان کو تک رہا تھا جس نے کلیان کے مرغزاروں میں شہسواری کرتے وقت نجانے کتنی مرتبہ وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں ڈوبتے اُبھرتے کہانی کے اس دیو کو دیکھا ہوگا اور جو اسوقت ہزار شہسواروں کی معیت میں بر واڑا اور کھرڈی کے راستے بیابانوں اور تنگ دروں کے ذریعے ماہولی کی تلہٹی میں پہنچ چکا تھا تاکہ فرمانِ شاہی (گیارہ مارچ ۱۶۸۹ء) کے مطابق اُسے تسخیر کر سکے مگر اس مہم کے وسائل اور ذرائع اُس کی دسترس سے باہر تھے۔ محاصرے کا خیال ہوا کی دوش پر اُڑتے ہوئے ابر کی طرح آیا اور گذر گیا اور وہ کلیان لوٹ آیا تاکہ سامانِ جنگ کی فراہمی کر سکے۔ درگاڑی کی گڑھی پر معتبر خان نے قبضہ کر کے اُسے اپنی مہمات کا مرکز و محاذ بنا لیا ......[1]

سنبھاجی کو گرفتار ہوئے چند ہفتے گذر چکے تھے اور نواب اچھی طرح جانتا تھا کہ مرہٹوں میں انتشار پھیل چکا ہے۔ ہر سردار اپنے اقتدار کا ایک نیا بت تراش رہا تھا۔ اُس نے ماہولی کے قلعے دار سے سمجھوتہ بازی اور سودابازی کے لئے رابطہ قائم کیا۔ عملہ واحشام قلعہ کو شاہی ملازمت اور جاہ و منصب کی لالچ دیکر رام کر لیا اور جب اس ضمن میں ۲۸ جولائی ۱۶۸۹ء کے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ضمانت ملی تو غنیموں نے قلعۂ ماہولی بطورِ نذرانہ مغل شہنشاہ کی خدمت میں پیش

---

[1] تاریخ عالمگیر سرکار، جلد پنجم، ص ۵۸ ۔ ۱۵۱ ۔ ص: ۱۲۵ ۔

کردیا۔ معتبر خان اپنے آقا کے ناموس کی پاسداری کے لئے سوداگری بھی کرتا تھا اور سپہ گری بھی اور ملنگ گڑھ، کرنالا (بنویل) اور دوگارڈ (بھیونڈی) کے قلعوں کے علاوہ بیسیوں قلعے زیر ہو چکے تھے۔ اُس کا منشی جیٹھ مل اپنی منشآت میں لکھتا ہے "خانِ والاشان نے کوئی پچاس کے قریب قلعوں کو اتنی چابکدستی سے تسخیر کرلیا تھا جو کبھی شیواجی کا خاصہ تھا۔ اورنگ آباد سے لے کر ساحل سمندر تک اور بالخصوص تلکوکن نظام الملکی کا حصہ جنیر تک تمام آلودگیوں سے پاک ہو گیا" شمالی کونکن میں کلیان اور نواحی پرگنے جن پر برسوں مرہٹوں کا غلبہ رہا تھا، تاخت وتاراج کے سبب ویرانے بن چکے تھے[1] کوکن کا مظلوم دیہی طبقہ جوھار اور رامنگر کے کولی علاقوں میں پناہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ پرتگیزی عملداری میں کئی کسانوں پر ظلم ہوتا شروع ہوا تو یہ بھاگ کر کلیان میں آباد ہو گئے۔ اِس طرح چھ سو کے قریب اُجڑی ہوئی بستیوں میں نواب کے سعیٔ کرم سے زندگی پھیل گئی۔ اُس نے نئی بستیاں آباد کر کے مدنیت کے تصوّرات کو فروغ دیا۔ نرمل پانی کی نہریں افتادہ اور غیر مزروعہ اراضی کو سیراب کرنے لگیں۔ کھیتیاں لہلہانے لگیں اور نئے باغات کی بہار آفرینیوں اور پُرشکوہ عمارتوں کی حُسن کاریوں سے جھلسے ہوئے کوکن کو آباد اور خوش حال بنا دیا[2] ——— (۱۶۸۹ – ۱۶۹۰ء) کا یہی زمانہ تھا جب جزائر بمبئی، تھانہ اور مغربی ہندوستان کا سارا ساحلی علاقہ دمن اور سورت تک طاعون کی وبا کا شکار ہو چکا تھا اور فرنگی سیاست کے طاعوتی حربے

---

[1] دیکھئے پچھلے اوراق۔

[2] کارنامۂ جیٹھ مل، اوراق: ۴،۳۔

مہاراشٹر کی فضا کو مسموم بنا رہے تھے۔ پرتگیزوں کی شورشوں اور سازشوں سے تنگ آکر معتبر خان نے بسین کی کھاڑی تک سارے علاقے کو روند ڈالا اور بہادر پور میں عسکری محاذ بنا کر سرکاری توپخانے کا منتظر تھا کہ پرتگیزی حکومت نے عالمگیر کے سامنے بدیسی تحائف کا ڈھیر لگا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ناچار بادشاہ کو دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ اور مغل امیر البحر سیدی یاقوت کو جو معتبر خان کی مدد کے لئے آیا تھا۔ مجبور ہو کر اپنے بحریے کا لنگر اٹھانا پڑا اور نواب نے اپنی تلوار میان میں ڈال لی۔ بادشاہ نے معتبر خان کا دل بڑھانے کے لئے اضافۂ منصب کا شاہی فرمان بھیجا مگر ۱۲ رفروری ۱۷۰۴ء کو قضا و قدر کا حکم آن پہنچا۔ پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا۔[1]

نواب معتبر خاں کے تہذیبی کارنامے

معتبر خان سرزمینِ کوکن کا غالباً پہلا نوایتی امیر تھا جو اپنی صلاحیتوں اور حوصلہ مندیوں کے سبب علو مرتبت کو پہنچا۔ ثروت و دولت نے اُس کے قدم چومے اور ملکی فتوحات نے اُس کی ناموری کے دروازے دلّی تک کھول دیئے جہاں کا بادشاہ عالمگیر کہا کرتا تھا۔ "مثلِ معتبر خان نوکری باشد"۔[2] عالمگیر کو بھی اپنی خواجگی کا پاس تھا، اِس لئے اُس کی سفارش پر کلیان کے نوایتی مسلمان علی جی کو $\frac{\text{۱۰۹۵ھ}}{\text{۱۶۹۵ء}}$ میں وہاں کی قلعہ داری تفویض کی اور چودھرائی حقوق دیئے۔ مزید برآں لگان میں سے ۲ فیصد "رسوم" مقرر کیا۔ علی جی (غالباً) معتبر خان کی قرابت میں تھا۔ معتبر خان کی سپہ گری

---

[1] کارنامۂ جیٹھ مل

[2] تاریخ النوائط۔ ص ۳۳۱۔ ص ۳۲۹۔ ۳۲۸۔

کی ہیبت سے پرتگیزوں پر لرزہ طاری رہتا تھا جو اُسے "مغل آسیب"[1] کہتے تھے۔

نواب اپنے عہد کے حکمران طبقے اور اہلِ ثروت و اقتدار کا ایسا نمائندہ تھا جو قرونِ وسطیٰ کی امارت، تہذیب اور ثقافت کا معیاری نمونہ سمجھا تھا جس کی تہذیب و شائستگی کا عکسِ جمیل اُس کے تہذیبی و ثقافتی کارناموں اور یادگاروں سے جھلکتا تھا۔ کلیان میں دوبارہ توطن اختیار کیا تو اس کی بگڑی اداؤں کو سنوارنے کے لئے تعمیرات کا طویل سلسلہ شروع کیا۔ فنِ معماری کے شوق میں کیا عجب کہ بیروزگاروں کے اقتصادی تحفظ کا راز مضمر ہو۔ شہر پناہ تعمیر ہوئی تو ۳۱۲۴ گز طویل فصیل نے ستر ایکڑ رقبے کو محیط کرلیا۔ گیارہ مینارے سر اُٹھا کر پاسبانی کرنے لگے اور چار بڑے دروازے آنے جانے والوں کی نگہبانی۔ آدھار دروازہ شنالا تالاب کی طرف باغِ معتبر خان سے متصل تھا۔ بندر دروازہ بحری راستے سے آنے والوں کا استقبال کرتا تھا جس کے بالائی حصے پر واقع نوبت خانے میں پنج نوبت بجتی رہتی تھی۔ پنویل دروازہ اور دکن دروازہ (جسے گنیش دروازہ بھی کہتے تھے) ان مقامات کی گذرگاہوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ شہر پناہ کی تکمیلِ تعمیر ایک سنگی کتبے کی رو سے (جو اب نہ معلوم کہاں ہے) ۱۰۹۴ھ مطابق ۱۶۹۴ء میں ہوئی۔ دُرگاڑی قلعہ فصیل سے باہر تھا، جہاں ایک[2] مقبرہ اور عیدگاہ کا وجود اس قطعہ اراضی کو مسلم ملکیت کا ثبوت بنا ہوا تھا۔ یہیں ایک مختصر سی مسجد بھی تھی جو مسلمان محافظ دستے کی عبادت کے لئے وقف تھی (کیونکہ سپاہی اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے

---

[1] کارنامہ اور دیکھئے تاریخِ عالمگیر سرکار۔ ج ۵، ص: ۵۲، ۱۵۱۔

[2] تھانہ گزیٹیر۔ ج: ۱۴، قابلِ دید مقامات، ص ۱۱۸، اور فٹ نوٹ۔

تھے، سامنے فصیل کے اندر اور خندق کے اوپر نواب کا دیوان محل تھا جس کے پہلو میں ایک عالی شان حویلی بھی تھی جو نواب کی فرودگاہ تھی۔ اسی سے متصل ایک کشادہ ایوان یا بارہ دری تھا جہاں بیٹھ کر نواب حاجت مندوں کے مسائل کی عقدہ کشائی کرتا تھا۔ سطوت و ثروت کو حسنِ عبودیت سے آہنگ کرنے کے لئے خان نے اس کے جوار میں مسجد یا نگاہ تعمیر کرائی۔ ایک ایوانِ عام بھی تھا جس کے احاطے میں ترکی حمام اور ایک باغ تھا۔ اس کے درمیان ایک بام مسقف کے نیچے حوض اور ایک فوارہ تھا۔ برہا گاؤں میں نواب نے ایک قلعے کے علاوہ ایک عالیشان ایوان عام بھی تعمیر کرایا تھا جو عام تقریبات کے موقع پر استعمال ہوتا تھا۔ جب اُس کی چھپّن سالہ چہیتی بیگم کا انتقال ہو گیا تو معتبر خان نے اس کی یادگار میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا [اور آج جب کہ وقت و تاریخ کے جبروت نے تمام عمارتوں کو ملبوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب یہی مسمار مدفن رہ گیا ہے جو اپنے شکستہ وجود پر سسکیاں لیتا نظر آتا ہے] وہ شاہ جہاں نہیں تھا اور نہ کسی ملک کا تاجدار۔ اس کے وسائل شہنشاہ کے مقابلے میں بے حد حقیر تھے مگر تخیل اور حوصلے بلند تھے۔ حسن آفریں ذہن رکھتا تھا اور محبت بھرا دل۔ لاکھ روپوں کی لاگت سے تاج تو نہیں بنا سکا مگر تراشیدہ سِلوں کے سنگین سینوں میں محبت کے جذبات اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دیئے کہ آج بھی اس شکستہ مزار کو دیکھ کر محبت کی لازوال قدروں کا سنگین احساس اُبھر آتا ہے۔ یہ مغل طرز تعمیر کا نادر نمونہ نظر آتا ہے جس پر تاج محل کے محبت آفریں ماحول کا گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ مقبرہ باغ معتبر خان کے وسیع احاطے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جنوب میں ایک بڑے دروازے

---

۱ کارنامہ اور سرکار، ایضاً۔

سے گزرتے ہی مقبرے کے سارے خطوط کھنچ کر سامنے آجاتے تھے۔ ایک سبزہ پوش روش کا قطعہ، مستزاد کی طرح باب الداخلہ اور مقبرہ کو ملاتا تھا۔ مقبرے کے مغربی پہلو میں ایک مختصر سی عبادت گاہ بھی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک حوض اور ایک فوارہ تھا۔

باب الداخلہ پر مرمریں کتبے کی آیتِ کریمہ "اُدخُلی جنّتی" مادۂ تاریخ بنا ہے۔ گو یہ مقبرہ بیگم معتبر خان کی یادگار میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ لیکن اس نے بانیٔ مقبرہ کے نام سے شہرت پائی۔

معتبر خان کی شہرت اس کی جائداد و املاک کی طرح کوکن اور دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ خجستہ بنیاد اورنگ آباد میں محلہ فاضل پورہ میں "حویلیٔ معتبر خان" کئی محل سراؤں پر مشتمل تھی۔ ان میں دیوان خانہ، خلوت گاہ، حمّام اور شاگرد پیشہ کے علاوہ سواریوں کے لیئے آخور بھی تھا۔ صحن میں چوبی پاکھوں کے سائبانوں کے تلے حوض تھے۔ اسی طرح زیب و زینت کے لیئے کھپریل کے چھپّروں کے نیچے فوّارے نواب کے ولولوں اور اُمنگوں کی طرح اُچھلتے اُبلتے رہتے تھے[1]۔

نواب لاولد تھا۔ اپنے رشتہ داروں میں سے ایک عزیز کو اپنی تبنیت میں لے لیا تھا۔

---

[1] دیکھیئے تذکرۂ حضرت دیوان شاہ۔ ص: ۳۸۔ ۳۷

پندرھواں باب

صنادیدِ دکن

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآئِهَا ۔

(یہ چند بستیاں ہیں جن کے حالات ہم تم کو سناتے ہیں)

جب بہمنی بادشاہت کی بنیاد دکن میں پڑی تو اسلامی طرز و اسلوب کے جو معیاری معارم ہنونے تھے وہ دور — دلی میں رہ گئے۔ پہلے دلی میں دیکھے گئے پھر دولت آباد میں۔ اسی لئے بہمنی دور کی اولین تعمیرات میں مسلم تہذیب اور اس کی دینی نفاست کی پرچھائیاں دھندلی نظر آتی ہیں۔ اس کے برعکس کنگوروں اور برجیوں کی تراش و قامت پر مندروں کا تیکھا پن ابھر آیا ہے۔ بعض عمارتوں کی ساخت اور اقلیدسی زاویوں سے جہاں وسطی ایشیا کے فنی اسالیب کے اثرات کے خطوط ابھرتے ہیں۔ وہیں کنول کے تراشیدہ نقوش۔ قدیم ہندوستانی روایات کے نقش و نگار ابھارتے نظر آتے ہیں۔ سونولی (تعلقہ بھمبڑی) کے گو پڑیاں اور روانسدی کے گنج شہیداں یا شہید واڑہ کی قبروں کے بالین اور پائینتی پتھروں کے کٹاؤ۔ کنول کی تراش اور زنجیر سے آویزاں فروزاں شمعوں کے نقوش سے ہندوستانی کلا اور مسلم تمدن کے باہمی امتزاج کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

فنِ معماری نے عادلشاہی دور میں اپنی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔ دکن کے فنِ تعمیر پر ایرانی تہذیب و مدنیت نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ گو اس دور کی تعمیرات کی اپنی انفرادی حیثیت تھی پھر بھی خارجی اثرات کا پرتو جھلکتا ضرور ہے۔ عادل شاہی دور کی تعمیرات میں اسی لئے وہ ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ جو مختلف جگہوں کے فنی اسالیب کے تال میل کا

نتیجہ تھی ۔ پھر بھی یہ ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہیں کہ ہم کسی قدرِ مشترک کی نبض پر انگلی نہیں دھر سکتے ۔ ۱

سولہویں صدی کا سورج جب عین سر پر تھا تو شمالی ہندوستان میں مغل شہنشاہیت بامِ عروج پر تھی ۔ جس کی پرنور پرچھائیاں سارے دکن پر پڑ رہی تھیں ۔ جہاں اس وقت قطب شاہی ، عادلخانی اور نظام الملکی بادشاہتیں اپنی شان و شوکت کا بھرم برقرار رکھنے کی جدوجہد کر رہی تھیں ۔ ثقافت اور مدنیت کی کثرت نمائیاں سارے ملک کی وحدت بن چکی تھیں ۔ فنونِ لطیفہ اور ہندو مسلم ثقافت کا ہر لطیف پہلو کہیں اکبر بادشاہ ، ابراہیم عادلشاہ اور محمد قلی قطب شاہ کی عظیم شخصیتوں میں جلوہ گر ہوا ۔ اور کہیں فیضی ، عرفی نظیری اور ظہوری کی شاعری کی روح بن کر زندہ رہا ۔ کہیں مرمریں ستونوں اور فنِ معماری کے زاویوں میں ڈھل گیا ۔ اور کہیں ابراہیم روضہ کا لازوال حسن بن گیا ۔ کبھی بول گنبد بن کر عظمت معماری کا بول بالا کیا اور کہیں آگرہ کا قلعہ بن کر جبروت ، شائستہ قوت اور استقلال کا مظہر بن گیا ۔ اقتصادی ترقیوں نے ہندوستانی سماج کی نئی عمارت کو نئے اقدار اور جاندار روایات کی بنیادوں پر کھڑا کر دیا تھا جس کے رد و کار اور زاویوں سے ہندو مسلم ثقافت کے امتزاج اور ہم آہنگی کی نقاشیاں نظر آتی ہیں ۔ زرعی معیشت نے اقتصادی نظام کو زمین کی طرح زرخیز بنا دیا تھا ۔ محنت و عمل کو وسعت و استقامت میسر ہوئی تو فکر و فن نے نمود کیلئے سنگ و خشت کا سہارا لے لیا ۔ بلند حوصلوں نے قلعوں میں پناہیں ڈھونڈیں اور شائستہ مزاجی اور ذوقِ سلیم نے مرمریں محلات میں انگڑائیاں لیں ۔ دینی آگہی اور عرفانِ حقیقت نے مقبروں میں اپنے آپ کو

---

۱ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنِ تعمیر پروفیسر محمد مجیب معارف : ستمبر ۱۹۶۳ء

مستور کر لیا۔ عہد سلاطین کی یادگاروں کا شمار نہیں۔ چیتوپل اور کلیان کے محلات ملبے تلے ڈھیر ہیں۔ اور مسمار درگاہیں جو احترام اور عقیدت کی علامتیں تھیں بے سہاروں اور بے روزگاروں کی چھاونیاں بن گئیں اور بھولے بھٹکے سیاحوں کیلئے شب گذاری کی اقامت گاہیں۔ وسطی ایشیا کے مدنی و سماجی علوم نے شہری تصورات کو اتنا فروغ دے دیا تھا کہ اس کی وسعتیں دلی سے لے کر دکن تک کو محیط کئے ہوئی تھیں۔ پرانی بستیوں کے کھنڈروں پر نئی آبادیاں تعمیر کی جانے لگیں۔ ملک عنبر اور معتبر خان نے اس سلسلے میں عملی اقدام کئے تھے سلاطین دکن کے عہد میں (دکن) کے ایسے کتنے ہی شہر اور قصبے تھے جن کی عظمت رفتہ کی جھلکیاں آج بھی تاریخ کے دھندلکوں سے نمایاں ہیں۔

کلیان

معتبر خان کی تعمیرات اور اقتصادی ترقیوں نے کلیان کو ایک مرتبہ اور قرون وسطی کے مسلم متمدن شہروں میں شامل کر دیا۔ اسے پھر وہی مرتبہ مل گیا جو عہد ماضی میں نظام الملکی اور عادلشاہی حکومتوں کے زیر سایہ حاصل تھا۔ بہمنیوں نے تھانہ اور کلیان کی طرف کبھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ یہاں بھی چیول، تھانہ، بانکوٹ، مہائم، بسین اور سوپارہ کی طرح نوائطیوں کی بستی عہد قدیم سے اپنا ناطہ جوڑے ہوئے تھی۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے۔ عمارتی لکڑیوں کی تجارت میں یہ اپنی ساکھ کے ستون گاڑ چکے تھے۔ اور نمک کے بیوپار نے ان کی معاشی زندگی میں ملاحت بھر دی تھی۔ قدیم خاندانوں میں قاضی، پھیری اور ٹٹوالہ کے خطیب۔ اور سید تھے۔ اور غالباً کلیان کی قدیم مسجدوں کے بانی کھرکھندی اور چوگھور بھی عرصۂ دراز سے آباد تھے۔ تانتلی اور تھانول قبیلوں کے وجود کا ثبوت اسناد سے ملتا ہے۔ چودھریوں میں علی جی اور میاں جی کے دو گھرانے تھے۔ جو بھٹالہ تالاب

۱؎ ڈاکٹر جون فریئر ص ۱۸۹

کے کنارے محلۂ چودھریان (چودھری پاڑہ) میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے تالکوکن نظام الملکی کی سرپرستی کی سرد نشیمنکھی ان کے گھرانوں میں تھی اور باہمی قرابت کے علاوہ یہ گھرانے بھیونڈی کے خاندان سادات اور غالباً معتبر خان کے بھی عزیز داروں میں سے تھے

نوائطی تاجروں کے مکانات پختہ اور نہایت عالیشان ہوتے تھے تراشدہ سلوں کے اونچے چبوتروں پر منقش چوبی ستونوں پر یک منزلہ عمارتیں ہوتی تھیں۔ بلند چھتیں چوبی تختوں سے مسقف ہوتی تھیں۔ ان پر اندر دیواروں کی روکاروں پر شنی اور نیل کے رنگوں سے نقش ونگار بنے ہوئے ہوتے تھے۔ نوائطوں کی ہندو بستی میں کوکن اور گجرات کے برہمنوں کی صاف ستھری واڑیاں تھیں۔ کاشتکار بھوؤں یک منزلہ اور بعض دو منزلہ عمارتیں عموماً جھکی ہوئی چھتوں کے سبب اندر سے نیم تاریک دکھائی دیتی تھیں۔ گھوڑسے گھرانے کے لقب والے جوشی بھٹ مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ مالگنڈ کا برہمن کُم وِدیا کا پرچار کرتا تھا۔ ان کی واڑیاں محلۂ حمالاں میں تھیں۔ یہاں ہاتھی گھوڑوں کے اصطبل بھی تھے۔ پورنگاؤنکر، کلیان کے ساہوکار بھی تھے۔ اور وید شاستر کے پنڈت بھی۔ اور بھانہ کا لوکر خاندان۔ پیشوا کے عہد میں صوبیداری کے عہدے سے سرفراز ہوا تو اس کا بول بالا ہوا۔ کوکن کے دلوی فوجی زندگی چھوڑ کر چودھریوں کے متصدی اور کارکن بن گئے تھے۔ بھڈکے اور گپتے پربھو اور چوبل گھرانے کلیان میں عرصۂ دراز سے آباد تھے[2]۔ تنگ گلیوں میں دیش وانیوں اور خوجوں کو دکانیں تھیں اور۔ ناریل کی باڑیوں کے مالک پارسی قبیلے میخانوں میں شراب

---

[1] دیکھیے راقم کی تصنیف۔ تذکرہ حضرت دیوان شاہ مع خاندان سادات

[2] : چنتامن وِجناتھ بھڑے: شہر کلیان۔ ترنگ۔ مارچ ۱۹۶۲ء۔ شمارہ ۲ (مراٹھی)

آتشیں اور آتشکدوں میں مذہبی عقیدت کی آگ سلگائے رکھتے تھے

عہد نظام الملکی میں کلیان طرف بنا دیا گیا تھا۔ اس کا صدر مقام جیئوں تھا۔ اسی عہد کی یادگار شالا تالاب ہے جس کا ظرف ۲۴۰ ایکڑ زمین کو محیط کئے ہوئے تھا اور یہ ۱۲۳۳ فٹ طویل اور ۵۰۰ فٹ عریض تھا۔ پختہ چہار دیواری کے بوجھل پپوٹوں کے اردگرد تراشیدہ سلوں کی سیڑھیاں اس خوبصورت "چشم آب" کی گویا پلکیں تھیں یہاں لوگ اس کے ایک باب الداخلہ پر کندہ اس آیۂ کریمہ کے مطابق جو مادۂ تاریخ بنا ہوا ہے۔ فان کنتم جنبا فطہروا (۹۹۸ھ / ۱۵۹۲ء)۔ اپنے گناہوں کو پاک صاف کرتے تھے کلیان لیکن سیاست کی آلودگیوں سے ملوث ہی رہا۔ برہان نظام شاہ اور پرتگیزوں کے مابین جب ایک سیاسی موڑ پر نفاق و نفرت کی گندی خلیج حائل ہو گئی تو "خیر و برکت کا شہر" (کلیانا) ۱۵۳۵ء میں فرنگی استبداد کے ادبار میں گھر گیا۔ اسی سال مغلوں کے انخلا کے بعد بسین میں پرتگیزیوں نے تعمیر قلعہ کے اپنے دیرینہ خواب کو سنگ سرخ میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے سنگین قلعوں کا طویل سلسلہ بھیونڈی میں کاموری ندی کے کنارے کانبے سے لے کر انجور تک نظام شاہی سرحدوں کو جکڑنے لگا۔ کانبے (فرنگی نام: جونان پتا) گوہ رپائے (پانچ گاؤں)، نو گھر، کرباڈ اور فرنگ پاڑہ (نام سے نسل ظاہر ہے) نو آبادیاتی نظام کے محاذ بن گئے۔ پھر سو برس بعد ہندوستانیوں کے خون سے رنگین۔ یہ سنگین قلعے سر ہونے لگے۔

دو سو برس بوڑھی نظام الملکی بادشاہت کو سو سالہ جوان مغل شہنشاہیت نے توسیع پسندی کا نوالہ بنایا اور جب گلے سے نہیں اترا تو ۱۶۳۶ء میں نظام الملکی ملک کو عادل شاہی حکومت کے گلے باندھ دیا۔ معاہدے کی رو سے گلے پڑے کا سودا تھا۔ گلے

لگانا ہی پڑا اور اس کا انتظام کلیان کے فوجدار کے گلے باندھ دیا گیا۔ عادلشاہی عہد کی یادگار سنگ سیاہ سے بنی ہوئی کالی مسجد ہے جو اپنی متانت اور سادگی کے سبب سوادِ کوکن میں سویدائے شیعیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ دائیں ہاتھ کی دیوار پر نقش و طراز کے طغرے میں "اللہ، محمدؐ، علیؓ" کے اسماء کھدے ہوئے ہیں۔ ان کی علامتیں۔ تین محرابیں ہیں۔ اور پانچ طاقچے تشیع کے عقیدے کے مطابق پنجتن پاک کے ناموں کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس کا سنگین کتبہ (جو اب ناپید ہو چکا ہے) " سعید ابد بر دگوی سخا ہ" (۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) غالباً کسی عادلشاہی شیعہ امیر "سعید" کی سعادت دینی کی شہادت دیتا ہے۔ شنالا تالاب کے مغربی گوشے میں اس سیہ پوش "کالی مسجد" اور مندروں کے مابین قد آدم سرنگ پھیلی ہوئی تھی جس کے ذریعے شنالا تال سے چار حوضوں (اساس) میں آب رسانی کی جاتی تھی۔ (مسجد کے متصل ایک یوگی سہاجانند کی سمادھی تھی[۱]۔)

پانچ قدیم مسجدیں تھیں جو شنالا تالاب کے راستے پر۔ ڈاونگے اور پوزالے تالابوں کے کنارے، آدھارواڑے کے قریب اور قلعہ کے اندر واقع تھیں۔ (اور ۱۸۸۲ء تک انکے کھنڈر رہ گئے تھے[۲]) آدھارواڑے کے بیرونی گورستان اور پرانے خاندانوں (جیسے حمو خور) سے منسوب قبرستانوں کے علاوہ الہاس کے کنارے کنارے کئی شہر خموشاں آباد تھے۔ ایسا ہی ایک شہر غریباں سونولی کی غالب مسلم بستی کی ویرانیوں کو اور زیادہ غم انگیز بنا رہا تھا۔

۱؎ مقالہ گزیٹیر ۲ء۔ قالبدید مقالات۔ ص۱۱۱ اور ص۲ ز ۲ٹ

سونولی (سونولہ)

الہاس کی زرخیز وادی میں واقع سونولی کے قدیم کھنڈر بتلاتے ہیں کہ یہاں بدھ یگ سے لے کر گیارہویں صدی تک ہندوراج اور سنسکرتی کا ڈیرا لگا ہوا جو اسی صدی کے آخری موڑ پر مسلم تسلط کے سبب لٹ چکا تھا۔ اس لٹے ہوئے کاروانِ تہذیب کی کئی یادگاریں ایک صدی قبل تک سونولی کے ویرانوں میں بکھری پڑی تھیں۔ جنوب مغربی سمت میں بارہویں صدی تک کوئی بستی آباد تھی جس میں داخل ہونے کے لئے ایک مہان سنگین دروازہ تھا جس پر ایک عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جو مگدر لئے اپنی پرمپرا کی پاسبانی کرتی نظر آتی تھی۔ سوناؤلی پاڑہ میں ایک جوم کے پائینتی وشنو کی شکستہ مورتی اپنی شکتی کھو جانے پر کھوئی کھوئی نظر آتی تھی سنگین چبوتروں اور قبروں کی تعویذوں کے بھاری بھرکم کٹاؤ پتھر۔ اور دو فٹ اونچے مدور سنگھاسے بالیں تبلاتے ہیں کہ یہ کبھی کسی مہان مندر کو سنوارے اور سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ مندر گہرے سبز اور بادامی پتھروں کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ جسے دینِ اسلام کے روبرو سجدہ ریز ہونا پڑا ایک مسجد کی بڑی بڑی اینٹوں اور کٹاؤ سلوں سے ان کے پرانے دھرم کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی مسجد کے مشرق میں اور ایک تالاب کی مغربی سمت میں ان گنت قبروں کی قطاریں "جنگ و ملت" کی صف آرائی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان مدفنوں کے سنگھاسے بالیں پر کوکن کی

ص۱ تھانہ گزیٹیر ج۱۴۔ قابلِ دید مقامات۔ ص۱۴۳ اور رنگ نوٹ

ص۲ جمو غور ڈونگری بھی مشہور تھی۔

ص۳ حوالہ کیلئے دیکھئے تھانہ گزیٹیر۔ ایضاً۔ ص۳۱۳

قبروں کی روایت کے مطابق کنول کے پھول دونوں طرف کھدے ہوئے تھے اور درمیان میں زنجیر سے آویزاں شمع فروزاں کے نقوش سے کفر کا دھندلایا ہوا چہرہ نظر آتا تھا۔ سونولی پاڑہ میں سمت ۱۴۰۷ مطابق ۱۳۵۱ عیسوی کے ایک شلپ شاسن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم تسلط کے اکسٹھ سال بعد بھی مقامی مطیع راجاؤں کو دھرمارتھ کرنے اور انعام میں اراضی دینے کا حق بدستور سابق حاصل تھا۔ سونولی کو عہد مغلیہ میں پرگنہ اسلام آباد میں ٹپہ کی حیثیت حاصل تھی جس کی عملداری کوار ترزگ تک تھی۔ اسی ٹپے میں بھیمڑی کے خاندان سادات کی انعامی زمینیں[۱] واقع تھیں۔ سونولی اور بھیمڑی کی قدیم گذرگاہ پہ۔ موخر الذکر قصبہ کے گرد و نواح ندی کاموری کے کنارے کاروٹی تک آموں کے گھنے جھنڈوں میں گنجہائے شہیداں کے ہزاروں مرقد دنیاو عقبیٰ کے سفر کے نشانِ راہ بنے پڑے تھے ۔۔۔!!

بھیونڈی (بھیمڑی۔ اسلام آباد)

جو وقت اور تاریخ کے طویل سفر کا ایک بعید نمایاں نشانِ راہ تھا۔ بیونڈی کو اگر بطلیموس کی بنڈاندی کا مشتق تسلیم کر لیا جائے تو بھی قصبہ اس کے تخیل میں آباد تھا۔ بھیم واڑی اور بمستان اگر بعب دیویا بھیم دیو سے منسوب سمجھ لیا جائے تو یہ صرف اس کے اتہاس کے ناٹک کے ایک اہم کلاکار کی طرف اشارہ ہے۔ فرانسیسی سیاح پڑے ورنئے بونڈی لکھتا ہے۔ یہی فارسی میں اضافے کے ساتھ کہیں کہیں بہونڈی بن گیا۔ شاہ عالم کا اطالوی حکیم اور سیاح منوچی جو خود بھیونڈی میں

---

[۱] تذکرہ حضرت دیوان شاہ مع خاندان سادات ۔ ص ۵۳

چند دنوں مقیم رہا۔ پرتگیز مورخین کی تقلید میں بیونڈی لکھتا ہے۔ ۱۷۵۰ء کے ایک جرمن جغرافیہ میں بھیمڑی۔ بمبری اور بھیونڈی کے تلفظ ملتے ہیں۔ یہی آخری تلفظ انگریزی اور مرہٹی میں رائج رہا اور فارسی (اردو) میں بھیمڑی عرف اسلام آباد مقبول رہا۔

اور جب سے یہ اسلام آباد بنا یہاں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے۔ یہی باعث تھا کہ دور دور سے مبلغین اور صوفیائے کرام آکر اس بستی میں آباد ہونے لگے۔ جب اس مسلم قصبے نے درویشوں اور دریوزہ گروں کی بے سہارا زندگیوں کو تکیہ دیا تو ان کے کئی تکیے یہاں قائم ہو گئے۔ جن میں تکیۂ باواحسین کو امتیازی اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔" اس تکیہ گاہِ نعیم " کو حکومت عادلشاہی کے ایک دیوان شاہ حسین قادری عرف دیوان شاہ بابا نے خود اپنے سلسلۂ قادریہ اور دیگر سلسلوں کے فقراء کی اقامت کیلئے قائم کیا تھا۔ درگاہ دیوان شاہ کی اوقافی آمدنی سے تکیہ جنگی شاہ کے " شب چراغ " کیلئے مالی مدد[1] ملتی تھی۔ یہ تکیہ شہر سے باہر سونولی بھیمڑی کے راستے پر واقع تھا۔ نذر و نیاز درگاہ کا ایک حصہ اسی طرح سلسلہ مداریہ سے منسوب " چھلہ مدار " کیلئے وقف تھا[2]۔ درگاہ کی تعمیر دیوان شاہ بابا کے نواسے سید قطب الدین محمد (۱۰۴۱ھ - ۱۶۵۰ء) نے بارہ برس میں کثیر خرچ سے تعمیر کرائی تھی[3]۔ اس کی بناوٹ پر عادلشاہی طرزِ تعمیر کا عکس پڑا ہوا ہے۔ احاطۂ درگاہ میں دیوان شاہ بابا کے خاندان

ص۱ دیکھئے تذکرۂ حضرت دیوان شاہ مع خاندان سادات۔ ڈاکٹر مومن محی الدین۔

ص۲ ۔ ایضاً ص۲ ص۶۴

ص۳ تفصیل کیلئے دیکھئے۔ ایضاً صفحہ ۲۶-۲۹ ص۶۰

سادات کا موروثی قبرستان تھا۔ درگاہ کے عقب میں سنگین و بلند فصیل کے نیچے زینہ دار تالاب لنصر اللہ ملکو پرے لے رہا تھا۔ جس میں آموں کے پیڑ جھانک جھانک کر اپنا دیدار دیکھتے رہتے تھے۔ ابتدائے کی آبپاشی اسی تالاب کے پانی سے رہٹ کی مدد سے اور پختہ قناتوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ احاطہ میں درگاہ کی تعمیر سے قبل باباصاحب کی بنائی ہوئی ایک عبادت گاہ بھی تھی۔ (جو غالباً موجودہ مسجد کی جگہ پر ہوگی جو اب درگاہ سے ملحق ہے) قصبہ کی قدیم ترین مسجدیں جن میں سے بعض مذکورہ بالا مسجد اور مسجد قلوریہ کی طرح عادلشاہی عہد کی یادگار تھیں۔ زیادہ تر بھونالہ تالاب کے ارد گرد واقع تھیں۔ مسلم آبادی کا مرکز بھی یہی حصہ تھا۔ شکر شاہ کی مسجد اور مدرسہ کی عمارتیں معمولی طرز کی تھیں جن سے عہد نظام الملکی کے فن معماری کی سادگی و پرکاری کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ (یہی عمارتیں قصبہ کی سب سے قدیم تھیں) ان کے سامنے ہی مسجد ناصر الدین اپنی بانی کی بندگی کی شہادت دے رہی تھی۔ قصبہ کے قریب امین الدین پور (کی نامعلوم بستی) میں مسجد عبداللہ بھی مسجد ناصر الدین کی طرح تاریخی حیثیت کی حامل تھی۔ کیونکہ ان دونوں مساجد کی "خدمات امامت و صرف روشنی" کے لئے حکومت وقت نے (پرگنہ گلشن آباد ناسک) میں زمینیں وقف کر رکھی تھیں۔ "خدامان مساجد" میں عموماً: امام، موذن و جاروب کش اور سقا شامل رہتے تھے۔ انہیں حکومت وقت سے آٹھ تنکے "یومیہ" ملتا تھا۔[1] خاندان سادات اور درگاہ کی اوقافی جائداد وغیرہ منقولہ کا طویل سلسلہ "چھلہ بدار" سے لے کر "محلہ سوداگران" "محلہ حمالان" اور "بازار خورد" (مارکیٹ روڈ) تک

۱؎ ایضاً صفحہ ۱۴۔ غالباً یہ تانبے کا "تنکۂ سیاہ" ہوگا جسے جیتل بھی کہتے تھے ۴۸ جیتل یا ۱۰۵ فلوس یا چیدام ہوتے تھے۔

پھیلا ہوا تھا۔ حضرت سید حسین قادری کا خاندان سادات نسلی و نسبی اعتبار سے قصبہ بھر میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا "شرع متین و دین مبین" سے عوام کو روشناس کرانے والا خانوادہ قاضیوں کا تھا[1] عہد مغلیہ میں خاندان سادات کے عالم و فاضل افراد کو بھی عہدہ قضات پر سرفراز کیا جاتا تھا ("بیلہ" گھرانے میں بھی عہدۂ قضات وارثتاً چلا آرہا تھا) مذہبی پیشوائی کا علمبردار، قصبہ کا خطیب خانوادہ تھا۔ عیدین کے موقعوں پر قاضی و خطیب کو جلوس کی شکل میں عیدگاہ تک لے جاتے تھے[2] محلہ ناخدایان میں مسلم ملاح (تانڈیل) بستے تھے۔ ناخواہ۔ نوائطی جہازراں قبیلے کا لقب تھا۔ نوائطی سوداگر (جن سے محلہ سوداگران منسوب تھا) عموماً دھان (چاول) لکڑے اور نمک کا بیوپار کرتے تھے۔ میٹ کر کے نام سے موروثی تجارت کی ملاحت عیاں ہے۔ نرویل[3] اور تھانول کے وجود کا ثبوت معاصر دستاویزات سے ملتا ہے۔ اسی طرح کہاری، نلگری، بھیگری، بوہرہ، بنسالے، سونے لہاسنے، واندرکھ، سابہ، سرورہ، دبا (دبہ) وغیرہ قبیلوں کا ذکر درگاہ دیوان شاہ سے متعلق عہد مغلیہ کے پروانجات وسجلات واسناد میں ملتا ہے[4] بعض گھرانوں کے

ص ۱۔ ہر مسلمان آبادی میں قاضی کا تقرر ضروری تسلیم کیا جاتا تھا۔ قلابہ ضلع کے ناگوٹھنہ اور چیول میں قاضیوں کے کنبے بعید قدیم تھے۔ یہ مخیر بھی تھے اور عالم دین بھی۔ ناگوٹھنہ کا پل چیول کے قاضی علاؤالدین نے ۱۰۲۹ھ میں تعمیر کرایا تھا۔

ص ۲۔ تموالہ کے خطیب اور کلیان کے جموغور بھیمڑی کے خطیب قبیلے کے قرابت دار تھے۔ اسی طرح بھیمڑی کے فقیہوں سے بھی خطیب قصبہ کی قریبی رشتہ داری تھی بحوالہ "وقف نامہ" یہ وقف الاولاد "وصیت نامہ" بھیمڑی کے مرحوم حاجی محمد صدیق فقیہہ صاحب نے لا کر دیا تھا۔ یہ ان کی خاندانی دستاویز ہے۔

ص ۳۔ بحوالہ "الزاد" مورخہ ۱۰۵۹ھ فقہ شافعی پر ایک عربی تصنیف مخطوطہ مملوکہ مولوی حامد فقیہہ صاحب بھیمڑی۔

ص ۴۔ دیکھیے تذکرہ۔ جابجا۔ بھیمڑی کے قدیم ہندو خاندانوں میں تین برہمنوں کے نام ملتے ہیں۔ بھیکل، بہانت اور جوشی۔ انھوں نے باہمی اشتراک سے بیرون قصبہ ایک سنگین زینہ دار گھاٹ اور تالاب تعمیر کرایا تھا جیسا کہ سنگی کتبے سے پتہ چلتا ہے۔ یہ پیشواؤں کا زمانہ تھا۔ دیکھیے تھانہ گزیٹیر ص ۱۴ قابل دید مقامات۔ بھیمڑی کلا بیان۔

القاب اصل سکونت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً میرکیہ (کاشی میرا۔ گھوڑبندر کے تھے۔) اس طرح غالباً گوریکر اور کھالکر وغیرہ تھے۔ بھیمڑی کی قدیم صنعت پارچہ بانی کے بارے میں کوئی معاصر دستاویزی ثبوت گو ابھی تک ملا نہیں ہے لیکن وانمج بخروں (وانمدرکر۔ گوریکر اور مقری) کے وجود سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صنعت کے تانے بانے بھیمڑی لاسے لے کر بسین، برنج اور تھانہ تک) پھیلے ہوئے تھے [1] خاندان سادات کے ملوکہ بلغوریخانوں میں دھان کوٹ کر صاف کیا جاتا تھا [2] پٹیل اور کھوت بندوبست اراضی سے تعلق رکھتے تھے۔ بھیمڑی بندر سے جزائر بمبئی، بلسار کھمبایت اور بھاؤ نگر نمک روغن تل، (خراسانی) نمک، سوکھی مچھلی (بومبل) اور (کسارا۔ کھرڈی، اٹگاؤں اور واسند کے جنگلوں سے) شہتیر کی تجارت [3] ہوتی تھی۔ اس دیندار قصبہ پر ہمیشہ علم و فضل کی برکتیں نازل ہوتی رہی ہیں اور یہاں اوامر و نواہی کا سدا چرچا رہتا تھا۔ اس کی دینی مرکزیت کا یہ عالم تھا کہ عرصۂ دراز تک (خصوصاً شافعی جماعت میں) بوقت نکاح مہر باندھتے وقت "چالیس تولہ سونا بوزن اسلام آباد بھیمڑی" بولا جاتا تھا۔ مہر معجل و موجل، باندھنے کا یہ طریقہ خطۂ کوکن کے علاوہ گلشن آباد (ناسک) تک رائج تھا۔ بھیونڈی کو باب الملکہ کی حیثیت بھی حاصل تھی کیونکہ خاندیس اور دکن سے عازمین حج بھیمڑی ہو کر ہی بندر مبارک سورت جاتے تھے۔

<u>جلوۂ نیر نگھائی بمبئی</u>: جب رات کے اطلسی اندھیارے کی چلمن سرکنے

---

[1]۔ دیکھئے اسی کتاب کا صفحہ   [2] تذکرۂ حضرت دیوان شاہ۔ صفحہ

[3]۔ گزیٹیر ضلع تھانہ۔

لگتی تو بھیڑی کے زائرین اور مسافرینِ الھاس کی مٹیالی لہروں پر رنگتی ہوئی
بادبانی کشتیوں پر سوار کجلائی ہوئی صبح کے دھندلکوں کے دریچے سے دیکھتے تو گہرے
نیلے ساگر کے اس پار بمبئی کے جزیرے ان کی نظروں کے سامنے اپنے شاداب حسن
اور تازگیٔ جمال کے اسرار کھولنے لگتے۔ کھاڑیوں اور خلیجوں کی روپہلی لکیریں فلسفہ کے
مسائل کی طرح پیچیدہ دکھائی دیتیں اور بیکراں سمندر لامتناہیوں کی مہین اور تابناک
دھند میں گم ہوتا ہوا نظر آنے لگتا۔ ان کے دھندلے دودھیا کناروں پر زمردیں پہاڑیوں
کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ نیچے چمکیلا نیلا سمندر اور اوپر دھوپ سے تمتایا ہوا اور
تپتے ہوئے اجالے سے منور نیلا آسمان مصورِ قدرت کے اس دلآویز شاہکار
کی تکمیل کرتے تھے۔ اونچے ستونوں کے سروں کے اوپر سے اور پیڑوں کی گہری سبز
چلمن کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی سفید عمارتیں، جوان اور شرمیلی سفید پوش
راہباؤں کی طرح نظر آتی تھیں۔ یہ حسین اور خواب انگیز جزیرہ، میڈیٹرینین کے
رومان پرور "کیپری آئلینڈ" سے زیادہ دلکش نظر آنے لگا تھا۔ دلفریب جزیروں
اور ٹاپوؤں کی جھرمٹ میں کسی کے سہاگ کی یہ نشانی، اب عروس البلاد بنتی جا رہی
تھی۔ محنت کے ہاتھ جس کی مشاطگی کر رہے تھے اور جس کے نظر افروز پیکر پر معلوم
فنکار رنگ و خشت کے زاویے اور دائرے بنا کر اس کے حسین جسم کے سارے
خطوط واضح کر رہے تھے۔ اور خد و خال ابھار رہے تھے۔ ماتھے پر روشنیوں کی
تابناک افشاں بکھر رہی تھی اور بل کھاتی ہوئی راہوں کی زلفیں دراز ہونے لگی تھیں
جن پر پالکیوں میں سوار "بتانِ آذری اور دلبرانِ شام و ایران" پریوں کی طرح

ط۲ "بمبئی اور گرد" (انگریزی) صفحہ ۲۴ P. XI

اڑتی پھرتی تھیں۔ فتنہ ساماں فرنگی حسینائیں (ریلاسس سے بریتج کینیڈی تک) ڈانس کیلئے جاتی تھیں۔ پانٹن اور بگھیوں پر سوار پریل تک سیر کے لئے نکلتی تھیں (بریتج کینیڈی سے فورٹ تک بیل گاڑیاں چلتی تھیں) "آشوبگاہ بمبئی" میں "خوبان نزدوششی" کا ایسا ہنگامہ اور "دلبرانِ شوخ و بے پروا" کا ایسا ہجوم رہتا تھا کہ "گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را"[2] کا نظارہ درمیان میں رہتا تھا (گورنر پالکیوں میں نکلتے تو روپے نثار کرتے تھے)[3] اور مہر و وفا کے سوداگر "متاعِ کہنہ دو" "نثار بمبئی" پر آمادہ نظر آتے تھے۔ "گرمیِ بازارِ بمبئی" دیکھ کر بڑی بڑی عظیم ہستیاں "نرگسِ مست" کی خاطر رسوائیاں مول لینے کیلئے آتی تھیں۔ (گو یہ رسوا تو کم ہوئیں مگر افواہیں ضرور بن گئیں) اس جزیرے میں لوگ قسمت آزمانے کیلئے دور دور سے آتے تھے۔ یہیں سیوہ قلعہ کے نیچے ناگ پھنی سے گھری ہوئی ایک فوجی چوکی کے کونے میں ایک جادوگرنی برسوں لوگوں کی قسمتوں کا حال بتاتی رہی[4] اور بندر مہائم کے ایک گوشہ میں واقع عہدِ مظفر شاہی کی یادگار درگاہ میں عقیدتمندوں کو "حال" آجاتا تھا۔ جب قوال امیر خسرو کی کوئی غزل چھیڑتے تھے۔

بندر مہائم

یہاں خطۂ کوکن کے "قطب الاقطاب" اور عظیم عالمِ دین کی آخری آرام گاہ تھی۔

---

[1]۔ ایضاً۔ ص؂ [2] کلیاتِ شبلی (فارسی) [3]۔ بمبئی کے اردگرد۔ صفحہ ۱۳۸

[4] ایضاً۔ صفحہ ۱۴۲ "وحشت نمیرا ند سفالیان" سے قلم اٹھا کر شبلی کے قلم نے سوادِ بمبئی میں بڑی جولانیاں دکھلائی ہیں۔ اردو کے شاعر صفی نے بھی بمبئی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔

بمبئی ہندوستاں کا صدر دروازہ ہے تو ؎ بلکہ رخسارِ عروسِ ہند کا غازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو ؎ ایک نگار رنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو

شیخ علی المہائمی کی معاصر عمارت پر برسوں بعد عہد فلیہ میں کسی مخیر عقیدتمند نے عالیشان گنبد ۸۰۵۱ھ میں بنوایا تھا۔ اسی نے روضہ کی توسیع اور مرمت بھی کروائی تھی۔ ایک ایوان اور چار گوشہ گنبدوں کا اضافہ کسی دوسرے امیر علی [خان] کی ہمت سے ہوا۔ جیسا کہ مادۂ تاریخ " زہمت علی منور شد " سے ہویدا ہوتا ہے[1]۔ نواح میں دیگر اعزا کی قبریں ہیں۔ اس روضہ کی تولیت اور سجادگی عہد قدیم سے بھیمڑی کے مشہور بزرگ دین دیوان شاہ بابا کے خاندان سادات میں وارثتاً چلی آرہی تھی۔ سلاطین احمد نگر اور بیجاپور سے بطور مدد معاش اور اخراجات "مولود و شب چراغ و عود و گل و اعراس" زمینیں[2] وقف تھیں۔

ارنالہ

ظہور اسلام کے بعد ہندوستان کے جس خطے میں سب سے پہلے کسی مینارۂ مسجد سے اذان گونجی وہ کوکن کا ساحلی علاقہ تھا۔ جہاں صیمور، سوپارہ اور سنجان کی قدیم

---

[1] درگاہ کے سامنے ایک باب الداخلہ ۱۳۰۳ھ ۱۹۵۰ء کا تعمیر کردہ ہے

[2] ۔ تذکرہ حضرت دیوان شاہ بھیمڑی کے خاندان سادات کے ایک فرد نواب سردار الحق خان بہادر دلیر جنگ دلیر ملک سی، آئی، ای، درگاہ مہائم کے موروثی متولی رہ چکے تھے۔ نواب کے بعد سید سردار علی ٹرسٹی مقرر ہوئے تو درگاہ سے متصل ایک مدرسہ مخدومی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس نام کا ایک مدرسہ آج قائم ہے۔ یادگار مخدومی ص۲۸۔ مہائم کا عرس نوابین کے عہد میں اتنے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا کہ اخبار وں میں تفصیلات شائع ہوتی تھیں۔ بمبئی کے گورنر لارڈ لیمنگٹن نے نواب نصر اللہ خان متولی درگاہ کی معیت میں ایک مرتبہ عرس کا معائنہ کیا تھا۔ جس کی رپورٹ مرزا حیرت کے مشہور اخبار کرزن گزٹ کے شمارہ ص۱۲ مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

بستیوں میں عرب نوآبادکاروں کی نوائطی اولاد اشاعت دین کے عہد سے پھل پھول رہی تھی۔ سنجان کے کھنڈروں میں ایک عربی کتبہ دریافت ہوا تھا جو قدیم ترین رسم خط "کوفی" میں تھا۔ اور جس میں "اللہ، ملک سلطان اور سلام" کے الفاظ سے اس خطہ میں مروجہ زبانوں۔ فارسی و عربی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سنجان سے قریب ارنالہ پر بھی مسلمانوں کا اقتدار برسوں تک رہ چکا تھا۔ اقتدار کے اس مد و جزر میں تہذیب و ثقافت کے صدف زاروں سے نجانے کتنے موتی مرجان چمکتے ریگزاروں پر بکھیل گئے تھے وقت کے ریلے نے جنھیں ریت کے گھروندوں کی مثال بہا دیا اور ذرّوں کی طرح بے مول بنا دیا۔ ارنالہ میں مقامی راجہ کا بنایا ہوا پرانا قلعہ سندھودرگ یا سمندری قلعہ سلاطین گجرات کے امواج تسلط کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس جزیرہ قلعہ میں مسلم دور کی کئی یادگاریں آج کھنڈروں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ قلعہ کے مشرقی دروازے پر سنسکرت اور مرہٹی کتبے اپنے پراچین یگ کی یاد دلاتے ہیں۔ مسلمانوں کے فن تعمیر کا نمونہ اندلسی طرز کے گنبد اور محرابوں میں ملتا ہے۔ ایک ہشت گوشہ حوض کے علاوہ دو باؤلیاں بانجھ کی کوکھ کی طرح کھوکھلی اور سوکھی پڑی ہیں۔ یہاں شاہ علی اور حاجی علی کے مزارات ہیں جنھوں نے اس کولی علاقے میں تبلیغ دین کی تھی۔ ۱۶۶۴ء میں اس جزیرے پر مسقطی عربوں نے عارضی قبضہ کر لیا تھا۔

سانکشی قلعہ

اپنے بانی راجہ سانک کے نام اور دھام کو اپنی شرن میں چھپائے سہما ہوا کھڑا تھا۔ یہاں کبھی راج بھون تھا جس کے مسمار غلام گردشوں سے آج بھی قدرت کے حسین نظارے اس کے ارد گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ ٹیلے کی پیٹھ کے

پیچھے سے اس کا دشمن قلعہ کرناکہ اسے گھورتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے قد و
قامت کا اندازہ سانکشھی کو کوہستانی سلسلوں کی سرمئی چلمنوں سے اس وقت
تک بخوبی نہیں ہوا تھا جب تک کہ خود اسے دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرنا
نہیں پڑا تھا۔ اُتری پُوربی پہلو میں کھڑے مانک گڑھ کو بھی اس خونریز جنگ
کی خونچکاں داستان یاد تھی جو راجہ سانک اور کرناک کے مسلمان قلعدار کے درمیان
سانکشھی کے دامن میں پردھان محال کے میدانوں میں لڑی گئی تھی۔ راجہ سانک
کا سر کٹا تو قلعہ سر ہوا۔ اور اس کی غیرت کی ماری بیٹی وجرائی نے سر جھکانے یا سر چھپانے
کی بجائے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔ تاؤلی، نورہ نوری کے جوڑے
اور اس سے پرے ماتھیران اور پربل کی پڑوسی چوٹیوں کو سانکشھی کے سینے کی گہری
چوٹ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ سنسان وادی کے ارد گرد دبی چال سے چلتی ہوئی منگسی
ندی پہاڑی کے چرنوں سے لپٹ کر آٹھ مہینے سسکتی رہتی تھی۔ اور جب
گھٹاؤں کو بھی رونا آجاتا تو اس کی آہ و زاری بڑھ جاتی۔ دور پچھم سے سوگوار سمندر
کی کراہیں بھی سنائی دینے لگتی تھیں۔

سانکشھی کی سنسان وادی کا سسکتا ہوا سناٹا شاہ بدرالدین کے سالانہ عرس
کی گھما گھمی سے ٹوٹ جاتا تھا جب پوس (دسمبر، جنوری) کی سرمائی رات میں
چودھویں کی ٹھنڈی چاندنی کے ساتھ ہزاروں زائرین سارے میں پھیل جاتے۔
بدرالدین شاہ نے غازی شاہ اور دیگر حواریوں کے ہمرکاب اس جنگ میں حصہ
لیا تھا۔ اسی لئے اسے بدرالدین کا قلعہ بھی کہتے ہیں۔ مقامی باشندوں میں یہ
"در گا چہ کلاّ" کے نام سے مشہور ہے۔
کوکن کے مختلف قلعوں اور شہروں کے سلسلۂ داستان میں سانکشھی کی لبنی بھی

ایک ایسی کڑی ہے جس نے مختلف یگوں اور زمانوں کو باہم باندھ رکھا ہے۔ قلعہ کے دامن میں موجود بدرالدین شاہ کی درگاہ سے اس قلعہ پر مسلم تسلط کی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں سے قلعہ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے وہیں سے سانکشی کے اتہاس کے اس موڑ کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں کبھی پراچین ہندو بستی تھی۔ چڑھائی کا راستہ اس بستی سے مڑ کر گھسی پسی گول چٹانوں کی ناہموار سیڑھیوں سے خندق کے پشتوں تک جاتا ہے۔ قلعہ کے اندر تک چٹانوں میں تراشی ہوئی غلّے کی کھتیاں ملتی ہیں جو آج بھوکے کی پیٹ کی طرح خالی پڑی ہیں۔ ایک "چور طاق" بھی ہے۔ جہاں تہ خانے میں اناج کا پوشیدہ ذخیرہ رکھا جاتا تھا۔ پانی کے اخراج کے لئے بدررویں تھیں اور آب سانی اور ذخیرے کیلئے چٹانوں میں آٹھ حوض تراشے گئے تھے جو آج تک اپنے بانیوں کے ناموں کی آبرو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ وجرآئی نے جہاں آتم گھات کیا تھا وہیں اس کے نام کی باؤلی موجود ہے۔ جس کے سنگین طاقچے میں اس کی مورتی تراشی گئی تھی۔ یہ دیوی جگ ماتا بن گئی اور اس کی پوجا ہونے لگی۔ غازی شاہ کا مقبرہ اور اسی نام کا حوض مسلمانوں کے فتح و نصرت کی یادگاریں ہیں۔ اس حوض کی طرح دیگر حوضوں پر بھی چار ستونوں کے سہارے چھت ڈالی گئی تھی۔ گوداآنی حوض ایک اندرونی دیوار سے دو خانوں میں منقسم تھا۔ اور اس میں داخلہ کیلئے پاکھوں کے سہارے دروازہ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ان پاکھوں پر پیچ دقیق محرابیں تھیں اور باب الداخلہ کے اوپر چوکھٹ تھی۔

بدرالدین شاہ کی معمولی درگاہ اپنے ہیاوبنتی پتھروں کے سبب غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ روضہ مشرقی نواح میں آباد مسلم بستی کا محور تھا۔ مسلمان گھروں سے پرے ایک گمنام گنبد والا مقبرہ تھا جسے جنجیرہ کے کسی تاجر نے تعمیر کرایا تھا۔

چکنے سلوں سے سجے ہوئے اس روضہ کے دروازے کے ارد گرد خوشنما منبت کاری اور تراشیدہ نقش ونگاری کی گئی تھی۔ جنوبی دروازے پر عربی کتبہ کھدا ہوا تھا۔ اس کا اندرونی حصہ مثمن پہلوؤں والا تھا۔ ایک قدیم خشک حوض کے قریب بیہا دبتی پتھروں کے کھنڈروں میں جامع مسجد کے آثار بتلاتے ہیں کہ یہاں کبھی مسلمانوں کی جامع آبادی تھی۔ دوسوکھی باؤلیوں کے پاس دو پانی کے چشمے قدیم طریقۂ آب رسانی کے چشم دید گواہ بنے ہوئے تھے۔ قلعہ سے لے کر پہاڑی کے مشرقی دامن تک آبادی آدھ میل پھیلی ہوئی تھی۔ اور اب جس کے ویرانے میں کھنڈروں کے گنبدوں سے ہندو سنسکرتی اور مسلم تمدن کے جھلکیاں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔ جن پر جھاڑ جھنکاڑوں کی جھلملی پڑی ہوئی ہے۔ اور رسیلے آم کے پیڑوں کا گھنا سایہ ڈول رہا ہے۔ ان خرابوں میں قلعہ کے آگے سے لے کر پچھم میں پردھان محال تک اور دوسری جانب ہمرا پور (قدیم ہیرا ابا پور) تک بیشمار قبریں داغ ہائے دل کی طرح نمایاں ہیں۔ موت کی یہ چھاؤنیاں ان شہسواروں کی ہیں جو میدان جنگ میں گرے تھے۔

حبشان جزیرہ۔ جنجیرہ

مشرقی افریقہ اور حبش سے غلاموں کی تجارت کا ذکر پیری پلس "(سنہ ۶۲ء) کے مصنف نے کسی جذبۂ حیرت کے تحت نہیں کیا تھا جبکہ خود اس کے دیس کی یونانی کنیائیں جنگلی پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے ہاتھوں میں کمان سیدھی کئے راجہ کے انتھپور میں داسیوں اور پاتراؤں کے بھیس میں نظر آتی تھیں۔ (کالیداس کے "شکنتلا" ناٹک میں یونانی دوشیزاؤں کے حسن وجمال سے شبستانوں میں بڑی رونق نظر آتی ہے) ساتواہن راج کی راجدھانی اور بندرگاہ "شری استھانک"

میں سوفالہ (افریقہ) کے سِدّی غلاموں کی تجارت کوئی انوکھی بات نہ تھی کیونکہ کاتھکاری باشندوں کی سِدّی جاتی۔ حبش کے سدّیوں میں اپنے پرکھوں کی جھلک دیکھ لیتی تھی ص^۱۔ افاناسی نکی تن کے بردہ فروشی کے بیان سے البتہ اس کے جذبۂ برتری اور تحقیر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ خود اس کے وطن میں ایک نیا جاگیرداری سماجی نظام تشکیل کے دور سے گذر رہا تھا۔ (اس نے منگولوں کے "بیگار" کے متعلق ضرور سنا یا۔ پڑھا ہوگا جسے آج چل کر قرون وسطیٰ کے زرعی نظام میں غلامی کا جوا بنا لیا گیا تھا)

(مصر کے بازاروں) اور کوکن کی منڈیوں میں بے مول بکنے والے حبشی غلاموں نے جب اپنی ذہانت، وفاداری اور بہادری کا بول بالا کیا تو انھوں نے بہمنی حکمران طبقہ کے دلوں کو موہ لیا۔ دکھنی امراء سے تو انھوں نے پہلے پہل شادی بیاہ کے ذریعے وابستگی پیدا کرلی تھی۔ اور بعد میں جب ایک سیاسی محاذ پر آفاقیوں کے مدمقابل کھڑے ہوگئے تو شیفتگی اور بڑھ گئی۔ حوصلوں کو توانائی ملی تو اپنے ہم قوم اور ہم وطنوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کیا۔ اور اپنی الگ جماعت بنا ڈالی۔ تنظیم کو استوار اور مستحکم کرنے کی غرض سے حبشیوں نے آپس ہی میں شادیاں کرنے کو رواج دیا۔ اس طرح ان کی یگانگت قوم کی روایت بن گئی۔ جب احساس آفاقی کو توانائی حاصل ہوئی تو اپنی ہی قوم کے غلاموں کو دام و درم سے خرید کر بندۂ بے دام بنا لیا۔ اور جب بھی ضرورت محسوس کی اپنے وطن سے اپنے ہی لوگوں

ص۱ ابوالفداء (رائنوڈ) ج۔ ص۱۵۶

ص۲ بھارت۔ روس۔ باب ۱

کو پاس بلا کر کام بنا لیا۔ اس طرح سدیوں کی ایک "امیرانہ جمہوریہ" [1] کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور ان کی سیاسی قوتوں کی بیل منڈھے چڑھنے لگی۔ اور غوروان کے ہی محنت کش طبقہ کے مزدوروں، خدمتگاروں، غلاموں اور ملاحوں کی آبیاری سے ان کی سیاسی تنظیم کی نشوونما ہونے لگی۔ جب میدان جنگ میں قدم رکھتے تو فتح و نصرت ان کے قدم چومتی۔ اور جب سمندر پر چڑھائی کرتے تو ہمتوں کے بادبان کھولے، سرفروشی کے مستولوں کا سر اٹھائے اور حوصلوں کی پتوار سنبھالے اپنے سفینۂ مراد کو کامیابیوں سے ہمکنار کر دیتے تھے۔

جب پندرھویں صدی کی ڈھلتی رات میں وقت کے شہرزاد نے بہمنی بیدر کے الف لیلوی محل میں حبشیوں کی جہم بازی کی داستان شروع کی تو "سندباد جہازی" کی شخصیت سدی یاقوت کے روپ میں موج بن کر ابھری مگر جلد ہی بہمنی جاہ و جلال کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی [2] مگر اس کے ساتھ ہی موجوں کی زنجیروں نے کوکن کے ساحلوں کو جکڑنا شروع کر دیا۔ سدی یاقوت نام ہی کے ایک دوسرے جانباز نے ۱۴۹۰ء میں اپنے ہمراہیوں کی مدد سے ملک احمد بحری کے ڈانڈا۔ راجپوری کے طویل اکتا دینے والے محاصرے کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اس طرح گجراتی حکومت کی پچیس سرکاروں

---

[1] - اورسے "ہسٹاریکل فریگ منٹس" ص ۵۶ - ص ۵۰

زرشتہ (ترجمہ برگس) ج ۲ ۔ ص ۵۳۹ - ۵۴۳ - [2] ص ۲ سدی یاقوت - بہادر گیلانی کا امیر البحر تھا۔ یہ ۱۴۹۳ء میں قتل ہوا۔

ص ۲ -

(اضلاع) میں سے نکل کر ڈانڈا۔ راجپوری کی سرکار ملک احمد کی نئی بادشاہت[1] کی چوکھٹ بن گئی۔ اس نے اپنے غلام سدی یاقوت کو جب جزیرے کی آقائی عطا کی تو اس خوابوں کے جزیرے پر حبشیوں کی حکومت کے خواب بیدار ہونے لگے لیکن حبشی مہم بازوں کی آنکھ جلد ہی کھل گئی کیونکہ برہان نظام شاہ (۱۵۰۸-۵۳) نے یہ علاقہ اپنے پیر و مرشد شیعہ مبلغ شاہ طاہر الحسینی کی عملداری میں دے دیا تھا[2] ۱۵۳۰-۴۵ء کے دوران جب تھانہ کے بیشتر علاقوں پر پرتگیزوں نے اپنے تسلط کا لنگر ڈالا تو ڈانڈا۔ راجپوری کے ڈانڈے فرنگی مقبوضات کی سرحدوں سے مدتوں تک ملتے رہے۔ اور جب سترہویں صدی وقت کے پاتال میں ڈوب گئی تو ٹھیک اسی وقت مغل فتوحات کی باڑھ کوکن کے کناروں تک پہنچ چکی تھی۔ نظام شاہی کی شکستہ کشتی مغل استعماریت کے منجدھار میں پھنس کر ڈوبنے لگی تو ملک عنبر وزیر نے ناخدائی کا بیڑا اٹھا لیا۔ پھر بھی اٹھارہ سال تک ڈانڈا، راجپوری پر مغل اقتدار احمد نگر بادشاہت کی کمزور بنیادوں میں مسلسل رخنے پیدا کرتا رہا۔ ۱۶۱۲ء میں پہلا حبشی حاکم سدی سیرل خان مقرر ہوا اور

---

[1] میرات احمدی (ترجمہ۔ انگریزی۔ برڈ) ص۱۱۱ "حقیقت الصورت" (فارسی مخطوطہ) شیخ محمد فاضل۔ فصل دوازدہم۔ "در احوال ناظمان جزیرہ ڈانڈا۔ راجپوری۔ حبشان"

[2] شاہ طاہر بن شاہ رضی الدین الاسماعلی الحسینی الدکنی۔ کاشان (ایران) کی مدرسی سے ترقی کر کے احمد نگر میں برہان نظام شاہ کی مشیری تک پہنچا۔ اس کی تبلیغی جد و جہد نے سرکاری مذہب تسنّن کو تشیع میں بدل دیا۔ کئی تصنیفیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں فتح نامہ اور انشائی طاہر الحسینی مشہور ہیں۔ سالِ وفات ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء ہے۔ (فرشتہ۔ ترجمہ برگس۔ ج ۳۔ ص۲۲۳)

دو سال بعد حبشیوں کے بعید مقبول نام والے ایک تیسرے یاقوت کو زمردین کوہساروں اور نقرئی سمندروں سے گھرے ہوئے جنجیرہ کے رومان پرور جزیرے کی صوبیداری عطا ہوئی۔ لیکن سال بھر بعد ہی یاقوت کی قوت۔ نئے نظام الملکی حاکم سدی عنبر سانگ کے سامنے سرد پڑ گئی۔ سدی عنبر پندرہ برس تک نظام شاہی اقتدار کو کوکن کے ساحلوں پر ڈوبتا ہوا دیکھتا رہا اور جب مغل تسلط کا سیلاب امڈا تو بحریوں کی بادشاہت ہمیشہ کیلئے قعر فنا میں ڈوب گئی لیکن سدی عنبر کی بحری قوت اتنی تلاطم خیز بن چکی تھی کہ ناگوتھنہ سے بانکوٹ تک کے مغلوں کے قائم کردہ نئے نگہبان عادلشاہیوں نے حبشی امیر البحر کو اس علاقے کی پاسبانی سونپ دی تاکہ زائرین کعبہ کی حفاظت اور عادلشاہی تجارت کی محافظت ہوتی رہے [۱]۔ جبشان جزیرے کا امیر البحر عادلشاہی حکومت کی وزارت بحریہ کا وزیر تسلیم کیا جانے لگا۔ اور یہ عہدہ حبشیوں کی امیرانہ جمہوریہ کے قانون کے مطابق غیر موروثی قرار دیا گیا۔ اور بحریہ کا پہلا اعلیٰ عہدہ دار وزیر کا جانشین تسلیم کیا جانے لگا۔ سدی عنبر کی موت (سنہ ۱۶۴۲ء) کے بعد سدی یوسف کو وزارت ملی۔ اور تیرا سال بعد جب اس کا کاروان حیات لٹ گیا تو فتح خان کے نصیب کو تخیابی نصیب ہوئی۔ اور اس کے زمانۂ وزارت میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی قوت برسوں جنجیرہ قلعہ کی سنگین دیواروں [۲] سے سر ٹکراتی رہی۔ قلعۂ جنجیرہ کے مد مقابل کھوکری گاؤں میں جبشان کے حکمرانوں

---

[۱] جزویں۔ کوکن صفحہ ۹۔ گرانٹ ڈف "مرہٹوں کی تاریخ" صفحہ ۹۳

[۲] گرانٹ ڈف۔ ایضاً۔ خافی خان (ایلیٹ) ج۔ صفحہ ۲۸۹

تین سنگین مقبرے ہیں جو ہندوستانی۔ عربی طرز تعمیر کے امتزاج کا جلوہ پیش کرتے ہیں۔ یاقوت خان (سدی قاسم ۱۶۷۰ء) خیریت خان کے مقبروں پر ان کی وفات کی تاریخوں کے عربی کتبے ہیں۔

سدیوں کی جماعت نے صدیوں کے سفر کے بعد بھی اپنی قومی روایات اور ثقافتی میراث کو وقت کے دستبرد سے محفوظ رکھا تھا۔ (گو آج تصور کے پردے پر اور تاریخ کے اوراق پر ان کی صرف چند جھکتی ہوئی پرچھائیاں رہ گئی ہیں) کہ کس طرح یہ رقص (دھمالی کے دیوانے) نرگی کے اور ڈھولکی کی تال پر اپنے جماعت خانوں میں ساری رات قبائلی رقص لولو، لیوہ اور بدوگیہ وغیرہ ناچتے تھے اور قومی جذبے سے سرشار اور روحانی غلبہ سے مغلوب ہو کر مذہبی رقص دھمالی اور جنون کا مظاہرہ کرتے تھے کیونکہ یہ "باکوباباں" ان میں روحانی قوت پیدا کرتی تھیں[1]

پنجتن

مزاروں کے شمار میں چند ایسے مدفن بھی نظر آتے ہیں جن پر روایت اور عقیدے کے دبیز غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ بعض روایتوں نے مجاز و استعارات کے دائروں سے نکل کر لیپٹ اور کر کرامتوں اور کرشموں کے نورانی ہالے بنا لئے ہیں جنجیرہ قلعہ میں پنجتن کے پانچ مزار ان مسلمانوں کے ہیں جو غرق دریا ہو گئے تھے اور مدتوں نہ جن کا جنازہ اٹھ سکا اور نہ مزار بن سکا۔ تاوقتیکہ مقامی مسلمانوں کو

---

[1] BY-WAYS OF BOMBAY; S.M.EDWARDS, (BOMBAY, 1912) P.88.

خواب میں کشف ہوا اور پھر اجاڑ جزیرے میں پنجتن کی درگاہ تعمیر ہوئی۔ دوسری روایت اس درگاہ کو شاہ طاہر الحسینی کی تبلیغ شیعیت کی یادگار بتلاتی ہے ایک تیسری روایت پانچوں قبروں کے سنگین تعویذوں میں کولی دیوتاؤں کا اوتار دیکھتی ہے جن کی مورتیوں کو مسلمانوں نے مشرف بہ اسلام کر کے مزار بنا دیا۔ پنجتن پیروں کو ہر سال خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں شیعہ و سنی زائرین کے علاوہ فقیر اور سنت سادھو بھی ہوتے ہیں۔ جنجیرہ سے چھ میل کے فاصلے پر "پنجتن لوہرلائی" کی ایک دوسری درگاہ سے بھی دراصل تشیع کے شیوع کی شہادت ملتی ہے۔

دابھول

شہر (دابھلیشور) اور اس کے مندر (دابھل وتی) کی یاد میں بسائی گئی "دیوتاؤں کی بستی" (امراوتی) میں کبھی جنگل کے دیوتا (دابھیلہ) بستے تھے۔ یہاں پراچین یگ (شکہ سنہ ۵۵ء) کے بادامی چالوکیہ مندروں کی طرح تراشا ہوا "چنڈیکا دیوی" کا مندر بھی تھا۔ گیارہویں صدی میں یہ بستی جین راج کی راجدھانی تھی۔ تاریخ کی ایک صدی کی خاموشی کے بعد جب روایت[۱] نے زبان کھولی تو کسی شاہ نصیر الدین الملقب بہ اعظم خان امیر کی داستان سنائی دی جو سمندر پار سے آیا تھا۔ اور جس نے (جین راجہ) ناگوجی راؤ کو سرنگوں کر کے اس خطہ میں اسلام کا علم بلند کیا۔ اپنے لڑکے مصطفٰے کے نام پر دابھول کو مصطفٰے آباد بنا دیا اور اس کے نواح میں ایک نئی بستی حمزہ آباد اپنے دوسرے بیٹے کے نام پر بسائی۔

---

[۱]۔ مخطوطہ ملوکہ کتب خانہ نواب جنجیرہ۔ بحوالہ رتناگیری گزیٹیر (نٹ نوٹ)

چودہویں صدی کے قافلے نے ابھی وقت کی بارہ منزلیں طے کی تھیں کہ ملک کافور کی ترکتازی کے تذکرے کافور کی طرح دکن اور کوکن میں پھیل گئے۔ بربادی کے لٹے ہوئے قافلوں میں مصطفٰے آباد کا شہر بھی تھا۔ ۱۳۵۷ء میں جب بہمنی حکومت نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو دابھول نے بھی خضر آباد کے نئے نام سے اپنی نئی زندگی کا سفر شروع کیا۔ یہ بہمنی مملکت کا مغربی سرحدی شہر اور تجارتی مرکز تھا جس کے پھیلے ہوئے ریگزار صوفیوں، شاعروں اور تاجروں کے نقوشِ قدم سے جگمگا اٹھے تھے۔ کبھی اس کی خاک نے بڑھ کر بانیٔ بیجاپور کی (۱۴۵۹ء) میں قدم بوسی کی اور کبھی روسی سیاح افانسی نکی تن کی (۱۴۷۰ء میں پذیرائی کی اور اس وقت تک خضر آباد کی تجارتی رونق کو عمر خضر نصیب ہو چکی تھی۔ اور اس کی بندرگاہ ہرمز، مکّہ اور عدن کے تجارتی جہازوں کی آماجگاہ، عرب، خراسان اور مصور سے گھوڑوں کی تجارت کی جولانگاہ اور ہندوستان کے ساحلی شہروں اور حبش کے باشندوں کے میل جول کی منزل بن گئی تھی۔ اطالوی سیاح ورتھیمہ جب ۱۵۰۳ء میں خضر آباد آیا تو اس نے اس کے اردگرد مغربی طرز کی حصاربندی دیکھی جس کے اندر ابھی ابھی محمد شاہ بہمنی (۱۴۸۲ - ۱۵۱۸ء) نے یتیم خاں نے تعمیر کرائے تھے اپنے خوبصورت محل وقوع کے سبب عالیشان عمارتوں اور سندر مندروں اور اعلےٰ مسجدوں کے باعث دابھول کا دبدبہ دور دور تک چھایا ہوا تھا۔ گویا ابوسا کو گھاس پھوس کی جھونپڑیاں دیکھ کر تعجب بھی ہوا ہوگا۔ مگر اس نے بھی ورتھیمہ کی طرح نوائطی عرب، اور گجراتی بیوپاریوں کو خارجی تجارت کا اجارہ دار اور اندرونی لین دین کا ٹھیکہ دار بنا دیکھا۔ تانبا، سیاب، چاندی، نیل اور گھوڑے کی تجارت رفتار پکڑ چکی تھی۔ دابھول کے کرگھوں کا بنا ہوا کپڑا، اور اندرونِ ملک سے پارچے

گیہوں اور سبزیاں ، دیو اور کھمبایت کے دو باشیوں ، ملیبار[1] کے تو تیل جہازوں اور ایران و عرب کے دھاؤں میں بیوپاری باہر لے جاتے تھے ۔ لوہا اور ہاتھی دانت کی تجارت ۱۶۱۱ء میں فروغ پر تھی ۔ اور یہ سورت کے انگریزوں کیلئے باعث رشک تھی ۔ اور غالباً دابھول کی یہی دھن دولت تھی جس کے سبب پرتگیزی استبداد نے ۱۵۰۸ء سے اس کا گلا دبوچنا شروع کر دیا تھا[2])

عادلشاہی کی تعمیرات میں سے دابھول کے نصیب میں کئی عمارتیں آئی تھیں مگر جب بھی اس کا نصیب بگڑا اس جنت ارضی کی صورت بگڑ گئی ۔ ناریل کے گھرے جھنڈوں میں عرصے تک عالیشان مسجدوں اور عمارتوں کے حسین کھنڈر ، اپنی عظمت رفتہ کا مدفن بنے رہے ۔ اسی گور غریباں میں ایک عادلشاہی شہزادی عائشہ بی بی کی بنائی ہوئی تاریخی مسجد " ماں صاحبہ کی مسجد " کے ملند مینارے اپنے ماضی کے سوگ میں سرنگوں ہیں سنگین حصار کے اندر مسجد کے سامنے پتھر کے چبوترے پر کبھی ایک خوشنما فوارہ ۔ عاشق کے دل کی طرح اچھلتا رہتا تھا ۔ اور قریب ہی ایک سوکھی باؤلی کسی باؤلی کی طرح پُراسرار بنی ہوئی تھی ۔ اس خوبصورت مسجد کے عالیشان گنبد پر سونے کے ملمع کاری کی گئی تھی ۔ اور اس کے کلس کا ہلال سونے کا بنا ہوا تھا ۔ گو اب نہ تو شمسیہ ہی رہا اور نہ ہلال ہی نظر آتا ہے ۔ مگر پتھروں کے کٹاؤ کی آرائش اور منبت کاری کے بکھرے ہوئے اور معدوم آثار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس کا عالم کیا ہوگا ؟ شہزادی عائشہ نے اسے اپنے دابھول کے

---

[1] ۔ دور تعمیر کا سفرنامہ

[2] دسے کھنا ۔ چپلون ۔ ص ۳۰ ۔ بار بسا ص ۲۲

کے دوران قیام میں ۱۶۵۹ء میں مقامی مولویوں اور قاضیوں کی درخواست پر پندرہ لاکھ روپے کی خطیر رقم سے چار سال کے اندر بنوایا تھا۔ یہ رقم وہ اپنے ساتھ زادِ راہ حج کی صورت میں لے جا رہی تھی۔ مگر قزاقی کے ڈر سے وہ اپنے بیس ہزار گھوڑسواروں کے ساتھ داابھول سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ اس مسجد کے معمار کا نام کامل خان تھا۔

داابھول کی جامع مسجد پیر احمد عبداللہ طرف دار مصطفیٰ آباد کے جذبۂ عبودیت کی یادگار ہے۔ جس کی تکمیل ایک کتبے کے بموجب ۱۰۷۵ھ میں ہوئی تھی۔ سمندر کے کنارے عادل شاہی تشیع کی دوستی یادگار ایک مسمار مسجد (ٹوٹی ہوئی) شکستگی کی حالت میں نظر آتی ہے جس کے چوبی کتبے پر پنجتنِ پاک کے اسماء کے ساتھ بانی مسجد سعادت علی شاہ پادشاہان [؟] کا نام بھی کندہ تھا۔ اس کی تاریخ تعمیر ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء تھی۔ مقامِ خضر کے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی یادگار میں تعمیر کئے گئے۔ اس قبرستان نے بھی اسی سال داابھول میں اپنا مقام بنایا تھا۔ عجب کہ یہ بھی سعادت علی کی سعادت دینی کا ثبوت ہو۔ بانی مصطفیٰ آباد، اعظم خان نے چونکہ نئی بستیاں بسا کر قرونِ وسطیٰ کے معیارِ رفاہیت و سماجی اخلاقیات کے مطابق بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اسی لئے مقامی عوام نے اسے [حسبِ معمول] پیر کا درجہ بخش دیا تھا۔ اس پیر کی درگاہ مرجع خلائق تھی یہاں آباد قدیم کوکنی خاندانوں میں قاضی کا گھرانہ نہایت ممتاز تھا۔

بالا پیر:

داابھول کے دیہی مضافات کے اسلامی آثار باقیہ سے مسلم تسلط کے پھیلاؤ

اور مسلم ثقافت کے گہرے نفوذ کا اندازہ ہوتا ہے۔ داآبھول کے شمال مشرق میں کھاڑی کے کنارے بالا پیر کی بستی لپنے بانی، بالا سیٹھ کا بول بالا کر رہی ہے بالا سیٹھ دکھن کے ایک نومسلم وانی کا درجہ پیری حاصل کر لینا کسی تاریخی حیثیت کا حامل ہوگا۔ پہاڑی کے دامن میں اس کی بنائی ہوئی مسجد کا محل وقوع وہی ہے جہاں روایت کے مطابق اس کا بیل آکر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بیل اس کے نزدیک کتنا متبرک ہوگا جس کی قبر خود بالا سیٹھ کے مقبرے کے آگے موجود ہے اور جس کے پہلو میں ایک دوسرا وفادار جانور گھوڑا بھی مدفون ہے۔ پہاڑی کی سطح پر زینہ دار کنواں، دراصل معدن تھا جس کے پتھروں کو تراش کر یہ مسجد تعمیر کی گئی تھی جنجیرہ کے کسی نواب نے ۱۷۶۵ء میں اس مسجد [اور غالباً درگاہ بالا سیٹھ] کے اخراجات کے لئے (دیہاتوں کا) اوقاف مقرر کر دیا تھا جسے بعد میں انگریز اور پیشواؤں نے بھی برقرار رکھا تھا۔

بندر ساکھری

داآبھول سے دو میل کے فاصلے پر بالا پیر کی سمت ہی میں وا شِشٹی کے دلدلی کناروں پر آباد تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی بستی تھی اور اِرد گرد کے دیہات خان خاندان کی جاگیر میں تھے جس کے کسی فرد نے (جس کا نام امین یا امینہ تھا) امینہ مسجد بنوائی تھی۔ جو بندر ساکھری کی دراصل جامع مسجد تھی۔ یہ کالے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ بندر ساکھری کے مشرق و مغرب میں کو تھمبہ اور راجی بینٹلہ کے دیہاتوں میں بھی مسمار مسجدوں کے آثار اور تسلسل پہاڑی میں زینہ دار کنویں "گھوڑ باؤ" کے وجود سے اسلامی تسلط کا اظہار ہوتا ہے۔

انجن ویل

انجن ویل کی ساحلی بستی واشسنٹ یا دابھول کی کھاڑی کے جنوبی دہانے پر مصطفٰے آباد کے مقابل اپنے عادل شاہی قلعہ کی حفاظت میں کھڑی تھی۔ سورن درگ، وجیہ درگ، رسال گڑھ اور جے گڑھ کے قلعوں کی طرح اس گڑھ نے بھی عادل شاہیہ دورِ عظمت میں سربلندی حاصل کی تھی۔ (انگریز نے اسے گوپال گڑھ کا نام دیا تھا) مسلم بادشاہوں کی تعمیر یا اضافی تعمیر کی یادگاریں اس قسم کے قلعوں میں فصیل "حصار" یا اوپری کوٹ "بالا" کی صورتوں میں موجود ہیں۔ انجن ویل کے قلعہ کے اندر کبھی تھانیدار قلعہ کی حویلی کے ارد گرد ایک دنیا آباد تھی۔ کنوؤں سے آب رسانی کی جاتی تھی۔ گودام اور کھلیان پٹے پڑے رہتے تھے۔ عمارتیں قلعہ کے "پڑکوٹ" اور "بالا کوٹ" کی بلندیوں سے اوپر سر اٹھا کر اس راستے کی طرف دیکھا کرتی تھیں جو سورن درگ سے پرے کیلشی کی مسلم بستی کی طرف جاتا تھا۔

کیلشی

اسی نام کی ندی کے کنارے بانکوٹ کے جنوب مشرق میں پان کی بیلوں میں لپٹا۔ پام کے درختوں اور پہاڑی کے گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا چھوٹا سا گاؤں تھا دوم جو آگیسٹو نے (۱۵۳۸ء) میں یہاں ایک مسجد کے اونچے مینارے کو دیکھ کر صحیح طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ یہ بستی کلمہ گو نوائطیوں کی تھی۔

۱۔ جدیس کونکن: ص ۹۲

ساتولی

بھی ایک ایسی ہی چھوٹی سی مسلمان بستی تھی جو پان کی ندی پر کنڈی کے کنارے پہاڑیوں کے گھیرے میں آباد تھی۔ بار بوسا (۱۵۱۶ء میں) اسے دو تبیلہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ندی کے کنارے اس نے چھوٹی چھوٹی آبادیوں کو خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے دیکھا تھا۔ پان کی باڑیاں ندی کے مچلتے پانی میں اپنے سایوں کا ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ اور پھلوں کے باغات ان ریگزاروں سے بمشکل ریت نہا رہے تھے۔ جو اپنی ریت آہستہ آہستہ کناروں پر پھیلا کر انھیں پاٹ دینا چاہتے تھے۔

راجہ پور۔ کوکن کے قدیم شہر کی طرح یہاں بھی وسطی ایشیا کے قصباتی سڑکوں جیسی کھڑنجے والی سڑک مسلم بستی سے گذرتی تھی جس کے کناروں پر مسلمانوں کی یادگاریں اور عبادت گاہیں۔ قطار در قطار امتداد زمانہ کے سبب سربسجود ہو رہی تھیں۔

لانجے

ساتولی اور وشال گڑھ قلعہ کے درمیان ایک قدیم راستے پر لانجے کی مسلمان بستی کا ڈیرا لگا ہوا تھا۔ یہی بخارا کے سید چاند علی فقیر کی آخری منزل تھی۔ جن کی درگاہ آماجگاہ خلائق تھی اور جن کے عقیدت مندوں میں ہندو، مسلمان سبھی شامل تھے اور جن کے سالانہ عرس میں مقامی زائرین کے علاوہ راجہ پور کے بھی بیوپاری امڈ پڑتے تھے۔ مہینہ بھر دُکان لگائے رہتے۔ مقامی کرگھوں کا کپڑا اور دکن کے نفیس پارچے اور دیگر اشیا لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ یہاں ایک کلس دار روضہ بھی اپنے ماضی کی یادوں کا بوجھ اٹھائے کھڑا تھا جس کے تلے ایک عادل شاہی

شہزادی آبادی نیند سو رہی ہے[۱]۔ جسے اثنائے سفر مدت کی آخری منزل سے گزرنا پڑا تھا۔ تاریخ کا سیاح اب وجیہ درگ ندی سے پچیس میل کے فاصلے پر آباد۔

کھارے پاٹن

کھارے پاٹن کی مسلمان بستی میں پہنچ گیا تھا۔ یہ بار نو سال کا آرا لینی تھا۔ ایک جیتا جاگتا شہر جہاں کوفہ اور بصرہ کے قدیم نوائطی گھرانے اور مخلوط النسل کوکنی مسلم قبیلے صدیوں سے آباد تھے۔ یہاں مقامی کھوت عہدے داروں کے "کھوتی وطن" دور دور تک کھاڑی کے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ کھارے پاٹن ایک خوشنما پہاڑی کے دامن اور وسیع میدان میں کئی منزلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈھلوانوں پر برجیوں والی گڑھی کے ارد گرد (جہاں آج واگوٹھن ہے) ایک جامع مسجد اور درجنوں چھوٹی چھوٹی مسجدیں اپنے میناروں کی انگشت شہادت سے خدا کی وحدانیت کا اعلان کرتی تھیں۔ یہیں مسلمانوں کا گورغریباں بھی تھا۔ جس کے دونوں پہلوؤں پر پہوڈیوں کا گوہتہ ان غاصب بنا ہوا تھا۔ آبادی کے وسط میں ہندو مسلم بستیوں کے بیچ ایک سنگین سرحد نفاق کی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔ ہندو بستی میں دیوگڑھ اور ساونتری ندی کے درمیان آباد ہو نیولے چتپاون برہمنوں کے گھرانے اور کرناٹکی جین مہاجر کٹھن زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ یہاں کا جین مندر کوکن علاقہ میں اپنی نوعیت کا واحد مندر تھا جس میں تیسویں تیرتھنکر پارس ناتھ کا سنگ سیاہ سے تراشا ہوا خوبصورت بُت تھا۔ آج کھارے پاٹن کی اس قدیم مسلم بستی میں سوائے چند شکستہ مزاروں، سرسجود

---

[۱] نیرتے۔ انڈین اینٹی کیئری۔ ج۔ ص ۳۱۷

مسجدوں کے کوئی آثار اُس میدان میں موجود نہیں ہیں جس کے بیچ سے ایک کچّا راستہ ندی کی طرف جاتا ہے۔ آج اس کا حال، شکستہ مزاروں اور مقبروں کے شمار میں گم ہے۔ کل جس کا ماضی نہایت شاندار تھا۔

کنکیشور

جس نام کا عظیم مندر آج بھی ہندو مسلم اتحاد اور مسلم رواداری کی یادگار بن کر کھڑا ہے۔ دیوگڑھ کے قریب واقع یہ مندر اپنے بانی ایک مسلمان تاجر کی جذباتی ہم آہنگی کا شاندار مظہر تھا۔

عادل آباد۔ بانڈہ

مملکت عادلشاہیہ کا طرف تھا۔ سولہویں صدی کی چمکیلی صبح میں یہاں عرب اور نوائطی تاجروں کی بستی میں بے حد رونق پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سارے دکن اور ملیبار سے تجارت کے اجارہ دار بنے بیٹھے تھے۔ عادل آباد کا تجارتی رشتہ کوکن اور گجرات کی بندرگاہوں سے بندھا ہوا تھا۔ چاول، مکئی اور سبزی ترکاریوں کے بوجھ سے لدے پھندے بگلے، بوتیل اور بتیلے جہاز یہاں ٹھہرتے تھے۔ اور دیو، عدن اور ہرمز کے ڈہاؤ اور ونگی یہاں سے ناریل، مسالے، سیاہ مرچ اور جڑی بوٹیاں لے جاتے تھے۔ یہاں دبگرا سے زیادہ تجارتی گہما گہمی رہتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی بندرگاہ اس لحاظ سے کارآمد تھی کہ یہاں تک بڑے بڑے بادبانی جہاز آسکتے تھے۔

عا۔ ہنڈلیہ ص۲۱۵، ص۲۲۳۔ اوگلبی۔ اٹلس۔ ج۔ ص۲۷

مگر جب ۱۵۷۰ء میں پرتگیزوں اور وجیانگرم کے مابین تجارتی معاہدے کی تکمیل ہوئی تو سیاسی چالبازیوں نے ہوا کے رُخ بدل دیئے۔ باندہ کی تجارت پر اوس پڑ گئی۔ انکولہ اور ہنووَر کی حریف بندرگاہوں پر بہار چھا گئی۔ لیکن پرتگیزی اقتدار کے سبب سے ہی کچھ دنوں کے لئے باندہ کی بندرگاہ میں سیاہ مرچ اور فرنگی مصنوعات کا لین دین تیز ہو گیا تھا۔

گوا کی طرح عادل آباد کی شاہراہیں بھی بے حد کشادہ تھیں جن کے پیچ و خم کی خوبصورتی سے فرنگی سیاحوں کے ہوش گم ہو جاتے اور عالیشان عمارتیں اور سندر مندر ان کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ مسجدوں کے کھنڈر اور شکستہ مقبروں کی قطاریں اپنی عظمتوں کے شمار میں آج گم ہو چکی ہیں۔ جنوب میں کبھی مسجدوں کی قطاریں تھیں۔ لال اینٹوں کی پختہ جامع مسجد کی باقیات۔ منقش چھجے اور تراشے ہوئے سنگین زینے آج بھی اپنی عظمتِ رفتہ کی آہٹیں سنتے رہتے ہیں جب کوئی نیا بیاہتا جوڑا "مقبرۂ سید عبد القادر جیلانی" پر دعائے خیر کیلئے آنکلتا ہے یہ پیران پیر دستگیر کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا مگر ایک مقامی روایت اسے اسی نام کے کسی عادل شاہی امیر سے منسوب کرتی ہے۔ یہیں ہشت پہلوؤں والا مینارہ اور مدّور چھت والا مسافر خانہ بھی ہے۔ جو ماضی کے کاروانوں کے انٹ گرد و غبار میں لپٹا ہوا ہے۔ لال اینٹوں سے تعمیر کئے ہوئے خوبصورت محرابوں کے سنگین ستونوں کی اوٹ میں دو شکستہ مزار "بی چراغی بی گلی" کا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔ اردگرد چھت دار غلام گردش ہے۔ ان کھنڈروں میں ایک ہشت گونہ سنگین ستونوں والی مسجد کے آثار باقیہ ابھی ناپید نہیں ہوئے ہیں۔ جس کی چھت۔ اب وہی نیلی چھت ہے۔ جس کے نیچے نجانے کتنے ہی ساری تہذیبوں نے جنم لیا ہے۔ اس

گور غریباں میں گنبدوں اور شکستہ دیواروں کا شمار نہیں۔ انہیں ملبوں میں "پیڈی گمباج" (یعنی مسجد) آج بھی قابلِ مرمت اور استعمال ہے۔ عظمتِ رفتہ کی تہی دامنی میں چند سوکھی باؤلیاں اور چند حوض ہیں جن کے طاقچوں میں کبھی منتوں کے چراغ جلتے تھے۔ وہی چراغ جو جیلون کی مسجدیں "آتی چی کریہ" کی نیت سے جلائے جاتے تھے۔ اور مرادوں اور تمناؤں کے وہ چراغ جن سے کبھی وانجول کا شہر سنسان جگمگا اٹھتا۔

گووا

کدمب راج کا چندر منڈل یا چندر پور۔ جب زوال کی بدلیوں میں چھپا۔ تو بدرِ کامل بن کر ملالی سائے تلے ابھرا۔ اور اسے صندا پور کہنے لگے۔ سلاہاروں کے یگ کے گومنت۔ اور کدمب کل راج کے گوا پوری میں ہمیشہ مسلمان آباد رہے ہیں۔ [مسعودی اور ابن بطوطہ کے بیانات سے واقف ہوتے ہوئے بھی] محمودِ گاوان تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "عہد ماضی سے لے کر (اس کے زمانے تک) یہ خطہ کواکبِ مناقب اسلام سے منور نہیں ہوا تھا"۔ حالانکہ نورِ اسلام کی کرنوں کے ساتھ معجزۂ شق القمر کی شہرت کالی کٹ کے زمورنِ راجہ تک پہنچ چکی تھی۔

گھلا دیو (دوم) کے عرب محسن محمود تاجی کے وزیر بیٹے شدامنے گوا پوری

۱: رتناگیری گزیٹیر (حصہ ساونت واڑی) ص ۹۴ ۔ ۶۴۳

کی مسلم بستی میں جو مجی گدی" (جامع مسجد) بنوائی تھی وہ اس خطہ کی غالباً پہلی عبادتگاہ تھی جس کی بانگ تاریخ کے ایوانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔[1] ابن بطوطہ نے جمال الدین ہنوری کی تعمیر کی ہوئی جامع مسجد میں بغداد کے فن معماری کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔ ہنور میں مسلم مکتبوں کی خاصی تعداد تھی۔ مگر وقت کے استبداد اور تاریخ کی جبریت نے مکتبوں اور مسجدوں کو ملبوں میں دفن کر دیا۔ گوا ہمیشہ سے اپنی کشادہ شاہراہوں اور گھنیرے خیابانوں کے سبب شہرت پھیلائے ہوئے تھا۔ قدرت کی نعمتوں سے مالامال اور حسین مناظر سے مزین اس بستی میں رنگ و نور کی پرچھائیاں ڈولتی رہتی تھیں۔ ناریل، سپاری، تاڑ اور کیلے کے پیڑوں کے گھرے سبز سایوں میں چالوکیہ فن تعمیر کی مٹتی ہوئی یادگاریں ماضی کی ان گنت داستانیں سرگوشیوں میں سناٹوں کو سناتی رہتی تھیں کہ کس طرح یہاں کے مندروں اور مہامند بلیشوروں کے آنگنوں میں کسی وقت عراقی اور خراسانی گھوڑے اپنے تنگ کی بندھوں کے خاموش تماشائی بنے تھان پر بندھے رہتے تھے۔ گلستانوں اور گلکدوں میں رنگ و بو کی جلوہ آفرینیاں تھیں۔ اور پاتراؤں کے کوٹھوں پر حسن و شباب کی فتنہ سامانیاں حشر برپا کرتی تھیں۔ رو پہلی نہروں میں جلترنگ بجتا رہتا تھا۔ اور سنگین زینہ دار حوض جگہ جگہ ڈبڈبائی آنکھوں سے کدمب راج کی پرمپرا اور چالوکیہ سنسکرتی کو پاتال میں ڈوبتا دیکھتے رہتے تھے۔[2] کیونکہ وقت کے گہرے، گمبھیر اور بیکراں سمندر کے سینے پر عادلشاہی ثقافت کا مینارۂ نور تعمیر

---

[1] - جاسنج مدرسیس۔ کدمب کل۔ (انگریزی۔ مطبوعہ بمبئی)

[2] - ایضاً۔

ہو چکا تھا۔

عادل شاہی گووا میں اس دور کی یادگاروں میں ایک کھپریل کی پوشش والی مسجد سے آج بھی خدا کی وحدانیت کا اعلان ہوتا ہے۔ ۱۵۶۰ء میں ابراہیم عادل شاہ نے بھونڈا قلعہ کے اندر ایک دل افروز تالاب کے کنارے محرابوں سے مزین مسجد صوفیہ شاہ پوری تعمیر کرائی تھی۔ اسی [مسمار] قلعہ میں غازی عبداللہ خان شہید کا مشہد بھی اس کی جوانمردی کی شہادت دے رہا تھا اخراجات درگاہ کیلئے سنبھاجی نے زمینیں وقف میں دی تھیں ۔[1] جلیوں اور کھاڑیوں کے نقرئی ہالوں میں گھرے ہوئے پرانے گووا میں مسلمانوں کی بستی میں بڑی رونق بستی تھی۔ سفید رنگت کی نوائطی خواتین اور مقامی مسلمان عورتوں میں پردے کا رواج تھا۔ یہ زیوروں سے لدی پھندی رہتی تھیں۔ فرصت کے اوقات میں آموں کا اچار بناتی تھیں جس کی بڑی شہرت تھی۔ اور پھر ایک ایسا دن بھی آیا کہ پان کی بیلوں کی چنریا اوڑھے اور چنبیلی کی لچکیلی ڈالیوں کی دھانی بانکیں پہنے دلہنوں کی طرح سمٹی ہوئی حویلیوں کا سہاگ اُجڑ گیا۔ گونجتے ہوئے ساحل پر سناٹا موجیں مارنے لگا۔ اور نرم ریگزاروں سے اجنبی قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ سات پہاڑیوں پر آباد گووا ہندوستان میں پرتگالی مقبوضات کا صدر مقام بنا تو یہ ایشیا کا روم بن گیا۔ اور پرانا گووا۔ نیرو کا روم بن گیا جہاں مسلمانوں کی جھلسی ہوئی تقدیریں عظمت ماضی کے کھنڈروں اور ویرانوں میں مدتوں تلک سلگتی رہیں[2] ۔۔!!

۱۔ گرناکی قدیم عبادت گاہیں۔ ۲۔ ڈاکٹر جون فرینیئر۔ ج ۔ ص

چیوَل بالا۔ خاوَل

عہدِ عادلشاہی کے چیوَل بالا یا خاوَل کا طرفدار شیخ، جواب مَلِک کہلاتا تھا، اپنے موروثی محل میں متمکن محرابی دریچے کی حریری چلمن سے دُور نیلگوں سمندر کے دُھندلے کناروں کو تکتا رہتا تھا۔ اُس کی بے چین نظریں کبھی پرتگیزی جہازوں کے سرکش مستولوں سے ٹکرا جاتیں اور کبھی کورلے ٹاپو یا "اِل مورودی چیوَل" کے نظام الملکی قلعے کے سرنگوں اور شکستہ "برجِ مدافعت" اور کالنسی کے ڈھلے ہوئے شیر و عقاب کے مجسموں سے اُلجھ جاتی تھیں۔ اِس عجوبۂ طاقت و تکمیل "قلعے کے فخر و مباہات" کا سراپش پاش ہو گیا تھا جب (۱۵۹۴ء میں) پُرتگیزوں نے نظام الملکی محصورین کو شکستِ فاش دی تھی اور ناگوٹھنہ کھاڑی پر ۴۸۰ فٹ طویل اور ۱۹ فٹ بلند تنگ پُل تھی جسے چیوَل کے قاضی علاء الدین نے تین لاکھ روپوں کی کثیر رقم سے چودہ برس پہلے تعمیر کرایا تھا۔ برہان نظام شاہ (دوم) کی افواج کی رہگذر بن کر فتح کی راہ ہموار نہ کر سکا تھا۔ ریوڈنڈا کی پرتگیزی نو آبادی میں (جو اب پُرانی ہو چکی تھی) دَونی فی کن خانقاہ اور کیتھڈرل کے مینارے، جیسوئٹ راہبوں کا گرجا اور اُن کی درس گاہ اور آگسٹینین کلیسا کی مخروطی برجیاں شیخ خاوَل کے سینے میں پیوست ہوتی رہتی تھیں۔ پرتگیزی قلعہ آگرکوٹ کے "چوکونی برج" کے آگے عادلشاہی قلعے کی گُمٹیاں گُم ہوتی نظر آتی تھیں اور ہشت ستونوں پر ایستادہ مخروطی محرابوں سے مزین دو منزلہ محل بے بنیاد دکھائی دیتا تھا۔[1] روہا کھاڑی کے کنارے آباد قدیم مُسلم بستی میں باغوں

---

[1] یہ قلعہ ۱۶۳۶-۴۶ء کی درمیانی مدت میں کسی وقت تعمیر کیا گیا تھا جب مغلوں نے اس نئے مقبوضہ "معاملہ مرتضیٰ آباد" کو معاہدہ کی رُو سے عادلشاہیوں کو تفویض کر دیا تھا۔ یہاں کا طرفدار ملک کہلانے لگا تھا۔ دیکھیے: فرشتہ (برِگس)، ج ۳، ص ۳۱۰۔ فرانسسکو پیارارڈ، ج ۲، ص ۲۲۷-۱۶۵-۶۶۔

اور بوستانوں سے گھری ہوئی حویلیوں اور واڑیوں کے جھرمٹ میں مسلم سرکاری دفاتر اور دیوان ـــــ ریوڈنڈا کے پرتگیزی "منصف" اوویدر" کی عدالت کے روبرو مجرم سے لگتے تھے۔ فرانسسکن اداروں کے مرکز میں واقع سینٹ باربا کلیسا اور صومعہ کا عظیم الشان "سات[1] خانی برج" پام کے سبز شامیانے کا سینہ چیر کر "چیول دارِبہ" (مسلم چیولِ بالا) کی بستیوں کا مذاق اڑاتا نظر آتا تھا اور ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھری ہوئی مسجدوں کے سہمے ہوئے میناروں کو بڑی حقارت سے دیکھا رہتا تھا۔ ان مسجدوں کے قبلہ محرابوں کے آگے مغروروں کے بھی سر جھک جاتے تھے لیکن جوابِ ضعف میں اغیار کی بات تو اٹھا سکتے تھے مگر سر نہیں اٹھا سکتے تھے ـــــ کیونکہ اغیار کے گرانبار دستِ ستم نے انھیں سجدہ ریز بنا دیا تھا ـــــ ایسی ہی ایک مسجد ندی کے نقرئی کنارے اینٹوں کے چبوترے پر رکوع میں کھڑی تھی۔ اس پر چوکور اور مثمن پہلودار ستونوں کی کئی صفیں آراستہ تھیں جن پر محرابوں کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں، ان کے چھجوں کی اوٹ سے کبھی سولہ قبوں کے چاند ابھرتے نظر آتے تھے مگر اب جنھیں برگد کی چٹانوں نے جکڑ لیا تھا ـــــ اور پرتگیزوں کی توپوں نے جھلسا دیا تھا۔ "ساحل کے سفید ریگزاروں کے دامن میں ٹنکے ہوئے پام کے پیڑوں کے سبز جھالروں سے مسمار عمارتوں کی چاک دامانی بے حد نمایاں تھی۔ اسی ویرانے میں بھاؤ کے تالاب کے مغربی کنارے پر [دتاتریہ اور ہنگلاج کے مندروں کے مدِمقابل) ایک دوسری عظیم الشان مسجد اور ایک مقبرے کے گنبد اور سنگ وخشت

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے : دا کنھا، بسین اور چیول کی قدامت کا تذکرہ (انگریزی) حصہ دوم۔

کے انبار اپنے رہے سہے وجود سے دست گریبان نظر آرہے تھے۔ ان کی چکنی چٹانی دیواروں کی گچی کاری کا کام تمام ہو چکا تھا اور انگڑائی لیتے ہوئے کماچوں کا بانکپن ٹوٹ رہا تھا۔ گچی کئے ہوئے سطحی خانوں [Panel] کے اُوپر اینٹوں کا گنبد سر اُٹھائے اپنی تباہیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اندرونی دیواروں کی کنگنیوں کے اُوپر ڈھال کی شکل کے طاقچوں میں کبھی منّتوں کے چراغ چلتے ہوں گے اور کبھی انہیں گگروں کے اُوپر گچی کام کے گل بوٹے دہکتے ہوں گے اور سطحی خانوں میں استر کاری کے نقش و نگار بہار دکھلاتے ہوں گے۔ باب الداخلہ کی دونوں طرف دیواری ستونوں پر گل کاری کی گئی تھی اور دروازے کے اُوپر پتھروں کے کٹاؤ سے آرائش کی گئی تھی۔

ہنگلاج کے کوہستانی سلسلے کے ایک ٹیلے پر یادگاری پتھروں اور تراشیدہ سلوں کے ڈھیر میں ان گنت قبروں کے راز دفن تھے۔ تُربتوں اور مزاروں کا اٹوٹ سلسلہ سارے جنوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس شہرِ غریباں میں مقبروں اور مرقدوں کا شمار نہ تھا اور گنجہائے شہیداں مشہدوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ کہیں جنجوٹی کے واگھ دیوی مندر کے قریب کوئی مسمار مقبرہ اپنے ماضی کا مرثیہ خواں بنا ہوا تھا اور کہیں ہنگلاج کے کوہساروں میں کوئی کلس دار روسنہ یأس و حرمان کی تصویر بنا سر نیوڑھائے اپنے پچھلے جنم کے "کافرانہ وجود"[1] کو یاد کرتا رہتا تھا۔ راجکوٹ قلعہ کے قریب "گیری چے دھونڈ بندر" کے کنارے چند شکستہ مقبروں کے وجود کا لنگر ٹوٹ رہا تھا۔ یہیں پاٹل کھاڑی کے "دادر"

---

[1] قلابہ گزیٹیر۔ ص: ۳۰۱۔

کی پرلی طرف اک شہرِ خموشاں میں بے شمار قبریں اپنی بیکسی و بے لبسی کا گویا ماتم کررہی تھیں اور بارہویں صدی کی یادگار مہالکشمی کی مسمار معبدگاہ کے ملبوں میں کوئی گمنام مقبرہ وقت کے کڑے کوس طے کرکے درختوں کے گنجان سائے تلے سستا رہا تھا۔ اس کے گنبد کے گلے میں خودرَو پودوں اور جھنکاڑوں کی سازشی ڈالیوں اور جنگلی درختوں کی آسیبی ٹہنیوں نے جال بچھا رکھا تھا اور اس کے کالس کا کنگن ٹوٹ رہا تھا۔ طاقچوں میں سفاک وقت نے گہرے گھاؤ ڈال دئیے تھے ـــــ یہ سارے مقبرے ماضی کی بھول بھلیوں میں اپنے مکینوں کے نام گم کر چکے تھے۔ صرف ایک پیر سید احمد کا مقبرہ تھا، جو سیاہ، سجل سلوں سے بنی قبروں کے درمیان اپنے وجود کا بھرم برقرار رکھے ہوئے تھا۔ ایسے دو مقبرے اور بھی تھے جن کے کتبے [۹۱۵ھ / ۱۵۰۷ء اور ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء] صدیوں کے سفر کے نشانِ راہ بنے ہوئے تھے۔ اِن مسمار مرقدوں کے ڈھانچ ڈہیر کو دیکھ کر ان کے حسین خدوخال تصور میں ابھر آتے تھے اور دُور تک پھیلے ہوئے شہرِ خموشاں کے سسکتے سناٹوں سے اُبھر کر اَن گنت آوازیں تخیل کے ایوانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔

یہ نظام الملکی دَور کا چیول تھا ـــــ !!

چیول کی منڈی اور مسلم آبادی سے پَرے ہندو واڑیوں کی بستی میں: جگدمبہ (مہالکشمی) کے مہان مندر سے ناقوس کی چیخیں سنائی اور کھتری بنکروں کے کرگھوں کے شور میں ڈوب جاتی تھیں [اِن کرگھوں پر سال بھر میں پانچ ہزار تافتہ کے تھان تیار کئے جاتے تھے[2]]۔ سومیشور درّے کے راستے پر مسلم طرز کے

---

[1] ڈیلا ویل کا سفرنامہ۔ یہ اطالوی سیاح چیول میں ۱۶۲۵ء میں ۲۵ رنومبر تا ۱ردسمبر مقیم رہا۔
[2] ھیملٹن۔ نیو اکاؤنٹ (انگریزی) ج ۱، ص: ۲۴۳۔

کلس دار سومیشور مندر میں لنگ کے پجاریوں کے شلوکوں سے کوہساروں پر ارتعاش طاری رہتا تھا۔ ہنگلاج کے کوہستانوں میں ڈیڑھ سو سال قبل از مسیح کے بودھ غاروں میں داگھوب اور چیتیاؤں کے گہرے سناٹے کے پاتال میں ڈوبے گپتے چُنے بھکشو موکش کی کھوج میں دھیان کی رہگذاروں پر بھٹکتے رہتے تھے۔ انہیں گپھاؤں سے پرے پہاڑی پر واقع دتاترے مندر کی تلہٹی میں بھگوتی دیوی کا مندر پیپل کی چھتناری چھاؤں میں پراچین یگ سے دھرم کا پرچار کر رہا تھا۔ رامیشور کے سُندر مندر سے بھکتی رس میں ڈوبے اور کھماج اور کافی راگوں میں رچے بھجن بلند ہو کر کانوں میں امرت رس ٹپکاتے تھے۔ اُس کے سامنے ایک چوکور پختہ پوکھرن میں امرت جل ہلکورے لینے لگتا تھا جب کوئی یاتری یا پُجاری زینے دار گھاٹ کی سیڑھی پر بیٹھ کر اپنے چرن دھوتا، پھر چوکھٹ کے سامنے چار ستونوں پر قائم کلس کے نیچے نندی کی مُورت کے سامنے ناصیہ فرسائی کرتا تھا اور ہاتھ سے اُس کی دُم چھو کر عقیدت کا اظہار کرتا۔۔۔ اِسی گھاٹ کی پرلی طرف سایہ دار پیڑوں کے تلے سُندر اور جوان ہندو استریاں، راہگیروں، بستی کے کھنڈروں اور سیّاحوں (جیسے اطالوی سیاح ڈیلا دیل تھا) کی ہوس ناک نظروں سے بے نیاز نیم برہنہ کھلے بندوں اشنان کرتی رہتی تھیں۔ دُوسری طرف دھوبنوں کے کپڑے پیٹنے اور "چھوا چھو" کے بے ہنگم شور سے سارے ماحول میں دھمک پیدا ہوتی رہتی تھی[1]۔۔۔!

سندھیا کے سمے جب ڈھور ڈنگر گاؤں کی اور لوٹنے لگتے اور

---

[1] ڈیلا دیل

پنکھ پکھیرو پیپل اور بڑ کے پیڑوں پر بسیرا لینے کے لئے پر تولنے لگتے تو نفیری پر [ایمن کلیان] کے سُر، امرت سوئر (مہادیو) کے شوالے سے بلند ہو کر سنسان فضاؤں میں منڈلانے لگتے اور شام کی اُمنگیں دم توڑنے لگ جاتیں، اِس کا الاپ سُن کر بستی سے باہر سومیشور درّے کے پاس " کلو تنی چے واڑہ " کی مطربانِ خوش الحان، مسلم فنِ معماری کے شاہکار کوٹھوں پر [مالکوس] کی اِستھائی چھیڑ دیتی تھیں۔ اِس واڑہ کی بحل دیوار کی تینوں چھجّہ دار محرابوں سے آویزاں بلوری قندیلیں رات کے پچھلے پہر تک فروزاں رہتی تھیں اور تین قبّوں کی غلام گردش اور تین گنبدوں کے ایوان میں بڑھتی ہوئی لے اور اُبھرتے ہوئے سُر گردش کرتے رہتے ـــــ پھر جب ایوان کے مغرب میں احاطے سے باہر واقع مسجد سے صبح کی اذان بلند ہوتی تو سارے سُر سناٹے کے ساگر میں ڈوب جاتے۔ صرف مسجد کے سامنے ایک بڑے حوض میں نمازیوں کے وضو کرنے سے دھیمے سُروں میں کبھی کبھار جلترنگ سی بج اُٹھتی تھی . . . !!

اور ایسی ہزاروں جلترنگوں کی دُھنوں سے سارا چیوَل گونجنے لگتا۔ جب اُودی گھٹاؤں کے تمام جھام سے اُتر کر برسات کی جل پریاں دھرتی پر رم جھم برسانے لگتی تھیں اور بام کے بے حد گھنے جھنڈ میں مُسلم دَور کی یادگار گلشن سرائے کا " جل مندر " جل تھل ہو جاتا، جو ایک حوض کے مرکز میں چبوترے پر ایستادہ تھا اور اب جس کے چہار محرابوں کی کمانیں جھک گئی تھیں اور چار گوشہ ستونوں کی کمر ٹیڑھی ہو چلی تھی۔ جھنکاڑوں اور برگد کی جٹاؤں اور جڑوں

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے، قلابہ گزیٹیر، چیوَل کا بیان۔

نے جل مندر کو جکڑ لیا تھا[1]۔

جب چھاجوں پانی برستا تو کوہساروں کے قدموں تلے ندیوں اور کھاڑیوں کے نقرئی چھاگلیں بجنے لگتی تھیں۔ بھگوتی دیوی مندر کے پڑوس میں سنسان قبرستان کا پوکھرن گھٹاؤں کے آنسوؤں سے بھر جاتا اور جنجیرہ پہاڑیوں کے ابرووں تلے تال تالابوں کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں۔ بستی سے قریب زینہ دار گھاٹ کے "تال نوتے ناگھر" اور بھاؤلے تالاب[2] پر اشنان کرنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ مسجدوں کے بیرونی حوضوں پر [جمعہ کے روز بچوں اور جوانوں کا جم غفیر لگ جاتا تھا]، کھیتوں، باغوں اور بوستانوں کی باؤلیوں کے من کانسی کے گاگروں سے گونجنے لگ جاتے جب پنہاریوں کے جگھمٹ پنگھٹ پر لگ جاتے تھے۔

موسلادھار بارش کے زمانے میں مقامی نوائطی سوداگر کھپریل کی نئی چھاؤنی ڈالے ہوئے بند و تاریک مکانوں میں محفوظ بیٹھے رہتے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے کرتوں میں ملبوس، سر پر ریشمی پھیٹا [جسے روسی سیاح افاناسی نکیتن "پھٹا" کہتا ہے[3]] اور کمر میں پٹکا باندھے، بھات سے بنی ہوئی روشنائی اور نرکل کے تراشے ہوئے قلم سے [فارسی یا عربی کے کسی مخطوطہ کی نقل کرنے میں مصروف رہتے یا سعدی کی بوستان و گلستان سے گل چینی کرنے میں مگن رہتے تھے] ان کی بیبیاں سروں پر مقامی کرگھوں پر بنی ریشمی اوڑھنی[4]

---

[1] قلابہ گزیٹیر، چیوّل کا بیان۔
[2] ڈیلا ویل۔ ایضاً۔
[3] بحوالہ زاگنھا، ص ۱۸۰ – [4] داگنھا اور باربوسا۔ ص ۷۱، ۶۹، ۶۰۰۔

ڈالے اور زیادہ تر ساریوں میں ملبوس [گھریلو کام کاج میں مشغول رہتی تھیں]
نائیتی امیروں کے خدمت گار "پھینٹے" کو کاندھوں پر ڈالے اور کمر میں باندھے
ہاتھوں میں ہتھیار لیے اونچے "وَٹے" پر بیٹھے پہرہ داری کیا کرتے تھے[1]
جیئول کی گہما گہمی اور رونق شروع جاڑے میں (صرف) چار مہینوں کے
لئے لوٹ آتی۔ اندرونِ ملک سے بنیئے، بقال، بزاز، کنجڑے اور صراف
بیلوں پر بوروں میں بھرے ہوئے تجارتی اسباب لادے، قافلوں کی صورت میں
جیئول کی طرف چل پڑتے۔ ہر بیوپاری کے پاس تیس سے لے کر چالیس باربردار
بیلوں کا قافلہ ہوتا تھا۔[2] آبادی سے تین میل باہر ایک کھلے میدان میں جو
سومیشور درّے سے پرے کلوتنگی چہ واڑا اور سرائے دیہات کے سرے پر
واقع تھا ــــ بازار لگ جاتا۔ بدیسی تاجروں کے بھی ٹھٹ لگ جاتے جن میں
خلیج فارس اور عرب کے سوداگر سب سے زیادہ نمایاں رہتے تھے۔[3] [یہ غالباً
سرائے دیہات میں قائم کاروان سراؤں میں ٹھہرتے ہوں گے جیساکہ نام سے
ظاہر ہوتا ہے اور شاید یہاں کلوتنگی چہ واڑا کے خرابوں میں واقع خراباتوں میں اُن
کی مدارات بھی ہو جاتی ہوگی]۔ جب یہ پیر سید احمد کے مقبرے کے نواح میں
واقع حمام خانوں کو دیکھتے ہوں گے تو اُن کے مُلکوں کے "گرمابوں" کی یادوں سے
ذہنوں میں گرمیٔ خیال پیدا ہو جاتی ہوگی۔ اِن حمام خانوں میں دراصل اقامت
گاہیں بھی تھیں جو چھ محرابدار حجروں پر مشتمل تھیں۔ دو محرابدار غلام گردش سے

---

[1] دا کنہا۔ ص: ۱۸
[2] دُورات باربوسا۔ ایضاً
[3] ڈیلا ویل کا بیان۔ ایضاً

گذر کر ایک مربع ایوان ملتا تھا، جس پر گنبد دار چھت تھی جس کے تین جانب پس گوشوں میں طاق بنے ہوئے تھے [جنہیں دیکھ کر تصور میں بھولی بسری یادوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہوں گے] ایوان کے شمال مغرب سے ایک پُر پیچ گذرگاہ دو حماموں تک پہنچاتی تھی۔ ان میں ہندو نہیں نہاتے تھے۔[1] [مسلمانوں کے ملیچھ ہونے کے احساس سے ابھی تک ذہن صاف نہیں ہوئے تھے۔ حمام خانہ یا گرمابہ اسی لئے صرف مسلم مدنیت کا تہذیبی ورثہ تھا]۔

دسمبر سے مارچ تک چیول کی منڈی اور بندر میں میلا سا لگا رہتا تھا۔ جب موافق ہوائیں چلنے لگ جاتیں تو بار بردار کشتیوں کے بادبان کھل جاتے اور تجارتی اسباب سے لدے پھندے فتح ماری، شبر، لنگر، کوتیا، کوتیل، دوباشی اور دھنگی، دھاؤ[2] اپنے اپنے دلیسوں کی دِشا پر دوڑنے لگ جاتے اور اور ارد گرد کے شہروں کے بیوپاری بازار ہاٹ میں اپنے مال بیچ کر یا بدلیس بھیج کر دوسرے موسم تک کے لئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ـــــ پھر یہاں بڑی گمبھیر اداسی پھیل جاتی اور گہرا سناٹا چھا جاتا، جو دور سمندر کے شور اور آسمان پر منڈلاتے ہوئے بادلوں کی گھن گرج سے کبھی کبھار ٹوٹ جاتا تھا ـــــ ساحل کی طرف زندگی کے آثار ناپید ہو جاتے، صرف چند نفوس رہ جاتے اور چند آبی پرندے اور مہاجر طائر جہا[3] ہجرت کے لئے پر تولتے نظر آ جاتے تھے اور بھورے رنگ کے پیڑ گرم دھوپ سے بچنے کے لئے ہل چلے

---

[1] دوراتِ باربوسا۔ ص: ۴۲، ۳۱، ۲۸، ۱۶۔ داکنھا، ص، ۳۳۔
[2] داکنھا۔ ص: ۳۴۔
گزیٹیر۔ ضلع قلابہ۔ ص: ۳۷-۳۶۔

ہوئے کھیتوں کی مُنڈیروں پر اُگے جھنکاڑوں میں پناہ لینے کے لئے پُھدکتے رہتے تھے، یا دُھوپ میں سُوکھتے ہوئے جالوں میں پھنسی ہوئی سُوکھی مچھلیوں کے گلپھڑوں اور خولوں پر چونچ مارتے رہتے تھے۔ جُنوب میں جزیرے کی طرح دکھائی دیتی ہوئی زمرّدیں پہاڑیوں کے دامن میں سنسان گھاٹ سے دَریا کی بے چین لہریں سر ٹکراتی رہتی تھیں اور شمال میں دونوں کنارو اکے ریگزاروں پر خالی سیپ، اَدھ مُوئے گھونگھے، کوڑیاں اور سنگریزے پھیلاتی رہتی تھیں۔ [شاید عرب ساگر کے سارے موتی مَرجان بحرِ ظلمات کی پاتال میں پہنچ چکے تھے]۔ اسی بحر اوقیانوس کی طُوفانی موجوں کی زنجیروں نے مغربی ساحل کو جکڑ لیا تھا۔ اور لہروں کے "بندِ غم" میں نڈھال عرب ساگر دن رات سسکیاں لے لے کر روتا رہتا تھا ـــــ!! اور سوا سو سال بعد!

چیوَل کے عادل شاہی طرفدار کا دل بھی چُپکے چُپکے رونے لگا تھا جب سے وہ اپنے محل کے محرابدار دریچے سے سولہ میل تک پھیلی ہوئی عادلشاہی عملداری کی شکستوں کا شُمار کرنے لگا تھا جو مسلم چاوَل اور پرتگیز چیوَل کے درمیان ایک وسیع شاہراہ پر دم توڑ دیتی تھی۔ اس شاہراہ کی کاکُلِ مشکیں کے دونوں جانب سبزوں کے خطوط اُبھرے ہوئے تھے اور بام کے بلند قامت پیڑوں کا سبز آنچل لہراتا رہتا تھا جس کے سبب سڑک کی فضا گرمیوں تک نمناک اور خُنک رہتی تھی اور اِس ملگجی رہگذر کا چہرہ گردو غُبار کے غازے سے صاف رہتا تھا۔

شیخ چیوَل کی غمزدہ نظریں جب تفریحی ندیوں اور کھاڑیوں کے رُوپہلے جال میں اُلجھ جاتیں تو وہ دیکھتا کہ [گووا کے شرفائے پرتگال کے دوبادبانذار

کو مچھیا کی طرح) کسی نداالگو کا بجزاساحل کی سمت پناہ لینے کے لئے تیزی سے
رواں دواں ہے اور وہ سمجھ جاتا کہ شیواجی کا بحریہ آس پاس کہیں منڈلا رہا ہے۔
اور شیواجی کے خیال سے اُسے جُھرجُھری سی آجاتی، کیونکہ اُس نے چند برس
ہوئے (۱۶۴۸ء میں) جنجول کو بُری طرح لوٹا تھا اور پھر سمندر کے تلاطم میں اُسے
اپنا محل ڈوبتا دکھائی دینے لگتا۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے گاؤ تکیے کا سہارا لے کر
مسند پر بیٹھ جاتا، جس پر مکّی غالیچہ بچھا رہتا تھا اور پھر دریائے تفکرات میں
غرق ہوجاتا۔ جب احساسِ پسپائی کے تھپیڑے کھاکر اُس کا "سفینۂ غمِ دل"
ڈوبنے لگ جاتا تو اُس کے اندر پوشیدہ قرونِ وسطیٰ کا انفعالی صوفی مراقبے
سے بیدار ہوجاتا اور اُس کے سامنے دنیا کی بے ثباتی اور تہی مائگی کا نقشہ کھینچ
دیتا۔ [پھر شیخ جنجول کو عمر خیام کی یہ رُباعی یاد آجاتی ہوگی] :

آں قصر کہ بہرام درو جام گرفت   آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتی ہمہ عمر   بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

زندگی کا یہ مآل ___ اُسے تھوڑی دیر کے لئے تسکینِ قلب بخش دیتا تھا اور
جب وہ اپنی تہذیبی یادگاروں، اپنے قصور و محلات کا جائزہ لینے لگتا (جو لاکھ
شکستہ و تباہ حال سہی) تو اُس کا سینہ فخر سے پھول جاتا اور وہ اپنی گھٹتی ہوئی
سطوت اور ڈھلتی ہوئی تہذیب کی زوال آمادہ قدروں کو سینے سے چمٹا لیتا،
اُسے اپنے حکمران طبقے کے اعلیٰ معاشرے کی شاندار ثقافتی روایات یاد آجاتیں

---

[1] تاریخ الفنسٹن۔ ص: ۵۶۶
[2] دوارت باربوسا کا بیان
[3] فرانکو پالارڈ "نووہ گووا" (۱۸۶۲ء) ج: ۲; ص: ۱۷۱، ۱۶۶، و ۱۶۵

(جن میں اہلِ ثروت اور جاگیردارانہ سماج کی تعیش کوشی کی روایتیں بھی شامل تھیں) ــــــ مگر اس طرح اس کا صوفیانہ پندار کا صنم کدہ ویران ہو جاتا اور ــــــ شبستانِ عیش آباد ہو جاتا [جس میں اُس کے ذہنی قرار کا چور دروازہ بھی کھلتا تھا]۔ پھر ہجومِ دلبران و میہمانان میں وہ سب کچھ بھول جاتا۔ شام کی ضیافت کے بعد جس میں بدیسی تاجر اور فرنگی سیاح [بے حد خوشامد سے مدعو کئے جاتے تھے] جب غمزدہ شیخ جیسوں کی ہم نشینی میں بادہ پیمائی کرنے لگتا تو "جوشِ قدح" سے سارا ماحول "بزمِ چراغاں" بن جاتا تھا اور اُس کا خیال ہر ایک گُل و لالہ پر دوڑنے لگ جاتا۔ گُل اندام و لالہ رُخ رقاصائیں "ناز و خرام کے کرشمے" دکھلانے لگ جاتیں۔ یہ رنگین [تافتہ] کے پارچوں کی شاش یا کمر بند باندھے رہتی تھیں۔ [سنگیت میں اِن کنچنیوں کی سنگت کرنے والی "کلونتی چہرہ واڑا" کی کوئی مُغنّیہ جب حافظ کی غزل کے اِس شعر پر تان لیتی ہوگی تو شیخ کا دل نا معلوم خوف سے دھڑکنے لگتا ہوگا۔]

عَروسِ جہاں گرچہ در حدِّ حُسن است

ز حد می بَرد شیوۂ بیوفائی

دنیاوی جاہ و جلال کی بے مائگی اور حکومت و اقتدار کی ناپائداری کے حقائق سے جیُول کا مَلِک کما حقّہٗ طور سے واقف تھا اور قرونِ وسطیٰ کے معیار کے مطابق وہ حکمران طبقے کا ایسا ذہین فرد تھا جو تاریخ کے سماجی و عمرانی عوامل و محرکات کا شعور رکھتا تھا۔ [گو اُس نے ابنِ خلدون کو پڑھا نہ ہو، تب بھی فارسی کتبِ اخلاق میں سے "سیاستِ مُدن" کا درس ضرور لیا ہوگا]۔
گردشِ روزگار کا فلسفہ جب اُس کے ذہن کی ویران گاہ میں چمگادڑوں

کی طرح چکر کاٹنے لگا تو ـــــ رقص کی گردش تھم گئی۔ سازو آہنگ کا طلسم ٹوٹ گیا اور راگ رنگ کے سُروں نے زخمی طائر کی طرح تڑپ کر دم توڑ دیا۔ پھر یکبارگی سناٹے کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ تخلیہ ہو گیا تو جان لیوا ویران تنہائی ناگ بن کر ڈسنے لگی ـــــ زندگی کی طرح پھیلے ہوئے لامتناہی ساحل اور محبّت کی طرح حسین و بیکراں سمندر کے سامنے وہ اپنے آپ کو بے حد حقیر ـــــ اور بے حد تنہا محسوس کرنے لگا۔ زندگی کے فلسفیانہ مسائل اور انفعالی تصوف کے اپاہج اقدار اُس کے دھیان کی رہگذاروں پر چلنے لگے۔ سوچتے ـــــ سوچتے اُس کا ذہن اُس کی تلوار کی طرح کند ہو گیا ـــــ اور سمندری ہواؤں نے تھپکیاں دے دے کر اُسے سُلا دیا ـــــ!! ـــــ وہ سوتا پڑا رہ گیا ـــــ اور اس وقفے کے دوران کئی صدیاں گُذر گئیں۔!!

مگر چیول کے ماضی کی آنکھ ابھی تک نہیں لگی ہے۔ اس کی اُجاڑ دھرتی جنگلی پیڑوں کے سایوں اور جھنکاڑوں کے گھرے کُنجوں میں اب تک سانس لے رہی ہے۔ آج بھی اُس کے کھنڈروں اور ملبوں میں سنگ وخشت کے گھونٹ اور چٹانی اور مرمریں سلوں کے انباروں کو محنت کے گرم ہاتھوں کا وہ لمس یاد ہے جنھوں نے سرمائے کی مدد سے اُن کے وجود کو سنوارا تھا۔ درختوں کے زمرّدیں محرابوں تلے چیول کی وسیع شاہ راہ عابد شب زندہ دار کی طرح اُونگھتی پڑی ـــــ ہوئی اُن آہٹوں کو سُنتی رہتی ہے جو کبھی اُس کے دل کی دھڑکنیں بنی ہوئی تھیں۔ جب کوئی بھولا بھٹکا بدیسی سیاح ان ویرانوں میں نکل آتا ہے تو یہ چونک پڑتی ہے، مگر خیابانوں میں سرسراتی ہوئی حریری ہوائیں سانپ کی مانند رینگتی ہوئی تنہائیوں سے سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں "۔ اب یہاں

کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا" اور شاید وہ "پی" بھی نہیں آئے گا، جیسے پپیہا برسات کی بھیگی فضاؤں میں ــــ رکھب سُروں میں پُکارتا پھرتا ہے اور جیسے بیساکھ کی گرم راتوں کی بھرپور چاندنی میں جب سمندر کے تیز و تند جھونکے سناٹے کے تاروں پر للت کی استھائی چھیڑتے ہیں تو اس گمبھیر تنہائی سے اکتا کر کوئی مہجور چکور فضاؤں میں چیخ کی ایک لکیر کھینچتا ہوا چاند کی اور تیزی سے اُڑ جاتا ہے۔ جیسے اُسے اب اس دھرتی پر نہیں، صرف چاند پر ہی پناہ ملے گی ــ کوکن کا کسان جب کھیتوں میں اپنا ازلی اور ابدی رہٹ چلانے لگتا ہے تو "چرخ چوں" کے کراہنا شور سے ساری فضا کراہنے لگتی ہے ـــــ اور دُور سمندر سسکیاں لے لے کر رونے لگتا ہے ــ یہ تنہائی کا کرب ہے یا ایک شاندار تہذیب اور تاریخ کے مٹ جانے کا ماتم ــ؟

بے دلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے نہ دیں!

ـــ ـــ